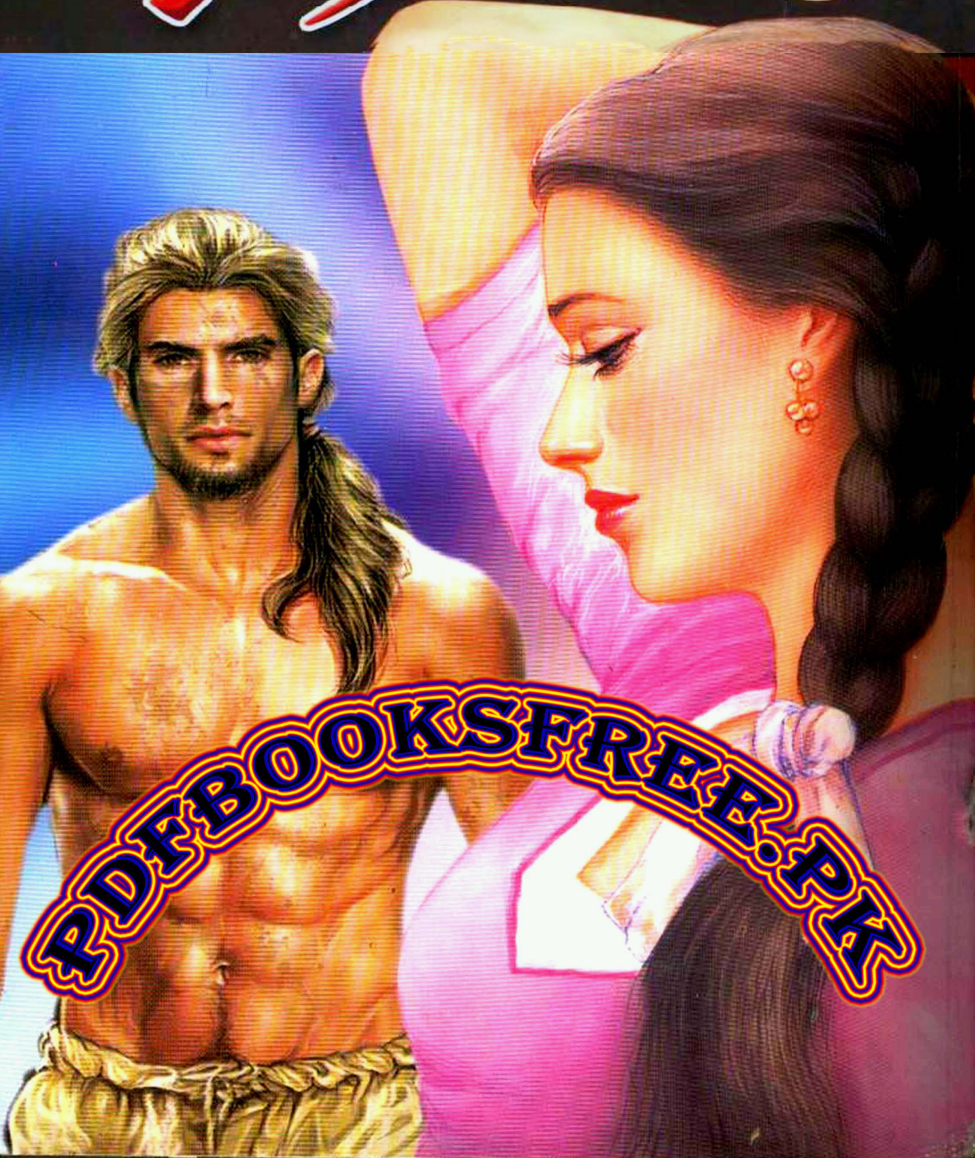


ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی تہلکہ خیز کہانی

سراب

راوی: شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

15



ایک نوجوان کے بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں کی ایک تھلکہ خیز کہانی

سراب

پندرہواں حصہ

کاشف زبیر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 37247414

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بارشاعت ————— اول
مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ————— عاطف رحمن۔ لاہور
قیمت ————— 250 روپے
بیرون ملک ————— 10 برطانوی پونڈ
15 امریکی ڈالر

ISBN 978-969-517-320-6

Stokist: (U.K)

Azhar Enterprises

315, Dickenson Road

Longsight, Manchester, M13 0NR

Tel: 0044 (0) 161 224 6331

اسٹاکسٹ
علیٰ ہیکسٹال
نسبت روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور

یہ بریفنگ تقریباً دو گھنٹے جاری رہی تھی۔ بیٹو کو انگریزی کی زیادہ سمجھ نہیں تھی اس لئے وہ عملی طور پر ہتھیار دیکھ رہا تھا اور ہاتھوں میں لے کر سمجھ رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ بھوک اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے میں نے واپسی کا فیصلہ کیا اور جانے سے پہلے کر ٹل سے کہا۔

"آج شام تاریکی کے بعد ہم ٹارگٹ پریکٹس کرنا چاہتے ہیں۔"
 "کھلے میں تو ممکن نہیں ہے لیکن یہاں ایک زیر زمین پرکٹس ہال ہے۔"
 "کوئی بات نہیں ہم روشنیاں کم کر کے پریکٹس کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ہاں یاد آیا تم منشی دل جی سے یقیناً کنور پیلس کے بارے میں ساری معلومات حاصل کر لی ہوں گی۔"
 اس نے سر ہلایا۔ "تقریباً تمام اہم معلومات حاصل کر لی ہیں۔"
 "پاور سپلائی کے بارے میں کیا معلوم کیا ہے؟"
 "کنور پیلس کو مرکزی گرڈ سے لائن دی ہوئی ہے اس کا گرڈ اسٹیشن تک اپنا ہے۔ پہلے مرحلے میں لائن اڑادی جائے گی۔ دوسرے مرحلے میں اہم جزیئر تباہ کریں گے وہ گرڈ اسٹیشن کے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود ہر عمارت کے لئے یو پی اس پاور بیک اپ ہے۔ مکمل طور پر بند کرنا ناممکن ہے۔"
 "بالکل ممکن ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "اس کی آسان سی ترکیب ہے۔ ہر عمارت میں گھسنے والے سب سے پہلے کسی ساکٹ میں تار ڈال کر اسے اڑادیں۔"

"تم نے اچھی تجویز دی ہے۔" وہ بولا۔ "یہ آسان سا کام ہے اور جب تک ساکٹ میں دائر رہے گی فیوز اڑتا رہے گا۔"

میں اور بیٹو میننگ روم سے نکل رہے تھے کہ کر ٹل جیمز نے آواز دی۔ "شہباز ملک..... مجھے اس عورت کی تصویر چاہئے جسے ہم نکالنے جا رہے ہیں میرے ہر آدمی کو اس کی صورت سے واقفیت ہونی چاہئے تاکہ کسی قسم کی کوئی غلطی نہ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟"

میں نے سر ہلایا۔ "تصویر مل جائے گی..... تم اسے پرنٹ کروالیتا۔"

"یہ کام ہو جائے گا۔"

میں اور بیٹو واپس آئے اور لچ کا آرڈر دیا۔ میں نے کم کھایا تھا اور جلد اٹھ گیا۔ اسکاپ آن کر کے رابطہ

کیا۔ سفیر آن لائن تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سادی کے چہرے کی واضح تصویر بھیج دو۔“
 ”کیسے؟“ سفیر نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے اسکاپ سے بھی ٹرانسفر ہو جاتی ہے لیکن پہلے تصویر تو دیکھو۔ اگر نہیں ہے تو ویم سے معلوم کرو۔“

”دس منٹ بعد کال کرنا۔“ سفیر نے کہا۔

میں نے ساریہ سے اپنے لیے کافی منگوائی اور دس منٹ بعد کال کی۔ سفیر نے کہا۔ ”تصویر ہے ویم کے پاس..... وہ مانی سے اسکیمن کر رہا ہے۔“

”عبداللہ کہاں ہے؟“

”وہ حویلی گیا ہوا ہے۔ ویم کے آدمی آنا شروع ہو گئے ہیں۔“ سفیر نے مطلع کیا اسی اثناء میں ویم یو ایس بی لے آیا اور اس نے لگا کر اسکاپ سے فائل ٹرانسفر کی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ سادی کی بہت واضح تصویر تھی وہ حویلی کے پس منظر میں کھڑی تھی اور اس کے بال ہوا کے ساتھ اڑ رہے تھے۔ چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ تصویر لینے والا ویم تھا۔ میں نے اسے محفوظ کر لیا اور پھر ان لوگوں کو آج کی میٹنگ کا مختصر احوال سنا کر اسکاپ بند کر دیا۔ بیٹو لچ سے فارغ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے آگاہ کیا۔ ”شوہی آج سے ہمارا دوا ختم ہو گیا ہے اور ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ زخم ٹھیک ہے۔ آج ہم نہائے گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن ہاتھ پر اتنا زور مت دینا کہ زخم متاثر ہو۔ ایک ہفتہ پورا ہو گیا ہے لیکن گولی کا زخم اتنی جلدی نہیں بھرتا ہے۔“

”ہم نے ہر طرح سے ہاتھ ہلا کر اور استعمال کر کے دیکھ لیا ہے ہم کو ذرا بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔“
 ”آج ٹارگٹ پریکٹس کے بعد پھر ڈاکٹر کو دکھالینا۔“ میں نے کہا اور کمرل سے رابطہ کیا۔ ”تصویر آگئی ہے۔“

”بلو تو تھ پری بے نام کا آئی فون سرچ کر کے اس پر بھیج دو۔“

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور یہیں بیٹھے بیٹھے سادی کی تصویر کمرل کے پاس پہنچ گئی اس نے مطلع کیا۔ ”مل گئی ہے۔“

”مجھے فتح خان سے بات کرنی ہے۔“

”تین نمبر دباؤ اس پر کھان ملے گا۔“

میں نے تین نمبر دبا دیا تو فتح خان کی محمود آواز آئی۔ ”شہباز خانا..... اس وقت کیسے یاد کیا؟“

”تو پھر کس وقت یاد کروں..... ویسے سہ پہر کے تین بج رہے ہیں۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”فورا؟“ اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

”اگر تم مصروف ہو تو کچھ دیر بعد بھی مل سکتے ہو۔“

”بہت مصروف ہے..... آہ.....“ فتح خان نے کہتے ہوئے آہ بھری اور عقب سے آتی نسوانی ہنسی نے راز

فاش کیا کہ مصروفیت کی نوعیت کیا تھی۔ میں نے واکی ٹاکی بند کر دیا۔ بیٹو نے کہا۔

”شوبی ہمار ہاتھ میں خارش ہو رہا ہے اس کا مطلب ہے باردھاڑ ہوگا اور ہم اس میں حصہ لے گا۔“
 ”ظاہر ہے نہ ہم کنور پبلس پر پھول برسائے جارہے ہیں اور نہ وہ ہار پھول لے کر ہمارا استقبال کریں گے۔“

”شوبی ہم کو دیدی کا لکڑ ہے۔“

”مجھے بھی اس کی لکڑ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کنور پبلس کی مرکزی عمارت میں ہے۔“

”حملے سے پہلے تصدیق کرے گا کہ وہ وہاں ہے یا کہیں اور تو نہیں بھیج دیا ہے۔“

یہ تصدیق سفیر کر سکتا تھا۔ سادی نے بتایا تھا کہ وہ پبلس میں اپنے کمرے میں تھی اور وہاں اسے فون کی سہولت دی گئی تھی۔ اس سے براہ راست رابطہ کیا جا سکتا تھا لیکن ہم نہ تو اسے کوئی اشارہ دے سکتے تھے اور نہ کہہ سکتے تھے کہ وہ کسی ناگہانی صورت حال میں اپنے کمرے میں رہے۔ اسے تو خبر بھی نہیں تھی کہ اسے چھڑانے کے لیے ہم ہالی ووڈ کی موویز جیسا ایکشن کرنے جارہے تھے۔ اس میں باردھاڑ ہوتی اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کون بچتا اور کون مارا جاتا۔ اگر سادی کو پتا چل جاتا تو وہ یقیناً مخالفت کرتی کیونکہ وہ اپنے لیے کسی کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ تو میرے بارے میں کہہ رہی تھی کہ یہاں خطرہ تھا اور میں واپس پاکستان چلا جاؤں۔ مگر میں اس کی یہ بات نہیں مان سکتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد فتح خان آیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی جو یقیناً ناوقت شراب و شباب سے شغل کا فطری نتیجہ تھا اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے بد مزگی سے کہا۔ ”شہباز خان! تم نے غلط وقت پر کال کیا۔۔۔۔۔ میرا سارا مزہ خراب ہو گیا۔“

”کوئی بات نہیں یہاں یقیناً تم پر مزے کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بعد میں تم مزے کو دہیں سے شروع کر سکتے ہو جہاں چھوڑا ہوگا۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم نے اپنے آدمیوں سے بات کی؟“

”ہاں میں نے ان کو بتا دیا ہے وہ تیاری کر رہا ہے کرنل کا آدمی ان کا تربیت کر رہا ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے، اس کا مطلب ہے تمہارے آدمی ہی میرے ساتھ ہوں گے؟“

”تم نے فرمائش کیا تو وہ پورا ہوگا نا۔۔۔۔۔ میں نے بتایا تھا تمہارے لیے سب کرے گا۔“

”تم نے کہا تھا اس بار تم دل سے ساتھ نہیں ہو۔۔۔۔۔ اس کی وجہ؟“

”ہم اس خنزیر کا بچہ کرنل زریبکی کے پیچھے تھا۔ ادھر شامیب کا حکم آ گیا کہ انڈیا آؤ۔۔۔۔۔ ہم اس کے پاس پہنچ گیا تھا پر کیا کرتا۔۔۔۔۔ اسے چھوڑ کر ادھر آنا پڑا۔“

اب میری سمجھ میں آیا کہ فتح خان بیزار کیوں تھا۔ اس کی کرنل زریبکی سے ٹھن گئی تھی۔ میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ ”صرف یہی وجہ ہے یا کوئی بات اور بھی ہے؟“

”اور کیا بات ہو سکتا ہے؟“

”اس بار تم ڈیوڈ شا کے بعد دو نمبر نہیں ہو۔۔۔۔۔ کرنل جیمز دو نمبر ہے۔“

اس کے چہرے پر ایک لمحے کو سختی آئی لیکن پھر اس نے لاپرواہی سے شانے ہلائے۔ ”ہم کو اس کا پروا نہیں ہے۔۔۔۔۔ شامیب باس ہے وہ جسے چاہے دو نمبر بنائے اور جسے چاہے دس نمبر بنا دے۔“ کہتے ہوئے فتح خان کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آ گئی تھی۔

”اس مہم کے بعد تم واپس چلے جاؤ گے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی مجھے یہاں رکنا ہے جب تک شامیب جانے کا اجازت نہ دے۔“
میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شافع خان کو ہمالیہ والی مہم میں بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ کرل جیمز اور اس کے آدمی بھی شامل ہوں۔ میں نے کہا۔ ”امید ہے نشی دل جی کے بارے میں جو طے ہوا تھا اس پر عمل کیا جا رہا ہوگا۔“
”تم اس کا فکر مت کرو۔ اب اس کا شامیب سے رابطہ بھی نہیں ہے۔ وہ کرل کے پاس ہے اور ابھی اسے ادھر ادھر جانے کا اجازت بھی نہیں ہے۔“

”وہ بہت شاطر آدمی ہے اس نے بیک وقت دونوں کنوروں کو بنے وقوف بنایا اور دونوں اسے اپنا آدمی سمجھتے رہے جب کہ وہ صرف اپنے لیے کام کر رہا تھا۔ پھر پول کھنسنے پر وہ ان کے ہاتھ نہیں آیا کامیابی سے وہاں سے فرار ہو گیا۔“

”چالاک سے چالاک آدمی بھی جب حالات کاٹھکنے میں آتا ہے تو کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر اسے معلوم ہے ڈیوڈ شا کو دھوکا دینے کی صورت میں اس کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔“ فتح خان نے سر ہلایا۔ ”یہ بتاؤ تم کو کسی چیز کا ضرورت تو نہیں ہے۔“

”ابھی تک تو ایسی کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی ہے جس کے لیے خاص طور سے تمہیں کہنا پڑے۔“ میں نے کہا۔

”ادھر بہت اچھا جم اور سوئمنگ پول بھی ہے اگر استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔“

یہ اچھی خبر تھی۔ ”کہاں ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ فتح خان بولا۔ جم اور پول والی عمارت اس عمارت کے عقب میں تھی اور اسی لیے مخصوص تھی۔ سوئمنگ پول بڑا نہیں تھا مگر تیراکی کے لیے کافی تھا موسم کی مناسبت سے اس میں گرم پانی تھا۔ جم میں تمام آلات اور مشینیں تھیں۔ یہاں تیراکی کے لیے زنانہ اور مردانہ دونوں طرح کے لمبوسات دستیاب تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک گھنٹے تک سوئمنگ کر کے میں واپس آیا تو خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس دوران میں بیٹو بھی نہاد دھوکا تازہ دم ہو گیا تھا خاصے دن بعد اسے مکمل باتھ کا موقع ملا تھا اس لیے خوش تھا۔

”شوہی ہمارا وزن ایک کلو کم ہوا ہے؟“

”وہ کیسے؟“

”اتنا میل اتر ا ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”حالانکہ تم اس حالت میں بھی نہاتے دھوتے رہے ہو زخم بچا کر۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”تیار ہو جاؤ“

کچھ دیر میں تاریکی ہو جائے گی تو ہمیں جانا ہوگا۔“

”شوہی پہلے چائے نہ پی لے۔“

”ہی لو۔“ میں نے کہا تو اس نے ساریہ کو بلایا۔ چائے تو ایسے ہی تھی اصل میں اس نے ریفریجیٹ کا

آرڈر دیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ اس عمر میں ہمیں ہمہ وقت تو کھانے کے چکر میں نہیں ہوتا تھا لیکن کچھ بھی اور کتنا بھی

مالیت سب ہضم ہو جاتا تھا۔ چند گھنٹے بعد پھر سے کھانے کو تیار ہوتا تھا۔ یہ عربی ایسی ہوتی ہے اور بیٹو کو شوق بھی۔ مانی اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ بیٹو کی صحت پھر بھی اچھی تھی مانی نازک اندام نو جوان تھا۔ اسے دیکھ کر ل نہیں پتا چلتا تھا کہ وہ اتنا کھاتا ہوگا۔ چائے اور دوسرے لوازمات سے نمٹتے ہوئے باہر تارکی چھا گئی تھی۔ اسے پہلے میں کرل کو کال کرتا اس کی کال آگئی۔ ”شہباز میں باہر تمہارا منتظر ہوں۔“

”ہم آتے ہیں۔“ میں نے کہا اور بیٹو کو اشارہ کیا تو وہ بادل نا خواستہ کچوری کی پلیٹ چھوڑ کر اٹھا تھا۔ لٹ پریکٹس کے لیے ریج اس عمارت کے نیچے تہہ خانے میں تھی جہاں ڈیوڈ شا ہوتا تھا۔ تہہ خانہ تقریباً پوری رات کے برابر تھا۔ یہاں شوٹنگ کے مکمل انتظامات تھے۔ مختلف طرح کے ٹارگٹس تھے اور ان میں حرکت کرنے والے ٹارگٹس بھی تھے۔ ہتھیاروں کی مکمل ریج تھی۔ کیونکہ جگہ بند تھی اس لیے آواز بہت زیادہ گونجتی اور گونج سے کانوں کو بچانے کے لیے ہیڈ فون جیسے آلے تھے جو کانوں کو مکمل طور پر ڈھک لیتے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے کھور برداشت کرنے کی زحمت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ یہاں وہ دونوں ہتھیار تھے جو ہمیں ملتے یعنی رائفل ہتول۔ اس کے علاوہ ہینڈ گرنیڈز اسوک، ایم اور وائس ایم ملتے مگر ان کی پریکٹس نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرا نشانہ ل سے اچھا تھا اور رائفل سے اتنا اچھا نہیں تھا اس لیے میں نے ہتول منتخب کیا۔ بیٹو نے رائفل منتخب کی۔

”برسٹ تین سیکنڈ سے زیادہ کا نہ ہو ورنہ رائفل کے جام ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے جب برسٹ ڈون میں گنتی بھی گنو۔“

میں نے بیٹو کو سمجھایا تو اس نے سر ہلایا۔ ”ہم ویم بھائی سے سب سیکھ چکا ہے اس کو بولو اپنا منہ بند۔“

”یہ مشن کمانڈر ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”ہوگا۔“ بیٹو نے بے نیازی سے کہا اور رائفل کو سنگل موڈ پر کر کے اس نے ایک ٹارگٹ پر لگا تار فائر کرل کے ساتھ میں بھی حیران رہ گیا جب تمام گولیاں ٹارگٹ کے سر اور سینے پر لگیں۔ کرل نے بے ساختہ

”ایکسی لٹ یگ مین۔“

بیٹو نے مختلف انداز میں فائرنگ کی مشق کی۔ گھوم کر زمین پر قلابازی کھا کر اور زمین پر گر کر۔۔۔۔۔ یہ تمام اسے مقابلے کے دوران پیش آنے والی صورت حال کے مطابق حرکات تھیں۔ جب بہت تیز حرکت اور دوران میں درست نشانہ ہی آپ کو بچاتا ہے۔ سستی یا غلط نشانے دونوں کی سزا عام طور سے موت کی صورت میں ہے۔ بیٹو کے بیشتر نشانے درست لگے تھے۔ پھر اس نے ہتول سے نشانے بازی کا مظاہرہ کیا۔ اس بار اس کے نوے فیصد سے زیادہ نشانے درست لگے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا۔ کرل بری طرف دیکھا۔ ”اسے کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں ہے یہ تمام ٹیکر جانتا ہے۔“

”یہ سب تو مجھے بھی نہیں آتا ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”لڑکا بہت شارپ شوٹر ہے۔“ کرل نے کہا۔

بیٹو بہت تیزی سے گر اور اٹھ رہا تھا مجھے خدشہ ہونے لگا کہ اس کے زخم کو ٹھیس نہ لگے۔ مگر میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ ہم تقریباً دو گھنٹے تک اپنے ہتھیار اور نشانے آزماتے رہے تھے۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنی گولیاں مشق کے دوران نہیں چلائی تھیں جتنی اس دن چلائی تھیں۔ مجموعی طور پر دو سو سے زائد فائر کیے تھے۔ کرنل کچھ دیر ہمارے ساتھ رہا تھا پھر وہ چلا گیا۔ اس کے کچھ آدمی آگئے تھے اور اس نے انہیں بریف کرنا تھا۔ باقی اگلی صبح پہنچ جاتے۔ کرنل کے جانے کے بعد بیٹو نے کہا۔ ”شوبی اس گورے کا انداز ایسا ہے جیسے ہم کو کچھ نہیں آتا ہے۔“

”اب نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے تمہارا نشانہ اتنا اچھا ہے اور تم تو باقاعدہ کمانڈر و اسٹائل میں مگن استعمال کر رہے ہو۔“

”سب دسیم بھائی نے سکھایا ہے پھر ہم کو بہت سارا مگن چلانا سکھایا جو نہیں تھا وہ انٹرنیٹ سے نکال کر اور اس کا ویڈیو کی مدد سے بتایا کہ یہ کیسے چلتا ہے۔ ادھر میز پر جو ہتھیار رکھا تھا وہ سب ہم کو چلانا آتا ہے۔ بس میز اکل چلانا نہیں آتا۔“

”وہ بھی مشکل نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

دو گھنٹے کی مشق نے میرا نشانہ بہت بہتر کر دیا تھا۔ بیٹو نے بھی اچھی خاصی مشق کر لی تھی۔ ہم باہر نکلے تو تہہ خانے کے دروازے پر ایک خادمہ موجود تھی۔ بہ ظاہر وہ ہماری خدمت گزاری کے لیے تھی لیکن اصل میں اسے اس لیے تعینات کیا گیا تھا کہ ہم اس عمارت میں مڑگشت کی کوشش نہ کریں اور مشق کر کے یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ ہم اس کے ساتھ دروازے تک آئے اور باہر نکلے تھے کہ منشی دل جی سے سامنا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا منہ بگڑ گیا تھا۔ کیونکہ اب وہ کنوروں کی منشی گیری نہیں کر رہا تھا اس لیے اسے ظاہری اخلاق برتنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے افسوس سے کہا۔ ”تم اصل میں منشی گیری کے قابل ہو۔ بالکل بنیادینیت ہے تمہاری..... راجپوت کہیں سے نہیں لگتے۔“

”شہباز جی آپ کچھ زیادہ ہی بول رہے ہیں۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”آپ جانتے ہیں میں شروع سے زیادہ بولنے کا عادی ہوں۔ آئیے ذرا پھل قدمی ہو جائے۔“

ایک لمحے کو ایسا لگا جیسے وہ انکار کر دے گا۔ مگر پھر اس نے سر ہلایا اور ہمارے ساتھ ہو لیا۔ بیٹو نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی ضروری نہیں تھی اس لیے وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ میں اور منشی دل جی لان کی پختہ روش پر ٹہل رہے تھے جس کے دونوں طرف موت تھی۔ صرف ایک قدم رکھنے کی دیر ہوئی اندھی گولی آ کر کام تمام کر دیتی۔ بیٹو کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”منشی جی..... میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ کے ارادے کیا ہیں اور ڈیوڈ شاتک آپ کی رسائی کیسے ہوئی؟..... البتہ یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کنوروں کی جاگیر پر قبضے کے سلسلے میں اتنے پُر امید کیوں ہیں؟“

میرے سوال پر وہ چونکا اور پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ان دونوں بھائیوں کے بعد میں ہی واحد مرد بچتا ہوں۔ ظاہر ہے میں ہی جاگیر کا مالک ہوں گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر کنوروں کی دونوں بہنوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی راج کنوری اولاد ہے۔ بے شک وہ ابھی بچے ہیں لیکن ان کا حق بنتا ہے تم کس کھاتے میں آتے ہو یہ میں سمجھ نہیں پا رہا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو مہاشی جی.....“

”مجھے فضول اور مکارانہ ناموں سے پکارنے کے بجائے میرا نام لو۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔

”ٹھیک ہے شہبازی جی..... تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”نشی جی یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے کہ کئی قریبی اور قانونی وارثوں کے ہوتے ہوئے بھی تم جاگیر پر کیسے قبضہ کر لو گے۔ کم سے کم قانونی لحاظ سے یہ ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ جب کہ تم نے ڈیوڈ شا سے کہا ہے کہ تم جاگیر پر قبضے کے بدلے اس کی مدد کر رہے ہو۔ مجھے تو لگ رہا ہے تم اسے بھی دھوکا دے رہے ہو۔“

نشی دل جی کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔ ”تمہیں کیا دلچسپی ہے اس سے؟“

”جلد تمہیں پتا چل گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے تم کسی اور چکر میں ہو۔“

”اگر میں کسی اور چکر میں ہوں تو تمہیں کیا؟“

”نشی جی مجھے یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے اگر میرے کسی کام میں رخنہ پڑا تو تمہارا نام بھی میرے دشمنوں میں شامل ہو جائے گا اور دشمن مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے میری کوشش ہے کہ کوئی میرا دشمن باقی نہ رہے یا تو وہ انسان کا بچہ بن جائے یا پھر اس دنیا میں نہ رہے میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”فکرمات کرو میں تمہارے کام میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔“ اس نے کہا اور پلٹ کر اس عمارت کی طرف چلا گیا۔ میں فکرمند ہو گیا کیونکہ فتح خان نے مجھے یقین دلایا تھا کہ نشی جی اب کرل کی تحویل میں ہے اور وہ اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ لیکن وہ آزادی سے محروم رہا تھا اور اس عمارت میں جا رہا تھا جس میں ڈیوڈ شا مقیم تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ نشی دل جی صرف ایک آلہ کار کے طور پر ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا کچھ اور مقصد بھی تھا۔ آج کے دور میں وارثوں کے ہوتے ہوئے کسی کی دولت اور جائیداد پر قابض ہو جانا آسان کام نہیں تھا۔ یہ بات بھی قابلِ غرض نہیں تھی کہ نشی صرف کنوروں سے انتقام لینے کے لیے ڈیوڈ شا سے ملا تھا جب کہ ڈیوڈ شا میرے ساتھ کٹ منٹ کر چکا تھا کہ دونوں کنوروں پر میرا اختیار ہو گا۔ ہو سکتا تھا میں ان کے ساتھ کچھ رعایت کر دیتا لیکن نشی انہیں ایک لمحہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دیتا۔ میں واپس آیا تو بیٹو کسی سوچ میں گم تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو بر خوردار؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”شوہی..... یہ نشی کنوروں کا دشمن ہے؟“

”ایسا ویسا اس کا بس چلتا تو انہیں اب تک جہنم رسید کر چکا ہوتا۔“

”تب آپ خود کیوں مانگ رہا ہے اس پر چھوڑ دو؟“

میں بیٹو کا مطلب سمجھ گیا وہ کہہ رہا تھا کہ میں کنوروں کو مانتے کے بجائے ان کی قسمت کا فیصلہ نشی اور ڈیوڈ شا پر چھوڑ دوں۔ لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ایسا کر کے میں غلطی کروں گا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ نشی جی خالص انتقام یا جاگیر پر قبضے کے لیے ڈیوڈ شا کے ساتھ ہے تو شاید میں اس چیز سے دست بردار ہو کر کنوروں کا انجام ان لوگوں پر چھوڑ دیتا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ اس کی یہی نیت ہے مجھے لگ رہا تھا کہ اصل چکر کچھ اور ہے۔ یہ بات میں یہاں کھل کر نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے میں نے بیٹو سے کہا۔ ”وہ ہمارے مجرم ہیں اس لیے ان کی

قسمت کا فیصلہ بھی ہم کریں گے۔“

”شوبی کیا نشی ہمارے ساتھ جائے گا؟“

اگرچہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نشی دل جی ہمارے ساتھ جائے گا یا نہیں، مگر میں نے اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ نشی نہیں جائے گا اس کا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کی طرف سے مہیا کیے جانے والے آدمی باہر رہ کر مدد کرتے۔ میں ان میں سے کسی کو پہلے ہی لے جانے سے انکار کر چکا تھا۔ مجھے اس بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں تھیں۔ میں نے کرنل سے رابطہ کیا۔ ”نشی دل جی اور اس کے آدمی اس مشن کے دوران کہاں ہوں گے؟“

”آف کورس..... آؤٹ سائیڈ ہیلز۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا اس کی موجودگی ضروری ہے؟“

”ہاں اپنے آدمیوں کو وہی کنٹرول کرے گا۔“

”کیا مطلب وہ تمہاری کمانڈ میں نہیں ہوں گے؟“

”نشی میری کمانڈ میں ہوگا اس لیے وہ بھی میری کمانڈ میں ہوں گے میرا حکم نشی کے توسط سے پہنچے گا۔“

یہاں زبان کا مسئلہ ہے۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”دو درجن آدمی ہیں۔ وہ پورا علاقہ بند کر دیں گے اگر اس دوران میں کوئی پولیس پارٹی آگئی تو وہی اس سے نمٹیں گے۔“ کرنل نے کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”مسٹر ملک میرا ایک مشورہ ہے..... یہاں نیٹ کا استعمال کم سے کم کرو۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟“

”ہاں اور میں پہلے ہی اس پر عمل کر رہا ہوں۔“

”شملہ ایک حساس جگہ ہے اور پاکستان کے لیے نیٹ ٹریفکنگ مقامی حکام کو چوکنا کر سکتی ہے۔“

کرنل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ شروع میں، ہمیں بہت محتاط تھا۔ مگر ہم پاکستانیوں کی عادت ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ریلیکس ہو جاتے ہیں اور لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ میں بھی لاپرواہی کر رہا تھا جب کہ مجھے زیادہ محتاط رہنا چاہیے تھا دشمن کو کمزور سمجھنے والا ہمیشہ احمق ہوتا ہے۔ میں نے کرنل سے کہا۔ ”اگر یہاں کوئی غیر متوقع صورت حال پیش آتی ہے تو تمہارے پاس کوئی حفاظتی میگزین ہے؟“

”کیسی صورت حال؟“

”مقامی حکام چڑھ دوڑتے ہیں اس صورت میں ہم کیا کریں گے؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔ ایسی کسی صورت میں ہمیں پہلے سے ہتھ چل جائے گا اور ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“

”ایک مشورہ میرا بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”واکی ٹاکی کا استعمال کم سے کم کرو..... بے شک یہ بہت حد یہاں کے اور ان کی فریکوئنسی پکڑنا مشکل ہوگا لیکن ناممکن نہیں ہے۔ آج کل ریڈیو سے متعلق آلات بہت حد تک آگے ہیں۔ بچے بھی ان کی مدد سے آس پاس کی نشریات پکڑتے ہیں۔ خاص طور سے وہ کارڈ لیس کی

نشریات پکڑ کر لوگوں کی غبی گفتگو سنتے ہیں۔“

اس بار کرنل نے میری بات تسلیم کی اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ ساریہ دستک دے کر اندر آئی اس نے ڈنر کا پوچھا۔ کیونکہ ہمیں اپنے کمرے میں ڈنر کرنا تھا اس لیے ہم نے اپنی پسند کی چیزیں بتائیں۔ آدھے گھنٹے میں ڈنر آگیا تھا۔ مجھے بھوک خاصی لگ رہی تھی لیکن اس بار بھی میں نے ہاتھ ہلکا رکھا۔ خوراک کی زیادتی جسم کو سست کرتی ہے اور اس کی کمی انسان کو چست رکھتی ہے اس مشن کے دوران میں مکمل طور پر چست رہنا تھا اس لیے میں نے ابھی سے خوراک کم کر دی تھی۔ بیو نے نوٹ کر لیا۔ ”شوبی کیا بات ہے آپ دودن سے کم کھا رہا ہے؟“

میں نے اسے اپنا کچھ نظر بتایا تو اس نے ہاتھ روک لیا۔ ”تب تو ہم کو بھی کم کھانا چاہیے۔“
”تمہیں فرق نہیں پڑے گا۔ ایک تو تم نو عمر ہو، اس عمر میں آدمی جو کھالے اور جتنا کھالے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ دوسرے تمہارا خون ضائع ہوا ہے اور زخم تقریباً بھرا ہے تمہیں خوراک کی زیادہ ضرورت ہے اس لیے دبا کر کھاؤ۔“

بیو خوش ہو گیا۔ ”تب ٹھیک ہے۔“

کھانے کے بعد میں نے چہل قدمی کی۔ پھر شاور لیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ زندگی کا ایک چکر بن گیا تھا جب تک آزاد رہتا۔ کھانے اور آرام کا موقع کم ملتا تھا۔ بھاگ دوڑ اور ہنگامہ آرائیاں زیادہ ہوتی تھیں۔ آرام اور ٹھیک سے کھانے کا موقع دشمن کی قید میں ملتا تھا۔ اگلی ہنگامہ آرائیوں کے لیے جسم کی بٹری چارج ہو جاتی تھی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کنور پیلس سے چھٹکارے کے بعد چند دن بہت سخت اور بے آرام گزرے تھے۔ ہمالیہ ہوٹل جیسی جگہ قیام کا بھی فائدہ مند نہیں ہوا تھا اور آخری دودن تو بہت سخت گزرے تھے۔ مگر ڈیوڈ شا کی یہ میں آنے کے بعد میں آرام کر رہا تھا۔ میری سب سے بڑی ٹینشن کا حل نظر آنے لگا تھا اس لیے ذہنی طور پر بھی سکون سے تھا۔ اس سکون کا اثر مجھ پر ہوا تھا۔ پہلے جو چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے آگئے تھے۔ دودن کے آرام سے ٹھیک ہو گئے تھے۔ مجھ سے زیادہ بیو پر اثر ہوا تھا۔ اس کا زخم اسی وجہ سے بہت تیزی سے بھر گیا تھا ورنہ بھاگ دوڑ اور بے آرامی میں یہ اتنی آسانی سے نہ بھرتا۔

عام زندگی میں بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو بہت کم آرام کرتے ہیں وہ اپنے کام میں بہت زیادہ لگے ہوتے ہیں۔ اتنا زیادہ کہ کھانے، پینے اور سونے کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔ قدرت نے ہر آدمی کے لیے توازن رکھا ہوا ہے کہ اسے ساری زندگی میں وہ سب کرنا ہے جو ایک آدمی کا مقدر ہوتا ہے لیکن وہ اپنے طور پر بعض چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے جیسے آرام اور کھانے پینے کو، تو قدرت ایسے لوگوں کو دوسرے طریقے سے آرام کا موقع دیتی ہے۔ وہ اچانک بیمار پڑ جاتے ہیں یا کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے اور وہ بستر تک محدود ہو جاتے ہیں۔ یوں اپنے مقدر کا آرام حاصل کرتے ہیں۔ میرے لیے دشمن کی قید ایسا ہی مقدر تھی جس میں، میں اپنے حصے کا آرام حاصل کرتا تھا۔

کئی دن سے وقت پر کھانا پینا اور سونا جاگنا ہو رہا تھا۔ ورنہ پوری روٹین ڈسٹرب ہوتی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ سرے سے کوئی روٹین ہی نہیں ہوتی تھی۔ جب موقع ملا کھالیا اور جب موقع ملا تو سولے۔ میں نیند میں تھا اور اچانک میری آنکھ کھلی تو مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں کھلی ہے مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز

دوسرے کا ہے۔“

میں نے سکون محسوس کیا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو یہ لوگ یقیناً خیال رکھتے۔ ہماری والی گاڑی سب سے آخر میں نکلی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ تمام گاڑیاں قافلہ بنا کر سفر کریں گی لیکن جب ہم پہاڑی سے نیچے آئے تو وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ نہ ہمارے آگے اور نہ ہی پیچھے کوئی گاڑی تھی۔ پچھلی سیٹ پر فتح خان سمیت میں اور بیٹو تھے۔ دو آگے بیٹھے تھے اور تین پیچھے بیٹھے تھے۔ ہمارے بیک ہمارے پاس تھے کیونکہ پیچھے قطعی کوئی جگہ نہیں بچی تھی جہاں سامان رکھا جاسکتا۔ فتح خان خالی ہاتھ تھا۔ آگے بیٹھے دونوں افراد گورے تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہیں معلوم ہے ہمیں کہاں جانا ہے۔ گاڑی پہاڑی سے اترنے کے بعد بائیں طرف گھومی اور ہم کچھ غیر معروف سڑکوں سے ہوتے ہوئے شمال مشرق کی طرف جانے لگے۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اگر راستے میں ڈمبھیڑ ہوگئی تو.....“

”تو کیا؟“

”ہم خالی ہاتھ ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”فکرمات کرو اس صورت میں تمہیں سب مل جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”پر کچھ نہیں ہوگا ہم بروقت نکل آیا ہے۔“

”باقی کہاں ہیں؟“

”وہ دوسرے راستے سے جا رہا ہے۔“ فتح خان نے کہا۔

اچانک گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور ڈرائیور نے امریکی لہجے میں کہا۔ ”گائز ہیراز پراہلم۔“ سامنے ایک پولیس موہاں کھڑی تھی اور اس کے ساتھ موجود دو پولیس والے ہاتھ سے گاڑی کو روکنے کا کہہ رہے تھے۔ انہوں نے روایتی رائفلیں اٹھا رکھی تھیں۔ فتح خان ایک دم ہیجان زدہ ہو گیا اس نے غرا کر انگریزی میں کہا۔ ”سب تیار ہو جائیں۔“

میں نے اسے ٹوکا۔ ”ایک منٹ ان کا انداز نارمل ہے یہ صرف چیکنگ کر رہے ہیں دوسری صورت میں لگ انداز میں ہمیں روکتے۔“

”ہم چیکنگ کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ فتح خان بولا۔ ”گاڑی میں اسلحہ ہے۔“

”ضروری نہیں ہے وہ چیک کریں۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کے پاس خاموش پستول ہے؟“

”ہاں ہے۔“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے امریکی نے کہا۔

”مجھے دو اور باقی بھی ہوشیار رہیں اگر ہمیں ان کو ٹھکانے لگانا پڑا تو یہ کام خاموشی سے ہونا چاہیے کوئی ماکے والی چیز استعمال نہ ہو۔ میری بات سمجھ میں آگئی ہے؟“

سب خاموش رہے اس کا مطلب ہے وہ متفق تھے۔ میں نے کہا۔ ”گاڑی پولیس کار سے ذرا پہلے روک۔“

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی رکتے ہی دونوں سپاہی آگے بڑھے انہوں نے سنکل شاٹ رائفلیں اٹھا لی تھیں۔ وہ بے چارے عام سے سرکاری ملازم تھے۔ نزدیک آنے پر میں نے بٹن دبا کر شیشہ نیچے کیا اور

”اے انداز میں کہا۔“ کیوں روکا ہے..... ٹھا کر صاحب کو دیر ہو رہی ہے..... چیف منسٹر کے ڈنر سے واپس آ رہے ہیں۔“ میں نے چینی نقوش رکھنے والے فتح خان کو ٹھا کر بنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ ٹھا کر صاحب اور چیف منسٹر کا سن کر سپاہی مرعوب ہوئے تھے ایک نے کہا۔

”معافی صاحب..... اوپر سے حکم ہے کہ ادھر سے گزرنے والی ہر گاڑی کا تلاشی لیا جائے۔“

”تلاشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہو تو تمہاری شملہ پولیس چیف سے بات کرادی جائے۔“

وہ کانٹیل تھے اور پولیس چیف ان سے بہت اوپر کی چیز تھا۔ بولنے والا ہچکچایا تھا مگر اس کا ساتھی چالاک تھا اس نے سامنے بیٹھے گوروں کو دیکھ لیا تھا اس نے پوچھ لیا۔ ”یہ گورے ہیں؟“

”ہاں ٹھا کر جی کے گورے گاڑ دیں۔ ان کو گورے ملازم رکھنے کا شوق ہے۔“ میں نے کہا اور ہزار کا ایک نوٹ نکال کر یوں مٹھی میں دبایا کہ اس کی جھلک نظر آئے۔ ”بہت دیا لو ہیں..... غریبوں کا خیال رکھتے ہیں..... تم لوگ اس سردی میں ڈیوٹی دے رہے ہو۔“

اس بار دوسرا سپاہی بھی متاثر ہوا تھا پہلے والے نے کہا۔ ”بس کیا کریں سرکار کی نوکری تو غلامی ہوتی

۴۔“

”یہ رکھو..... بچوں کے لیے کچھ لے جانا۔“ میں نے نوٹ بولنے والے کو تھما دیا۔

”دوسرے کو الگ سے دو۔“ فتح خان فوراً دیا لوٹھا کر بن گیا۔ رقم میری جیب سے جا رہی تھی مگر کون سی مہری حق حلال کی کمائی تھی اس لیے میں نے دوسرے کی خدمت میں بھی ہزار کا نوٹ پیش کیا۔ نوٹ لے کر اہوں نے سلام کیا۔ مگر یہ کام انہوں نے اتنی صفائی سے کیا کہ موبائل میں موجود باقی پولیس والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے پیچھے ہٹ کر جانے کا اشارہ کیا تو ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ تقریباً سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اگرچہ پولیس والے اسلحے اور تربیت کے لحاظ سے ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور امکان یہی تھا کہ وہ سب مارے جاتے مگر اس صورت میں نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ قانون نافذ کرنے والوں کا قتل کسی بھی ملک میں سنگین ترین واقعہ سمجھا جاتا ہے اور پوری انتظامیہ حرکت میں آ جاتی ہے۔ پھر پولیس والے بہر حال مسلح تھے اور جب گولیاں چلتی ہیں تو نہیں کہا جاسکتا کہ کون بچے گا اور کون مارا جائے گا۔ باقی سب خوش تھے مگر فتح خان خوش نہیں تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

”شہباز خانا لگتا ہے تم آج کل کچھ امن پسند ہوتا جا رہا ہے۔“

”امن پسند میں ہمیشہ سے تھا۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”ورنہ تم اب زندہ کیسے گھوم رہے ہوتے۔“

”تمہارے معاملے میں تو میں بھی امن پسند ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر اس وقت میرے ہاتھ میں

کھلی ہو رہا تھا۔“

”اپنی کھلی کو قابو رکھو۔ یہاں مار دھاڑ ہوتی تو پولیس پیچھے لگ جاتی۔ ہمارے ہتھیار بے آواز تھے پولیس کے نہیں اور یہاں ہونے والی فائرنگ سارے شہر میں سنائی دیتی۔ مار دھاڑ کا وقت زیادہ دور نہیں ہے تم کو دل کھول کر ہاتھ کھانے کا موقع ملے گا۔“

فتح خان قائل ہو گیا۔ ”ہاں یوں تم نے اچھا کیا۔“

”شوبی ہمیشہ اچھا کرتا ہے۔“ بتو نے مداخلت کی۔ ”یہ تو تم جیسا لوگ ہے جو غلط کرتا ہے۔“
 خلاف توقع فتح خان مشتعل نہیں ہوا۔ اس نے تسلیم کیا۔ ”تم ٹھیک کہتا ہے ہم غلط آدمی ہے اس لیے غلط
 کرتا ہے شہباز خان ٹھیک آدمی ہے اس لیے ٹھیک کرتا ہے۔“
 میں نے محسوس کیا کہ گاڑی شیلے سے باہر کی طرف جارہی تھی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
 فتح خان نے شانے اچکائے۔ ”پتا نہیں..... کماؤ رکڑل ہے وہی لے جا رہا ہے۔“
 ”جب تمہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوگا باقی سب نے بھی وہیں جانا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں یا الگ جانا
 ہے۔“

”تمہیں باقی سب سے کیا؟“

”مجھے باقی سب سے نہیں لیکن نشی دل جی سے ہے تم نے غور نہیں کیا کہ اس کے آتے ہی یہ مسئلہ کھڑا ہو
 گیا۔ آخر ائین حکام کو کیسے پتا چلا یہاں کا؟“
 ”کھٹک تو ہم کو بھی ہوا۔“ فتح خان نے سر ہلایا۔ ”ابھی سب سامنے آئے گا۔ اگر اس نے کوئی حرای پن
 کیا تو بھٹکتے گا۔“

”بشرطیکہ ہم فتح گئے ورنہ اسے موقع ملا تو وہ پھر مروائے گا۔ اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔“
 فتح خان نے غور کیا اور ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ اس نے گاڑی روکی تو فتح خان موبائل نکالتا ہوا
 نیچے اتر گیا اور گاڑی سے اتنی دور جا کر بات کرنے لگا کہ اس کی آواز ہمیں نہ سنانی دے اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ
 وہ کسے کال کر رہا ہے۔ دونٹ بعد وہ واپس آیا اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔ فتح خان نے نہیں بتایا کہ اس نے کس
 سے اور کس سلسلے میں بات کی تھی نہ میں نے پوچھا۔ آدمے کھٹے بعد ہم شہر سے باہر تھے یہاں سڑک اونچے نیچے
 ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی اور کہیں کہیں کھائیاں تھیں۔ ٹیلوں پر بنگلے اور کھائیاں بنی ہوئی تھیں۔ مگر عام
 آبادی نظر نہیں آ رہی تھی اس قسم کی زمین پر غریب غریبا آباد نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہاں پانی نہیں ہوتا ہے اور
 ناہموار زمین کی وجہ سے کاشت کاری بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔ البتہ دولت مندوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ
 دولت کے بل بوتے پر اس دیرانے میں بھی تمام سہولتیں حاصل کر سکتے تھے اور انہوں نے حاصل کی ہوئی تھی۔
 سڑک کے دائیں ٹیلوں پر بنے مکانوں تک جانے کے لیے پختہ راستے بنے ہوئے تھے۔

گاڑی اچانک ایک ایسے ہی راستے پر گھوم گئی۔ یہ خاصا بڑا اور اوپر سے مسطح ٹیلا تھا جس پر یہ دو منزلہ مکان
 کھڑا تھا۔ پتروں اور لکڑی سے بنے اس مکان کے سامنے وسیع کارپورچ تھا اور وہاں دو گاڑیاں پہلے سے موجود
 تھیں۔ یہ ہم سے پہلے روانہ ہوئی تھیں۔ جب ہم نیچے اترے تو باقی گاڑیاں بھی نظر آ گئیں وہ مکان کی سائینڈ میں
 موجود تھیں۔ ان میں سامان والی وین بھی تھی۔ وہ کسی اور راستے سے آئی تھیں اور بغیر رکے آئی تھیں اس لیے ہم
 سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ اتنی گاڑیوں کے باوجود وہاں بہت خاموشی تھی اور سوائے چند ایک افراد کے جو مکان کی
 نگرانی اور حفاظت پر مامور تھے باہر کوئی نہیں تھا۔ روشنیاں بھی بہت کم آن تھیں اور تقریباً نیم تاریکی تھی۔ یہ اچھی
 حکمت عملی تھی۔ باہر سے بہ ظاہر یہ مکان دیران یا خواہیدہ نظر آ رہا تھا لیکن اندر صورت حال اس کے برعکس تھی۔ ہم
 اندر داخل ہوئے تو نشست گاہ اور اس سے آگے والے کمرے میں خاصی گہما گہمی تھی۔ نشست گاہ میں بیٹھے

ہوئے مختلف اقسام کے الکوحل زدہ مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اصل کام دوسرے کمرے میں ہو رہا تھا کٹرل وہیں تھا میں کمرے میں داخل ہوا تو کٹرل نے میری طرف دیکھا۔

”تم نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا جو مار دھاڑ کی نوبت نہیں آئی۔“

”میں بلا وجہ کی مار دھاڑ سے گریز کرتا ہوں۔“ میں نے دلچسپی سے دیکھا۔ کٹرل کے کپیوٹرز والے آدمی اپنا سامان سیٹ کر رہے تھے۔ ”لگتا ہے تم سب لے آئے ہو۔“

”ایک ایک چیز۔“ اس نے سر ہلایا۔

”مسئلہ کیا ہوا؟“

کٹرل نے شانے اچکائے۔ ”مقامی پولیس اور شاید کوئی ایجنسی مل کر چھاپہ مارنے والے تھے ہمیں پہلے پتا چل گیا اور ہم وہاں سے نکل آئے۔“

”وجہ کیا تھی؟“ میں نے پوچھا مجھے محسوس ہوا کہ وہ اس واقعے کو ہلکا لے رہا تھا۔

”وجہ کوئی بھی رہی ہو.....“

”معاف کرنا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اگر تم وجہ ساتھ لے آئے ہو تو یہ جگہ بھی غیر محفوظ ہو جائے گی۔“

کٹرل نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

فشی دل جی ایک کونے میں موجود تھا اور میری طرف سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”اگر یہ چھاپہ اندر کے کسی آدمی کی وجہ سے مارا جا رہا ہے تو اس کا دوبارہ امکان بھی ہے۔ یہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہے گی۔“

کٹرل مضطرب ہو گیا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ میرا ایک ایک آدمی اعتماد کا ہے۔“

”یہاں تمہارے آدمیوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں فشی دل جی کی طرف

دیکھا۔ ”جن کے بارے میں تم زیادہ نہیں جانتے ہو۔“

اس بار فشی دل جی نے خونی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کا ذکر کر رہا ہوں۔

کٹرل کچھ دیر غور کرتا رہا پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم مکان سے باہر گھنٹے میں آئے۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

”فوری طور پر تمام افراد سے ان کے موبائل فون لے لو..... کسی کے پاس موبائل فون نہیں ہونا

چاہیے..... یہاں کوئی لائن فون ہے؟“

”نہیں۔“

”ٹھیک ہے وائرلیس ڈیوائسز تمہارے قبضے میں ہونی چاہئیں۔ تمام افراد کو خبردار کرو اگر کسی کے پاس

سے ایسی کوئی چیز نکلی تو اسے غدار سمجھا جائے گا۔“

کٹرل نے گہری سانس لی۔ ”ابھی تک کفر نہیں ہے کہ ریڈ کس وجہ سے ہوا ہے۔“

”ریڈ ہو گیا ہے؟“

”ہمارے نکلنے کے دس منٹ بعد پولیس اور سادہ لباس خفیہ ایجنسی کے ایجنٹس پہنچ گئے تھے۔ اصل ریڈیو کا تھا پولیس شامل تھی۔ ہمیں پولیس منبر نے اطلاع دی۔“

”مجھے تو یہ بھی مشکوک لگ رہا ہے کہ ہم اتنی آسانی سے وہاں سے نکل کر آ گئے۔ اگر معاملہ ایجنسی کا ہے تو اسے اور بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ کوئی وہاں نگرانی نہیں کر رہا تھا۔“

کرنل نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”یہ تو مجھے بھی مشکوک لگ رہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے اچانک کئی غیر ملکیوں کی پرمقامی ایجنسیاں چونکی ہوں۔“

”شملہ ایک معروف سیاحتی مقام ہے یہاں روزانہ سینکڑوں کی تعداد میں غیر ملکی آتے ہیں ان میں اکثر بری ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایجنسیاں نظر رکھتی ہیں مگر ہر ایک کو چیک نہیں کر سکتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

کرنل تم بھی یہاں نئے ہو بہتر ہے اس سلسلے میں ڈیوڈ شا سے رہنمائی حاصل کرو۔ اسی نے تمہیں خبردار کیا ہے

”میں یہی کروں گا تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“

”ابھی پریشان ہونا بہتر ہے بہ نسبت بعد میں مشکل میں پڑنے کے۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

کیا یہ عارضی ٹھکانہ ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو..... کسی ایمر جنسی کے لیے رکھا تھا۔ اب کام آیا۔“

”اس کے بارے میں کون کون جانتا ہے؟“

”صرف ڈیوڈ شا، اسی نے اطلاع کے ساتھ مجھے یہاں کا پتا بھی بھیجا تھا۔“

مجھے خیال آیا۔ ”تمہارے پاس وائرلیس کیونین کیشن کا سراغ لگانے والے آلات ہیں۔“

”بالکل ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارا پورا سیٹ آپ ہے جو کسی قسم کی وائرلیس کیونیکیشن کا سراغ بھی لگا

تا ہے اور اسے بلاک بھی کر سکتا ہے۔“

”تو بس اسے آن کر لو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ بیٹو نشست گاہ میں شور سے بے نیاز ایک صوفے پر ادھک رہا

میں نے اسے اٹھایا۔ فتح خان یہاں پہنچ کر غائب ہو گیا تھا۔ بیٹو اور اپنا سامان لے کر میں اوپر آیا۔ ایک کمر

لی دکھائی دیا جس میں ڈبل بیڈ تھا میں نے اس پر قبضے کا فیصلہ کیا۔ بستر ملتے ہی بیٹو گر کر سو گیا تھا۔ میں نے حفظ

مقدمہ کر کے کی تلاشی لی۔ مگر وہ خالی نکلا اس کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور لیٹ گیا مگر نیند نہیں

آئی۔ کچھ دیر لیٹا رہا پھر اٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں دروازہ اندر سے لاک کر کے

آ رہا تھا۔ اب خاموشی تھی اور پینے پلانے والے سوچے تھے یا مد ہوش تھے۔ البتہ کرنل اپنے کنٹرول روم میں جاگ

تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

”تمہیں بھی نیند نہیں آرہی ہے۔“

”ظاہر ہے یہ اصل میں میرا مشن ہے۔ مجھے اس کی زیادہ فکر ہونی چاہیے۔“ میں نے ایک طرف رکھی کافی

الیکٹریک کھیل سے مگ میں کافی نکالی۔ اس میں ہلکی شکر اور کریم ملائی۔ کافی سے نیس کیف کی مخصوص خوشبو آ

تی تھی۔

”میں نے جبر آں کر دیا۔“ کرنل نے ایک چھوٹی کمپیوٹرائزڈ مشین کی طرف اشارہ کیا۔ ایک بڑے سائز کے ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر جیسی مشین کے ساتھ ایل سی ڈی اور دوسرے آلات منسلک تھے۔ اسکرین پر لائنیں آرہی تھیں اور فی الحال یہ لائنیں سیدھی تھیں۔ ”اب اس گھر کی حد میں کوئی وائرلیس ڈیوائس استعمال نہیں ہو سکے گی۔“

”انٹرنیٹ ڈیوائس بھی نہیں۔“

”کوئی بھی نہیں۔“ کرنل نے کہا۔ ”اگر کوئی ایسی کوشش کرے گا تو یہ آلہ نہ صرف اسے پکڑ لے گا بلکہ ہلاک بھی کر دے گا۔“

”تم تجربہ کر کے دکھاؤ گے؟“

”کیوں نہیں۔“ کرنل نے اپنا آئی فون نکالا۔ اسے آن کیا اور فوراً اسکرین پر ایک لائن لہرانے لگی۔ پھر کرنل نے کال کرنے کی کوشش کی اور آئی فون میرے کان سے لگایا تو آگے سے ریڈیائی شور سنائی دیا تھا۔ ”تم نے سنا جا میرے رابطہ ختم کر دیا۔“

”یہ اچھی چیز ہے لیکن اگر رابطہ کرنا ہو تو؟“

”اس کی حد سو گز ہے اس سے باہر جانا ہوگا۔“ کرنل نے کہا۔

”اس در بدری کا ہمارے پلان پر کوئی اثر پڑے گا؟“

”بالکل بھی نہیں..... تمام افراد ساتھ ہیں اور تمام آلات اور ہتھیار ہم لے آئے ہیں اب ہمیں ایک کیل کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ جنہوں نے صبح آنا تھا وہ بھی اتفاق سے نکلنے سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ گئے تھے۔“

کرنل کے پاس دو درجن بہترین تربیت یافتہ افراد تھے جن میں سے بیشتر سابقہ فوجی تھے جو مختلف جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ باقی تمام بھی کسی نہ کسی لڑائی کا تجربہ رکھتے تھے۔ چھ افراد فتح خان کے ساتھ تھے۔ میں کرنل، فتح خان اور بیٹو اس کے علاوہ تھے۔ منشی دل جی بھی دو درجن مقامی بد معاش لا رہا تھا جو باہر سے ہمیں سپورٹ کرتے۔ سورج نکلنے تک میں اور کرنل حملے کے منصوبے پر بات کرتے رہے۔ میرے تجربے اور معلومات کی بنیاد پر کرنل نے کنور پیلس کے تین اطراف میں تین مقامات کو اسنا پھرز اور میزائل حملوں کے لیے منتخب کیا۔ یہاں تین میزائل مین اور چھ اسنا پھرز تعینات کیے جاتے۔ حملے کا آغاز ان ہی مقامات سے ہوتا۔ ہیلی کاپٹر میں دو پائلٹ کے علاوہ آٹھ افراد کی گنجائش تھی اس سے بڑا ہیلی کاپٹر کوشش کے باوجود نہیں ملا تھا۔ میرے اور بیٹو کے علاوہ فتح خان اور اس کے پانچ آدمی ہوتے۔ دونوں بکتر بند گاڑیوں میں آٹھ آٹھ افراد جاتے۔ ایک بکتر بند میں کرنل ہوتا اور وہ کنور پیلس سے باہر موجود افراد کی کمانڈ کرتا۔

”دونوں بکتر بند گاڑیاں کنیشنز میں بند کنور پیلس کے پاس موجود ہیں۔“ کرنل نے کہا۔ ”دو پہر میں ہماری پہلی ٹیم روانہ ہو جائے گی وہ موہا بل ناور اور بجلی کی ہائی ٹینشن وائر ناور میں وائرلیس کنٹرول بم نصب کرے گی۔ بجلی بند ہوتے ہی سب سے پہلے میزائل بردار میزائل فائر کریں گے۔ ہر ایک تین تین میزائل فائر کرے گا۔ عمارتوں کے داخلی دروازے کے علاوہ گرد آشتیں، جنریٹر اور ہیلی کاپٹر کوشنا نہ بنایا جائے گا۔ اس دوران میں اسنا پھرز گاڑ ڈر کوشنا نہ بنانا شروع کر دیں گے۔ میزائلوں کے بعد سموک اور گیس گرینیڈز پھینکے جائیں گے۔ یہ ذمے داری بھی میزائل چلانے والوں کی ہوگی۔“

”اگر کسی میزائل کا نشانہ خطا گیا تو؟“

”ہر ایک کے پاس چار میزائل ہوں گے یعنی ایک ایک اضافی میزائل ہوگا وہ اسی مقصد کے لیے ہوگا۔“
 ”کنورٹیلز بڑی عمارت ہے اور سب سے سخت سیورٹی یہیں ہوتی ہے۔ وہاں سخت جان گارڈز ہوتے ہیں جو جان کی قیمت پر اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ سخت مزاحمت کریں گے۔ ہمیں تین منزلیں اترنا پڑے گا اور ہر منزل پر مزاحمت کو صاف کرنا ہوگا۔ اس صورت میں کامیابی حاصل کرنے میں وقت لگ سکتا ہے۔ سوال یہ ہے ہیلی کاپٹر کتنی دیر انتظار کرے گا۔“

”تمہیں اور تمہاری ٹیم کو اتار کر ہیلی کاپٹر پون گھنٹہ فضا میں رہ سکتا ہے اس میں کل ڈیڑھ گھنٹہ کی پرواز کا ایندھن ہوگا۔“

پون گھنٹہ کافی تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ ناکافی ہو جاتا۔ ہمیں توقع سے زیادہ وقت لگ جاتا۔ اس صورت میں ہمارا کلکنا مسئلہ بن جاتا۔ اس علاقے سے نکلنے کا تیز ترین ذریعہ ہیلی کاپٹر ہی تھا۔ زمینی راستے پر بہت خدشات تھے۔ مجھے باقی افراد کی فکر نہیں تھی مجھے یقین تھا کہ کرنل اور ڈیوڈ شا کو بھی نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کو معاوضہ ہی خطرات کا سامنا کرنے کا دیا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا اور کہا۔ ”نہیں ہیلی کاپٹر فضا میں نہیں رہے گا۔ فتح خان مجھے قابو کر کے ہیلی کاپٹر میں شملہ لایا تھا۔ جہاں اس نے ہیلی کاپٹر اتروایا تھا وہ جگہ بہت مناسب اور کنورٹیلز سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے ہیلی کاپٹر دو منٹ میں کنورٹیلز آ سکتا ہے۔“

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔“ کرنل نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن رات کا وقت ہوگا..... خیر اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔ میں کھان سے بات کرتا ہوں۔“

”اس سے ہمیں فری ہینڈل جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر دیر ہوگئی تب بھی ہم ہیلی سے واپس آ سکیں گے۔ اسے ڈن سمجھو۔“

”ٹھیک ہے پھر مجھے اپنے آدمیوں کو کہنا ہوگا۔ ہیلی پیڈ تیار کرنا پڑے گا اس کے بغیر رات میں کسی بھی جگہ اترنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“

”یہ کام بھی فتح خان کے سپرد کر دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”ڈیوڈ شا سے بات ہوئی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”حتمی طور پر معلوم نہیں ہوا ہے لیکن ریڈ اطلاع پر کیا گیا تھا۔“

”اس غدار کا پتا چلانا بہت ضروری ہے ورنہ سب چوہٹ ہو سکتا ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں..... میں نے سب کے موبائل لے لیے ہیں۔ جن کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت تھی وہ بھی واپس لے لی ہے۔“

”ان آلات سے کی جانے والی کالز کا پتا چلایا جاسکتا ہے؟“

”ہاں اگر وہ ان کے ریکارڈ میں ہوئیں تو۔“ کرنل نے کہا۔ ”میں نے چیک کیا ہے کہ کس نے مقامی کال

کی ہے اور کہاں کی ہے؟ مگر اس سے بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرے آدمی کلیر ہیں۔“

”نفی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

کرنل ہچکچایا۔ ”وہ ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور اس کا مفاد بھی ہے اگر ہم ناکام رہے تو وہ بھی ناکام ہو

جائے گا۔“

”ممکن ہے وہ اپنا مفاد کسی اور طریقے سے حاصل کر لے۔“

”ڈبل کر اس..... لیکن یہ بھی آسان نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ مشن ناکام ہو جائے گا۔ بالآخر اسے ڈیوڈ

شا کو جواب دینا ہوگا۔“

”ڈیوڈ شا خدا نہیں ہے جو ہر ایک اسے جواب دے.....“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”جب انسان خدا کو

خاطر میں نہیں لاتا ہے تو ڈیوڈ شا کی کیا حیثیت ہے اسے بھی دھوکا دیا جاسکتا ہے اور دھوکا دے کر سینہ تان کر رہا بھی جاسکتا ہے۔“

کرنل خاموش ہو گیا۔ شاید وہ مجھ سے متفق نہیں تھا لیکن میں نے ڈیوڈ شا کے بارے میں حقیقت بیان کی تھی۔ بے شک وہ بعض معاملات میں توپ ہوگا لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک اس کی بالادستی تسلیم کر لے۔ ہر ایک کے اپنے مفادات ہوتے ہیں اور وہ ان کی روشنی میں فیصلے کرتا ہے۔ اسے آقا کہنے والے مرشد نے کتنی آسانی سے اس کی ضمانت اس کے منہ پر دے ماری تھی۔ کچھ دیر میں باہر روشنی ہونے لگی تھی اور مکان میں پھر سے گہما گہمی کا آغاز ہوا۔ کچن میں ناشتہ تیار کیا جا رہا تھا۔ ابلے انڈوں کے ساتھ، پورج، سیریل اور دودھ تھا۔ ساتھ میں چائے کافی تھی۔ بیٹا ابھی تک سو رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر لے۔ میں ناشتے کے بعد کافی کا گم لے کر باہر نکل آیا۔ مکان والے نیلے کے عقب میں ایک گہری کھائی تھی اور اس کے پار ایک بڑی ڈھلان تھی جو بتدریج بلند ہوتے ہوئے شمال مشرق میں بلند پہاڑوں سے جا کر مل گئی تھی یہاں سے ان برف پوش چوٹیوں کا نظارہ ممکن تھا جن کی طرف سارے سال نہیں کھلتی ہے۔ مکان کے عقبی حصے میں پختہ ٹیرس تھا اور کھائی کے کنارے ریٹنگ لگی تھی۔ کچھ فاصلے سے سرو کے درخت تھے۔ سورج بلند ہو گیا تھا اور اس کی روشنی میں پہاڑوں کی چوٹیاں نہایت نمایاں تھیں۔ برف کی چمک یہاں تک آ رہی تھی۔

”خوب صورت منظر ہے۔“ پاس سے فتح خان کی آواز آئی۔

”خدا کا بنایا ہوا ہر منظر خوب صورت ہے اسے بد صورت انسان بناتا ہے۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں

کہا۔ ”تم کل رات سے کہاں غائب تھے؟“

”میں کام سے گیا تھا؟“

”میں چونکا۔“ تم یہاں نہیں تھے؟“

”میں فوراً چلا گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میرے آدمی یہاں نہیں ہیں ان کو ایک اور جگہ رکھا ہے۔ ان کو

دوسری جگہ چھوڑنا تھا۔“

”تمہیں خطرہ تھا کہ وہاں بھی چھاپہ پڑ سکتا ہے؟“

”لازمی بات ہے..... جب ایک جگہ کا خبری ہو سکتا ہے تو دوسرا جگہ کا بھی ہو سکتا ہے۔“

”ویسے تمہارے آدمیوں کو یہاں ہونا چاہیے تھا۔ آج رات سے پہلے روانگی ہے۔“

”وہ دوپہر تک یہاں آجائیں گے۔“ فتح خان بولا۔

”کرنل نے تم سے پہلی کا پڑا تارنے کی بات کی ہے؟“

”ہاں میرا آدمی پہلے وہاں جائے گا ادھر ہیلی اتارنے کا بندوبست کرے گا اور وہیں سے ہیلی پر سوار ہو گا۔ تم اور میں ادھر سے جائے گا۔“ اس نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ”تم بلاوجہ کا پریشان ہو رہا ہے۔ ادھر سب ٹھیک ہے۔“

”بلاوجہ تو میں کبھی پریشان نہیں ہوا..... میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔“

”کچھ ہونا ہوتا تو اب تک ہو جاتا.....“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایک ناکام چھاپے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ سکون سے بیٹھ جائیں گے۔ ہماری تلاش جاری ہوگی اور شملہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔“

فتح خان نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تم کیا کہتا ہے پھر کیا کرے؟“

”ہمیں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے، شملہ سے جتنا دور جائیں گے اتنا ہی محفوظ رہیں گے۔“

”یہ تو تم کنٹرل سے کہو..... انچارج تو وہ ہے۔“ فتح خان کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”فتح خان لگتا ہے یہ بات تم کو پسند نہیں آئی ہے؟“

”کیسے پسند آئے گا..... کوئی پہلی بار شا کے لیے کام کر رہا ہے..... اس سے پہلے اس کا کتنا کام کیا.....

اسے کبھی شکایت نہیں ہوا..... اب ایک گورالاکر بولتا ہے یہ انچارج ہے..... وہ فوجی ہے لڑچکا ہے۔ پر جو تجربہ

فتح خان کے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ جلد شا کو پتا چل جائے گا۔“

”فتح خان وہ مخصوص ذہنیت کا گورا ہے۔ تم میرے دشمن ہو لیکن میں تمہاری بات تسلیم کرتا ہوں۔ اب تک

جتنے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا ہے ان میں سب سے شاطر اور چالاک آدمی تم ہو۔ تم خطرے کو بھانپ کر بہت

تیزی سے حرکت میں آتے ہو اور اسی لیے میں نے تمہیں اور تمہارے آدمیوں کو اپنی ٹیم میں رکھا ہے۔ یہ گورے

آسمان سے نہیں اترے ہیں۔ اگر ایسی بات ہوتی تو لاکھوں کی تعداد میں مسلح ترین فوج چند ہزار افراد کے سامنے

یوں زچ نہ ہوتی۔ یہاں ان کی جدید ترین ٹیکنالوجی اور تربیت بھی کام نہیں آ رہی ہے۔“

فتح خان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”شہباز خانا ہم کو بھی اعتراف ہے تم ایک باظرف دشمن

ہے..... کاش کہ تم ہمارا دوست ہوتا۔“

”معذرت کے ساتھ تمہارے جو خیالات اور نظریات ہیں ان کے ہوتے ہوئے تمہیں شاید ہی کوئی

دوست ملے گا مفاد پرست ساتھی ضرور ملیں گے جو صرف مفاد کی حد تک ساتھ ہوں گے۔“

اس نے سر آدھ بھری۔ ”تم ٹھیک کہتا ہے..... ہم بولتا ہوں اور خواہش گندم کی کرتا ہے۔“

”فتح خان۔“ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”ہیلی کا پٹر میں آٹھ افراد کی محاکش ہوگی لیکن آٹھ افراد ساتھ

جائیں گے۔ میرے، تمہارے اور بیٹے کے علاوہ تمہارے پانچ آدمی ہوں گے۔ تم ان میں سے پانچ منتخب کرلو جو

سب سے بہتر ہوں وہی ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اب بھی آدمی کم ہے..... پر پلان پر ٹھیک سے عمل کیا تو ہم کامیاب رہے گا۔ ہم کو

اطمینان ہے پلان تمہارے مشورے سے بنا ہے۔“

”کنٹرل زریسکی سے تمہارا انکراؤ کہاں ہوا؟“

فتح خان کا چہرہ پھر بگڑ گیا اور اس نے پشتو کی چند نستعلیق کالیوں سے آغاز کیا۔ ”وہ ختم خنزیر ہم کو سوات سے اوپر ملا تھا۔ تم کو وہ کیمین یاد ہے جہاں سے تم کو انڈیا والا ٹیلی میں لے گیا تھا۔“

”بالکل یاد ہے۔“

”وہ وہ ہیں تھا۔ وہ میرا کیمین ہے اور اس کا دیدہ دلیری دیکھو اسے استعمال کر رہا تھا۔ ادھر اسلحے کا ایک بڑا کھپ آئے والا تھا۔“

”کرل منگوار ہا تھا؟“

فتح خان نے سر ہلایا۔ ”وہ کچھ مقامی جنگجو گروپوں کو اسلحہ بیچتا ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وطن عزیز میں چاروں طرف سے اسلحہ آرہا تھا۔ ہاتھیں آنے والے وقت میں کیا ہونے والا تھا مگر بے پناہ غیر قانونی اسلحے کی موجودگی کا مطلب تھا کہ اس کے استعمال کے نت نئے راستے نکلتے رہیں گے اور پورے ملک میں انارکی کا تاثر برقرار رہے گا۔ ہم پہلے ہی صوبوں، زبانوں اور فرقوں میں بٹے لوگ ہیں۔ ہماری مخالفت کو اب زبان کے ساتھ اسلحہ بھی مل گیا ہے۔ مختلف ذرائع سے جو چشم کشا رپورٹس سامنے آرہی ہیں ان سے صرف چند دردمندوں کے سینوں میں اضطراب پیدا ہوتا ہے لیکن عوام کی اکثریت اور ارباب اختیار خواب خرگوش میں مگن ہیں۔ ایک طرف امریکہ جیسے ملک میں قانونی اسلحہ کو محدود کرنے کی مہم چل رہی ہے تو دوسری طرف ہمارے ہاں غیر قانونی اور مہلک اسلحے کے پھیلاؤ میں اوپر سے لے کر نیچے تک سب لوگ ملوث ہیں۔ متعدد غیر ملکی خفیہ ایجنسیاں اس کام میں ملوث ہیں کیونکہ یہ ہمیں تباہ کرنے کی سب سے آسان ترکیب ہے۔ اس جذباتی اور کم سمجھ قوم کو اسلحہ دے دوسرے مارنے کے راستے یہ خود نکال لے گی۔

”کس سوچ میں پڑ گیا ہے۔“ فتح خان نے کہا تو میں خیالوں سے چونکا۔ میں نے خفت سے کہا۔

”وہ میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔“

فتح خان نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہے تم کس سوچ میں پڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی میں خود بھی سوچتا ہے کہ مجھ سے بڑے مجرم تو وہ لوگ ہیں جن کا کام ہی اس ملک کی حفاظت کرنا ہے اور وہ خود اس کا بڑا کھود رہا ہے۔ پر میں کچھ نہیں کر سکتا..... میں چھوٹا مجرم ہے۔ شہباز خان! تم بھی کچھ نہیں کر سکتا تم جیسا لوگ بہت تھوڑا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن میرا ایمان ہے مشکلات آدمی اور قوموں کو اوپر لے جانے کے لیے آتی ہیں اور جب وہ ان آزمائشوں سے کامیاب نکلتے ہیں تب ہی کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔“

”ہم ایسا نہیں سوچتا ہے۔“ فتح خان نے گہری سانس لی۔



دن کے وقت مکان سے باہر صرف دو تین آدمی تھے اور وہ بھی اسلحہ چھپائے ہوئے نمایاں ہونے سے گریز کر رہے تھے۔ خاص طور سے ان کی کوشش تھی کہ سڑک سے نظر نہ آئیں۔ رات میں سامنے رکنے والی گاڑیوں کو بھی اب سائیڈ پارکنگ میں کھڑا کر دیا تھا۔ یہاں یہ سڑک سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ تمام کھڑکیوں پر پردے تھے تاکہ اندر کی سرگرمیاں دکھائی نہ دیں۔ یہ احتیاطی تدابیر اچھی تھیں مگر صرف عام حالات میں..... ابھی

ہم شدید خطرے میں تھے۔ کل رات ہم پکڑے جانے سے بال بال بچے تھے اور کچھ پتا نہیں تھا کہ انڈین اس جگہ کا پتا بھی لگالیں۔ ہمیں جلد از جلد اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ میں اندر آیا تو میتھن کچن میں بیٹھا ہوا ڈبل روٹی اور کھننگل رہا تھا۔ یہ اس کے لیے خوفناک ناشر تھا۔ ابلے انڈوں سے وہ پہلے ہی انصاف کر چکا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ لیپ ٹاپ والا بیگ ساتھ لایا تھا اس نے اوپر چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ میں نے اپنے لیے کافی نکالی۔ یہاں سیلف سروس تھی سب اپنے لیے خود ہی کر رہے تھے۔ اب مجھے کرنل کی تلاش تھی وہ کنٹرول روم میں نہیں تھا۔ وہ اوپری منزل میں اپنے کمرے میں ملا تھا۔ کمرے کا مجھے ایک آدمی نے بتایا۔ دستک کے جواب میں اس نے پوچھا۔ ”ہوا ز دیر۔“

”شہباز۔“

”آجاؤ۔“ کرنل نے کہا تو میں اندر چلا گیا۔ وہ صرف نیکر اور بنیان میں قالین پر ڈپس لگا رہا تھا وہ بدستور ڈپس لگاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”کرنل میرے خیال میں ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”ہم یہاں سے تین بجے نکلیں گے۔“

”ابھی نو بج رہے تھے۔“ کرنل دیر کی وجہ؟

”جلدی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔“ اس نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

”مغطرہ تو ہے۔“ میں نے اصرار کیا۔ ”اگر ہم چند گھنٹے پہلے بھی نکل جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے گہری سانس لی۔

میں نے خود کمانڈ کی پیشکش قبول نہیں کی تھی اور اب کمانڈر کرنل تھا فیصلہ اس نے کرنا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”اچھا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنی پارٹی کے ہمراہ ابھی روانہ ہو جاؤں؟“

”آخر تمہیں کس بات کا خطرہ ہے؟“

”میں نہیں جانتا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے ہمیں جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”ہمیں بہت تیاری کرنی ہے۔“ کرنل نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”اگر میں ابھی حکم دوں تب بھی

ہمیں روانہ ہوتے ہوتے بارہ بج سکتے ہیں۔“

”چلو بارہ بجے ہی سہی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس سے زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔ میں تمہاری کمانڈ

میں مداخلت نہیں کر رہا ہوں اسے میری درخواست سمجھ لو۔“

کرنل کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے دروازہ کھول کر کسی جوز کو آواز دی۔ ایک اسپیشل نقوش والا تو نمند آدمی آگیا۔ ”لیں کرنل؟“

”تیاری کرو ہمیں بارہ بجے روانہ ہونا ہے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”تھینک یو کرنل، تم نے میری بات مان لی۔“

”ایک تو یہ مشن تمہارے لیے ہے میں کمانڈر ضرور ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”دوسرے میں خود بھی چھٹی حس

کے اشارے پر عمل کرتا ہوں۔ بہت بار میری چھٹی حس نے مجھے بچایا ہے۔“

مجھے دسیم کی بات یاد آئی اور میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے تعذیق کر لوں۔ ”تم نے ایک ایسے جنگلی مشن میں اپنے چوبیس ساتھیوں کو بچایا تھا جس میں تم سب کا بچنا بہت مشکل تھا؟“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”تمہیں کیسے علم ہوا؟“

”تم غیر معروف نہیں ہو اور تم بھول رہے ہو میں بھی اسی خطے سے تعلق رکھتا ہوں۔“

”ہاں اسی مشن میں، ہمیں شدید زخمی ہوا تھا اور دو سال تک میرا علاج جاری رہا تھا۔“ اس نے تو لیے سے جسم صاف کرتے ہوئے کہا۔ اب میں نے دیکھا اس کے پورے اوپری جسم پر زخموں کے بے شمار مدہم نشانات تھے۔ ”میرا خیال ہے میں بھی تیار ہو جاتا ہوں۔“

اس کا اشارہ سمجھ کر میں وہاں سے رخصت ہو گیا اور میرا ارادہ بھی تیاری کا تھا۔ جوز مجھے راستے میں مل گیا۔ اس نے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ اپنی کٹ لے لو۔“

ایک کمرے میں دیوار پر ویسے ہی سوٹ لٹکے ہوئے تھے جیسا کٹرل نے مجھے ڈیو میں دکھایا تھا۔ جوز نے کہا۔ ”اس میں سے اپنے اور اپنے ساتھی کے ناپ کا نکال لو۔“

ٹی شرٹ، ٹراؤزر اور جیکٹ کے ساتھ بلٹ پروف بھی تھا۔ ایک طرف قطار میں جوتے رکھے تھے۔ مخصوص دستانے جو پتیلیوں کو حرارت اور سخت چیز کی رگڑ سے بچاتے ہیں ان میں سے صرف نصف انگلیاں باہر ہوتی ہیں تاکہ ٹریگر دبانے یا انگلیوں والے کسی کام میں رکاوٹ نہ ہو۔ ساتھ میں گیس ماسک بھی تھا۔ یہ منہ اور ناک کو مکمل ڈھک لیتا اور شفاف پلاسٹک کا بنا ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے رکاوٹ نہیں بناتا تھا۔ اس کے نیچے ایک گول ڈسک لگی تھی جس پر شہد کی مکھی جیسا چمٹا بنا ہوا تھا یہ فلٹر تھا جس سے صرف ہوا گزر کر اندر جاسکتی تھی۔ ہر سوٹ کے ساتھ پشت پر باندھنے والا اسکول سائز کا بیگ تھا۔ فی الحال یہ خالی تھا۔ میں نے اپنے اور بیٹو کے ناپ کے سوٹ لیے۔ پھر جوتے منتخب کیے اور اپنے کمرے میں آیا۔ بیٹو وہاں موجود تھا اور وہ غسل کر چکا تھا۔ اس نے اطلاع دی۔

”شوٹی میرا کھرٹ بھی پکا ہو گیا ہے۔“

”گڈ نائپ تم تیار ہو جاؤ جب تک میں نہاتا ہوں۔ ہمیں بارہ بجے یہاں سے نکلنا ہے۔“

باتھ روم بڑا انہیں تھا مگر تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔ گرم پانی آرہا تھا میں نہا کر باہر آیا۔ بیٹو نے سوٹ اور بلٹ پروف پہن لیا تھا مگر اس کی ڈوریاں ٹھیک سے نہیں بندھی تھیں۔ میں نے انہیں درست کیا اور ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں پہن چکا تھا۔ بیٹو نے مجھے بلٹ پروف پہنایا۔ اس سے پہلے بھی میں ایک دوبار پہن چکا ہوں۔ کسی قدر بھاری اور گھٹے ہوئے میٹرل سے بنا ہونے کی بنا پر یہ گولی کو گزرنے کی اجازت نہیں دیتا ہے لیکن گولی کا دھچکا بہر حال انسان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر سامنے سے گولی لگے تو دھچکے سے پہلی بھی ٹوٹ جاتی ہے لیکن جان بچ جاتی ہے اور یہی اس کا اصل مقصد ہے۔ یہاں موسم زیادہ سرد نہیں تھا اور پھر ابھی دن کا وقت تھا اس لیے جیکٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ جوتے ہمیں پورے تھے۔ گیس ماسک ایک تسمے کی مدد سے گردن میں بلٹ پروف کے ساتھ جھول رہا تھا اور بد وقت ضرورت اسے منہ پر جمانے میں چند سیکنڈ لگتے۔ بیٹو نے پوچھا۔

”باقی سامان اور اسلحہ کب ملے گا۔“

میں نے ڈیجیٹل نقشہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے روانگی کے وقت نہیں ملے گا یہ منزل پر پہنچ کر ملے گا۔“

ٹراؤز ملٹری ڈیزائن کا تھا مگر جیکٹ سادہ خاکی رنگ کی تھی۔ ہمیں ابھی سفر کرنا تھا اور راستے میں لوگ چونک سکتے تھے اس لیے جیکٹ کو سادہ رکھا تھا۔ کرنل نے ہر زاویے سے نظر رکھی تھی۔ بیٹو نے بیگ لہرایا۔ ”شوہی اس کا کیا کرتا ہے؟“

”نی الحال اسے لیپ ٹاپ اور رقم کے لیے رکھ لیتے ہیں لیکن ابھی اور سامان ملے گا جس کی ضرورت ہو۔“

کی۔ وہ اسی بیگ میں لیپ ٹاپ اور رقم ڈال لی۔ اب تک مجھے اپنے ساتھیوں سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے سوچا کہ راستے میں بات کروں گا۔ یہاں ویسے بھی جامر لگا ہوا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے ہم نیچے آئے تو بھاری اسلحہ اور سامان دین میں لا جا رہا تھا۔ باقی سب بھی تیار دکھائی دے رہے تھے۔ جوسب کو ایک ایک بیک بانٹ رہا تھا۔ اس میں پانی کی لیٹر والی دو بوتلیں اور کھانے کا پیک سامان تھا۔ ایک چھوٹا میڈیکل بیک بھی تھا۔ اس میں مرہم پٹی کا سامان اور ہنگامی حالات میں کام آنے والی دوائیں تھیں۔ بیٹو نے کہا۔ ”شوہی اس میں تو سب ہے۔“

”ہاں ہمیں وہاں جس چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ اس میں ہے۔“

فتح خان باہر موجود تھا اور ماچس کی تیلی سے دانتوں میں خلل کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ ”میرا آدمی آگیا ہے راستے میں ایک جگہ ملے گا۔ ہم وہاں سے ان کے ساتھ جائے گا۔“

”یہ اچھی بات ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ فتح خان نے بھی وہی لباس پہن لیا تھا اور کچھ بے چین لگ رہا تھا۔ وہ ڈسپلن والا آدمی نہیں تھا یہ بے چینی شاید اسی وجہ سے تھی۔ بارہ سے کچھ پہلے گاڑیاں ایک ایک کر کے روانہ ہونے لگیں۔ مجھے کل ایک بار کے بعد نشی دل جی نظر نہیں آیا تھا۔ مگر وہ یہیں تھا۔ پہلی گاڑی میں ہمیں، بیٹو، فتح خان اور پانچ دوسرے افراد تھے۔ ہم تینوں درمیانی نشست پر تھے۔ باہر نکلتے ہی میں نے لیپ ٹاپ نکال کر آن کیا اور یو ایس بی ڈیو آؤس لگائی۔ مگر یہاں اس کے سگنل نہیں تھے۔ میں نے مایوس ہو کر انہیں واپس بیگ میں رکھ دیا۔ کنورٹبلز کی طرف جانے والی ہائی وے پر چڑھنے کے لیے ہمیں شملہ شہر سے ہو کر گزرنا پڑا تھا اور مجھے وہاں پولیس یا قانون نافذ کرنے والوں اور لوگوں کی کوئی ایسی سرگرمی نظر نہیں آئی جس سے لگتا کہ وہ ہماری تلاش میں ہیں۔ بلکہ مجھے تو چھاپے بھی نمائش لگ رہا تھا ہم بہت آرام سے وہاں سے نکل آئے تھے۔ شہر میں یقیناً انٹرنیٹ کے سگنل تھے لیکن وہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ بیس منٹ میں ہم شہر سے گزر کر ہائی وے پر آ گئے تھے۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”تمہارے آدمی کہاں ہیں؟“

”وہ آگے ہیں۔“ فتح خان نے جواب دیا۔ ”وہ انتظار کرے گا پھر ہم ایک ساتھ سفر کرے گا۔“

شہر سے باہر آ کر میں نے پھر کوشش کی اور اس بار مجھے سگنل مل گئے۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور میں اتر کر باہر آ گیا۔ بیٹو میرے ساتھ تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کال کرنے جا رہا ہوں۔ سفیر آن لائن تھا۔

یقیناً وہ لوگ کمپیوٹر سے لگے بیٹھے ہوں گے۔ میری کال ریسیو کی گئی۔ اسکرین پر وسیم نمودار ہوا تھا۔ ”اسلام علیکم آپ کہاں ہیں؟“

”ہم بڑے بھیا کے گھر کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”امید ہے کل تک بہنا کو لے آئیں گے۔“

”ان شاء اللہ۔“ وسیم نے کہا۔ اس سے گفتگو کے دوران سفیر اور عبداللہ بھی آگئے۔ بلکہ ایاز بھی تھا۔ ان سب سے سلام دعا ہوئی میں نے انہیں بتایا کہ وقت کم ہے دوران سفر ان سے بات نہیں ہو سکتی ہے اور میں اس وقت گاڑی سے اتر کر بات کر رہا ہوں۔ بیٹو نے بھی سلام دعا کی آج کسی نے اسے نہیں چھیڑا سب کو احساس تھا کہ ہم ایک خطرناک مشن پر جا رہے ہیں اور سب ہمارے لیے فکر مند تھے۔ دس منٹ بعد کال کاٹ کر میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ اس پر بتیل جا رہی تھی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ دو کوششوں کے بعد نے کوشش ترک کر دی اور ہم گاڑی میں آگئے۔ وقت کم تھا میں آگے جا کر کوشش کر سکتا تھا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو فتح خان نے آہستگی سے کہا۔ ”تم ادھر بات کر رہا تھا؟“ اس کا اشارہ سرحد پار کی طرف تھا میں نے سر ہلایا۔ اس نے سرد آہ بھری۔

”ہمارا کوئی نہیں ہے جس سے بات کرے۔“

”تمہارے گھر والے..... بہن بھائی؟“

”ماں باپ گزر گیا..... دو بھائی ہے پتا نہیں کہاں ہے ہماری طرح کا کام کرتا ہے..... ایک بہن ہے وہ اپنے گھر میں آباد ہے اس کا شوہر شریف آدمی ہے اس لیے ہم خود دور رہتا ہے۔“

”شادی تم نے کی نہیں بس اس بے چاری لڑکی کو دھوکا دیا تھا۔“ مجھے بھاگ بھری یاد آگئی۔ جسے فتح خان مال غنیمت کی طرح لے گیا تھا اور ایک نام نہاد نکاح نامے کی مدد سے اس پر قبضہ جمالیا تھا۔ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی پھر میں نے اسے فتح خان کے چنگل سے نکالا اور اس دوران میں زخمی ہونے سے اس کا حمل ضائع ہو گیا تھا بعد میں اسے اور اس کے باپ کو راجا عمر دراز نے اپنے محل میں رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے معلوم نہیں کیا تھا مگر امید تھی وہ وہاں خوش ہوگی اور ہو سکتا ہے اس کا گھر بھی آباد ہو گیا ہو۔ یہ بات فتح خان کے علم میں نہیں تھی۔ البتہ اسے شک ضرور تھا کہ بھاگ بھری ہمارے پاس ہے۔ اس نے ایک دو بار پہلے بھی اس کا ذکر کیا تھا مگر میں نے انکار کیا تو وہ خاموش ہو گیا تھا۔

”وہ مجھ کو یاد آتا ہے۔“ فتح خان نے سرد آہ بھری۔ ”اسے تم لے گیا تھا اور میرے کو یقین ہے اسے تم نے کہیں رکھا ہے۔“

”تم کچھ بھی سمجھنے میں آزاد ہو۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”ویسے تم کسی طرح بھی اس پر حق نہیں رکھتے ہو۔ بلکہ تم نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دی۔“

فتح خان چپ ہو گیا۔ یقیناً وہ مجھ سے متفق نہیں تھا۔ گاڑی اب پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی جانی پہچانی سڑک سے گزر رہی تھی میں اس سڑک پر اتنا سفر کر چکا تھا کہ اب مجھے اس کے موڑ اور نشانیاں بھی یاد ہو گئی تھیں۔ بیٹو اداس تھا۔ یقیناً اسے سب یاد آرہے تھے اور وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ ارادہ تو میرا بھی یہی تھا کہ سادی کے ساتھ ہی ہم بھی واپس جائیں گے۔ بارہ بج رہے تھے اور ابھی کم سے کم دو سے ڈھائی گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ آدھے

گھٹے بعد ہمیں فتح خان کے آدمی ایسی ہی ایک گاڑی میں منتظر ملے۔ ہم اتر کر اس میں آگئے اور اس میں سے ایک آدمی اتر کر دوسری گاڑی میں چلا گیا۔ فتح خان پہلے ہی ملے کر چکا تھا کہ اس کے ساتھ کون سے پانچ آدمی جائیں گے۔ اکیلا جانے والا اداس تھا۔ یہاں بھی ہم درمیان والی نشست پر آگئے۔ یہ پیچھے سے بڑی تھی اور اس میں آخری حصے میں چار نشستیں تھیں۔ اسی وجہ سے آٹھ آدمی آرام سے آگئے تھے۔ اب تک کے سفر میں مجھے دوسری گاڑیاں نہیں نظر آئی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ فاصلے سے سفر کر رہی تھی۔ کیونکہ ہائی وے تو یہی تھی۔

ڈیڑھ بجے ہم اس قصبے تک پہنچے جہاں سینا دیوی اپنے گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بے خوف رہ رہی ہو گی کیونکہ اس کا سابق عفریت شوہر اپنی تمام خطرناکیوں سمیت دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ پتا نہیں اس کی لاش ملی تھی یا پہاڑوں پر پائے جانے والے گوشت خور جانوروں کی خوراک بن گئی تھی۔ یہاں سے آگے بڑھے۔ بیٹو نے پہلی بار زبان کھولی۔ ”شوہنی یہاں سے کھانے کو کچھ لے نہیں سکتا ہے؟“

”یہ مناسب نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ہمیں پلان کے مطابق عمل کرتا ہے اور اس میں کسی آبادی میں رکنے سے گریز کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر ہم ڈبل روٹی اور مکھن سے لُچ کرتا ہے۔“ بیٹو نے کہا اور اپنے بیگ سے ایک بڑی ڈبل روٹی، مکھن کا ڈبا اور چھوٹی سی پلاسٹک کی چھری نکالی اور سلاسل پر مکھن لگا لگا کر کھانے لگا۔ اس کا چند پیک چیزوں سے گزارا ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے مجھے بھی پیکش کی لیکن میرا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ راستے میں میں بار بار انٹر نیٹ کنکشن چیک کرتا رہا تھا مگر اس کے سگنل صرف آبادی میں مل رہے تھے اور میں وہاں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم آخری آبادی کے پاس پہنچے تھے اس کے بعد کنور پبلک تک کوئی اور آبادی نہیں تھی۔ اچانک مجھے راستے میں ایک دیہاتی موبائل فون پر بات کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ آبادی کی طرف جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک خیال آیا اور میں نے گاڑی روکنے کو کہا۔

”کیا ہوا؟“ فتح خان نے حیرت سے کہا۔

”گاڑی روکو۔“ میں نے کہا تو اس نے ڈرائیور سے کہا اور اس نے گاڑی روک دی۔ دیہاتی دس بارہ قدم آگے نکل گیا تھا میں اتر کر غلت میں اس کے پیچھے آیا۔ ”اے رکو..... بھائی۔“ وہ رک گیا اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور کچھ مقامی زبان میں کہا۔ ”مجھے ہندی آتی ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم ہندی سمجھتے ہو؟“

”کیا بات ہے بابو؟“ اس بار اس نے اردو میں کہا۔

”مجھے یہ موبائل چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”بہت ضروری سمجھو۔ میں اس کی قیمت دوں گا۔“

”نہیں بیچنا۔“ اس نے انکار کیا۔

میں نے جیب سے نوٹوں کی گلدی نکالی یہ ہزار والے نوٹ تھے۔ میں نے دس نوٹ الگ کیے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ”یہ اس سیٹ کی قیمت سے دو گئے سے زیادہ ہیں۔“

پہلے اس کا منہ کھلا رہ گیا پھر اس پر لالچ غالب آ گیا۔ ”بابو میں دے گا تو دوں گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ وہ ایک عام سا آدمی تھا اگر اسے ایک ہاتھ رسید کرتا تو وہ خود موبائل دے کر

بھاگ جاتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے پاس رقم تھی اور اس کے پاس موبائل تھا۔ مجھے رقم کی اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی موبائل کی تھی اور اس کے ساتھ معاملہ الٹا تھا۔ میں نے دس نوٹ اور نکالے۔ مگر اسے دینے سے پہلے پوچھا۔ ”اس میں بیلنس ہے؟“

”ابھی ہزار کا بیلنس ڈلوایا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بے شک دیکھ لو۔“

”مجھے دکھاؤ؟“ میں نے مطالبہ کیا تو اس نے بیلنس چیک کر لیا اس میں سچ بج ہزار سے اوپر کا بیلنس تھا۔ میں نے اسے بیس ہزار دیئے۔ ”نوعیش کرو۔ مگر سب بلاک کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے گھر آ جاؤں گا۔“ اسے خبردار کر کے میں پلٹ آیا۔ اب مجھے ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ ایک اجنبی موبائل کا استعمال بہت کم رسی تھا۔ کنورٹیل کے پاس سگنل ہوتے اور میں کال کر سکتا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم اس ٹیلیفون تک پہنچ گئے جہاں سے ہیلی کاپڑ ہمیں لے گیا تھا۔ گاڑی با آسانی اس پہاڑی پر چڑھ گئی۔ ایک کسی قدر ہموار جگہ گاڑی رکی تو ہم نیچے اتر آئے۔ جو ہیلی کاپڑ ہمیں کنورٹیل لے جاتا وہ سائز میں اس ٹیلیفون کا پڑ سے بڑا تھا جس میں فتح خان ہمیں شملہ لے گیا تھا۔ فتح خان نے اوپری حصے کا جائزہ لیا اور پھر اپنے آدمیوں کو جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں کاٹنے پر لگا دیا تاکہ ہیلی کاپڑ کسی دقت کے بغیر اتر سکے۔ وہ میٹری سے چلنے والی سپاٹ لائٹس لایا تھا۔ اس نے زمین پر چونے سے نشانات بنوائے اور پھر ان سے چاروں سمت ڈوری کی مدد سے ایسی چیزوں کا فاصلہ ناپا جن سے ہیلی کاپڑ کا پنکھا ٹکرانے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ اس بات کو یقینی بنارہا تھا کہ ایسا کوئی حادثہ نہ ہو۔ ان کاموں میں تین بج گئے تھے۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”کرنل اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟ ان سے رابطہ کی کیا صورت ہے۔“

فتح خان گاڑی سے ایک بڑے سائز کا جدید ریڈیو نکال لایا۔ یہ ایمرجنسی لائٹ کے سائز کا تھا۔ ”اس سے رابطہ کھرے گا۔ مگر ابھی نہیں..... وہ ادھر آ گیا ہو گا اس کا آدمی بجلی اور موبائل ٹاور میں بم لگا رہا ہو گا۔“

”اس نے رابطہ کرنا چاہا تو؟“

”یہ آن ہے۔“ فتح خان نے ریڈیو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم کو پتا چل جائے گا۔“

یہاں موبائل سگنل نہیں تھے۔ غیر متوقع طور پر فتح خان کے ساتھی چائے اور کافی کا قہر ماس بھروا کر بلائے تھے۔ فتح خان نے کافی نکالی تو میں خوش ہو گیا۔ ”یہ کیا ہے کام۔“

”یہ کھانا بھی لایا ہے۔“ فتح خان نے انکشاف کیا۔ ”مرغ کی بھی بنا کر لایا ہے۔“

”تم اب بتا رہے ہو۔“ بیوٹو نے فحشی سے کہا۔ ”مجھے لچ میں بھی ڈبل روٹی اور مکھن کھانا پڑا تھا۔“

”وہ شام کے لیے ہے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”ابھی تو میرے آدمیوں نے بھی نہیں کھایا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے ہمیں کم سے کم پانچ گھنٹے پہلے کھانے پینے سے فارغ ہو جانا چاہیے۔“ میں نے

کہا۔ یہاں بلندی زیادہ نہیں تھی۔ فتح خان کی گھڑی میں آٹمی میٹر تھا اس نے بتایا۔

”یہاں بلندی پانچ ہزار نو سو فٹ ہے۔“

اسی لیے یہاں کچھ گہری تھی خاص طور پر جب ہم پہنچے تھے تو دھوپ بہت تیز تھی اور ہمیں ہلٹ پر دف بھی

چھینے لگا تھا اس لیے سب نے اتار دے تھے۔ مگر چار بجے کے بعد جب سورج مغرب کی افق کی طرف جھک چکا تھا تو

گری تیزی سے کم ہوئی۔ پہاڑوں میں اگر چند دن بارش نہ ہو اور کھل کر دھوپ نکلے تو بہت اذیت ناک قسم کی گری ہو جاتی ہے کیونکہ چٹانیں اور پتھر دھوپ سے تپ جاتے ہیں۔ یہاں شاید ایک دو دن پہلے بارش ہوئی تھی کیونکہ زمین میں معمولی سی نمی تھی اس لیے گری بہت زیادہ نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ریڈیو سے کرنل کی آواز ابھری۔

ایف کے..... ایف کے..... ڈو پوریڈی.....“

”ایس ایف کے میجر۔“ فتح خان نے ریڈیو کا ایک بٹن دبا کر کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“

”گنڈ..... سب اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں۔ سب اوکے ہے۔“

”اوکے..... کاپی۔“ فتح خان نے کہا اور کرنل نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”سب

اپنی اپنی جگہ پہنچ گیا ہے۔ اب اگلا مرحلہ ہے۔“

اگلے مرحلے سے مراد بجلی اور موبائل کے ٹاورز میں بم لگانا تھا اور میزائلوں اور اسٹائپر کے لیے موزوں جگہ تلاش کرنا تھی۔ اس کے لیے ابھی کئی گھنٹے تھے۔ ہمیں نصف رات کے بعد کارروائی کرنا تھی۔ چھ بجے کے بعد تیزی سے سردی اور تاریکی آئی تھی۔ فتح خان کے ساتھیوں نے الاؤ جھلانے کی اجازت مانگی تو اس نے شاندار الفاظ میں ان کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ لوگ پتک منانے نہیں آئے تھے۔ البتہ تاریکی ہونے کے بعد کھانا گرم کرنے کے لیے آگ جلائی تھی مگر اسے بھی آڑ میں جلایا تھا اور کھانا اور کافی گرم کرتے ہی اسے بچھا دیا گیا تھا۔ فتح خان اس حوالے سے بہت محتاط تھا۔ کھانے اور کافی سے فارغ ہو کر سب سستانے لگے تھے۔ اس دوران میں کرنل نے دو بار رابطہ کر کیا۔ ایک بار اس نے بتایا کہ انسپکشن مکمل ہو گئی ہے۔ یعنی بم لگ گئے ہیں اور باہر سے حملہ کرنے والے اپنی اپنی جگہوں پر پہنچ گئے ہیں۔ دوسری کال میں اس نے جی پی ایس لوکیشن پوچھی تھی۔ فتح خان نے جی پی ایس پر دیکھ کر اسے لوکیشن بتائی۔ سردی ہونے کے بعد سب نے بلٹ پروف اور اس پر جیکٹ پہن لی تھی۔

”اسلحہ کہاں ہے؟“ میں نے فتح خان سے پوچھا۔

”گماڑی میں ہے۔“ اس نے کہا اور اپنے آدی کو اسلحے والے بیگ لانے کا حکم دیا۔ وہ اندر سے دو بڑے بیگ نکال لایا۔ یہ خاص اسلحہ رکھنے والے بیگ تھے۔ اس میں رائفلیں ٹکڑوں میں تقسیم تھیں۔ سب اپنی اپنی رائفلیں جوڑنے لگے۔ ہر رائفل کے ساتھ چار اضافی میگزین تھے۔ یہ ایک خاص پلاسٹک کے بکٹ میں تھے۔ بکٹ کو جیکٹ سے منسلک کیا جاسکتا تھا اور صرف ایک سیکنڈ میں میگزین تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ جیکٹ کے سامنے والے حصے میں مختلف گرینڈز رکھنے کی جگہ تھی۔ پستول کے لیے جیب میں جگہ تھی۔ میں نے رائفل میں میگزین لوڈ کیا تو ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی بارہا اس قسم کے مشن پر جا چکا تھا۔ بہت قتل و غارت گری دیکھی اور کی تھی لیکن یہ احساس سب سے الگ تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ مشن سے بڑھ کر جنگ لگ رہی تھی۔ ہم بہت بڑے پیمانے پر کارروائی کرنے جا رہے تھے اور اس میں یقیناً بہت سارے انسان زندگی ہار جائیں گے۔ انسانی جان کی میرے نزدیک ہمیشہ بہت اہمیت رہی ہے میں نے کبھی انسانوں کو بے درجہ قتل کرنے کو اچھا نہیں سمجھا۔ میری کوشش رہی کہ میرے ہاتھ سے سوائے اشد ترین ضرورت کے کوئی انسانی جان ضائع نہ ہو۔ بہت کم ایسا ہوا کہ میں نے کسی انسان کو سوچ سمجھ کر مارا۔ ورنہ زیادہ تر جان بچانے کی کوشش یا لڑائی میں مارے

گئے تھے۔ اس لیے جب ایسا کوئی موقع آتا تو مجھے اندر سے عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔

”کیا سوچ رہا ہے شہباز خانا؟“ فتح خان نے پوچھا تو میں چونکا۔

”کچھ نہیں.....“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا آگے تک جا رہا ہوں۔“

فتح خان کسی قدر مضطرب ہو گیا۔ ”کدھر جاتا ہے؟“

”جہاں موہا بل سنگٹل مل سکیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ایک بہت ضروری کال کرنی ہے۔ وہ کال جس کے

لیے میں نے یہ موہا بل لیا ہے۔“

فتح خان سمجھ گیا تھا کہ میں کسے کال کرنے جا سکتا ہوں۔ اس نے سر ہلایا اور گھڑی دیکھی۔ ”ابھی نو بج رہا

ہے بہت وقت ہے پر کوشش کرنا جلدی آ جاؤ۔“

”تم فکر مت کرو میں ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”شوہی ہم بھی چلے گا۔“ بیٹو نے کہا۔

”نہیں تم یہیں رکو۔“ میں نے انکار کیا۔ ”یہ رکھو اور اس میں دیکھ کر کنور پیلس کا نقشہ سمجھنے کی کوشش کرو۔“

میں نے ڈیجیٹل نقشہ اسے تھمایا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا بیٹو نے میرے لمبے سے سمجھ لیا تھا کہ میں اسے لے کر

نہیں جاؤں گا اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔ پیدل کا راستہ اچھا خاصا تھا مگر بہت زیادہ بھی نہیں تھی۔ تقریباً

تین سو گز کے بعد سڑک آ گئی۔ میں نے موہا بل نکال کر دیکھا مگر سنگٹل غائب تھے۔ میں کنور پیلس کی طرف چل

پڑا۔ سنگٹل اسی طرف ملتے۔ کنور خاندان نے دولت کے بل بوتے پر اس دیرانے میں اپنے لیے جدید زندگی کی

تمام سہولتیں حاصل کر لی تھیں ان میں موہا بل فون سرورس اور انٹرنیٹ سرورس بھی شامل تھی۔ میرا اندازہ تھا کنور پیلس

یہاں سے کوئی تین سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور مجھے اس سے پہلے سنگٹل مل جائیں گے۔ تاریکی میں، میں

محفوظ تھا۔ چاند کی آخری تاریکیں تھیں اس لیے بہت چھوٹا سا چاند تھا اور آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے روشنی

بہت کم تھی۔ جب کوئی گاڑی آتی تو میں ڈھلان پر چڑھ کر کسی درخت یا پتھر کی آڑ لے لیتا۔ میرا حلیہ ایسا نہیں تھا

کہ میں کسی کے سامنے آنے کا خطرہ مول لیتا میں سر سے پاؤں تک مسلح تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اس سڑک کے

ساتھ تھا جو کنور پیلس کی طرف جاتی تھی۔ یہاں سنگٹل تھے۔ میں ذرا اوپر درختوں کے درمیان آیا۔

اب تک مجھے نہ تو کرنل کا کوئی آدی نظر آیا تھا اور نہ ہی کوئی گاڑی دکھائی دے تھی۔ وہ تھے اسی علاقے میں

مگر انہوں نے خود کو اچھی طرح کیوفلاج کر لیا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کیونکہ کنور پیلس سے تعلق رکھنے والے افراد کی

آمد و رفت ہو سکتی تھی اور وہ یہاں مشکوک افراد کو دیکھ کر پیلس والوں کو ہوشیار کر سکتے تھے۔ جب کہ ہمارا منصوبہ

انھار ہی رازداری پر کرتا تھا۔ میں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے میں سڑک پر نظر رکھ سکتا تھا اور مجھے کوئی

نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سویرا کا نمبر ملایا مجھے امید تھی کہ اس بار وہ موہا بل کو سینے سے لگائے گھوم

رہی ہوگی۔ پہلے اس نے شاید کسی کام سے رکھ دیا ہوگا مگر اجنبی نمبر دیکھ کر وہ سمجھ گئی ہوگی کہ میری ہی کال ہو سکتی

ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب اس نے دوسری بیل پر کال ریسیوو اور پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

”شہباز.....“

”ہاں سویرا میں۔“ میں نے کہا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس کے لہجے سے تڑپ ظاہر تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں سادی کو لینے جا رہا ہوں۔“

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کس خطرے میں جا رہا ہوں اور وہاں سے میری صحیح سلامت اور کامیاب واپسی بہت سی باتوں اور دعاؤں سے مشروط تھی۔ اس نے کہا۔ ”شہباز میں آپ کو روکوں گی نہیں لیکن آپ وعدہ کریں کہ آپ واپس آئیں گے۔“

”میں یہ وعدہ کیسے کر سکتا ہوں جب کہ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“

وہ دلی آواز میں رونے لگی۔ ”میرا دل بیٹھ رہا ہے مجھے لگ رہا ہے..... اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہوا تو میں بھی مر جاؤں گی۔“

میں نے نری سے کہا۔ ”تم اس سے بہتری کی امید رکھو اور دعا کرو مجھے اس وقت سب سے زیادہ ضرورت دعاؤں کی ہے۔ ماں جی سے بھی کہنا کہ دعا کریں۔“

”میں ضرور دعا کروں گی میرا رواں رواں دعا کرے گا۔“ اس نے کہا۔ ”جب آپ کی کال آئی تو میں نہا رہی تھی۔“

”نکھر گئی ہوگی۔“ میں نے ماضی کو یاد کیا۔ کبھی کبھی سویرا پر بھوت سوار ہوتا تو وہ خود صفائی پر تل جاتی تھی۔ اصل میں اسے صفائی تو میرے کمرے کی کرنی ہوتی تھی مگر اس بات کو چھپانے کے لیے وہ پورے رہائشی پورشن کی صفائی کر ڈالتی تھی اور بھوت بن جاتی۔ پھر نہادھو کر آتی تو اس کا رنگ دروپ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے شرم تھی۔

”آپ کو یاد ہے؟“

”میں بھولا کچھ بھی نہیں ہوں۔“ میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔ ”تمہارا رنگ دروپ بھولنے والی بات بھی نہیں ہے۔“

”تو بے کن لوگوں کی محبت میں رہ رہے ہیں۔“ اس نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔“

”یہاں چاروں طرف میری جیسی صورتیں ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں خیالوں میں تم ہوتی ہو میرے ساتھ۔“

”شہباز آپ سچ سچ بھی میرے ساتھ ہوں گے پلیز وعدہ کریں؟“ وہ پھر جذباتی ہو گئی۔

”سویرا میں وعدہ نہیں کرتا لیکن میری کوشش پوری ہوگی کہ واپس آؤں تمہارے لیے۔“

”میں آپ کا انتظار کروں گی۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ابھی کہاں ہیں؟“

”سمجھ لو سادی کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو وہ صبح کا سورج نکلنے سے پہلے وہ ہمارے پاس ہوگی

اور امکان ہے کہ چوبیس گھنٹے سے پہلے ہم واپس آ جائیں گے۔“

”سچ کہہ رہے ہیں؟“

”ارادہ تو یہی ہے آگے جو اللہ کی مرضی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں مجھے یقین ہے اللہ آپ سب کو بحفاظت واپس لائے گا۔“ سویرا نے یقین سے کہا۔ اسی لمحے پاس

کسی گاڑی کی آواز آئی اور میں چپ ہو گیا۔ سویرا نے محسوس کر لیا اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
 ”شش کوئی پاس ہے۔“ میں نے کہا۔ اگرچہ گاڑی سڑک سے گزر رہی تھی لیکن یہاں سناٹا شدید تھا اور احتیاط کا تقاضہ تھا کہ میں خاموش رہوں۔ گاڑی گزر کر آگے چلی گئی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا دس بجنے والے تھے میں نے سویرا سے کہا۔ ”وقت کم ہے زندگی رہی تو خوشخبری کے ساتھ دوبارہ بات کروں گا۔“
 ”ایک منٹ۔“ سویرا نے کہا وہ اتنی دیر سے خاموش تھی۔

”بولو۔“

سویرا کچھ دیر بعد بولی۔ ”میں کچھ پڑھ کر آپ پر بھونک رہی تھی اس لیے خاموش تھی۔ شہباز میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

اسے الوداع کہنا مشکل کام تھا مگر کہنا تو تھا۔ میں کال کے بعد بوجھل دل کے ساتھ نیچے اترا اور واپس روانہ ہوا۔ سڑک پر ان تھی بائیں طرف کوئی بیس پچیس گز آگے وہ موڑ تھا جو کنور ہیلز کی طرف جا رہا تھا۔ گاڑی کنور ہیلز والی سڑک پر مڑی تھی۔ میں مڑا اور واپس نیلے کی طرف چل پڑا۔ میرے قدم سُست اور بوجھل تھے۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر سویرا کا بھیگا لہجہ آ رہا تھا۔ میری جب اس سے بات ہوتی تو اس کا اختتام سویرا کے آنسوؤں پر ہوتا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے ذہن میں اس کی آواز اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ شاید اسی لیے میں عجب میں آنے والے آدمی کے قدموں کی آہٹ نہیں سن سکا تھا۔ پھر وہ بہت دے قدموں آیا تھا۔ بالکل آخری لمحوں میں مجھے آہٹ آئی لیکن اس سے پہلے میں مڑنا کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی اور میں نیچے گر گیا۔ ضرب شدید تھی اور میرا ذہن جیسے کسی تاریک دلدل میں ڈھنسنے لگا تھا۔ چند لمحے کی غفلت نے یہ وقت دکھایا تھا۔ میں نے کسی کی آواز سنی۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا تباہندہ ہے موبائل کی لائٹ تھی۔“

”یہ تو پوری طرح ہتھیار بند ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ وہ دونوں ہندی میں بات کر رہے تھے۔ ”سیدھا

کر اسے۔“

میں منہ کے بل گرا تھا۔ کسی نے مجھے ٹھوکر مار کر سیدھا کیا اور حیرت سے بولا۔ ”یہ تو وہی ہے بڑے کنور

والا بندہ.....“

”ہاں وہی ہے لے چل اسے.....“ دوسرا جوش سے بولا۔ ”بڑا کنور اس کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔ اپنے تو

دارے نیارے ہو جائیں گے بڑا کنور اتنا دے گا۔“

”سمجھ لے لاٹری کھل آئی ہے۔ ٹو اس کے پاس رک اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دے میں گاڑی لاتا ہوں۔“ پہلے نے کہا اور چلا گیا دوسرا میرے پاس بیٹھ کر مجھے ٹھونکنے لگا تھا۔ اس نے رائفل شانے سے اتارنا چاہی تو میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑا اس نے بدک کر کہا۔

”ہوش میں ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے سر پر ایک وار اور کیا۔ اس بار میں فوراً بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہائے ری قسمت..... کمند دو چار ہاتھ نہیں بلکہ دو چار انچ لب بام سے پہلے ٹوٹ گئی تھی۔ میں سادی کو آزاد کرانے آیا تھا اور خود اسیر ہو گیا تھا۔ میری تیاری کنور ہیلز کی حفاظت کے لحاظ سے تھی مگر مجھے بڑے کنور کے دو معمولی ملازموں

نے قابو کر کے اسیر کر لیا تھا۔ میری معمولی سی غلطی سے..... میں نے سوچا نہیں تھا کہ میرے کان سے لگے موبائل کی اسکرین کی روشنی کسی کو نظر آ سکتی ہے۔ وہ گاڑی پر یہاں سے گزر رہے تھے اور یقیناً یہ اتفاق تھا کہ ایک نے دیکھ لیا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کے بجائے موڑ کے بعد رک گئے اور پھر خاموشی سے میرے پیچھے آئے۔ رائفل سے انہوں نے اندازہ کر لیا کہ میں خطرناک آدمی ہوں اور مجھے بے خبری میں قابو کرنا ہی مناسب ہوگا۔ انہوں نے کامیابی سے اس پر عمل کیا۔



مجھے ہوش آیا تو میں ایک کرسی پر اس حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پشت پر ہتھکڑی سے بندھے تھے اور مجھے ہوش میں لانے کے لیے چہرے پر پانی پھینکا گیا تھا۔ میری جیکٹ، بلٹ پروف اور جسم سے تمام ہتھیار اور دوسری چیزیں اتاری گئی تھیں۔ میرے جسم پر شرٹ، ٹراؤزر اور جوتے تھے۔ منگے سے پھینکا جانے والا پانی سر دھپن کی طرح میرے منہ پر لگا اور بہہ کر شرٹ پر آیا تھا۔ دوسرے منگے پر مجھے ہوش آ گیا۔ سر شدت سے دکھ رہا تھا۔ دوسری ضرب نے سر پھاڑ دیا تھا اور خون بہہ کر میرے گال تک آیا ہوا تھا۔ پانی پڑا تو جما خون بھی بننے لگا تھا۔ چوت ٹھنڈی ہو کر دکھ رہی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر منہ سے ہٹایا اور بے ساختہ کراہا تھا۔ سر ہلانے سے قیامت کا درد اٹھا تھا۔ جب ذرا درد کم ہوا تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ میرا خیال تھا سب سے پہلے بڑے کنور سے سامنا ہوگا۔ مگر سامنے ہی رامن اور نائیک اپنی مکروہ صورتوں کے ساتھ موجود تھے۔ رامن طنز یہ انداز میں مسکرایا۔

”میری لک..... تم خود گرفتار ہو کر آ گئے۔“

”تمہاری لک؟“ میں نے جوابی طنز کیا۔ ”یا تمہارے آقا کی لک۔“

”جو تم سمجھ لو۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔ ”اس خیال میں مت رہنا کہ تم اب یہاں سے بچ کر نکل سکو

گے۔“

”خوش فہمیاں میں نے کبھی نہیں پالیں۔“ میں نے کسم کس کر اس جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ کمرے سے اندازہ ہو گیا کہ میں کنور پیلس کے قید خانے میں تھا جہاں پہلی بار آمد پر مجھے رکھا گیا تھا۔ دھات سے بنی کرسی زمین میں فکس تھی اور اسے ہلاتا بھی ناممکن تھا۔ اس میں ہاتھ پیروں کو جکڑنے کے لیے خصوصی انتظامات تھے۔ رامن کی نسبت نائیک کے تاثرات زیادہ خطرناک تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ رامن شریف تھا۔ وہ لکڑی کے فطرت رکھنے والا عیار شخص تھا جو اپنے جذبات آخر وقت تک چھپائے رکھنے کا ماہر تھا۔ میری نظر کسی گھڑی کی تلاش میں تھی جس سے مجھے وقت کا اندازہ ہو۔ مجھے ہوش میں لایا گیا تھا اور اگر یہ کام کنور پیلس میں لاتے ہی کیا گیا تھا تب بھی میں آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت بے ہوش رہا تھا اور میں دس کے آس پاس میں بے ہوش ہوا تھا۔ یعنی کم سے کم ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ لیکن یہ ایک اندازہ تھا ہو سکتا تھا میں اس سے زیادہ دیر بے ہوش رہا ہوں۔ میری کلائی سے گھڑی اتار لی گئی تھی اور وہاں دیواروں پر سوائے آلات تشدد کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ جگہ انٹر وکیشن سیل تھا۔ جہاں کنور خاندان کے معنویوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ نائیک اور رامن دونوں کی کلائیوں پر گھڑی تھی لیکن ان کے ڈائل میری سمت نہیں تھے۔ ورنہ میں ان سے وقت کا پتا چلا سکتا تھا۔ چند منٹ میں درد میں کسی قدر کمی آئی تھی میں نے پوچھا۔

”وہ کون تھے جنہوں نے مجھے بے ہوش کیا تھا؟“

”میرے آدمی تھے۔“ رامن نے دانتوں کی نمائش کی۔ ”یہ اتفاق ہے تم ان کے ہتھے چڑھ گئے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ میری گرفتاری اتفاق تھی۔۔۔ ورنہ ہوش میں آنے کے بعد مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ حملے کے بارے میں بھی نہ جان گئے ہوں۔ رامن کسی قدر آگے آیا۔ ”لیکن تم اس طرح کمانڈو بنے یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے میں کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے الٹا سوال کیا۔

”یہ اسی کو آزاد کرانے آیا ہوگا۔“ نائیک نے گھٹیا لہجے میں کہا۔

”نہیں میں تمہاری ناپاک روح کو تمہارے جسم سے آزاد کرانے آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے مجھے اس کا موقع ضرور ملے گا۔“

”خود موت کی کرسی پر بیٹھے ہو اور باتیں سنو۔“ نائیک نے فلمی ولن کے انداز میں قہقہہ لگایا۔

میں نے جھک کر دیکھا۔ کرسی مکمل طور پر دھاتی تھی اور اس سے ایک موٹا تار نکل کر نزدیکی سوئچ بورڈ تک جا رہا تھا جس سے ایک ریگولیٹر اور ایک ہینڈل منسلک تھا۔ ریگولیٹر کرنٹ کنٹرول کرنے کے لیے تھا اور ہینڈل گھمانے سے کرسی میں کرنٹ دوڑ جاتا ہوگا۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہری دوڑ گئی۔ کرنٹ کیسے آدمی کو توڑتا ہے مجھے اس کا تجربہ تھا جب اکرام چشتی نے مجھ پر کرنٹ کا تجربہ کیا تھا۔ مگر میں نے اپنا ظاہر پرسکون رکھا تھا میں نے رامن کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہارا مقصد مجھے زیادہ سے زیادہ عذاب سے مارنا ہے تو دیر کس بات کی ہے اپنا کام شروع کرو۔“

”فکر نہ کر جلد اس کا وقت بھی آئے گا۔“

”تب تم کیا چاہتے ہو..... بڑے کنور کے لیے میرا خون نچوڑنا چاہتے ہو؟“

اس نے میرا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ ”ابھی تو میں جانا چاہتا ہوں کہ تم کس مقصد کے لیے یہاں آئے

ہو؟“

”ظاہر ہے سادی کو آزاد کرانے اور اسے واپس لے جانے کے لیے۔“

رامن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شہباز تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ تم کنور پولیس کی سکیورٹی سے اچھی طرح واقف ہو۔ ایک آدمی اس کے گیٹ میں بھی نہیں گھس سکتا ہے اور تم اندر گھسنے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ میں نہیں مان سکتا۔“

”نامانو۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”ویسے ایک سوال ہے؟“

”کیا؟“

”یہاں کا حکمران بڑا کنور ہے یا پھر کوئی انقلاب آگیا ہے؟“

”بڑا کنور ہی یہاں کا حکمران ہے۔“ رامن نے چالاکی سے کہا۔

”تب مجھے اس کی تحویل میں ہونا چاہیے لیکن ایسا لگ رہا ہے اسے یہاں میری موجودگی کی خبر بھی نہیں

ہے۔“

”تمہارا اندازہ درست ہے۔“ راسن نے کہا۔ ”میں نے کہا تا وہ دونوں میرے آدمی تھے۔“
 راسن انہیں اپنے آدمی قرار دے رہا تھا جب کہ بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے ان کی جو گفتگو سنی تھی اس سے لگ رہا تھا وہ بڑے کنور کے ملازم تھے اور مجھے اس کے حضور پیش کر کے انعام و اکرام کے لیے بڑا امید تھے۔ مگر اس وقت مسئلہ یہ نہیں تھا کہ میں کس کے قبضے میں تھا اس وقت راسن اور بڑا کنور میرے لیے برابر تھے۔ مجھے فکر تھی کہ فتح خان اور دوسرے میرے غائب ہونے سے کسی تذبذب کا شکار نہ ہو جائیں اور حملہ ترک کر دیا جائے۔ اب حملہ ہونا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ورنہ میں یہیں پھنسا رہا تھا۔ راسن میرے پاس سے برآمد ہونے والا اسلحہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سب ایک طرف میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے واٹس بم والا سلیٹنڈر اٹھایا تھا۔ وہ اس کی چابی کے ساتھ چھپڑ کرنے جا رہا تھا کہ میں نے خبردار کیا۔ ”چابی مت چھیننا..... ورنہ یہ پھٹ جائے گا۔“
 ”میں احمق نہیں ہوں۔“ راسن نے اطمینان سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ واٹس بم ہے۔ یہ رائل، پستول، گرینینڈ اور اسوک گرینینڈ حاصل کر لینا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن یہ.....“ اس نے واٹس بم اوپر کیا۔ ”بہت ہائی فیک ہتھیار ہے۔ اسے ہر شخص حاصل نہیں کر سکتا ہے۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے..... ٹیکنالوجی کی ترقی اور اس سے زیادہ چور بازاری کی ترقی نے ہر ممنوعہ چیز کو قابل حصول بنا دیا ہے۔ تمہارے پاس پیسہ ہے تو تم سب خرید سکتے ہو۔“
 راسن ذرا آگے آیا اور جھک کر میرے چہرے کے پاس منہ لاکر بولا۔ ”شہباز مجھے تمہاری بات کا ذرا اعتبار نہیں ہے۔“

”مت کرو۔“ میں نے لا پرواہی سے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میری نظر اس کی کلائی پر بندھی گھڑی پر تھی مجھے ٹھیک سے ڈائل نظر نہیں آیا لیکن ایسا لگا جیسے گیارہ بجتے والے ہیں۔ میرا دل ایک لمحے کودھڑکا تھا۔ طے ہوا تھا کہ نصف رات کے بعد حملہ ہوگا۔ وقت کا تعین کرنٹ کرتا۔ وہ جب مناسب سمجھتا حملے کا حکم دیتا۔ مگر حملہ رات دس بجے چار بجے کے درمیان ہوتا۔ اگر گیارہ بجے تھے تو حملے میں تین سے پانچ گھنٹے کا وقت تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کم سے کم تین گھنٹے کا وقت میں کیسے گزاروں گا؟ راسن کے تیور بتا رہے تھے وہ مجھ سے حقیقت اگلوانے کے لیے کچھ کر گزرنے کو بے تاب تھا۔ یقیناً اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوگا کہ ہم کس پلانے پر کارروائی کرنے جا رہے تھے؟ شاید اسے خیال ہوگا کہ میرے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے اور وہ مجھ سے ان کے بارے میں جانا چاہتا تھا۔

راسن نے جھکے جھکے گردن گھما کر ٹائیک کی طرف دیکھا تو جیسے اس کی بانٹیں کھل گئی تھیں۔ وہ دیوار پر لگے سوچ اور ریگولیشن کی طرف بڑھا۔ اس نے ریگولیشن کا ڈائل گھما کر کرنٹ کے دو لیچ طے کیے۔ اس نے یقیناً کرنٹ اتار رکھا تھا کہ میں مروں نہیں۔ مگر کرنٹ مارے نہ بھی تب بھی وہ آدمی کی جان نکال لیتا ہے۔ میں نے دانت بچھنچھ لیے تھے اس کے باوجود جب اس نے سوچ آن کیا تو میں بے اختیار اچھلتا تھا اور میرے منہ سے دھاڑ نکلی تھی۔ اس نے شاید ایک دو سینکڑ کے لیے سوچ آن کیا تھا مگر مجھے یہ چند لمحے صدی جیسے لگے تھے۔ میرا بندھا جسم جھٹکے کھا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ مگر میں ایک حد سے زیادہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ ٹائیک نے سوچ بند کیا تو

کرنٹ رکاوٹ اور میری سانس بحال ہوئی۔ ذرا سی دیر میں کرنٹ نے میرا برا حال کر دیا تھا۔ پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

راسن اسی طرح جھکا ہوا دیکھ رہا تھا اس نے پوچھا۔ ”اب کیا کہتے ہو؟“

میرا تھوک جواب بن کر اس کے منہ پر گرا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر دو مال سے منہ صاف کیا اور ٹائیک کی طرف دیکھا اور اس نے سوچ کر آن کر دیا۔ اس بار کرنٹ زیادہ دیر تک جاری رہا تھا۔ میں لرزتا رہا اور چلا تا رہا۔ جب کرنٹ رکا تب بھی میرے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ کمرانظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ منہ میں نمکین ذائقہ آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زبان دانتوں میں آگئی ہو۔ کرنٹ رکنے کے بعد میں کرسی کی پشت سے سر نکا کر بے قابو سانس کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ اگرچہ بے ہوش ہونے میں عافیت تھی شاید مجھے ان دونوں کے ستم سے نجات مل جاتی مگر یہ ایسی صورت حال تھی کہ میں بے ہوش ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں بے ہوش ہو جاتا اور اسی دوران میں حالات میں کوئی تبدیلی آتی تو میں اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ راسن نے میرے بال پکڑ کر جھنجھوڑے اور کتے کی طرح غرایا۔

”شہباز بول تیرے ساتھ اور کون ہے۔“

”کوئی نہیں ہے.....“ میں نے ہانپ کر کہا۔ ”اگر کوئی ساتھ ہوتا تو کیا میں تمہارے دو عام ملازموں کے ہاتھوں پکڑا جاتا۔“

”جب تم اکیلے یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”میں نے سوچ تھا کہ کنور پبلس کی کوئی گاڑی روک کر اس کی مدد سے اندر پہنچ جاؤں گا۔“

”تم جانتے ہو یہ ممکن نہیں ہے..... باہر سے آنے والی ہر گاڑی کی مکمل تلاشی لی جاتی ہے بے شک اس میں کنور فیملی کا کوئی فرد کیوں نہ ہو۔ کلیئر ہونے کے بعد ہی اندر جانے والا گیٹ کھلتا ہے۔“

”میں نے چانس لینے کی کوشش کی تھی۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ رفتہ رفتہ اپنا صبر کھو رہا تھا اور یہ بات میرے لیے خطرناک ہو سکتی تھی۔ ایک حد سے زیادہ کرنٹ مجھے ناکارہ کر دیتا اور وقت آنے پر میں حرکت کرنے کے قابل نہ رہتا۔ اس کے علاوہ بھی وہ تشدد کے حربے آزمانے کے لیے آزاد تھے۔

”تم فضول کی بحث کر رہے ہو۔“ میں نے ملاعت سے کہا۔ ”اگر فرض کرو میرے کچھ ساتھی باہر ہیں تو میرے بغیر وہ بے کار ہیں۔“

”وہ بے کار ہیں مگر میں انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔“ راسن نے کہا۔ ”خاص طور تمہارے اس ساتھی کو جس کا تعلق یہیں کے قبائلیوں سے ہے اور جو تمہارے ساتھ پاکستان چلا گیا تھا۔“

میں چونکا تھا اسے بیٹو کے بارے میں کیسے علم ہوا تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ پاکستان میں ہے۔“ میرے جواب پر حرا مزادے ٹائیک نے راسن کے اشارے کے بغیر ہی سوچ کر آن کر دیا۔ اس بار کرنٹ غیر متوقع اور شدید تھا اور زیادہ دیر تک جاری رہا تھا۔ کرنٹ بند ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک میرا جسم بے اختیار لرزتا رہا تھا۔ اس بار سر اٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ڈیلوں میں آنکھیں بے قابو گردش کر رہی تھیں۔ پہلے سانس بے

قابو تھا اور اب سانس آہی نہیں رہا تھا بڑی مشکل سے میری حالت اس قابل ہوئی کہ میں سر اٹھا سکوں۔ رامن نے کہا۔ ”میں تصدیق کر چکا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ یہاں آیا ہے۔ تمہیں وہ ٹرک والا یاد ہے جسے تم نے ہار کیا تھا۔“

”اگر سنگھ۔“ میں چونکا۔ ”تم لوگ اس تک پہنچ گئے تھے؟“

رامن مسکرایا۔ ”تمہیں یاد ہے اس کا نام..... ہاں وہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا۔ میرا مطلب ہے رامن اٹھا لیا تھا۔“

”تھا۔“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”یعنی اسے چھوڑ دیا بعد میں؟“

”ہاں اب تو اس کا کریا کرم بھی ہو گیا ہوگا۔“ رامن نے یوں کہا جیسے معمولی سی بات ہو۔ اگر سنگھ کی موت کا سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”اسے مار دیا..... کیا قصور تھا اس کا؟“

”تم جانتے ہو اس کا قصور۔“ رامن نے سر دلچ میں کہا۔ ”اس نے سرحد پار سے آنے والوں کی مدد کی تھی۔“

”کیا میرے ماتھے پر لکھا تھا کہ میں سرحد پار سے آیا ہوں۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”میں نے اس کا ٹرک کرائے پر لیا تھا اور ہم نے اسے راستے میں چھوڑ دیا تھا۔“

”وہ بی ایس ایف کے چار آدمیوں کی لاشوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔“ رامن نے کہا۔ ”تم سوچ سکتے ہو فورس اور انجینی کے غم و غصے کا کیا حال ہوگا۔“

”ہاں جب تم لوگ اصل ذمے داروں کو نہیں پکڑ پاتے تو اپنی نااہلی کا غصہ بے گناہ اور مجبور لوگوں پر نکالتے ہو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”تم اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔“ رامن کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”وہ لڑکا کہاں ہے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو میں اس کے بارے میں بتا دیتا..... وہ ضد کر کے آ گیا تھا لیکن پھر میں نے اسے واپس بھیج دیا۔ وہ نا تجربے کا رہا تھا اور یہاں اس کا کوئی کام نہیں تھا۔“

”تم جھوٹ کہہ رہے ہو وہ یہیں ہے۔“

”تو معلوم کر لو۔“ میں نے سوچ کی طرف دیکھا۔ ”ایسا کرو اسے فل کرو اور کرٹ کھول دو..... تب شاید میں زبان کھول دوں۔“

رامن نے دانت پیسے۔ ”شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔“

لیکن اس سے پہلے وہ نائیک کو اشارہ کرتا جو سوچ آن کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ رامن کے پاس سے نیل کی آواز آئی اس نے موہاں نکال کر دیکھا اور پھر نائیک سے کہا۔ ”سب ایذا اڑ رکھنا کوئی تبدیلی نہ ہو میری بات سمجھ رہے ہوتا؟“

نائیک کا چہرہ بگھ گیا تھا۔ رامن نے اسے مجھ سے چھیڑ نہ کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ باہر چلا گیا اس کے جاتے ہی نائیک نے خباثت سے میری طرف دیکھا۔ ”دل تو چاہ رہا ہے کہ سچ سچ تجھے روست کر دوں۔“

”ہاں دل کی کیا بات ہے..... لیکن تمہارا آقا تمہیں صرف بھونکنے کا حکم دے کر گیا ہے افسوس کہ تمہیں کاٹنے کی آزادی نہیں ہے۔“

ٹائیک کو کئی بار میرے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی تھی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی اس کی عداوت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ ان نیش فطرت لوگوں میں سے تھا جو نزدیک آنے والے پر فرد پر اپنا ڈنک آزماتا تھا اور جن پر نہیں آزماتا تھا ان کا زیادہ دشمن بن جاتا۔ اس نے مکروہ شکل بنا کر کہا۔ ”نہیں کاٹ بھی سکتا ہوں۔“

مجھے اندازہ تھا کہ وہ کیا بد معاشی کرے گا۔ اس نے کرنٹ کم کیا اور سوئچ آن کیا تھا تو میں پہلے سے تیار تھا۔ میں نے ایسی فلک شکاف چیخ ماری کہ ٹائیک بھی اچھل پڑا تھا۔ اس نے ایک لمحے کو کرنٹ آن کیا تھا۔ میری آواز باہر تک گئی تھی اور فوراً رامن نے اندر جھانک کر کھا جانے والی نظروں سے ٹائیک کو دیکھا تو وہ فوراً بھیڑ پیے سے بھیڑ بن گیا تھا۔ رامن کے جانے کے بعد میں ہنسا تو وہ مشتعل ہو گیا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس بک بک میں مزید ادھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے ٹائیک کی گھڑی سے ہوا۔ وہ پاگل کتے کی سی بے قراری سے میرے سامنے ٹہل رہا تھا اور کئی بار اس کی گھڑی میرے سامنے آئی۔ اس بار میں نے واضح دیکھا ساڑھے گیارہ سے اوپر کا وقت ہو گیا تھا۔ مسلسل کئی بار کرنٹ کھانے سے میرا گلا خشک ہو گیا تھا اور مجھے پیاس لگ رہی تھی مگر میں پانی مانگ کر ذلیل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ پانی تو کیا ملتا ٹائیک کو موقع مل جاتا مجھے اذیت پہنچانے کا۔ اس لیے صبر سے برداشت کرتا رہا۔

خود پر قابو رکھنے اور ذہن پرسکون کرنے کے لیے میں نے سانس کی ایک مشق شروع کر دی اور اس کا فائدہ بھی ہوا تھا کیونکہ ٹائیک نے سادی کے حوالے سے بکواس شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی ذہنی گندگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اشتعال میں آنے کے بجائے خود کو سمجھایا کہ وہ کتا ہے اور اس کا کام ہی بھونکنا ہے میں اسے نہیں روک سکتا تھا اور جواب میں بھونک بھی نہیں سکتا تھا ہاں جلد موقع آتا تو میں اسے عملی جواب دے سکتا تھا اس کی گندی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر سکتا تھا۔ وہ بھونکتا رہا اور میں سانس کی مشق کرتا رہا۔ اس مشق کے باوجود بعض اوقات میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آدمی کے لیے عزت کا وار سب سے بڑھ کر ہوتا ہے اور وہ یہی دار کر رہا تھا۔ میں اسے جواب نہیں دے سکتا تھا البتہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ موقع ملنے پر اسے چھوڑوں گا نہیں جب وہ چپ ہوا تو میں نے اسے آگاہ بھی کر دیا۔

”جب مجھے موقع ملا میں تمہیں کتے کی موت مار دوں گا۔“

”ابھی تو تو خود کتے کی موت مرے گا۔“ ٹائیک نے ہانپتے ہوئے کہا اور باہر چلا گیا۔ وہ میری طرف سے بے فکر تھے کیونکہ میں کسی صورت از خود اس کرسی سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ فولادی کڑوں نے میرے ہاتھ پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ سامنے میرے سارے ہتھیار رکھے تھے اور میں بے بسی سے انہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ اچھا ہوا تھا کہ میں لیپ ٹاپ بیٹو کے پاس چھوڑ آیا تھا اور میرے پاس صرف خرید ہوا موبائل تھا۔ اس میں ایک ہی نمبر تھا اور وہ بھی سویرا کا تھا اس سے میرے دشمن کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے ہاں اگر سفیر یا ویم کے نمبر آ جاتے تو اس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر مجھ سے یہ عقل مندی نہیں ہوئی کہ میں انہیں کال کرتا میں نے موبائل صرف سویرا سے رابطے کے لیے لیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں آتے ہوئے کنور پیلز کا ڈیجیٹل میپ بیٹو کو دے آیا تھا۔ وہ میرے

پاس سے نکل آتا تو راس بہت زیادہ مشکوک ہو جاتا۔ مشکوک وہ اب بھی تھا لیکن اس کا ذہن کسی بڑی کارروائی کی طرف نہیں گیا تھا۔ ٹائیک کے باہر جانے سے میں نے سکون کا سانس لیا اور دل میں دعا کی کہ اب اس کی منحوس صورت مجھے دیر تک نظر نہ آئے۔

میں نے جانچنے کے لیے کڑوں پر روز آزمائی کی لیکن یہ پتلے مگر بہت ہی مضبوط فولاد سے بنے تھے اس کوشش میں یہ کلائیوں میں گڑ کر تکلیف دینے لگے تھے۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ یہ کڑے گھوم کر ایک ہک میں پھنس جاتے تھے اور اس ہک کا لاک ایسی جگہ تھا جہاں تک میری انگلیاں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ میں نے اس کی کوشش بھی کر کے دیکھ لی۔ کڑے اتنے تنگ تھے کہ کلائی سے نیچے ہاتھ ہلانے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ یہی حال پاؤں کو جکڑے کڑوں کا تھا۔ میں نے ممکن حد تک زور آزمائی کر لی اور پھر ہار مان لی میں اسی صورت میں آزاد ہو سکتا تھا جب کوئی آزاد کرتا یا کوئی غیب سے مدد ہوتی۔ میرے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ بارہ بج رہے تھے۔ طے شدہ وقت میں اب بھی دو گھنٹے باقی تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ قید خانے کی عمارت الگ تھلک تھی اور بہت بڑی نہیں تھی مشکل سے دو ڈھائی سو گز پر تھی اگر کرنل کے آدمی اس پر میزائل فائر کرتے تو امکان تھا کہ یہ پوری عمارت بلے کا ڈھیر نہ بن جائے۔

مجھے اپنے روٹنے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ صرف ایک چیز اس عمارت کو محفوظ رکھ سکتی تھی اور وہ اس کی بہت مضبوط ساخت تھی۔ اسے خاص طور سے قید خانے کے طور پر بنایا گیا تھا اور اس کی تعمیر میں مضبوطی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اس کی پتھروں کی دیواریں بہت موٹی تھیں اور تمام دروازے مضبوط فولاد کے تھے۔ اسی لحاظ سے اس کے اندر سر یا اور دوسرا تعمیراتی سامان استعمال ہوا ہوگا۔ یعنی اسے ہر ممکن مضبوطی کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہوگا۔ چند لمبے کے اضطراب کے بعد میں نے خود پر قابو پالیا۔ اس قسم کا اضطراب میرے دشمنوں کو ہوشیار کر سکتا تھا۔ جو میری قسمت میں لکھا تھا وہ تو ہونا تھا تو پہلے سے پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور کیونکہ معلوم کرنے کا ذریعہ نہیں تھا اس لیے کہنا مشکل تھا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ شاید ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

دروازہ کھلا تو چونکا اندر آنے والا راس تھا۔ وہ فکر مند لگ رہا تھا اور یہ دیکھ کر میں فکر مند ہو گیا کہ کہیں اسے کچھ سن گن تو نہیں مل گئی۔ اگر حملے کا راز فاش ہو جاتا تو پیلس کی سکیورٹی الٹ کر دی جاتی اور پھر کامیابی کے امکانات کم ہو جاتے۔ اول تو حملے کی کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے اور کنور حکومت سے مدد ہی طلب کر سکتا تھا۔ پھر اس کا بھی امکان تھا کہ بڑا کنور سادی کو لے کر یہاں سے نکل جاتا اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اس کے بعد ہم بے شک پورے کنور پیلس کو کھنڈر کر دیتے اور ایک ایک فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیتے اب بھی بے کار ہوتا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے کیا بڑے کنور کو یہاں میری موجودگی کا علم ہو گیا ہے؟“

”اسے پتا نہیں چلے گا۔“ وہ خشک لہجے میں بولا۔

میں ہنسا۔ ”تم سے پہلے یہی خوش فہمی راج کنور اور ششی دل جی کو بھی تھی۔“

وہ چونکا۔ ”تم ششی دل جی کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”تم شاید بے خبر ہو میری کئی بار بڑے کنور سے فون پر بات ہوئی ہے اور وہ جانتا ہے میں یہاں ہوں۔“
 اس بار رامن زیادہ فکر مند دکھائی دیا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا خدشہ کم ہو رہا تھا کہ رامن شاید حملے کے بارے میں جان گیا ہے۔ میں نے ملازمین کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ وہی میری امید تھے کہ وہ بڑے کنور تک خبر پہنچا سکتے تھے۔
 بے شک رامن نے انہیں منہ بند رکھنے کا حکم دیا ہو گا مگر ایک تو وہ ملازم تھے اور دوسرے انہیں لالچ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بڑا کنور اس جگہ کا اصل مالک تھا اور اسے میری اشد ضرورت تھی۔ جب وہ دیکھتے کہ رامن نے مجھے قید کیا ہوا ہے تو ممکن ہے انہیں خیال آتا اور وہ یہ بات بڑے کنور کے علم میں لانے کی کوشش کرتے لیکن یہ مفروضہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ رامن کی وفاداری کا دم بھرتے۔ رامن نے کچھ دیر بعد کہا۔
 ”بہر حال وہ اس وقت کنور پبلس میں تمہاری موجودگی سے لاعلم ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے علم ہو جائے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ مسکرایا۔ ”اگر تمہارا اشارہ ان دونوں کی طرف ہے جو تمہیں لے کر آئے تھے تو وہ دونوں اسی عمارت کے ایک کمرے میں موجود ہیں اور میری مرضی کے بغیر وہ یہاں سے نہ تو کہیں جاسکتے ہیں اور نہ کسی سے رابطہ کر سکتے ہیں۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ رامن اتنا ہی عیار ثابت ہوا تھا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس نے ان دونوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا تھا اب اس کے عزائم مزید واضح ہونے لگے تھے۔
 اس نے میرے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔ وہ بڑے کنور کی لاعلمی میں اس پر عمل کر گزرتا اور اسے بعد میں بھی خبر نہ ہوتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان دونوں ملازموں کے علاوہ اور لوگوں نے بھی مجھے دیکھا ہو گا کیا ان سے بڑے کنور کے علم میں یہ بات نہیں آئے گی؟ اگر ایسا ہی تھا تو اس کا مطلب تھا کہ رامن نے کنور پبلس میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا اور وہ اپنی من مانی کر سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ اس نے فشی دل جی کی جگہ حاصل کر لی ہو۔ وہ مجھے کھور رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔“
 مجھے مایوسی ہوئی تھی لیکن میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”میں نے کبھی کسی کی مدد پر بھروسہ نہیں کیا مجھے صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔“

رامن نے دانت نکالے۔ ”تو بس وہی تمہاری مدد کرے گا۔“

”مجھے بھی یقین ہے اللہ تمہاری زبان مبارک کرے اگرچہ تم آدمی نہایت منحوس ہو۔“

”بانو کہاں ہے؟“ اچانک اس نے موضوع بدل دیا۔

”جب تم یہ جانتے ہو کہ بیو میرے ساتھ آیا ہے تو تمہیں یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ بانو سرحد پار واپس جا چکی ہے۔“

”وہ پھر یہاں آئے گی اور اس بار کوئی اسے بچا نہیں سکے گا۔“

”اس کے برعکس مجھے یقین ہے اگر کبھی تم اپنی بد قسمتی سے اس کے سامنے آ گئے تو تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔“

وہ حقارت سے مسکرایا۔ ”تم نے اسے کچھ سکھا دیا تو اس کا مطلب ہے وہ میرے سامنے آ سکے۔“

”کچھ میں نے سکھایا ہے لیکن اب وہ جن ماہروں کے ساتھ ہے اور وہ اسے جو سکھا رہے ہیں وہ ایک وقت تمہارے جیسے چار آدمیوں سے مقابلہ کر سکتی ہے۔“

”میں تو نالہ نہیں ہوں۔ اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا ورنہ میں جس کھائی میں گرا تھا اس سے زندہ باہر نہیں آ سکتا تھا۔“

مجھے اعتراف تھا کیونکہ واقعی اس کا بیج جانا اور اتنی جلدی ٹھیک ہو جانا تھا اس کی سخت جانی کی اور اچھی قسمت کی دلیل تھی۔ مگر میں اسے بانو سے ڈر نہیں رہا تھا میں تو وقت گزاری کر رہا تھا اب وہ کسی بھی طریقے سے ہوتی اس لیے میں نے بحث جاری رکھی اور لا پرواہی سے کہا۔ ”وہ اتفاق تھا کہ تم بیج گئے..... مگر بانو کے سامنے کوئی اتفاق تمہیں نہیں بچا سکتا گا۔“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”شہباز تم غیر متعلقہ باتیں کر رہے ہو۔“

”تو تم متعلقہ بات کر لو۔“

”راج کنور کہاں ہے؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”میں نے اسے شملہ کے ایک اسپتال میں جمع کرایا تھا بعد میں وہ وہاں سے غائب پایا گیا۔“

”اسے کنور ہسپتال لایا جا رہا تھا راستے میں اس گاڑی پر حملہ ہوا جس میں کنور تھا۔ دونوں گاڑیوں کو مارے گئے اور حملہ کرنے والے راج کنور کو ساتھ لے گئے۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں حملہ میں نے نہیں کیا تھا اور راج کنور دیے بھی میرے لیے بے کار آدمی ہے اسے ساتھ لے جانے کے بجائے میں اس کی لاش چھوڑ جانا زیادہ پسند کرتا۔“

”جھوٹ مت بولو یہ تمہارا ہی کام ہے۔“

”مرضی تمہاری..... میں تمہارے قبضے میں ہوں، تم جو چاہے الزام لگا دو۔“ میں نے شانے ہلائے۔

”ویسے میو میں کیا صرف کرٹ ہے؟“

”نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔“ رامن نے دیوار پر سجے آلات تشدد کی طرف دیکھا۔ ”جو کہو گے کھانے کو ملے گا۔“

”جو تمہاری مرضی ہے..... لیکن میں بتا دوں کہ تم صرف وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے احتمانہ سوالات کر رہے ہو جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“

”میں وقت ضائع نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ بولا اور کمرے میں ٹپلنے لگا۔ ”تم نے کبھی سوچا کہ میں نے راجیے ادارے کو چھوڑ کر کنور کی چاکری کیوں کی؟“

”نہیں کیونکہ میرے پاس فالٹو باتیں سوچنے کا وقت نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے یقیناً کسی نہ کسی مقصد سے یہ کام کیا ہے۔ البتہ ایک شبہ ہے۔ میاں ممتاز کی حویلی میں بھی تم دراصل کنوروں کے لیے کام کر رہے تھے اور راکھ کی نوکری صرف کور تھی۔“

رامن نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”اور تم کہہ رہے ہو کہ تم میرے مارے میں سوچتے نہیں ہو؟“

”تھوڑا بہت تو سب اپنے دشمنوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے میری سوچ درست ہے۔ تم وہاں بھی کنوروں کے لیے کام کرتے تھے۔“

اس نے ٹھٹھکتے ہوئے سر ہلایا۔ ”ہاں یہ چکر دوسرا ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتا.....“

”تمہیں بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میاں ممتاز کا کنوروں سے کاروباری تعلق تھا۔ وہ ان سے ہیرے خریدتا تھا اور میرا خیال ہے تم وہاں کنوروں کے نگران کی حیثیت سے موجود تھے۔ شاید ادائیگیاں لیٹ کی جاتی ہوں گی۔ اس لیے تم وہاں بھیجے گئے تاکہ میاں جی کی نیت پر نظر رکھو۔“

”شہباز تم بہت خطرناک آدمی ہو۔“

”تمہیں اس معاملے میں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں کسی کے چکر میں بلاوجہ نہیں پڑتا۔ اگر تم اور کنور مجھ سے چھیڑ نہ کرتے تو آرام سے اپنا کام کرتے رہتے۔ اب بھی تم مجھ سے پنکا کر رہے ہو حالانکہ میں نے تمہیں مابے کے بجائے ایک موقع دیا اور اسی وجہ سے تم زندہ ہو۔ مگر ایک بار پھر تم میری راہ میں آئے ہو۔“

”اس بار مجبوری ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”میں تمہیں کنور تک پہنچنے سے روکنا چاہتا ہوں۔“

”دوسرے لفظوں میں تم چاہتے ہو کہ بڑا کنور ٹھیک نہ ہو۔“ میں نے غور کیا۔ ”لیکن کیوں..... اگر تم راج کنور کے لیے کام کر رہے ہو تو بے وقوفی کر رہے ہو اور میں جانتا ہوں تم بے وقوفی کرنے والے آدمی نہیں ہو۔“

”راج کنور سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”تو پھر کس سے تعلق ہے.....“ میں کہتے کہتے رک گیا اس کی وجہ میرے ذہن میں اچانک آنے والا خیال تھا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”تم کیا کہنا چاہ رہے تھے؟“ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

میں چپ رہا کیونکہ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا اور کچھ کڑیاں جو پہلے آپس میں ٹھیک سے نہیں بیٹھ رہی تھیں۔ اب بیٹھتی نظر آرہی تھیں۔ راجن اچانک میری طرف جھکا اور اس نے جھک کر پوچھا۔ ”بتاؤ تم کیا کہہ رہے تھے اور رک کیوں گئے؟“

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں تم سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔“

”نہیں تم کچھ کہتے کہتے رک گئے تھے۔“ اس نے ایک بار پھر میرے بال جکڑ لیے اور انہیں جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”بولو تم کیا کہنا چاہتے ہو تم کیا جانتے ہو؟“

میں اپنا سر پیچھے لے جا رہا تھا وہ میری طرف جھک رہا تھا۔ میں نے کوئی ردِ عمل نہیں دکھایا تھا۔ پھر جیسے ہی اس نے میرا سر جھوڑا میں نے پوری قوت سے سر آگے اچھالا۔ راجن کا منہ کچھ زیادہ ہی پاس آگیا تھا اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔ میرا منہ اس کی ناک پر لگا تھا اور وہ ایک دھاڑ کے ساتھ پیچھے جا گرا تھا۔ اس کی چیخ سن کر باہر سے نائیک اندر آیا تھا۔ اس نے جھک کر راجن کو اٹھانا چاہا تو اس نے نائیک کو دھکیل دیا۔ راجن اٹھا تو اس کی ناک لہو لہان ہو رہی تھی۔ وہ خوفناک نظر آ رہا تھا اور اس کے تاثرات بھیانک ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ غصے سے پاگل ہو جائے گا اس کے باوجود میں مسکرایا۔ ”میری طرف سے ایک اور تحفہ۔“

جواب میں وہ غراتا ہوا میری طرف آیا تھا کہ اچانک ہی روشنی غائب ہو گئی۔ رامن اور نائیک بیک وقت

ہٹکائے۔ ”یہ..... یہ کیا ہوا؟“

وہ نہیں سمجھتے تھے لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ میرے جسم میں تاریکی چھاتے ہی سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ تاریکی ایک لمحے کے لیے ہوئی تھی دوسرے لمحے روشنی بحال ہو گئی۔ رامن وحشت زدہ ہو رہا تھا شاید اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ وہ باہر کی طرف جھپٹا۔ نائیک وہیں موجود تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور میری طرف بڑھا تھا کہ میرے کانوں نے ایک سنسنائی آواز سنی اور پھر ایک دھمک سی ہوئی۔ دھماکے کی آواز سے پہلے نائیک کے عقب میں ایک آگ کا طوفان نمودار ہوا تھا۔ نائیک اچھل کر میری طرف آیا اور میں کرسی سمیت نیچے گرا تھا۔ دھماکے کی آواز سے پہلے میرے ہوش دھواں گم ہو گئے تھے۔



دھماکے نے میرے حواس قفل کر دیے تھے اور اس کے زور نے مجھے کرسی سمیت اکھاڑ پھینکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا جسم کئی حصوں میں بٹ گیا ہے۔ نائیک بہت قوت سے مجھ سے ٹکرایا تھا۔ اسے کمرے کا فلادی دروازہ لگا تھا۔ اس کا ہاتھ نہیں کیا حال ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ یہ وقت کتنی دیر تک رہا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میں چونکا تو باہر سے بے پناہ فائرنگ کے ساتھ انسانوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ اس عمارت کی روشنی بند ہو گئی تھی لیکن باہر لگنے والی آگ کے شعلوں کا اندکاس اندر تک آرہا تھا۔ میں پہلو کے بل اس طرح گرا ہوا تھا کہ کرسی میری پشت پر تھی۔ میں نے حرکت کرنا چاہی تو مجھے پتا چلا کہ میرے ہاتھ آزاد ہو گئے تھے۔ ٹوٹنے اور گرنے کے دوران کرسی کا کلپ کھولنے والا میکینزم کام کر چکا تھا اور میرے ہاتھ آزاد تھے۔ البتہ میرے پاؤں بدستور کرسی کے کلپس میں قید تھے۔

میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس دھماکے نے مجھے کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ میں درد اور ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنا جسم چیک کر رہا تھا۔ کئی جگہوں پر زخم تھے، مجھے خون کی چھچھاہٹ محسوس ہوئی تھی۔ مگر درد اتنا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ درست انداز میں کام کر رہے تھے اس لیے میں نے مزید معائنے کا کام ملتوی کیا اور خود کو آزاد کرانے کی کوشش شروع کر دی۔ پیروں کے کڑے کسی قدر موٹے حلقے والے تھے اور اسی لحاظ سے مضبوط تھے۔ کرنل نے شاید دو بجتے ہی حملے کا آغاز کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری غیر موجودگی میں کنور پیلس پر پہیلی کا پتھر سے اترنے والی ٹیم کی قیادت کون کرے گا؟ کڑوں کو اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش نا کام رہی تھی۔ وہ بہت مضبوطی سے اپنی جگہ جے ہوئے تھے۔ اس لیے اب میں کرسی کے عقبی حصے کو ٹٹول رہا تھا۔ ان کڑوں کو کھولنے والا میکینزم کرسی کی پشت پر ہی تھا۔ مگر یہ بہت مشکل کام تھا۔

دھماکے نے صرف دروازہ نہیں اکھاڑا تھا بلکہ کمرے کو بھی تہ و بالا کر دیا تھا۔ اگر دیو الہیں اور پھت بہت مضبوط نہ ہوتیں تو یہ گرجا تیں مگر اب بھی ان سے پلاسٹر کے ٹکڑے ٹوٹ کر گرے تھے۔ اندر گڑا اور دھوئیں نے ماحول دھندلا دیا تھا۔ اس کے پار روشنی جیسے لہرا رہی تھی۔ دھواں زیادہ نہیں تھا مگر گرد کے ساتھ مل کر سانس لینے میں مشکل پیدا کر رہا تھا۔ میرا گلا پہلے ہی خشک ہو رہا تھا۔ جسم موڑ کر میں کوسی کی پشت ٹٹول رہا تھا۔ میری انگلیوں

نے ایک ابھری ہوئی چیز کو چھوا۔ میں نے اسے اوپر کھسکانے کی کوشش کی مگر وہ جام ہو رہی تھی۔ شاید یہی پاؤں کے کڑے کھولنے والا کھٹکا تھا۔ اس کی پوزیشن بھی ایسی تھی کہ میں اسے بہ مشکل دو انگلیوں سے اوپر کی طرف کھینچ سکتا تھا اس سے زیادہ زور لگانا ممکن نہیں تھا۔ اگر یہ ذرا اوپر ہوتا تو میں انگوٹھے سے زور لگا کر اسے کھینچ لیتا۔ میں نے کوشش کر کے دیکھ لی مگر دو انگلیوں سے زیادہ رسائی نہیں تھی۔ پھر میں نے آس پاس ٹٹولا کہ کوئی چیز مل جائے جس سے میں کھٹکا کھسکا سکوں۔

دھماکے سے پہلے روشنی بند ہو گئی تھی۔ یقیناً کنور پیلز کو فراہم کی جانے والی پاور لائن اڑادی گئی تھی۔ پھر بیک آپ نے کام شروع کیا تھا اور جب میزائل آکر اس عمارت سے ٹکرایا تو اس نے بجلی کا نظام تباہ کر دیا تھا۔ اب یہاں پھر اندھیرا تھا مگر اچانک ہی دوبارہ روشنی ہو گئی۔ شاید عمارت کے بیک آپ نے کام شروع کر دیا تھا۔ مگر یہ روشنی زیادہ نہیں تھی اور کمرے کے کونے میں لٹک جانے والا بالب ٹمٹمار ہا تھا۔ بہر حال یہ روشنی بھی غنیمت تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا تو مجھے ایک زنبور نما آلہ دکھائی دیا۔ یہ شاید دانت یا ناخن اکھاڑنے کے کام آتا تھا۔ مگر وہ کچھ دور پڑا تھا۔ میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے کرسی آگے کھسکائی اور دوسری بار وزنی کرسی کھسکانے پر وہ زنبور نما آلہ میرے ہاتھ میں آ گیا جب میں نے ٹائیک کو فرش پر اپنے ہی خون میں غلٹا پڑے دیکھا تھا۔ اس کا ایک بازو تقریباً کٹ گیا تھا اور جبراً ٹوٹ جانے سے منہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ مر گیا تھا یا ابھی زندہ تھا۔

میں نے آلہ پیچھے لے جا کر اس سے کھٹکا کھسکانے کی کوشش شروع کی۔ اگر کھٹکا ٹھیک ہوتا تو وہ بہت آسانی سے کھسک جاتا مگر کرسی گرنے اور اسٹرکچر بگڑنے سے کھٹکا سخت ہو گیا تھا۔ وہ کھسک کر نہیں دے رہا تھا۔ میں نے آلہ اس پر مارا اور چند نستعلیق گالیاں بھی دیں مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کرسی خود فرش سے آزاد ہو گئی تھی لیکن مجھے قید رکھا ہوا تھا۔ میں نے آلے سے کڑا کاٹنے کی کوشش بھی کی۔ مگر ذرا کام کے لیے موزوں نہیں تھا۔ عجیب پوزیشن تھی۔ میں ایک بہت بڑے دھماکے میں بچ گیا تھا جب کہ میرے دشمن اس کا شکار ہو گئے تھے، کم سے کم ایک تو میرے سامنے پڑا ہوا تھا مگر ساتھ ہی میں قید سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ میری پوزیشن بھی ایسی تھی کہ میں خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ میری نظر ایک طرف موجود اپنے ہتھیاروں پر گئی تھی۔ دھماکے نے انہیں بھی میز سے منتشر کر دیا تھا اور خیریت رہی کہ ان میں سے کوئی گریینڈ یا اسوک بم نہیں پھٹا تھا ورنہ میرا بچنا محال تھا۔

مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اس طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ یہ خاصا مشکل کام تھا کیونکہ درمیان میں دروازہ پڑا ہوا تھا۔ اس سے گزر کر جانا تھا۔ کرسی کم سے کم ایک من وزنی تھی کیونکہ یہ ٹھوس فولادی بنی تھی۔ ایک من وزن سر کا بھی آسان نہیں تھا مگر جب انسان کی جان پر بنی ہوتی ہے تو وہ سب کر لیتا ہے۔ ایک پہاڑ سر پر اٹھا کر دوسرا پہاڑ بھی سر کر لیتا ہے یہ تو ایک من وزنی کرسی تھی۔ کسی نہ کسی طرح میں نے ہتھیاروں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ میں نے پستوں اٹھایا اسے چیک کیا۔ پھر اسے عقب میں لاکر نال کھٹکے پر رکھی اور آگے جھکتے ہوئے گولی چلا دی۔ گولی نہ جانے کہاں گئی۔ ایک دھماکا ہوا مگر کڑے بدستور بند رہے۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ کھٹکا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اپنی جگہ سے کسی قدر سرک بھی گیا تھا۔ میں دوسرا فائر کرنے والا تھا کہ باہر سے کسی نے چلا کر کہا۔

”اندر فائر ہوا ہے۔“

”ٹو جا کر دیکھ۔“ کسی اور نے اسے حکم دیا۔

خطرہ قریب آرہا تھا کیونکہ بولنے والے مقامی لہجے میں بات کر رہے تھے اور وہ یقیناً کرنل یا فتح خان کے آدمی نہیں تھے۔ جب تک میں آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا باہر چیخ و پکار اور فائرنگ کا شور جاری تھا۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ میزائل مین اپنا کام کر رہے تھے۔ شکر ہے اس عمارت پر دوسرا میزائل فائر نہیں ہوا تھا ورنہ اس بار یہ طبع کا ڈھیر بن جاتی۔ کبھی شور کم ہو جاتا اور کبھی بڑھ جاتا تھا۔ دور سے کی جانے والی فائرنگ کی آواز یہاں تک نہیں آرہی تھی البتہ کنور ہیلز کے گارڈز جو جواب دے رہے تھے اس کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہاں بھی کچھ لوگ تھے جو اندر سے فائر کی آواز پر چونک گئے تھے۔ اس سے پہلے کوئی نمودار ہوتا میرا آزاد ہونا ضروری تھا۔ میں نے پھر کھلے پر نال رکھی اور فائر کر دیا۔ اس بار بھی کڑا نہیں کھلا تھا۔ میں نے کڑے کی شان میں کچھ گستاخیاں کیں۔

اسی لمحے دروازے کی طرف ایک سایہ نمودار ہوا اس نے خود کار رائلٹ افشار رکھی تھی۔ میں نے کسی قدر مڑ کر پستول کا رخ دروازے کی طرف کیا اور جیسے ہی وہ سامنے آیا میں نے فائر کیا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا مگر فوراً اس کا رائلٹ والا ہاتھ آگے آیا۔ میں نے تیزی سے گھومتے ہوئے کرسی کی پشت اس کی طرف کر دی۔ اس کے عقب میں ہی میں کسی قدر بچ سکتا تھا۔ اس نے برسٹ مارا اور میں سر ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے گول مول ہو گیا۔ گولیاں کرسی سے لگیں اور کچھ اس سے بچ کر گزر گئیں۔ مجھے جھٹکا لگا مگر یہ گولی کا نہیں تھا بلکہ کڑے کھل جانے سے میرے پاؤں آزاد ہو گئے تھے۔ دشمن کی طرف سے چلائی جانے والی کسی گولی نے کام کر دیا تھا۔ میرے پاؤں پھنسے تھے اس لیے اچانک آزاد ہونے سے جھٹکا لگا تھا۔ میں آگے سر کا اور دوسرے برسٹ سے بچ گیا۔ کرسی کو آڑ بناتے ہوئے میں نے دروازے کی طرف پستول کا رخ کر کے پورا میگزین خالی کر دیا۔ اس بار وہ نشانہ بنا کیونکہ اس نے چیخ کر گالی دی پھر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

میں نے رائلٹ اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک طرف آگ بھڑک رہی تھی اور اس طرف عمارت تباہ ہونے سے کھلا آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ فائر کرنے والا دوسری طرف سے آیا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو جھانک کر دیکھا تو مجھے راہداری کے سرے پر دو افراد دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک زخمی تھا اس نے اپنا ہازو تھام رکھا تھا۔ میں نے رائلٹ کا رخ ان کی طرف کیا مگر اسی لمحے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ آگے جا چکے تھے۔ یہاں دھواں زیادہ تھا۔ میں واپس آیا اور جلدی سے بلٹ پروف اور اس پر جیکٹ پہنی، ہم لگائے اور مہرمنہ پر گیس ماسک لگا لیا۔ یہاں اثر نہیں تھا مگر باہر یقیناً گیس کا اثر موجود تھا۔ ہر چیز مٹی مٹی ہو رہی تھی مگر کسی چیز کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ اضافی میگزین کا بکٹ شانے سے لٹکایا اور باہر کی طرف بڑھا تھا کہ کراہ سنائی دی۔ میں نے چونک کر ٹائیک کی طرف دیکھا۔ وہ زندہ تھا اور ہوش میں آ گیا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے آزاد مسلح دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت آ گئی تھی۔ چند منٹ پہلے وہ آزاد تھا اور لاف گزاف کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا نہیں تھا کہ وقت اتنی تیزی سے پلٹ جائے گا۔ اب میں آزاد تھا اور وہ قریب المرگ تھا۔ میں نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

”تم بچ گئے..... افسوس..... میں نے سوچا تھا کہ تمہارے گندے خون سے ہاتھ رنگنے سے بچ گیا مگر ایسا لگ رہا ہے تمہاری موت میرے ہاتھوں ہی لکھی ہے۔ بولو کیسے مرنا پسند کرو گے، گولی سے، خنجر سے یا میں یہ گریبنڈ پن نکال کر تمہارے گندے منہ میں ٹھونس دوں۔“

اس نے بولنے کی کوشش کی مگر ٹوٹے جڑے نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا وہ گڑگڑا کر رہ گیا۔ میں نے جھک کر کہا۔ ”تم بول نہیں سکتے اس لیے یہ بھی نہیں بتا سکو گے کہ کس طرح مرنا چاہتے ہو لیکن میں نے تمہارے لیے ایک اچھا طریقہ سوچا ہے۔“

بجلی کا تار جو کرسی سے لگا ہوا تھا۔ کرسی اکھڑنے سے وہ بھی الگ ہو گیا تھا۔ مگر وہ دیوار میں موجود سوئچ اور ریگولیزر سے منسلک تھا۔ میں نے تار اٹھایا اور اس کا ننگا سرانٹیک کے منہ میں ڈال دیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ اپنا کھلا منہ ہی بند کر سکتا۔ تار حلق کے اندر تک اتار کر میں ریگولیزر اور سوئچ تک گیا۔ ٹائیک کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اگر وہ کوئی التجا کرنا چاہتا تھا تو کر نہیں سکتا تھا اور اگر کر سکتا تو میں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ریگولیزر کو فلپ پر کیا اور ٹائیک کی طرف دیکھا۔ ”مزے کرو۔“ میں نے کہتے ہوئے سوئچ آن کر دیا۔ ٹائیک کا جسم یک دم ایٹھا اور پھر تھر تھر کاٹنے لگا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ جس سے کچھ دیر پہلے وہ گند اگل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور یک دم ان کے ڈیلے سفید ہو گیا۔ میں نے منہ پھیر لیا اور باہر کی طرف بڑھا۔

اب مجھے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنا تھا۔ میرے پاس ریڈیو نہیں تھا کیونکہ وہ فتح خان سے لیا نہیں تھا۔ مجھے خود جا کر ان سے ملنا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر کیا ہوا تھا۔ اب شور کم رہ گیا تھا مگر فائرنگ کی آواز بتا رہی تھی کہ مزاحمت جارہی ہے۔ میں محتاط قدموں سے راہداری میں آیا۔ میں قید خانے کی عمارت کے پچھلے حصے میں تھا اور اس کا سامنے والا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ میں اسی وجہ سے بچا تھا۔ اس طرف کمروں میں جو لوگ قید تھے ان کے بچنے کا امکان کم تھا کیونکہ عمارت کا یہ حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ وہ بہ ظاہر عام سے نظر آنے والے میزائل کس قدر خطرناک تھیں یا ہیں۔ صرف ایک میزائل نے نکلگریٹ اور فولاد سے بنی اس عمارت کا یہ حال کر دیا تھا۔ راہداری میں بھی جا بجا لمبا بکھرا ہوا تھا۔ میں زخمی تھا مگر کوئی زخم ایسا نہیں تھا جو مجھے ناکارہ کر دیتا۔ ہڈی پہلی سب محفوظ تھیں۔ اگر ٹائیک سامنے نہ ہوتا تو فولادی دروازہ ٹوٹ کر مجھے لگتا اور اس کی جگہ میرا حشر کر دیتا۔ باہر نکلنے سے پہلے میں نے جیکٹ ٹوٹی اور اس میں وہ مخصوص سیٹی موجود پا کر اطمینان محسوس کیا جس کی آواز دوسروں کو سنل دیتی کہ میں کہاں ہوں۔

عمارت کا داخلی حصہ تباہ ہوا تھا اور یہ قید خانہ تھا اس لیے اس میں دوسرے راستے کی موجودگی بھی مشکل تھی۔ اگر واقعی ایک ہی راستہ تھا تو وہ بند ہو گیا تھا اور مجھے باہر جانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ راہداری آگے جا کر بائیں طرف مڑ رہی تھی اور مجھ پر حملہ کرنے والا وہیں کہیں دوسرے آدمی سمیت غائب ہوا تھا۔ میں دبے قدموں وہاں تک آیا تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ اس طرف راہداری مڑی تھی اور سامنے دیوار تھی۔ سامنے ہی نہیں دائیں بائیں بھی دیوار تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ اسی طرف گئے تھے۔ اس وقت یہاں خاصا دھواں تھا اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ وہ اچانک ہی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مگر وہ تھے راہداری کے آخری

سرے پر۔

میری جیکٹ میں ایک چھوٹی نارنج تھی۔ میں نے اسے آن کیا اور اچھی طرح معائنہ کیا مگر وہاں سوائے سپاٹ دیواروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس راہداری میں دونوں طرف پانچ پانچ کمرے تھے۔ جس طرف میزائل لگا تھا وہ داخلی حصہ تھا۔ وہ اس طرف کے پانچ کمروں سمیت تباہ ہو گیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف کے دو کمرے تباہ ہوئے تھے مگر جس میں، نہیں تھا اور اس سے آگے کے دو کمرے سلامت رہے تھے۔ میرے کمرے کا بھی دروازہ اکھڑا تھا۔ اگلے دونوں کمرے خالی تھے۔ وہ دھماکے سے دور ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے تھے۔ میں نے آگے والے کے تباہ شدہ کمروں کے دروازے کھولنے کی کوشش کی مگر جو تین دروازے صحیح سلامت تھے ان کے فریم ٹیڑھے ہونے اور آگے لمبا کرنے سے وہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ یہاں کی روشنیاں بھی گل تھیں شاید بجلی کی تاریں متاثر ہوئی تھیں۔ میں پہلے مکمل طور پر قید تھا۔ پھر لوگوں کی قید سے آزاد ہوا تو کرسی نے جکڑے رکھا تھا اور اب کرسی سے آزاد ہوا تھا تو اس قید خانے سے نکلنے کی کوئی راہ سہائی نہیں دے رہی تھی۔

حملہ شروع ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا مگر ابھی تک اندر کی مزاحمت ختم نہیں ہوئی تھی۔ باہر سے فائرنگ کی آوازیں رو رہ کر ابھر رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ مزاحمت توقع سے زیادہ شدید تھی۔ شروع میں میزائل فائر ہوئے تھے میں نے ہوش و حواس میں دو دھماکے سنے تھے۔ باقی یقیناً بے ہوشی کے دوران ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد گیس اور دھوئیں کے گولے پھینکے گئے ہوں گے۔ مگر یہاں ان کا اثر نہیں آیا تھا اس کے باوجود میں نے گیس ماسک پہن کر رکھا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ گیس کس نوعیت کی تھی اور میں بے خبری میں اس کا شکار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ احتیاط بہتر تھی بہ نسبت اس کے کہ میں اپنے لوگوں کی طرف سے پھینکی جانے والی گیس کا نشانہ بن جاؤں۔ اس لیے گیس ماسک مستقل منہ پر لگایا ہوا تھا۔

جو دو کمرے خالی تھے میں نے ان کا جائزہ نہیں لیا تھا اس لیے باہر نکلنے میں ناکامی کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ انہیں بھی دیکھ لوں ہو سکتا ہے مجھے کوئی راستہ مل جائے۔ میں نے ایک کمرے میں جھانکا جو مکمل طور پر خالی تھا۔ البتہ دوسرے کمرے میں مجھے ایک کام کی چیز نظر آگئی۔ یہ منرل واٹر کی بوتل جو نصف پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر سونگھا، پھر ذرا سا پانی زبان پر لے کر چکھا، مجھے لگا کہ پانی ٹھیک تھا اور اس میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ شاید یہ کسی نے پی کر یہاں رکھی تھی اور اٹھانا بھول گیا تھا۔ اصل میں یہ میرے لیے تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر چند گھونٹ پیے اور ڈھکن لگا کر بوتل ساتھ رکھ لی۔ ان چند گھونٹ سے میری پیاس بھی نہیں تھی لیکن قابو میں آگئی تھی۔

میرے پاس سیٹی تھی مگر اسے بجانے کا مطلب تھا کہ دوستوں کے ساتھ دشمن بھی ہوشیار ہو جاتے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ پہلے کون مجھ تک آتا۔ جب تک مجھے یقین نہ ہوتا کہ کرٹل کے آدی اندر آچکے ہیں اور ان کی پوزیشن مضبوط ہے تب تک میں سیٹی بجانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں اپنے قید خانے میں آیا۔ پہلے میں نے کرنٹ آف کیا اور تاریک کنج کرنا ٹیک کے منہ سے کھینچی لی۔ اس کے پاس سے جلنے جیسی بو آرہی تھی۔ میں نے سانس روکتے ہوئے اس کی کلائی سے گھڑی اتار لی۔ اس پر کچھ لوگ ناک تھا جو ای کے لباس سے رگڑ کر صاف کیا۔ گھڑی چل رہی تھی اور اس کے مطابق دو بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے گھڑی

کلائی پر باندھ لی اور باہر آیا تھا کہ میرے کانوں نے فائرنگ کے پس منظر میں ایک آواز اور سنی۔ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ میرا دل دھڑکا میری پارٹی آگئی تھی۔ وہ کنور ہیلز کی مرکزی عمارت پر حملہ کرنے والے تھے اور میں یہاں قید تھا۔ اگرچہ ہیلی کاپٹر خاصی تاخیر سے آیا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہیلی کاپٹر حملے کے پندرہ سے بیس منٹ بعد آ جاتا لیکن بنیادی شرط حالات قابو میں ہونے کی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ حالات قابو پانے میں خاصی دیر لگی اور دوسرا مطلب تھا کہ حالات قابو میں آچکے تھے بھی ہیلی کاپٹر آیا تھا۔

میں داخلی حصے کی طرف آیا مگر یہاں آگ کی تپش بہت زیادہ تھی۔ اگر اس عمارت کی تعمیر میں لکڑی یا آگ پکڑنے والی چیزوں کا زیادہ استعمال ہوتا تو آگ یقیناً پوری عمارت تک پھیل چکی ہوتی۔ پھر بھی اگلے حصے میں لگی آگ کم ہونے کے باوجود اتنی شدید تھی کہ وہاں سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں مجھے انسانی گوشت کے جلنے کی تیز بو محسوس ہوئی۔ اس حصے میں کچھ افراد تھے جو حملے کا نشانہ بنے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جیسے ہی رامن باہر نکلا تھا میزائل آکر عمارت سے ٹکرایا تھا یقیناً اسے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تو وہ کہاں تھا؟ کیا وہ مارا گیا تھا لیکن فوج کیا تھا تو اسے یہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس صورت میں وہ کہاں گیا جب کہ یہاں سے نکلنے کی بے ظاہر کوئی جگہ نہیں تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے غصے میں ٹائیک کو مار کر جلد بازی کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے پہلے میں بہت کم جذباتی ہوا اور کسی کو یوں مار دیا مگر ٹائیک نے اپنی موت پر خود سائن کیے تھے۔ اس نے سادی کے بارے میں ناقابل برداشت بکواس کی تھی۔ مجھے اپنے اقدام پر کوئی افسوس نہیں تھا اگر وہ دس بار زندہ ہوتا تو میں اسے دس بار یونہی مارتا۔

میں دوبارہ راہداری کے سرے کی طرف آیا اور اس تقریباً چوکور خانے نما حصے کا جائزہ لیا۔ اس کی یہاں کوئی تنگ نہیں بن رہی تھی۔ اس میں نہ تو سامان رکھا تھا اور نہ ہی یہ عمارت کا متناسب حصہ لگ رہا تھا۔ میں نے اب کے جھک کر فرش کا معائنہ کیا۔ یہاں بھی گرد آگئی تھی اسے ہاتھ سے صاف کیا اور ٹارچ سے روشنی ڈال کر دیکھتا رہا مگر مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ فرش کے بعد میں نے سامنے والی دیوار کا معائنہ کیا مگر یہاں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مجھے ایک خیال آیا اور میں انوسٹی کیٹھن سیل میں آیا۔ یہاں آلات تشدد میں ایک ہتھوڑے نما آلہ بھی تھا جس سے شاید ہڈیاں توڑی جاتی ہوں گی۔ وہ لے کر میں راہداری میں آیا اور وہاں فرش اور دیواریں بجا کر دیکھنے لگا۔ جب میں نے سامنے والی دیوار بجائی تو مجھے ایسا لگا جیسے یہ اتنی موٹی نہ ہو جتنی کے دوسری دیواریں تھیں۔ یہ ذرا کھوکھلے پن کا تاثر دے رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی میں اسے چیک کیا اور اس بار دیوار کی جڑوں کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ ان میں خلا تھا۔ یہ بہت باریک لائن تھی کیونکہ دیواریں اس طرح آپس میں نہیں جڑی تھیں جیسے عام طور سے دیواروں کا پلاسٹر جوڑ کر خلا بالکل ختم کر دیا جاتا ہے۔

یہاں دیوار میں چاروں طرف بہت باریک خلا تھا جو سیاہ لکیر کی صورت میں تھا۔ میں اب دیوار پر ہاتھ پھیر کر دیکھ رہا تھا۔ سامنے والی دیوار مکمل ہموار تھی۔ میں نے غلت کے بجائے اسے بہت آرام سے چیک کیا تھا۔ اس میں شاید پندرہ بیس منٹ کا وقت لگا تھا مگر میں نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ جہاں شبہ ہوتا وہاں دبا کر دیکھتا تھا۔ پھر میں نے دائیں دیوار کو اسی طرح چیک کرنا شروع کیا۔ باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں اب بہت کم رہ گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا بیشتر مزاحمت کرنے والے مارے گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب سیٹی کا استعمال کیا

جاسکتا تھا اگر کرنل اور اس کے آدمی اندر آگئے تھے تو وہ میری مدد کر سکتے تھے اور مجھے یہاں سے نکال سکتے تھے۔ ہتا نہیں باہر کیا ہو رہا تھا؟ بلی کا چرک آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنا کام کر کے واپس چلا گیا تھا۔

میں سیٹی سے کام لینے کا سوچ رہا تھا کہ میرا ہاتھ دیوار کے نچلے حصے میں کسی ابھری چیز سے ٹکرایا، میں نے روشنی ڈال کر دیکھا۔ یہ دیوار کا ہم رنگ ٹکڑا تھا اور اتنی مہارت سے رنگ کیا گیا تھا کہ دیکھنے میں مشکل سے ہی پتا چل رہا تھا۔ میں نے اسے دبا یا تو یہ کسی بٹن کی طرح دبا اور چھوڑنے پر دوبارہ ابھر گیا۔ اس کا انداز ڈوئل بٹن جیسا تھا جو آن اور آف دونوں کا کام کرتا ہے۔ ایک بار دبانے پر کچھ نہیں ہوا تھا میں نے اسے دوبارہ دبایا۔ اس بار بھی کچھ نہیں ہوا۔ پھر میں نے اسے لگا تار دو بار دبایا۔ چند لمبے انتظار کیا اور اس بار بھی مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے جھک کر اس کا معائنہ کیا۔ یہ دیوار کا کوئی خراب حصہ نہیں تھا یہ جس طرح دب رہا اور دوبارہ ابھر رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا اسے خاص طور سے بنایا گیا تھا۔ اگلی بار میں نے سیکنڈ کا حساب ذہن میں رکھتے ہوئے اسے وقفے وقفے سے تین بار دبایا اور اس بار مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار ایک ہلکی سی سنسناتی آواز کے ساتھ پیچھے کی طرف اٹھنے لگی۔ اس کے نچلے حصے سے پہلے ہلکی سی روشنی اور پھر بیڑھیاں نمودار ہونے لگیں۔

یہ وہ خفیہ راستہ تھا جسے میں تقریباً آدھے گھنٹے سے تلاش کر رہا تھا۔ گھڑی کے مطابق رات کے تین بج رہے تھے۔ حملہ شروع ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ دیوار اٹھ کر اوپر ہو گئی تھی۔ میں نے رائفل سامنے کی اور دبے قدموں سر جھکا کر بیڑھیوں تک آیا۔ بیڑھیاں نیچے ایک سرنگ تک جاری تھیں۔ اس پتلی سی سرنگ کے دونوں طرف صرف دیوار تھی۔ اس سے آگے کیا تھا یہ جاننے کے لیے نیچے جانا ضروری تھا۔ میں نے ایک لمبے کوسوچا اور نیچے اترنے لگا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اسی ابھار کو تین بار دبایا تو خفیہ راستہ بند ہونے لگا اور کچھ دیر بعد وہاں صرف دیوار تھی۔ میں عمارت کے باہر والے حصے میں ممکنہ حد تک واپس آیا۔ جہاں آگ کی تپش قابل برداشت تھی اور میں نے ایک گہری سانس لے کر منہ سے گیس ماسک اتار کر سیٹی منہ میں دبائی اور پوری قوت سے بجائی۔ اس مشکل سے دواغج کی سیٹی سے ایسی مع خراش اور جھپتی ہوئی آواز برآمد ہوئی کہ مجھے کانوں پر ہاتھ رکھنے پڑے تھے۔ جہاں تک ممکن ہوا میں نے سیٹی بجائی اور پھر گیس ماسک منہ پر لے کر اپنی سانس بحال کی اور اسی طرح دوبارہ سیٹی بجائی۔ مجھے یقین تھا اگر کنور بلیس میں کرنل اور اس کے آدمی داخل ہو چکے تھے تو انہوں نے لازمی سیٹی کی آواز سن لی ہوگی۔

میں واپس آیا اور خفیہ راستہ کھولا پھر ہتھوڑی بیڑھیوں پر اس طرح رکھی کہ اگر خفیہ راستہ بند ہونے لگے تو یہ اسے مکمل طور پر بند نہ ہونے دے۔ میں دبے قدموں اتر کر نیچے آیا۔ بیڑھیوں کے آخر میں تقریباً سات فٹ اونچی چھت پر ایک چھوٹا سرخ روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ سرنگ اور راستہ باقاعدہ کنکریٹ سے تیار کیا گیا تھا۔ نیچے آتے ہی مجھے کوئی دس گز کے بعد سرنگ دائیں بائیں مڑتی دکھائی دی۔ میں نے دیواروں اور چھت کا بغور جائزہ لیا اور مجھے کوئی مشکوک چیز نظر نہیں آئی جسے کیمرہ اقرار دیا جاسکتا۔ میں آگے بڑھا تھا کہ عقب سے ہلکی سی ویسی ہی سنسناتی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا راستہ بند ہو رہا تھا۔ دیوار شاید ہائیڈرو لک سسٹم سے کھلتی اور بند ہوتی تھی۔ تقریباً چھ بالی ڈھائی فٹ کی اور چھ اونچ موٹی اس دیوار کا وزن ایک ٹن تو ہو گا اور اسے صرف ہائیڈرو لک سے ہی کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہتھوڑی تک پہنچی اور پھر پھنس کر رک گئی۔ ایک دو لمبے کوزور لگایا تو

ہتھوڑی بالکل فکس ہوگئی اور اب راستہ بند نہیں ہو سکتا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ اب کرل یا اس کے آدمی عمارت میں آتے تو وہ اس خفیہ راستے کو دیکھ لیتے۔ اگر وہ بلاک ہو گیا تھا تب بھی اسے کھولنا کوئی مشکل نہیں تھا ایک چھوٹا نامم بم اسے اڑا دیتا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میں نے فتح خان سے یہ بم نہیں لیے تھے کیونکہ میں ان کا ماہر نہیں تھا۔ مگر میرے پاس ہینڈ گریڈ تھا اور میں اس سے یہی کام لے سکتا تھا۔

میں سرنگ کے موڑ تک آیا۔ خود جھانک کر دیکھنے کے بجائے میں نے گھڑی اتار کر اس کا ڈائل کنارے سے نکالا اور دائیں طرف دیکھا۔ مجھے یہاں بھی ویسی ہی ایک لمبی سرنگ دکھائی دی جو آگے جا کر مڑ رہی تھی۔ بائیں طرف سرنگ پھر دھڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کنور پیلس کی مختلف عمارتوں کو ملانے والی خفیہ سرنگوں میں ہوں۔ راج کنور یا فشی دل جی نے ان سرنگوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ راج کنور نے شاید اس لیے نہیں بتایا کہ میں نے اس سے ان سرنگوں کے بارے میں پوچھا نہیں تھا ورنہ وہ دوا کے زیر اثر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ البتہ فشی دل جی نے سرنگوں کے بارے میں نہ بتا کر صرف یاد دینا ہی کا ثبوت دیا تھا۔ ورنہ ان سرنگوں سے ہمیں حملے میں بہت مدد مل سکتی تھی۔ اگر ہم کسی طرح ان تک رسائی حاصل کر لیتے تو دوسری عمارتوں تک محفوظ طریقے سے پہنچا جا سکتا تھا۔

فشی دل جی نے آخر ان سرنگوں کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟ اس سے اس کا کیا مفاد وابستہ تھا؟ میں سوچ رہا تھا۔ اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں آگے جاؤں اور جاؤں تو کس طرف جاؤں؟ یہ فیصلہ کرنے میں چند سیکنڈ لگے کہ مجھے سرنگ میں ہی آگے جانا تھا مگر کس طرف جانا تھا یہ سوچنے میں کچھ دقت لگا۔ میں نے قید خانے کا نقشہ ذہن میں تازہ کیا۔ یہ کنور پیلس کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بائیں طرف واقع تھا۔ کنوروں کی رہائشی عمارت احاطے کے آخری حصے میں اور کسی قدر دائیں طرف تھی۔ گویا مجھے سرنگ میں دائیں طرف جانا تھا۔ ڈیجیٹل میپ نہ ہونے سے میری بچت بھی ہوئی تھی اور رامن کو شک نہیں ہوا تھا لیکن اس کے نہ ہونے سے مجھے اب دشواری ہو رہی تھی ورنہ اس کی مدد سے میں بہت آسانی سے مرکزی عمارت تک پہنچ سکتا تھا۔

آگے بڑھتے ہوئے میں نے رائفل کا رخ سامنے کی طرف رکھا اور میری انگلی ٹریگر پر تیار تھی۔ میں بالکل تیار تھا کہ کسی فرد سے سامنا ہوتے ہی اسے شوٹ کر دوں اگر وہ مسلح ہو تو..... دوسری صورت میں، میں اسے ہینڈز آپ کر کے اس سے معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ سرنگ آگے مڑ رہی تھی۔ میں تقریباً تیس گز آگے آیا تھا۔ اس پوری سرنگ میں ہر دس گز کے بعد اسی طرح کے سرخ روشنی والے بلب لگے ہوئے تھے اور ان کی روشنی اگرچہ بہت تیز نہیں تھی لیکن وہ سرنگ کو یکساں طور پر روشن کر رہی تھی۔ میں نے مڑنے سے پہلے پھر گھڑی کے ہتھکے کی مدد لی اور دوسری طرف دیکھا۔ یہاں سرنگ سیدھی چل رہی تھی لیکن جب میں اس سرنگ میں داخل ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ بالکل سیدھی بھی نہیں تھی اس میں دائیں بائیں راستے نکل رہے تھے۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ سرنگ مرکزی عمارت کی طرف ہی بڑھ رہی تھی۔ میں بائیں طرف نکلنے والی سرنگ تک آیا۔ اس میں جھانک کر دیکھا یہ خالی تھی اور آگے جا کر گھوم رہی تھی۔

اسے چھوڑ کر میں آگے آیا اور دائیں طرف نکلنے والی سرنگ میں جھانکا تو کوئی دس گز بعد سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ میں سیڑھیوں تک آیا۔ یہاں ویسا ہی خفیہ دروازہ تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں پیلس کی کسی وسطی عمارت

کے نیچے تھا۔ مجھے مرکزی عمارت تک جانا تھا اس لیے میں اس حصے کو نظر انداز کر کے آگے جانے والا تھا کہ وہی سنسناتی آواز آئی اور دیوار اٹھنے لگی تھی۔ میں پلٹ کر واپس بھاگا اور سرگم میں آکر پوزیشن لے لی۔ دیوار اوپر اٹھنے ہی کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ بیجانی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”حملہ کرنے والے بہت لوگ ہیں ہمارے اکثر گارڈ ز مارے جا چکے ہیں۔ اس جگہ سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ہے۔ ہمیں فوراً نکلتا ہوگا ورنہ یہی جگہ ششمان گھاٹ بن جائے گی۔“

”کیا یہ ہو رہا ہے؟“ میں نے رامن کی دھاڑنے کی آواز سنی۔ ”راستہ کس نے کھولا ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔ میری توقع کے عین مطابق رامن زندہ تھا اور وہ یقیناً اسی خفیہ راستے سے نکل گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے بیجانی لہجے میں بولنے والا اب منمنارہا تھا۔ ”وہ اندر آنے والے ہیں.....“

”کہاں سے۔“ رامن بولا۔ ”جب ہم باہر نہیں جاسکتے تو وہ اندر کیسے آئیں گے۔ تم نے دوسرے لوگوں کے سامنے بلا اجازت دروازہ کھولا ہے۔“ کہتے ہوئے رامن کا لہجہ خوفناک ہو گیا تھا۔

”باس مجھے معاف کر دو۔“ دوسرا شخص چلایا مگر فار کی آواز میں اس کی آواز دب گئی۔

”راستہ بند کر دو۔“ رامن نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب کسی نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ بھی کتے کی موت مرے گا۔“

سنسنائی کی آواز آئی اور دیوار واپس اپنی جگہ فکس ہو گئی۔ میرے تینے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ ورنہ میں آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اس واقعے سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے اوپر کی صورت حال کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا۔ میزائل چلانے والوں نے اپنا کام کر لیا تھا اور انہوں نے اس عمارت کے داخلی راستے کو بھی اڑا دیا تھا۔ کرنل کے آدمی اندر داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے کنور پیلس میں مضبوط پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ بیشتر گارڈ ز مارے گئے تھے اور بچنے والے یقیناً مقابلے کے قابل نہیں رہے تھے لیکن مرکزی عمارت میں کیا ہو رہا تھا اس کا کچھ ذکر نہیں تھا۔ شاید رامن خود بھی بے خبر تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جب آمدورفت کے لیے یہ خفیہ سرگم موجود تھی تو وہ لوگ عمارتوں میں کیوں محصور تھے۔ یقیناً یہ سرگم کہیں اور باہر بھی نکلتی ہوگی؟ میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں جلد از جلد مرکزی عمارت تک پہنچنا چاہتا تھا۔

زیر زمین ان سرنگوں کا نظام بہت وسیع اور طویل تھا اور اس کی تعمیر میں یقیناً بہت وقت اور بہت بڑی رقم لگی ہوگی۔ لیکن اصل اہمیت اس کی رازداری کی تھی۔ اسے بناتے ہوئے یقیناً پوری رازداری سے کام لیا ہوگا اور صرف مخصوص اشخاص ہی اس کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ لیکن اگر یہ سرنگیں ہنگامی حالات کے لیے بنائی گئی تھیں تو اس وقت ان کا استعمال کیوں نہیں کیا جا رہا تھا؟ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اپنے اندازے کے مطابق میں تقریباً نصف کلومیٹر آگے نکل آیا تھا۔ سرگم کئی بار گھومی لیکن مجموعی طور پر اس کا رخ کنور پیلس کی مرکزی عمارت کی طرف ہی تھا۔ اس سفر کے دوران میں پوری طرح چوکنا رہا تھا کیونکہ اس بند سرگم میں کسی وقت بھی دشمن کا سامنا ہو سکتا تھا اور یہاں بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی جو دار میں پہل کر تا وہی کامیاب رہتا۔

اس لیے جیسے ہی ایک راستے سے دو مسلح افراد برآمد ہوئے میرا چوکنا ہونا کام آیا۔ وہ مسلح تھے اور پیلس

کے گارڈز کی وردیوں میں تھے۔ انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا کہ میں نے رائفل کو ہلکی سی جنبش کے ساتھ برسٹ مارا۔ میں نے جان کر ان کے جسم کے نچلے حصوں کا نشانہ لیا تھا۔ مگر ان میں سے ایک کی قضا آئی تھی اس نے نیچے گر کر بجنے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں گولیاں اس کے سینے اور گردن کے پار ہو گئیں۔ دوسرے کا ایک پاؤں نشانہ بنا تھا۔ وہ چیخ کر گرا تھا مگر اس کی چیخ محدود جگہ فائرنگ کے بے پناہ شور میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں رائفل تانے تیز قدموں سے ان کی طرف بڑھا۔ پہلا والا دم توڑ رہا تھا لیکن دوسرا والا اپنی رائفل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پستول نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ پر گولی ماری۔ اس نے کراہ کر رائفل چھوڑی اور اپنا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے لات مار کر اس کی رائفل دور پھینک دی اور رائفل اس کے سر سے لگاتے ہوئے کہا۔

”اب حرکت مت کرتا۔“

وہ خوف سے ساکت ہو گیا۔ ”کون ہو تم، اوپر والوں کے ساتھی ہو؟“

”ہاں، تم کہاں سے نیچے آئے ہو؟“

وہ صاف اردو بول رہا تھا اور شکل صورت سے بھی شمالی انڈیا کا رہنے والا لگ رہا تھا۔ اس نے ہلنے کی کوشش کی تو میں نے رائفل اس کے سر سے لگائی تو وہ پھر ساکت ہو گیا تھا۔

”مین پیلس سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں نیچے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

”کس نے حکم دیا ہے؟“

”بڑے کنور نے۔“ اس نے جواب دیا۔

میرے اندر خدشات سرسرانے لگے تھے۔ ”بڑا کنور کہاں ہے؟“

”ابھی اوپر ہے لیکن جلد وہ نیچے آئے گا۔“

”اس کے ساتھ اور کون ہے؟“

”اس کی بہن اور اس کے خاص محافظ۔“ آدمی نے جواب دیا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مکمل تعاون

کر رہا تھا۔ ”کچھ اوپر اترنے والوں کو روک رہے ہیں اور کچھ بڑے کنور کے ساتھ ہیں۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیٹو اور اس کے ساتھی استقامت سے نیچے آنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کے دباؤ کی وجہ سے بڑا کنور نیچے آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے اور پیلس والے ڈیڑھ گھنٹے سے مزاحمت کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے ہمارا پلان تاخیر کا شکار تھا اور اگر ہم بلی کا پٹر فضا میں رکھتے تو اب وہ ایندھن کی کمی کی وجہ سے واپس جا چکا ہوتا اور ہماری واپسی کا سفر کھٹائی میں پڑ جاتا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ نیچے کہاں آئیں گے؟“

”یہاں ایک سیف ہاؤس ہے۔“ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اس میں صرف

مخصوص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ ہم اس میں نہیں جا سکتے۔“

میرے اندر پھر کھنٹی بجنے لگی۔ بڑا کنور سادی کو لے کر کسی سیف ہاؤس میں جانے کی تیاری کر رہا تھا اور وہ ایک بار اس میں داخل ہو جاتا تو پھر اسے وہاں سے نکالنا شاید ممکن نہ ہوتا۔ ”یہ سیف ہاؤس کہاں ہے؟“

”مین پیلس کے عین نیچے، یہی سرنگ اس طرف جاتی ہے۔“

”آگے اور مسلح افراد ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”لازمی ہوں گے۔“

”تمہارا شکر یہ۔“ میں نے کہا اور اس کے سر پر رائل کا دستہ مارا۔ اگرچہ یہ دھات کا نہیں تھا مگر مضبوطی اور سختی میں دھات سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک ہی ضرب میں بے ہوش ہو گیا۔ یہ بات یقینی تھی کہ سرنگ میں فائرنگ کا شور ہر جگہ پہنچا ہو گا۔ مگر فوری طور پر یہ اندازہ کرنا مشکل ہو گا کہ فائرنگ کہاں ہوئی ہے اور مجھے ملنے والی اس مہلت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ اب سرنگ سیدھی تھی۔ مگر یہ ایک جگہ پہنچ کر اچانک ہی ڈھلان کی صورت میں نیچے گئی تھی۔ تیزی کی وجہ سے میں رکتے رکتے بھی پھسل کر آگے چلا گیا تھا۔ یہاں سرنگ کا اختتام ایک کسی قدر بڑے اور گول ساخت والے کمرے میں ہو رہا تھا اور اس سے ایک طرف ویسی ہی میڑھیاں اوپر جاری تھیں جیسی کہ میں ہر جگہ دیکھتا آیا تھا۔ میں یقیناً مین پیلس کے نیچے پہنچ گیا تھا کیونکہ یہاں سے آگے کوئی سرنگ نہیں جاری تھی۔ البتہ ایک طرف بڑا سا فولادی دروازہ لگا ہوا تھا اور اس کی ساخت سیف روم کے دروازے جیسی تھی۔ کیا یہی سیف ہاؤس تھا۔ میں نے پاس جا کر اس کا جائزہ لیا۔ اس پر کہیں کوئی نمبر یا چابی سے کھلنے والا تالا نہیں تھا حتیٰ کہ اس پر کوئی گھمانے یا پکڑنے والا ہینڈل بھی نہیں تھا۔ یہ بے داغ چاندی سے چمکتے رنگ کا سپاٹ دروازہ تھا جس نے تقریباً اس پوری دیوار کو گھیر لیا تھا۔ تقریباً آٹھ فٹ قطر کے اس دھاتی دروازے کی موٹائی معلوم تھی کیونکہ وہ دیوار میں فکس تھا لیکن اگر یہ سیف ہاؤس کا دروازہ تھا تو اسے کسی بڑے بنک کے اسٹرائک روم کے دروازے جتنا موٹا اور مضبوط ہونا چاہیے تھا۔

میڑھیوں کے اوپر والا دروازہ بند تھا۔ میں دے قدموں اوپر آیا اور اندر سے اس کا جائزہ لیا کہ یہ کہاں سے کھل سکتا تھا؟ مگر اندر بھی اس کے کھولنے کا میکینزم خفیہ ہی تھا اور اسے تلاش کرنا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا میرے پاس اتنا وقت ہے۔ اگر میرے ساتھی جھٹ تک پہنچنے میں کامیاب رہے تھے تو جلد وہ نیچے کارخ کرتے اور بڑا کنوران سے نیچنے کے لیے سادی سمیت سیف ہاؤس میں جانے کے لیے نیچے آتا۔ یعنی یہ راستہ کسی وقت بھی کھل سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور ٹرائی کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ دروازہ بہت تیزی سے نہیں کھلتا تھا اگر یہ اچانک بھی کھلنے لگتا تو مجھے اتنی مہلت ضرور ملتی کہ میں نیچے پہنچ کر مرور چہ سنبھال لیتا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ پھیر کر وہ مخصوص ابھار تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا جسے دبانے سے یہ دروازہ کھلتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں بھی دیوار کی جڑ کے پاس ہو گا مگر دونوں طرف دیواروں پر نیچے ٹپن نہیں ملا۔

پھر میں نے درمیان اور اوپر کی دیوار پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد میں نے ہار مان لی۔ شاید اس دروازے کا ٹپن کہیں اور تھا۔ یعنی پیچھے سرنگ میں کہیں اور تھا اور ظاہر ہے اتنی وسیع جگہ پر میں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ میں مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔ زیادہ دیر میڑھیوں پر رہنے میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی عقب سے آتا تو مجھے پتہ نہیں چلتا اور وہ آرام سے مجھے ہینڈ زاپ کرا لیتا یا شوٹ کر دیتا۔ اب مجھے دو طرف کی نگرانی کرنی تھی۔ سادی کے بارے میں جان لینے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ میں یہاں سے ہٹتا۔ میں ساری عمر بھی اس جگہ اس کا انتظار کر سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا جلد یا بدیر بڑا کنورا سے لے کر یہاں کارخ کرے گا اور میں اسے قابو میں کر کے سادی کو لے کر نکل سکوں گا یا کم سے کم اس کی کوشش کر سکوں گا۔ کیونکہ اس آدمی نے بتایا تھا کہ بڑے کنور کے

ساتھ اس کے خاص محافظ بھی ہوں گے۔ ظاہر ہے وہ مجھے اتنی آسانی سے کامیاب ہونے نہیں دیں گے۔ مجھے خیال آیا کہ میں واپس جا کر کسی عمارت سے باہر نکلوں اور کرٹل کے آدمیوں کو اس راستے سے اندر لے آؤں۔ ہم زیادہ ہوں گے تو آسانی سے بڑے کنور کے آدمیوں پر قابو پالیں گے۔ مگر مجھے اس خوف نے باز رکھا کہ کہیں میں جاؤں اور اس دوران میں بڑا کنور سادی کو لے کر اس سیف ہاؤس میں چلا جائے۔ سیف ہاؤس اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا اسے کسی نہ کسی طرح کھولا جاسکتا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ اس سیف ہاؤس سے کوئی راستہ کنور پیلس سے باہر جاتا ہو اور بڑا کنور سادی کو لے کر اس راستے سے فرار ہو جائے۔ سیف ہاؤس کا دروازہ کھولنے میں کچھ وقت تو لگتا۔ میں قید خانے والی عمارت کا خفیہ دروازہ کھلا چھوڑ کر آیا تھا پھر میں نے سیٹی بجا کر کرٹل کے آدمیوں کو خبردار کیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ اگر وہ اندر آچکے تھے اور پوری طرح صورت حال پر قابو پا چکے تھے تو انہیں اب تک یہاں آ جانا چاہیے تھا۔

میرے اندر رہ کر یہ خدشہ سرا بھار رہا تھا کہ باہر کرٹل حالات پر پوری طرح قابو نہیں پاسکا تھا اور اس کے آدمی بھی مارے گئے تھے۔ اندر گارڈز تعداد میں کہیں زیادہ تھے۔ وہ تعداد میں حملہ آوروں سے کم سے کم پانچ گنا زیادہ تھے۔ اگر ان کی خاصی تعداد ابتدائی حملے کا شکار ہوئی تھی تب بھی بہت بڑی تعداد مدافعت کے لیے باقی رہی ہوگی۔ فرض کر لیا جائے کہ کرٹل کے آدمیوں کا جانی نقصان درجن سے اوپر جاتا ہے تو اس صورت میں افرادی قوت کی کمی اسے دفاعی پوزیشن میں لے آئے گی۔ اس صورت میں سادی کو بذریعہ ہیلی کاپٹر یہاں سے نکالنے کا کام خطرے میں پڑ جاتا۔ کنور پیلس کے گارڈز کے پاس ایسے ہتھیاروں کی موجودگی عین ممکن تھی جس سے ہیلی کاپٹر گرایا جاسکے یا اسے نقصان پہنچا کر پرواز سے روکا جاسکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اس خدشے میں اضافہ ہو رہا تھا۔

کرٹل اور میں نے اپنے طور پر بہت اچھا اور ہر پہلو کا جائزہ لے کر حملے کا پلان بنایا تھا مگر کوئی بھی پلان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے اور تب ہی اس کی خوبیاں اور خامیاں سامنے آتی ہیں۔ ممکن ہے ہم نے کنور پیلس کے حفاظتی انتظامات کا اتنا اچھا اندازہ نہ لگایا ہو جتنا اچھا لگانا چاہیے تھا اور کنور پیلس کے گارڈز ہمارے اندازے سے بڑھ کر مسلح اور چوکس ہوں۔ انہوں نے حالات کو مکمل طور پر اپنے قابو سے نکلنے نہ دیا ہو۔ وہ گیس اور دھوئیں سے نمٹنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ یہ کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ آج کل سیکورٹی کے معمولی ماہرین بھی جانتے ہیں کہ کسی محفوظ جگہ کن طریقوں سے حملہ کیا جاسکتا ہے اور ان سے کس طرح نمٹا جاسکتا ہے۔ دور مار ہتھیاروں کو شیلٹر اور بلٹ پروف کی مدد سے بے کار کیا جاسکتا ہے۔ گیس اور دھوئیں سے ماسک کی مدد سے بچا جاسکتا ہے۔ نائٹ ویژن سے اندھیرے میں بھی آنے والے دشمن کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے لیے پہلے سے بونی ٹریپ تیار کیے جاسکتے ہیں۔ جیسے ڈیوڈ شانے کیے تھے اس نے اسناہر گن لگائی تھی۔ ایسا ہی کوئی حربہ کنور پیلس میں بھی ہو سکتا تھا جو کرٹل اور اس کے آدمیوں کے لیے حیران کن ہو۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرے اضطراب میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ کیا اور پیلس کے گارڈز نے صورت حال پر قابو پالیا تھا جس کی وجہ سے اب بڑے کنور کو سیف ہاؤس میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ اوپر جا کر رٹن تلاش کرنے کی کوشش کی مگر اس بار بھی ناکام رہا۔ میں لامحدود وقت کے لیے

یہاں نہیں رہ سکتا تھا مجھے کچھ اور کرنا تھا۔ اگر میں یہاں سے اوپر نہیں جاسکتا تھا تو مجھے دوسرے طریقے سے اوپر جانا تھا۔ ایک چیز اور قابل غور تھی کہ میں نے یہاں فائرنگ کی لیکن اب تک کسی طرف سے رد عمل سامنے نہیں آیا تھا کیا یہاں صرف یہی دو افراد نیچے تھے۔ انہیں بھی بڑے کنور نے بھیجا تھا۔ یہ سرنگیں بنائی ہی خاص حالات کے لیے گئی تھیں اور آج سے زیادہ خاص حالات اور کیا ہو سکتے تھے مگر انہیں استعمال نہیں کیا جا رہا تھا۔ اس کے بجائے رامن نے اپنے ایک آدمی کو شوٹ کر دیا کہ اس نے خفیہ سرنگ کا راستہ کیوں کھولا تھا۔ گویا کسی کو بھی نیچے آنے کی اجازت نہیں تھی اور شاید کسی بھی عمارت میں موجود فرد کو نیچے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں نشان دہی کر رہی تھیں کہ سب ہمارے پلان کے مطابق نہیں ہو رہا ہے اس میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی یا کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی تھی۔ میرا ذہن رہ رہ کر منشی دل جی کی طرف جا رہا تھا۔ ڈیوڈ شانے اس پر اعتماد کر لیا کیونکہ وہ اس سے ناواقف تھا دوسرے اس پر اعتماد کرنے سے ڈیوڈ شاکو کوئی بڑا نقصان نہیں ہوتا لیکن میرے لیے یہ بہت ہی اہم مرحلہ تھا۔ ڈیوڈ شانے کا پیڑ مجھ سے معذرت کر لیتا اور مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کوئی نیا طریقہ اختیار کرتا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی مرشد کا کارڈ تھا۔ مگر میں ناکامی کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پونے چار بجے میں نے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں واپس آیا اور اس جگہ پہنچا جہاں دونوں گارڈ پڑے تھے۔ جسے بے ہوش کیا تھا وہ بھی ساکت پڑا تھا۔ میں ان کے خون سے بچتا ہوا آگے آیا۔ میں ذہن میں کنور پیلس کا نقشہ تازہ کر رہا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ذرا آگے جو سرنگیں دائیں بائیں نکل رہی تھیں وہ کن عمارتوں میں جا رہی تھیں۔ رامن جس عمارت میں تھا اس میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر میں نے قید خانے والی عمارت میں جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ مسئلہ پھر وہی ہوتا کہ میں اندر سے راستہ کیسے کھولتا۔ اگر میں گرینیڈ سے راستہ بناتا تو اندر موجود لوگ ہوشیار ہو جاتے۔ قید خانے والے دروازے کو نہ کھلنے کی صورت میں گرینیڈ سے بھی اڑایا جاسکتا تھا۔ میں سرنگ کے اس حصے تک آیا اور سیڑھیوں کے پاس آکر رکا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہتھوڑی غائب تھی۔ میں چونکنا ہو گیا۔ کوئی یہاں آیا تھا اور اسی نے ہتھوڑی ہٹا کر راستہ کھولا تھا۔ میں دبے قدموں اوپر آیا۔ وہاں سنا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جو بھی تھا یا تھے وہ خاموش تھے۔ میں نے کنارے سے راہداری میں جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر آگے بڑھا اور فوراً ہی مجھے انٹیر وگیشن روم میں کپی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ رامن تھا اور جھک کر ٹائیک کا معائنہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ زیر لب گالیاں دے رہا تھا۔ مگر اس کا ہدف غیر واضح تھا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کیا اور اس کا بولٹ چڑھایا تو اس کی آواز پر وہ ساکت ہو گیا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”شہباز.....“

”دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لو اگر ٹائیک کے پاس نہیں جانا چاہتے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے لاچوں و چراغ کی۔ وہ عقل مند آدمی تھا سمجھ گیا کہ اس وقت وہ بے بس ہے۔ میں اندر آیا۔ یہاں کا بلب اب جی ٹنٹا رہا تھا۔

”تم نے ٹائیک کو مار دیا؟ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔“

”ہاں، یہ اسی انجام کا مستحق تھا اور اب تم گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔“

اس بار بھی اس نے قہقہہ کی۔ میں نے رائفل شانے سے لٹکا کر پستول نکال کر اس کے سر سے لگایا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس ایک پستول تھا میں نے اسے نکال کر جیکٹ میں رکھ لیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس سے سینے پر نیام میں لگا ہوا راپوری خنجر برآمد ہوا تھا۔ میں نے اسے پتلون میں موجود خنجر کی جگہ اڑس لیا۔ پھر میں پیچھے ہٹا۔ ”راسن تم جانتے ہو میں نے تمہیں دیکھتے ہی شوٹ کیوں نہیں کیا؟“

”ہاں تم مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتے ہو گے۔“

”تم عقل مند ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میں جانا چاہتا ہوں باہر کیا ہو رہا ہے؟“

”مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ کچھ لوگ اندر گھس آئے ہیں اور ہمارے گارڈز ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ کیا

وہ تمہارے آدمی ہیں؟“

”سوال مجھے کرنے ہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں صرف جواب دینے ہیں۔ اس وقت کیا

پوزیشن ہے؟“

”ہمارے گارڈز نے کچھ جگہوں پر مورچے بنا لیے ہیں اور وہ مقابلہ کر رہے ہیں۔“

”مرکزی پیلس کی کیا صورت حال ہے؟“

”اس پر پہلی کا پٹر سے کچھ لوگ اترے ہیں لیکن وہ دوسری منزل تک ہیں ان کو نیچے آنے سے روکا ہوا

ہے۔“

راسن روانی سے اور بغیر انکے جواب دے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ سچ بول رہا تھا ویسے بھی میرا

اندازہ یہی تھا۔ اس نے تصدیق کی تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”راسن یہ تو سامنے کی کنڈیشن ہے میری چھٹی

حس کہہ رہی ہے اس کے پس پردہ بھی یہاں کچھ چل رہا ہے اور تم اس میں شامل ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے..... میں بھی تمہاری طرح محصور ہوں۔“

”یہاں عمارتوں میں گارڈز موجود ہیں۔ حملہ آوروں کے خلاف انہیں کیوں استعمال نہیں کیا گیا ہے جب

کہ یہ تمہاری ذمہ داری بنتی ہے۔“

”تمام عمارتوں کے داخلی راستے میزائلوں سے تباہ کر دیئے گئے ہیں جیسے اس عمارت کے ہیں اس وقت

باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”جھوٹ مت بولو..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر عمارت کا ایک ہی راستہ ہو..... پھر یہ سرنگیں کہیں نہ کہیں

باہر نکلتی ہوں گی۔ ان کو کیوں استعمال نہیں کیا گیا؟“

”مجھے نہیں معلوم تم کیا کہہ رہے ہو۔“ اس نے بے نیازی دکھانے کی کوشش کی لیکن اس کے لہجے میں

تشویش مجھ سے چھپی نہیں رہی تھی۔

”اگر میں نے تمہارے پیروں میں سوراخ کیے تو تم بہت اچھی طرح جان جاؤ گے کہ میں کیا کہہ رہا

ہوں۔ یہاں اتنے بڑے ہنگامے ہو رہے ہیں اور تم نے ہنگامی حالات کے لیے بنائی جانے والی سرنگ بالکل

استعمال نہیں کی ہے۔“

”بڑے کنور کے حکم سے۔“

”تمہیں بڑے کنور کا اتنا خیال ہے اور تم نے اسے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ میں تمہارے قبضے میں آ گیا ہوں۔“

”وہ الگ بات ہے، میں اپنے طور پر تم سے نفی کرنا چاہتا تھا، اس کے بعد تمہیں بڑے کنور کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔“ اس نے چالاکی سے کہا۔

”یہاں سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ ہونا چاہیے۔“

”راستہ ہے لیکن ہمیں باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”راستہ کہاں ہے؟“

”اوپر ایک باغ میں نکلتا ہے لیکن وہاں اس وقت کوئی نہیں جاسکتا، وہاں پبلک کے خاص گارڈز موجود ہیں جو براہ راست بڑے کنور سے حکم لیتے ہیں وہ میرے انڈر نہیں ہیں۔“

”راسن تم پھر کچھ چھپا رہے ہو۔“ میں نے پستول اس کے سر کی طرف سیدھا کیا۔ ”افسوس کہ تم نے اپنی جان کی درست قیمت ادا نہیں کی۔“

”تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور ٹریگر دبانا چاہتا تھا کہ دروازے پر ایک مسلح شخص نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے ایک طرف چھلانگ لگائی اور اس کا چلایا ہوا برسٹ اس جگہ سے گزرا جہاں ایک لمبے پہلے میں تھا۔ میں پہلو کے بل لمبے پر گرا۔ یہاں پاس ہی کمرے کا فولادی گیٹ اس طرح پڑا تھا کہ اس کا ایک پہلو اٹھا ہونے کی وجہ سے ذرا آڑ بن گئی تھی اور میں بروقت اس آڑ میں سرکا۔ دوسرا برسٹ دروازے پر لگا اور میں نے آڑ سے ہاتھ نکال کر دروازے کی طرف فائر کیا۔ مسلح شخص جھٹکے سے پیچھے گیا۔ پتا نہیں اسے گولی لگی تھی۔ جب تک میں رائل شائے سے اتار کر کھڑا ہوتا۔ راسن غائب ہو گیا تھا۔ وہ مکار آدمی اس ذرا سے موقع سے فائدہ اٹھا کر نکل گیا تھا بس ایک لمبے کی دیر ہو جاتی تو میں اس کے شیطانی دماغ میں گولی اتار چکا ہوتا۔ مگر اس کی موت نہیں آئی تھی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ ایک لمبے کو جھانک کر دیکھا اور سر اندر کر لیا۔ راہداری خالی تھی۔ پھر خفیہ دروازہ بند ہونے کی سننا ہٹ سنائی دی۔ لیکن میں نے اندھا دھند باہر آنے سے گریز کیا۔ اس کے بجائے میں نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔

”راسن میں تین تک گنوں گا اور گرینیڈ پھینک دوں گا۔ ایک..... دو..... تین.....“ تین کہتے ہی میں نے گرینیڈ کے بجائے کنکریٹ کا ایک ٹکڑا اس طرف اچھالا اور کسی نے گھٹی گھٹی سی آواز نکالی۔ میں بال بال بچا تھا۔ راسن اور اس کا ساتھی گھات لگائے بیٹھے تھے اور اگر میں اندھا دھند راہداری میں آتا تو مارا جاتا۔ اس بار میں نے بغیر کسی وارننگ کے گیس گرینیڈ اس طرف اچھال دیا۔ بند جگہ ہونے کی وجہ سے گیس تیزی سے پھیلی تھی۔ کسی کے کھانسنے کی آواز آئی اور میں دبے قدموں آگے بڑھا۔ وہی آدمی چلایا۔

”دروازہ کھولو۔“

ایسا لگ رہا تھا کہ راسن اسے چھوڑ کر نیچے اتر گیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مسلح آدمی زمین پر پڑا ہاتھ

پاؤں مار رہا تھا۔ گیس نے اس کا دم گھونٹ دیا تھا۔ میں گیس ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ میں نے تیزی سے خفیہ دروازہ کھولنے والا بین تین بار دبایا مگر دروازہ نہیں کھلا۔ میں نے دو تین بار بین دبایا مگر اس بار دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا رامن نے اندر سے کوئی کل چھیڑی تھی اور اس سے دروازہ اب باہر سے نہیں کھل سکتا تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں نہیں رک سکتا تھا ورنہ گیس کی زیادتی سے ماسک کا فلٹر ناکارہ بھی ہو سکتا تھا۔ میں واپس آیا اور عمارت کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا۔ آگ بجھ گئی تھی مگر دہاں زمین اور گرا ہوا ملبادہک رہا تھا اس پر سے ہو کر گزرنے ناممکن نہیں تھا۔ میں نے سامنے والے کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے کی دیواریں مکمل طور پر گرنے سے راستہ بن گیا تھا مگر اس کا دروازہ میزھا ہو کر پھنس گیا تھا اسے کھولے بغیر باہر جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ایک گرینینڈ نکالا اور اس کی چابی نکال کر اسے دروازے کے نچلے حصے میں پھنسا یا اور تیزی سے انٹر وکیشن روم میں آیا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ چند سیکنڈ بعد دھماکا ہوا اور میں نے جھانک کر دیکھا۔ گرد و غبار میں اڑا ہوا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں کمرے کے بلے سے گزر کر باہر آیا۔ شکر ہے یہاں آگ نہیں لگی تھی ورنہ اس بلے سے گزرنے بھی ممکن نہ ہوتا۔ میں براہ راست باہر نہیں آیا تھا کیونکہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر پیلس میں کہیں مقابلہ جاری تھا اور رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی۔ ان سے زیادہ خطرہ ان اسائپرز سے تھا جو پیلس کے باہر موجود تھے۔ وہ مجھے اکیلا دیکھ کر پیلس کا آدمی سمجھ کر شوٹ کر سکتے تھے۔ اگرچہ میری جیکٹ کے اوپر ہیٹ سکر لگے تھے جو جسمانی حرارت منتشر کر کے انفراریڈ دوربین سے نظر آتے۔ مگر یہاں جا بجا دھواں پھیلا ہوا تھا اور آگ لگی ہوئی تھی اس سے نشانچی دھوکا کھا سکتے تھے۔ جہاں تک عمارتیں نظر آرہی تھیں سب حملے کا نشانہ بنی تھیں۔ جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور یہ سب کی سب پیلس گارڈز کی تھیں۔ میں نے نائٹ ویژن آنکھوں پر پہن لی اس سے منظر زیادہ واضح نظر آنے لگا۔ مگر مجھے نہ تو کرنل کے کسی آدمی کی لاش دکھائی دی تھی اور نہ ہی وہ دو بکتر بند گاڑیاں کہیں نظر آرہی تھیں جنہیں حملے کے بعد اندر آنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ان میں سے کوئی نظر آیا تو سیٹی سے خبردار کروں گا۔

میں نے ان تین جگہوں کو ذہن میں رکھا جہاں کرنل کے اسائپرز تھے اور پھر اس کے لحاظ سے حرکت کرنے لگا۔ میں ایک مختلف سطح والے باغ کی دیوار کی آڑ میں آیا۔ یہ دیوار مشکل سے تین فٹ اونچی تھی۔ مگر مجھے کم سے کم دو طرف سے محفوظ دے رہی تھی ایک طرف موجود اسائپرز مجھے کسی قدر وقت سے دیکھ سکتا تھا۔ مگر میں اتنا خطرہ تو مول لے سکتا تھا۔ میں چاروں ہاتھوں پیروں سے دیوار کی آڑ میں چلے لگا۔ میرا رخ پیلس کے دائیں حصے کی طرف تھا جہاں سے مرکزی پیلس تک جانے والا ڈرائیوے گزرتا تھا۔ اس ڈرائیوے کو کم سے کم دو اندرونی گیٹس سے گزرنے پڑتا تھا۔ مگر وہ معمول کی بات تھی اس وقت محافظوں کو گیٹس کا ہوش کہاں ہوگا۔ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں آڑ تین طرف سے میسر تھی۔

میں نے ذرا بلند ہو کر دیکھا۔ تب مجھے پہلی اے پی سی نظر آئی۔ وہ دو عمارتوں کے بیچ میں تھی اور اس کے اندر سے دونوں طرف فائرنگ کی جارہی تھی۔ عمارتوں کی طرف سے جوابی فائرنگ ہو رہی تھی۔ اندر موجود گارڈز باہر نہیں آ سکتے تھے لیکن وہ کھڑکیوں سے فائرنگ تو کر سکتے تھے۔

میں نے سیٹی نکالی اور بجائے جارہا تھا کہ کوئی چیز سن سے میرے سر کے پاس سے گزری اور میں بے

ساخۂ آڑ میں گرا تھا۔ یہ گولی تھی اور یقیناً کسی اسائیر نے چلائی تھی۔ یہاں تک فائر کی آواز نہیں پہنچی تھی۔ میرا غدشہ درست نکلا تھا۔ اکیلے آدمی کو دیکھ کر ناشنہ غلط فہمی کا شکار ہو سکتے تھے۔ مگر اس کے بعد جو ہوا اس نے میری عقل خطا کر دی تھی۔ میں گر کر ابھی سنبھل رہا تھا کہ میں نے پیلس کے سامنے مخالف سمت پہاڑی سے ایک شعلے کو لپکے دیکھا۔ وہ میزائل تھا۔ لمبے سے بھی پہلے وہ میرے اوپر سے گزرا اور پھر ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ناشنہ مزاحمت کرنے والی کوئی عمارت بنی ہوگی لیکن جب میں نے جھانک کر دیکھا تو اسے پی سی گلوں میں بٹ گئی اور اس کے باقی ماندہ ڈھانچے سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ اس کے اندر موجود لوگوں کا حال سوچا جا سکتا تھا۔

”میرے خدا!“ میرے منہ سے نکلا۔ ”یہ کس احمق نے کیا ہے؟“

مگر فوراً ہی کنور پیلس کے دائیں طرف ہائی وے والی طرف سے ایک شعلہ اور لپکا اور اس بار اس کا نشانہ کہیں اوپر موجود دوسری اسے پی سی بنی تھی۔ میں نے اس کے گلوں سے ہوا میں بلند ہوتے دیکھے تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ کیا ناشنہ پاگل ہو گئے تھے؟ انہوں نے میزائل مار کر اپنی ہی دونوں بکتر بند گاڑیوں کو اڑا دیا تھا۔ میرا دل بیٹھے لگا۔ کرل اور اس کے آدمی مارے جا چکے تھے اور ہمارا مشن تقریباً ناکام ہو گیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ناشنہ دو دفعہ غلطی کریں۔ انہوں نے جان بوجھ کر یہ کام کیا تھا اور فوراً مجھے خیال آیا کہ مجھ پر گولی غلطی سے نہیں بلکہ جان کر چلائی گئی تھی۔ میری چھٹی حس جس خطرے سے خبردار کر رہی تھی وہ اچانک سامنے آ گیا تھا مگر ابھی پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ کرل کے آدمی بک گئے تھے اور انہوں نے اپنے ہی لوگوں کو ناشنہ بنا ڈالا تھا۔ یا پھر دوسرے لوگوں نے ان پر قابو پالیا تھا اور ان کے ہتھیار ہمارے خلاف استعمال کر رہے تھے۔

مگر یہ دوسرے کون ہو سکتے تھے؟ دونوں اسے پی سی کے اڑتے ہی کہیں چھپے پیلس کے گارڈز سامنے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے پی سی ان کے ساتھیوں نے اڑائی ہے۔ میں نے رائفل سنبھال لی۔ مگر مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اسائیرز نے ان گارڈز کو ناشنہ بنانا شروع کر دیا۔ ان میں سے چار پانچ گرے تو باقی واپس پناہ کے لیے بھاگے تھے۔ ان کی طرح میں بھی حیران تھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ ایسا لگ رہا تھا کہ اسائیرز جیج پانچ پاگل ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسے پی سی اڑانے کے بعد کنور پیلس کے گارڈز کو ناشنہ بنانا شروع کر دیا۔ گزبومیرے انداز سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ سب دیکھنے کے بعد کھلی جگہ پر آنا خودکشی ہوتی۔ میں واپس سرکنے لگا اور دیوار کے نیچے نیچے ہوتا واپس قید خانے کی عمارت کی طرف جانے لگا تھا۔ ابھی میں نصف راستے میں تھا میرے اوپر سے گولی گزر کر دیوار پر لگی۔ اب رکنا حماقت ہوتی میں اٹھ کر دوڑا۔ اسائیر مسلسل مجھے ناشنہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں حرکت کی وجہ سے بچ گیا۔

قید خانے کی عمارت کے بلے کے پاس آ کر میں نے چھلانگ لگائی اور دوسری طرف آڑ میں گرا تھا۔ اس بار مجھ پر دو طرف سے گولیاں برسائی گئی تھیں۔ بھاگنے کے دوران میں دوسرے اسائیرز کی نظر میں آ گیا تھا۔ دور بیٹھے اسائیر کے لیے تحریک مارگٹ کو ناشنہ بنانا ذرا مشکل ہوتا ہے کیونکہ رائفل کو بہت احتیاط سے اور معمولی سی جنبش دینی پڑتی ہے اور یہ خاصا مشکل کام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میری بچت ہوئی تھی مگر دوسری طرف بلے پر گرا تو پہلے سے زخمی جسم پر مزید چوٹیں آئی تھیں۔ میں کھڑے ہونے کے بجائے ریٹکتا ہوا نیم گرے کرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں میں اسائیرز کی حد سے باہر تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ تک کر میں نے پانی کی بوتل منہ سے لگائی اور

اس بار ایک ہی سانس میں خالی کر دی۔ جدوجہد سے زیادہ شک نے میرا گلہ خشک کر دیا تھا۔

ہمارا پلان مکمل طور پر ناکام ہو گیا تھا۔ اب مرکزی پبلکس کی چھت پر اترنے والے میرے ساتھیوں کی عافیت بھی خطرے میں پڑ گئی۔ ان میں بیٹو تھا اور مجھے سب سے زیادہ فکر اسی کی تھی۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ چند لمبے گہرے سانس لے کر میں اپنے حواس بحال کرتا رہا۔ چند منٹ بعد میری سوچ فوکس ہو گئی۔ ابتدائی صدمے کے بعد میں خود پر قابو پانے لگا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ جو ہر چکا تھا اس پر دکھی ہونے کے بجائے مجھے مرکزی پبلکس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کیونکہ وہاں میرے ساتھی تھے۔ سادی بڑے کنور کے ساتھ تھی اور اسے خطرہ نہیں تھا لیکن بیٹو خطرے میں تھا۔ اگر پبلکس کے گارڈز اس پر قابو پالیتے تو عین ممکن تھا اسے فوری مار دیا جاتا۔ کنوروں کے نزدیک وہ مجرم تھا۔ اسے بچانا میری ذمہ داری تھی اور اگر اس کے لیے مجھے خود کو بڑے کنور کے حوالے کرنا پڑتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔

ایک فیصلہ کر کے میں نے اپنے وسائل کا جائزہ لیا۔ میرے پاس ایک رائفل اور اس کے ساڑھے تین میگزین تھے۔ پستول اور اس کے امونیشن کی صورت حال یہی تھی۔ تین ہینڈ اور تین ہی اسوک گرینینڈ تھے ایک ایک میں استعمال کر چکا تھا۔ ایک وائس بم تھا مگر بغیر حفاظتی انتظامات کے میں اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ میں خود اس کا شکار ہو جاتا۔ میں اندر آیا۔ راہداری میں داخل ہونے سے پہلے سن گن لی۔ اندر کمرے میں جلنے والا واحد بلب بند ہو چکا تھا لیکن مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں نے نائٹ ویشن آن کر لی اور اب مجھے سب صاف نظر آرہا تھا۔ گیس کا شکار ہونے والا کوئی نہیں پڑا تھا، پتا نہیں زندہ تھا کہ مر چکا تھا۔ یہ بے ہوش کرنے والی گیس تھی مگر اس کی زیادتی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں دبے قدموں آگے آیا۔ خفیہ دروازہ بدستور بند تھا۔ میں نے جڑ میں لگے ہٹن کو دبایا۔ اس بار بھی دروازہ بند تھا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور بے ہوش گارڈ کو کھینچ کر باہر والے کمرے تک لے آیا۔

پھر ایک ہینڈ گرینینڈ خفیہ دروازے کے ساتھ رکھ کر تیزی سے خود بھی باہر آ گیا۔ عمارت مخدوش ہو گئی تھی ممکن تھا کہ کوئی دھماکا اسے سرے سے بٹھا دیتا۔ خاص طور سے جواسٹر پکچر کے ساتھ کیا جاتا۔ جیسے ہی میں نے باہر والے کمرے میں قدم رکھا دھماکا ہوا تھا اور راہداری میں دھواں اور گرد بھر گئی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا کہ گرد بیٹھ جائے۔ جیسے ہی گرد بیٹھی میں اندر آیا۔ خفیہ دروازے کا ایک حصہ اڑ گیا تھا اور اس میں اتنا غلا پیدا ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی جا سکتا تھا۔ میں نے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اس کے بجائے میں نے ایک گیس بم اندر اچھال دیا۔ گیس نکلنے کی سنسنی کے ساتھ ہی کوئی چلایا اور پھر بھاگنے کی آواز آئی۔ میں اندر داخل ہوا۔ یہاں بھی دھواں بھرا ہوا تھا مگر نائٹ ویشن سب صاف دکھا رہی تھی۔ گیس بم سے بہت تیزی سے گیس خارج ہو رہی تھی۔ میں نے نیچے آتے ہی اسے اٹھا کر آگے پھینک دیا۔ ابھی اس سے ایک منٹ تک گیس خارج ہو سکتی تھی۔ بم آگے گرا تو کوئی کھانا سا اور گالیاں دیتا ہوا مزید آگے بھاگا تھا۔

نیچے آتے (۱) میں نے نائٹ ویشن آف کر دی۔ کیونکہ یہاں بلب روشن تھے۔ گیس بم کی چابی کا ایک حصہ سکے کی طرح گول تھا اور اس کا سائز بھی پچیس پیسے کے سکے سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ میرے پاس تھا میں نے سرنگ کی چھت پر لگا پہلا بلب اتارا۔ یہ کسی قدر گرم تھا مگر ناقابلِ برداشت نہیں تھا۔ یہ سکہ میں نے بلب کے

ہولڈر میں لگانے والے حصے پر رکھا اور اسے بلند کر کے ہولڈر میں گھسا دیا۔ ایک جھماکا ہوا اور سرنگ میں چلنے والے تمام بلب بجھ گئے۔ وہاں گھپ اندھیرا ہو گیا مگر ٹائٹ ویژن آن کرتے ہی یہ اندھیرا اجالے میں بدل گیا۔ میں دبے قدموں مگر تیزی سے آگے بڑھا۔ آگے موجود افراد گیس بم سے اتنے دہشت زدہ ہوئے تھے کہ وہ سرنگ میں خاصے آگے نکل گئے تھے۔ جہاں تک نظر جاری تھی مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید روشنی بند ہونے سے وہ اور بھی ڈرے تھے اور واپس کسی عمارت میں گھس گئے تھے۔

میں مرکزی پیلس کی طرف جا رہا تھا۔ تقریباً تین سو گز کے بعد بلب دوبارہ روشن ملے۔ مجھے ٹائٹ ویژن بند کرنا پڑی تھا۔ میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے میں سکے کی طرح استعمال کر سکتا تھا اس لیے میں نے رائفل کے بٹ سے کام لینا شروع کیا اور راہ میں آنے والے بلب توڑنے لگا۔ جیسے جیسے میں آگے جا رہا تھا سرنگ میں تاریکی چھا رہی تھی۔ البتہ دائیں بائیں نکلنے والی سرنگوں کے بلب نہیں چھپڑے تھے وہ بدستور جل رہے تھے۔ میں صرف مرکزی سرنگ کے بلب توڑ رہا تھا۔ چند منٹ بعد میں مرکزی پیلس کے نیچے والے کمرے میں تھا اور یہاں سیڑھیوں والا دروازہ اب بھی بند تھا۔ میں تقریباً آدھا گھنٹا یہاں سے دوڑ رہا تھا۔ اس دوران میں اگر بڑا کنورسادی سمیت سیف ہاؤس میں جا چکا تھا تو مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔ مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حملہ آور ختم ہو چکے تھے اور جو چھت پر تھے ان پر قابو پایا جاسکتا تھا۔ میں نے یہاں کے بھی تمام بلب توڑ دیئے۔

اس جگہ ہینڈ گریینیڈ کا استعمال خاصا مشکل تھا کیونکہ یہاں سیڑھیاں تھیں اگر میں دروازے کے ساتھ رکھ کر اترتا تو اس میں وقت لگتا اور اگر میں نیچے سے اچھالتا تو وہ سیڑھیوں سے واپس نیچے آ جاتا۔ بالکل درست وقت پر پھینکنے میں خطرہ تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں ہی پھٹ جائے گا۔ یہ دو ہی گریینیڈز تھے یہ کام نہ آتے تو میں کسی صورت دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ گریینیڈ استعمال کرنے سے پہلے ایک بار پھر مٹن تلاش کروں۔ اوپری دیواروں پر دیکھا لیکن نیچے کی دیواروں پر نہیں دیکھا تھا۔ میں ایک دیوار پر ہاتھ پھیرتا ہوا نیچے تک آیا۔ پھر دوسری دیوار چیک کرنے اوپر جا رہا تھا کہ میری نظر سیڑھیوں پر ذرا ایک زیادہ روشن حصے پر گئی۔ یہ نقطے کی صورت میں اوپر سے نیچے پانچویں سیڑھی کی دیوار کے کونے پر روشن تھا اور آس پاس بے الگ نظر آ رہا تھا۔ میں اوپر آیا، اس پر انگلی پھیری اور گہری سانس لی۔ میں جس مٹن کی تلاش میں تھا وہ مل گیا تھا۔ اس دروازے کا مٹن سیڑھیوں پر تھا۔

میں نے اسے تین بار دیا اور فوراً ہی رائفل سنبھال لی کیونکہ دروازہ اوپر اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ روشنی کی لکیر نمایاں ہوئی جو پھیلتی چلی گئی اور پھر ایک چھوٹا لیکن دیباہی روشن خانہ دکھائی دیا جیسا کہ قید خانے میں تھا جہاں سے خفیہ راستہ شروع ہوتا تھا۔ یہ بھی شاید کسی گیلری میں تھا۔ میں چند لمبے انتظار کرتا رہا کہ وہاں کوئی موجود ہو تو دھم دھم سے آئے مگر نہ تو کوئی دھم سامنے آیا اور نہ ہی کوئی آواز آئی تھی۔ میں ٹائٹ ویژن آف کر کے اوپر آیا درخانے سے جھانکا مگر خلاف توقع یہ واش روم ثابت ہوا تھا۔ یہ خانہ اس قسم کا تھا جیسے بڑے واش رومز میں الگ سے شاور کی جگہ ہوتی ہے جسے پردے سے باقی واش روم سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہاں نہ تو شاور تھا اور نہ ہی کوئی پردہ تھا۔ میں باہر آیا اور دروازہ کھلا رہنے دیا کیونکہ مجھے یہاں اس کے مٹن کا علم نہیں تھا۔ ممکن ہے یہ کچھ دیر

بعد۔ بند ہو جاتا مگر مجھے اب شاید واپس نہیں جانا تھا اس لیے مجھے پیچھے کے بجائے آگے کی فکر تھی۔

واش روم خاصا بڑا تھا۔ اس میں ایک طرف آئینہ تھا۔ میں نے خود کو دیکھا۔ چہرے پر کئی جگہ خون لگا ہوا تھا۔ لباس گرد آلود اور کہیں کہیں سے خون آلود ہو رہا تھا اور میں کسی ایکشن فلم کا مار دھاڑ کرنے والا ہیرہ دلگ رہا تھا جس نے دشمنوں کے کشتوں کے پشے لگائے ہوں اور ساتھ ہی کچھ زخم خود بھی کھائے ہوں۔ میں نے دروازہ کھولے بغیر کان لگا کر باہر کی سن گن لی مگر کوئی آواز نہیں تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ باہر کوئی نہیں تھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کی لکڑی سے بنے ٹھوس دروازے تھے جن کو چوکھٹ میں پوری طرح فکس کیا گیا تھا اور یہ تقریباً ساؤنڈ پروف تھے۔ اگر اس سے باہر کچھ لوگ موجود تھے اور بات بھی کر رہے تھے تو وہ اندر سنائی نہیں دیتی۔ میں نے اس کا ٹوٹھا ماورا آہستہ سے گھمایا۔ وہ بے آواز گھوما اور ہلکی سی کلک کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ میں نے پٹ ہلکا سا کھول کر باہر دیکھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ایک بہت خوب صورت اور سچا ہوا بیڈروم تھا۔

یہاں سے اس کا دروازے والا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس بار بہت کان لگا کر سنا اور کمرے میں سنا محسوس کر کے میں باہر نکل آیا۔ رائفل شانے سے لٹکا لی تھی اور پستول ہاتھ میں رکھا تھا۔ میں نے تیزی سے پستول گھماتے ہوئے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ بڑے سائز کا یہ بیڈروم جس میں اعلیٰ درجے کا نفیس ترین فرنیچر تھا بالکل خالی تھا۔ بڑی لائسنس آف تھیں لیکن دو چھوٹی لائسنس آن تھیں۔ یہ ظاہر خاموشی تھی لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے اس عمارت میں کہیں ہلچل ہو۔ میں نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ کوئی ارتعاش نہیں تھا شاید یہ میرے احساسات تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھی اوپر تھے اور وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے۔ شاید اسی نے میرے اندر ارتعاش پیدا کیا تھا اور مجھے لگا جیسے جگ جگ کچھ ہو رہا ہو۔ مگر اسی لمحے زمین واضح طور پر ہلکی تھی اور پھر ایسا لگا جیسے کہیں کھلے میں دھماکا ہوا اور بند جگہ اس کی دھمک بنا آواز کے آئی ہو۔ دھماکا اسی عمارت میں ہوا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا اور اس کا ہینڈل گھما کر دیکھا وہ کھلا تھا۔ دروازہ ہلکا سا کھول کر میں نے باہر جھانکا تو ایک لمبی راہداری دکھائی دی جس کے آخری حصے میں سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں مگر یہ عام سی سیڑھیاں تھیں جیسے ایئر مینس کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ کنورٹبلز کی شاہانہ سیڑھیاں میں دیکھ چکا تھا جس کی چوڑائی نو دس فٹ تھی اور جن پر بیش قیمت سرخ قالین فکس کیے گئے تھے جس کے ساتھ مہانگی سے بنی لکڑی کی ریلنگ تھی اور اس پر چاندی جیسی کسی دھات کا سہارا تھا۔ راہداری خالی تھی مگر میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ یہ جگہ انسانوں سے خالی نہیں ہے یہاں دائیں بائیں کے کمروں میں لوگ تھے۔ راہداری بھی عام سی تھی۔ یعنی کارپٹ اور آرائشی سامان سے خالی تھی۔ اس سے لگ رہا تھا کہ ہیلز کا کوئی عام حصہ تھا۔ ممکنہ طور پر یہ حصہ ملازموں یا عام قسم کے مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ مگر میں جس کمرے میں تھا یہ عام نہیں تھا۔ اس کا فرنیچر اور دیگر سامان بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور پھر یہیں سرنگ میں جانے والا خفیہ راستہ تھا۔

میں باہر آیا اور دبے قدموں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ایک کمرے کے پاس سے گزرتے مجھے اندر سے کم سے کم دو افراد کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ بیجان زدہ ہو رہے تھے۔ میں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے تیزی سے سیڑھیوں تک آگیا۔ سیڑھیاں بل کھاتی اوپر کی طرف جا رہی تھیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو سیڑھیاں خاصی بلندی تک جاتی دکھائی دیں۔ یہ بلندی کم سے کم چالیس پچاس فٹ تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو

اسی کمرے کا دروازہ کھلتا محسوس ہوا اور میں تیزی سے جھک کر بیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جب چھت جتنی بلندی تک پہنچ گیا تو جھانک کر دیکھا۔ دوا فراد کمرے سے نکلے تھے اور وہ وردی سے کنور پیلس کے خاص گارڈز دکھائی دے رہے تھے۔ وہ مسلح تھے اور آپس میں تیز لہجے میں بات کر رہے تھے ان کی زبان غیر مانوس تھی۔ وہ نقوش سے نیپالی گورکھے لگ رہے تھے اور شاید اپنی زبان میں بات کر رہے تھے۔

میں تیار ہو گیا جب انہوں نے بیڑھیوں کا رخ کیا اور میں مزید کچھ اوپر چڑھ گیا۔ میں نے رائفل ہاتھ میں لے لی تھی اور مقابلے کے لیے تیار تھا۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی وہ بیڑھیوں کے نیچے سے گزر کر آگے کہیں چلے گئے۔ میں اتر کر نیچے آیا اور اس راستے پر جھانکا۔ یہاں بیڑھیاں ذرا نیچے اتر کر ایک چھوٹی راہداری میں جا رہی تھیں جو آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ وہاں چہل پہل تھی اور مجھے تین افراد تیزی سے گزرتے دکھائی دیے۔ ان کی توجہ اس طرف نہیں تھی ورنہ وہ شاید مجھے دیکھ لیتے۔ میں واپس آیا اور پھر بیڑھیوں کا جائزہ لیا۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ میں کنور پیلس کے کس حصے میں تھا۔ سیزم پر مناسب وقفے سے بلب روشن تھے اور وہاں تاریکی نہیں تھی۔ مگر روشنی بہت زیادہ بھی نہیں تھی۔ میں اوپر چڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ایک منزل بعد مجھے نکلنے کی کوئی راہ ملے گی۔ مگر سیزم کی توجس اوپر جا رہی تھی اور اس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

یہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے میں اوپر جاتے ہوئے راستے میں آنے والے بلب توڑتا جا رہا تھا۔ جتنی زیادہ تاریکی ہوتی میرے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ سیزم کے آخری حصے میں آکر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہاں ایک سپاٹ دیوار تھی اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا یہ سیزم کسی مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ کوئی پاگل ہو گا جو بلاوجہ سیزم بنا کر رکھ دے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی خفیہ دروازہ تھا جو اوپری فلور پر کہیں کھلتا ہو گا۔ میں دیوار پر ہاتھ پھیر کر اس دروازے کو کھولنے والا بن تلاش کرنے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے آخری بلب بھی توڑ دیا۔ اب وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے ٹائٹ ویژن آن کر کے دیوار کا معائنہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے کی طرح بنن نمایاں ہو جائے گا۔ کیونکہ بنن برقی ہوتا ہے اس لیے کرنٹ سے وہ کسی قدر گرم ہو جاتا ہے اور باقی دیوار سے ذرا نمایاں ہو جاتا ہے لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ پوری دیوار ایک جیسے رنگ میں نظر آرہی تھی۔

میں نے آس پاس کا جائزہ لیا پھر اتر کر بیڑھیوں پر دیکھا۔ پہلے بھی بنن مجھے بیڑھیوں پر ملا تھا لیکن اس بار بیڑھیوں پر بھی نہیں تھا اس کا بھی امکان تھا کہ بنن موجود تھا مگر کسی وجہ سے گرم نہیں تھا اس لیے مجھے الگ سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ اوپر کی دس بیڑھیوں کی دیوار چپک کی۔ کہیں کوئی ایسا ابھار نہیں ملا جو دب بھی رہا ہو۔ پھر میں اوپر آیا اور رائفل کے دسے سے دیوار بجا کر چپک کرنے لگا اور چوٹ کی آواز سے مجھے لگا کہ دیوار اتنی موٹی نہیں ہے۔ یقیناً یہاں دروازہ تھا۔ میں مایوس ہو کر پیچھے ہٹا تھا کہ اچانک ہی دیوار بالکل سی طرح اوپر ہونے لگی جیسے سرنگ کی دیواریں ہوتی تھیں۔ میں پھرتی سے پیچھے ہٹا تھا اور بیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے رائفل کا رخ اوپر کر لیا۔ بہت ہلکی سی روشنی آئی تھی۔ پھر میں نے کسی کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا۔ ”ادھر لوئی تھا میں نے خود آواز سنی، کوئی دیوار بجا رہا تھا۔“

میں ذرا اوپر آیا اور جھانک کر دیکھا۔ یہ ایک تقریباً تاریک کمرہ تھا اور وہاں معمولی روشنی میں کئی افراد نظر آ

رہے تھے۔ مگر وہ سامنے نہیں تھے اس لیے نمایاں بھی نہیں تھے۔ میں نے رائفل کی ٹال آگے کی۔ وہ کئی تھے اور جلد یا بدیر اپنے شہرے کے تصدیق کے لیے نیچے آتے۔ یہاں بچتا مشکل تھا اور وہی بچتا جو دار میں پھل کر جاتا۔ میرے پاس موقع تھا میں انہیں بے خبری میں نشانہ بنا سکتا تھا۔ اچانک چھڑکی آواز آئی اور کسی نے کہا۔ ”بکواس کرتا ہے خنزیر کا بچہ..... ادھر کون ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں بھگوان کی سوگند۔“ پہلے بولنے والا گھگلیا۔ ”دیکھو یہاں کی روشنیاں بھی بند ہیں ورنہ ان سیڑھیوں پر روشنی ہوتی ہے۔ تم لوگ خود جا کر دیکھ لو۔“

دوسرے شخص کی آواز سن کر میری ٹریگر پر سخت ہوتی انگلی نرم ہوئی تھی مگر ان کے یہاں آنے کا سن کر میں نے دوبارہ انگلی سخت کی اور ٹریگر دبائے والا تھا کہ ایک اور نے کہا۔ ”یہ ٹھیک بولتا..... ادھر کوئی ہے۔“

ایک دم میرا پر اور وجود ہی نرم پڑ گیا اور میں نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں نے ٹریگر نہیں دبایا ورنہ شاید ہونے والے نقصان کی کبھی تلافی نہیں کر سکتا تھا۔ تیسری آواز بیٹو کی تھی۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”یہ میں ہوں، گولی مت چلاتا۔“

”شوہی!“ بیٹو نے چلا کر کہا اور اس کا ہیولا دروازے کے خلا میں نمودار ہوا۔ میں اٹھ کر اوپر آیا تو وہ مجھ سے چٹ گیا۔ اس کی محبت کا ہمیشہ سے یہی انداز رہا تھا۔ وہ مجھے ٹول رہا تھا۔ ”شوہی آپ ٹھیک ہے نا؟“

”سو فیصد تو نہیں لیکن ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اندر چلو ہم دشمنوں کے عین سر کے اوپر ہیں۔“

بیٹو مجھے اندر لایا اور اس نے مذکورہ شخص کو دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ایک طرف دیوار میں لگا خفیہ مین تین بار دبایا اور دروازہ بند ہونے لگا۔ وہ پچیس گارڈز کی وردی میں تھا۔ ”یہ کیسے ہاتھ لگا؟“

بیٹو نے کہا۔ ”ہم نے یہاں موجود لوگ کا صفایا کر دیا، بس یہ زندہ ہاتھ لگا۔“

اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اس کے ساتھ اچھی خاصی مار پیٹ ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

”اے اندر سے لاک کر دو اب یہ سیڑھیوں کی طرف سے نہ کھلے۔“

اس نے اسی مین کو لگا تار چار بار دبایا اور بولا۔ ”اب یہ صرف اسی طرف سے کھلے گا سیڑھی کی طرف سے نہیں کھلے گا۔“

وہاں بیٹو کے ساتھ فتح خان کے دو آدمی تھے لیکن خود فتح خان اور باقی تین آدمی غائب تھے۔ ”باقی کہاں ہیں؟“

”تین ادھر ایک جگہ مور چرلا گئے ہوئے ہیں۔“ بیٹو بولا۔ ”پر فتح خان کا پتا نہیں ہے..... وہ ہمارے ساتھ

اترا تھا مگر کچھ دیر بعد غائب ہو گیا۔ ریڈیو پر بھی جواب نہیں دے رہا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”فتح خان بھی غائب ہے..... تمہیں معلوم ہے کرنل اور اس کے ساتھ اندر آنے

والے تمام افراد کا صفایا ہو گیا ہے ان کی بکتر بند گاڑیوں پر باہر سے میزائل فائر ہوئے ہیں۔“

بیٹو حیران ہوا تھا۔ ”باہر سے..... کس نے کیا؟“

”میرا خیال ہے ان ہی لوگوں نے جنہیں میزائل فائر کرنے پر لگایا گیا تھا وہ بک گئے ہیں یا مارے گئے

ہیں اور ان کی جگہ دوسرے لوگ آ گئے ہیں۔ مجھ پر فائرنگ کی گئی حالانکہ میں نے جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور میرے

سامنے ہی اسنا پیرز نے پیلس کے گارڈز کو نشانہ بنایا۔

بیٹو نے تیزی سے صورت حال کو سمجھ لیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شوہی یہ تو کوئی بڑا سازش ہو رہا ہے کوئی شخص اپنا کھیل کھیل رہا ہے۔“

”مجھے لگ رہا ہے کوئی شخص نہیں کئی افراد اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”نیچے سے شدید مزاحمت کی جارہی ہے؟“

”ہم دوسری منزل پر بھی نہیں جاسکا ہے۔“ بیٹو بولا۔ ”نیچے سے میزمری کو اڑا دیا گیا ہے اور ادھر بہت لوگ ہے۔“

”اس خفیہ راستے کا کیسے پتا چلا؟“

”اس کو بجایا تو یہ بولا۔“ بیٹو نے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔

”خود سے بتایا ہے اس نے؟“

”اتنا شریف نہیں ہے ہم کو خیال آیا کہ ادھر سے نیچے جانے کے واسطے بس ایک میزمری ہے۔ ہمیں خیال آیا کہ کوئی خفیہ راستہ ہوگا۔“

”ہیلی کاپٹر کہاں ہے؟“

”وہ چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔“ بیٹو نے بتایا۔ ”فتح خان نے اس کے پائلٹ سے کہا تھا کہ جب ریڈیو پر کہے تو ادھر آئے۔“

”ریڈیو پر کون کہے گا اور وہ ریڈیو کس کے پاس ہے؟“

”فتح خان بولتا، ریڈیو بھی اسی کے پاس ہے۔“

”اور وہ غائب ہے۔“ میں نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ یہ تشویش ناک خبر تھی۔ فتح خان کہاں غائب ہو گیا تھا اور اس کا ریڈیو بھی بند تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ دشمن کے ہاتھ چڑھ گیا تھا لیکن فتح خان کے بارے میں انکو اٹری کرنے سے پہلے میں نے اس جگہ کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ اوپری فلور بہت بڑا نہیں تھا یہاں چھ کمرے تھے اور درمیان میں گنبد کا بڑا سا ہال تھا۔ میزمریاں اس کے وسط سے نیچے جارہی تھی جہاں فتح خان کے تین ساتھی مورچہ بند موجود تھے۔ میزمریاں درمیان سے یوں تباہ کی گئی تھیں کہ ان کو کسی صورت بغیر کسی سہارے کے عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے بیٹو سے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے اب تک کیا کیا ہے؟“

”ہم نے گیس والا بم مارا پر ادھر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مورچہ لگانے والا اپنی جگہ ہے۔ یہ دیکھو۔“ بیٹو نے بتول سے نیچے کی طرف فائر کیا اور فوراً ہی جوابی برسٹ آیا۔ میں نے بیٹو کو پیچھے کھینچ لیا۔

”احتیاط سے برخورد دار..... اتنا جذبہ باتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”شوہی آپ کہاں تھا..... آپ کے غائب ہونے کے بعد ہم بہت پریشان تھا۔ ہم سوچ رہا تھا کہ حملہ نہ کرے پر فتح خان اور کرنل نے فیصلہ کیا کہ حملہ وقت پر ہوگا۔“

”انہوں نے ٹھیک فیصلہ کیا۔“ میں نے سر ہلایا اور بیٹو کو مختصر خود پر گزرنے والے احوال سے آگاہ کیا۔

”ہر ہونے والے تشدد کا سن کر اسے غصہ آیا تھا اور ٹائیک کا انجام سن کر اس نے دانت نکالے تھے۔“

”بالکل ٹھیک کیا، آپ کے ساتھ ہم ہوتا تو اسے کہیں اور کرنٹ لگاتا۔“

سرنگ اور پیلس کے نیچے موجود سیف ہاؤس کا سن کروہ فکر مند ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”شوہی کسی طرح

بھی ہم کو نیچے جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ وہ دیدی کو لے کر ادھر چلا جائے۔“

”اب نہیں جائے گا کیونکہ حملہ کرنے والوں میں بس ہم بچے ہیں اور ہم بھی یہاں پھنسے ہوئے ہیں۔“

”شوہی ایک راستہ تو پتا چل گیا ہے نیچے جانے کا۔“ بیو نے خفیہ راستے کی طرف اشارہ کیا۔

”مجھے لگ رہا ہے اب اس سے نیچے جانا بھی آسان نہیں ہو گا۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ صبح کے

سازھے چار بجنے والے تھے۔ کچھ دیر میں صبح کی روشنی ہونے لگتی اور ہرگز رتے لمحے یہاں سے نکلنا بھی دشوار لگ

رہا تھا مشن کی کامیابی تو ایک طرف رہی تھی۔ میں نے فتح خان کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ پانچ اور ہم دو

ہیں..... نیچے درجنوں مسلح گورکھے ہیں اور تم جانتے ہوڑنے مرنے میں یہ کیسے ہوتے ہیں۔“

”تب کیا کرے..... ادھر سے نکل بھی نہیں سکتا ہے۔ ہیلی کاپٹر صرف فتح خان منگوا سکتا ہے اور وہ ہے

نہیں۔“

”وہ غائب کیسے ہوا؟“

”ہم کو لگا وہ پہلے نیچے اتر گیا اس کے بعد سیر می تباہ ہو گیا۔“ بیو نے کہا۔ ”وہ ہیلی کاپٹر سے اترتے ہی

اندر آ گیا تھا۔“

”اس نے عجلت میں کام کیا۔ میرا خیال ہے یہاں کچھ لوگ گھات لگائے بیٹھے ہوں گے وہی اسے قابو

کر کے نیچے لے گئے ہوں گے۔“

”ممکن ہے مار دیا ہو؟“

”اس کا بھی امکان ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا فتح خان نے یہ جذباتی حرکت کیوں کی۔ اسے تم

لوگوں کی کمانڈ کرنی چاہیے تھی نہ کہ خود منہ اٹھائے دشمن کے حصار میں گھس جانا چاہیے تھا۔“ کہتے ہوئے میرا لہجہ

برہم ہو گیا۔

”ہم کو دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔“ بیو دبی آواز میں بولا۔

گنبد کے نیچے ہال تھا اور اس کے چاروں طرف چھ کمرے تھے۔ بالکل وسط میں سیر حیاں نیچے جارہی

تھیں۔ چاروں طرف تقریباً بیس بائیس فٹ کی خالی جگہ تھی جوشاید خاص تقریبات کے لیے استعمال کی جاتی ہو

گی۔ یہاں مکمل کارپٹ تھا اور دیوار کے ساتھ اعلیٰ درجے کے صوفے اور دوسری سٹنگ رکھی تھیں۔ ایک طرف

بڑی سی میز بھی تھی جس پر کھانے پینے کا سامان سجایا جاتا ہو گا۔ گنبد کا اوپری حصہ شیشے کا تھا۔ وسط میں ایک بہت

بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ یہ بلاشبہ کئی ٹن وزنی فانوس تھا جسے بہت مضبوط فولادی راڈ سے گنبد کی چھت سے باندھا

گیا تھا۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر باقی سب کو بھی پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا پھر راڈ کا نشانہ لے کر برسٹ مارا۔ پہلے

برسٹ میں راڈ نہیں ٹوٹی تھی۔ دوسرے برسٹ نے اس کی اوپری کڑی کو توڑ دیا اور فانوس سے آوازیں آنے

لگیں۔ بیو نے اضطراب سے کہا۔ ”شوہی یہ کیا کرتا ہے؟“

”دیکھتے رہو۔“ میں نے کہتے ہوئے تیسرا برسٹ مارا اور اس بار راڈ جواب دے گئی۔ ایک مہیب آواز

کے ساتھ وزنی فانوس تیزی سے نیچے گیا۔ یہ میڑھیوں کے عین اوپر تھا اس لیے سیدھا خلا میں گیا۔ زوردار چھناکوں کے ساتھ دھات ٹوٹنے کی خوفناک آوازیں بھی آئیں اور پھر نیچے موجود لوگ چیخنے چلانے لگے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں فانوس کے شیشے ٹوٹ کر ان پر برس رہے تھے اور انہیں زخمی کر رہے تھے۔ اب بیٹو سمجھا کہ میں نے کیا کیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”یہ آپ نے اچھا کیا۔“

فانوس گرا تو میں نے اوپر سے نکلنے والے بجلی کے تار کو پکڑ کر کھینچا اور اس میں سے تار توڑ کر اس کے دونوں سرے ننگے کیے اور انہیں وہیں موجود ایک ساکٹ میں ڈال کر بٹن آن کیا تو شعلہ لپکا اور اس جگہ کا فیوز اڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نیچے والی منزل بھی تاریک ہو گئی تھی یعنی دونوں کا فیوز ایک ہی تھا۔ میں نے نائٹ ویژن آن کرتے ہوئے نیچے جھانکا تو مجھے کچھ افراد حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ وہ زخمی ہوئے تھے اور اب کانچ اور فانوس کے لمبے سے بچنے کے لیے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں چاہتا تو ان کو آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی ان سب نے بھی نائٹ ویژن آن کر لیے۔ وہ بھی دیکھ رہے تھے اس لیے فتح خان کے ایک ساتھی نے اچانک فح جانے والوں پر برسٹ مارا۔ ان میں سے دو گرے اور باقی بھاگے تھے اب انہوں نے شیشوں کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ ان کے غائب ہونے کے بعد میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اس مشن کا کمانڈر میں ہوں اب تم میں سے کوئی مجھ سے پوچھے بغیر کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ سمجھ گئے؟“

”سمجھ گیا۔“ فائرنگ کرنے والا بولا۔ ”خان صیب کا حکم تھا کہ ادھر سامنے آنے والے ہر بندے کو شوٹ کرتا ہے۔“

”اب ایسا نہیں کرنا۔“ میں نے کہا۔ فح جانے والا گاڑی ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔ میں اس کے پاس آیا۔ ”تم اس عمارت کے خاص گاڑیوں میں سے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے اقرار کیا۔

”میں جانتا ہوں یہاں تم جیسے پچاس گاڑیوں ہوتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ان کا سربراہ کون ہے؟“

”اگر جنگ۔“ اس نے جواب دیا۔

”راسن کی کیا حیثیت ہے؟“

”وہ پبلس کے دوسروں حصوں کا مگر اس ہے لیکن اس عمارت کے معاملات سے اس کا تعلق نہیں ہے۔“

”باقی سکيورٹی بھی راسن کے ماتحت ہے؟“

”ہاں باقی پورا پبلس اس کے ماتحت ہے۔“

”جب پبلس پر حملہ ہوا تو تم لوگوں نے کیا کیا اور بڑے کنور کارڈ عمل کیا رہا۔“

وہ ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ ”بڑے کنور کی طرف سے ہمیں حکم دیا گیا کہ صرف اس عمارت کا دفاع کریں۔“

”میں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔“

”بڑا کنور کہاں ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں جانتا، جب اوپر حملہ ہوا تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو آنے والوں کو

ردکنے کا حکم ملا۔ ہم اوپر آئے پر میرے ساتھی مارے گئے اور میں پکڑا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بڑا کنور کہاں ہے ویسے بھی ہم دوسرے فلور پر رہتے ہیں ہمیں بلاوجہ نیچے جانے کی اجازت نہیں ہے۔“

”تم لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟“

”ہمارے گھر پیلس میں ہیں لیکن ڈیوٹی کے وقت ہم اسی عمارت میں رہتے ہیں۔ دو دن کے لیے آٹھ گھنٹے ڈیوٹی اور آٹھ گھنٹے آف ملتا ہے۔ ان دونوں میں ہمیں رہنا ہوتا ہے۔“

یہ پیلس کا سیورٹی سسٹم تھا اور اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ”تمہارے ساتھ کتنے آدمی آئے تھے۔“

”ایک درجن۔“ اس نے جواب دیا۔

”صرف تم نیچے ہو، نیچے بھی کم سے کم چار مارے گئے ہیں۔“

”اس سے پہلے ہی چھ سات اور مارے گئے۔“ بیو نے مداخلت کی۔ ”جب ہم نے نیچے جانے کی کوشش کی اور انہوں نے رد کا تھا۔“

مارے جانے والے بیشتر افراد بیڑھیوں کے آس پاس مارے گئے تھے اور ان کی لاشیں نیچے تھیں اور جو اوپر مارے گئے تھے ان کی لاشیں بھی ان لوگوں نے نیچے پھینک دی تھیں۔ اگر بیس کے قریب گارڈز مارے بھی گئے تھے تو نیچے اس سے زیادہ گارڈز موجود تھے۔ ابھی تو اوپر ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ تھے لیکن نیچے جانے کی صورت میں ہم براہ راست نشانے پر آ جاتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمیں نیچے نہیں جانا تھا۔ ہمیں نیچے جانا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ بچ کر یہ کام کر سکتے تھے۔ میں نے ایک بار پھر نیچے دیکھا۔ اب بیڑھیوں اور آس پاس جہاں تک نائٹ ویژن کام کر رہی تھی کوئی زندہ فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کچھ لاشیں پڑی تھیں جنہیں اٹھایا نہیں گیا تھا۔ آسان طریقہ تو خفیہ راستے کا تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس سے جانا آسان نہیں ہوگا۔ میں نے بیو اور دوسرے افراد سے کہا۔

”ری باندھو..... ہم اسی جگہ سے نیچے جائیں گے۔“

”شوبی یہ خطرناک ہو گا وہ لوگ گھات لگا کر بیٹھا ہو گا۔“

”ہم اندھا دھند نہیں جائیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے حصے کا ریڈیو کہاں ہے؟“

”ہمارے پاس ہے۔“ بیو نے اپنے بیگ سے چھوٹا ساریڈیو اور اس کے ایئر فون نکال کر دیئے جو کانوں میں پوری طرح فکس ہو جاتے تھے۔ میں نے اسے کانوں سے لگایا اور ریڈیو اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ فتح خان کے آدمی مختلف جگہوں پر رسیاں باندھ رہے تھے۔ انہوں نے ہیلی کاپٹر سے رسیوں سے اترنے کی تربیت حاصل کی تھی اور یہ کام ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے دُاس بم لیا اور ایک رسی سے اسے باندھا۔ اب بیو سمجھ گیا اس نے دانت نکالے۔ ”یہ اچھا ہے سب بے ہوش ہو جائے گا۔“

”خوش فہم مت ہو ممکن ہے انہوں نے اس کا توڑ بھی رکھا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کوئی اندر کا بھیدی ان لوگوں کے ساتھ مل گیا ہے اس صورت میں وہ ہمارے تمام حربوں سے آگاہ ہوں گے۔“

بیو نے سر ہلایا۔ فتح خان کے آدمی رسیاں باندھ چکے تھے۔ میں نے سب کو ایک جگہ بلایا اور سرگوشی میں اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ رسی سے بندھا ہوا بم پن نکال کر نیچے پھینکنے پر تقریباً بیس فٹ کی گہرائی تک چلا جاتا۔ رسی

اتنی ہی دراز تھی لیکن ہم اس کی حد میں ہوتے۔ یہ تقریباً پانچ سینڈ تک ایک سوئیں ڈیسی ٹیل کی مہیب آواز نکالتا اور جیسے ہی اس کی آواز ختم ہوتی ہم حرکت میں آ جاتے۔ وہ خاموشی سے سن رہے تھے۔ البتہ ایک نے سوال کیا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“ اس نے قیدی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے گولی مار دے۔“

”نہیں یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“ اس سوال سے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ”بلکہ یہ پہلے جائے گا۔ اگر کوئی نیچے ہوا تو وہ اسے ہی نشانہ بنائے گا اور ہمیں اس کی لوکیشن کا پتا بھی چل جائے گا۔“

یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ مگر اسے نیچے بھیجنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہوش میں ہو اور ارنفون کے بغیر اس کا وائس بم سے چپنا مشکل تھا کیونکہ اس کی حد میں میٹرز تھی۔ میں نے اسے فتح خان کے ایک آدمی کے ہمراہ ایک کمرے میں بھیج دیا جہاں وہ بم کی حد سے باہر ہوتا۔ اسے سمجھا دیا کہ اسے کانوں پر ہاتھ رکھنے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بم کی پن مینجی اور اسے نیچے خلا میں اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم دیواروں کی طرف بھاگے اور دونوں ہاتھوں سے کان ڈھانپ لیے تھے۔ اس کے باوجود پانچ سینڈ بعد جب بم پھٹا تو ایک باقاعدہ لہری ہمارے جسموں سے ٹکرائی اور بے پناہ امنڈتا ہوا شور کانوں سے ٹکرایا۔ اس کی شدت نے ایک لمحے کو بوکھلا دیا تھا۔ یہ کرنٹ کے شاک جیسا تھا۔ میں نے سانس روکی تو یہ قابل برداشت ہوا۔ آواز کسی حد تک ناک کے راستے بھی جسم میں داخل ہوتی ہے۔

اسی لیے سانس روکنے سے آواز کی شدت کسی قدر کم ہوئی تھی۔ سانس روکنے کے باوجود یہ پانچ سینڈ پانچ منٹ بن کر گزرے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے آواز رک ہی نہیں رہی ہے۔ ایک مسلسل لہری طرح چڑھے چلی آ رہی ہے۔ یہ چینی چنگھارتی آواز جیسے دماغ میں گھس رہی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ جن لوگوں نے اسے براہ راست سنا ہوگا ان کا کیا حال ہوگا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ کسی قابل نہیں رہے ہوں گے۔ آواز کی تو بھی کان سائیں سائیں کر رہے تھے اور میں نے کانوں سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بیو کو آواز دی تو مجھے خود اپنی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ پھر میں نے اسے ریڈیو پر پکارا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

”ہم ٹھیک ہے شوبی۔“ ایرفون سے اس کی آواز آئی۔ ”پر یہ آواز خدا کا پناہ.....“

”سب ٹھیک ہیں؟“

سب ٹھیک تھے۔ البتہ گورکھے گاڑ کی حالت کسی قدر خراب تھی۔ حالانکہ وہ دور تھا مگر شاید اس نے صبح سے کانوں کو نہیں ڈھکا تھا۔ سب سے پہلے اسے بھیجنا تھا اور وہ جمجمہ رہا تھا۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ رسی کے سہارے نہیں اتر سکے گا۔ میں نے کہا۔ ”اسے رسی سے باندھ کر نیچے اتار دو..... جلدی.....“

فتح خان کے آدمیوں نے اسے بغلوں سے رسی گزار کر باندھا اور کنارے تک لائے۔ وہ مزاحمت کر رہا تھا مگر خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔ قربانی کے بکرے کی طرح اسے نیچے ڈھکیل دیا اور پھر رسی کے سہارے وہ نیچے جانے لگا۔ ابھی وہ درمیان میں تھا کہ میں نے روک دیا۔ ”بس اب رسی کہیں باندھ دو اسے یہیں لٹکا رہنے دو۔“

کسی طرف سے فائرنگ یا مزاحمت نہیں ہوئی تھی اس کا مطلب تھا کہ کوئی نیچے تھا تو وہ وائس بم کا شکار ہو گیا تھا۔ رسی کو ایک طرف باندھ دیا گیا اور سب نیچے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے سات رسیاں باندھی تھیں۔ بیو نے پوچھا۔ ”جو نیچے ملے ان کا کیا کرنا ہے؟“

نیچے موجود گارڈز بہت خطرناک تھے انہیں موقع ملتا تو وہ ہمیں نہیں چھوڑتے اور ہمارے پاس نہ تو وقت تھا اور نہ ذرائع تھے کہ انہیں قیدی بنا لیتے۔ ہم صرف سات تھے۔ ان کا ایک ہی حل تھا میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”دیکھتے ہی شوٹ کر دینا۔ البتہ جو ہم کا شکار ہوں اور تمہاری پہنچ میں ہوں ان کو سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دینا۔ مگر یاد رکھنا بلا ضرورت فائر نہیں کرنا ہم جتنی خاموشی سے نیچے پہنچ جائیں اتنا ہی اچھا ہوگا۔“

ہم نے رسیاں نیچے لٹکائیں اور سب ایک ساتھ نیچے جانے لگے۔ کلب میں ہونے کی وجہ سے رسی پر گرفت تھی اور صرف ایک ہاتھ سے رسی چھوڑی جاسکتی تھی۔ دوسرا ہاتھ ہتھیار سنبالنے کے لیے آزاد تھا۔ ایسے میں شانے سے لٹکی راٹفل سب سے بہترین ہتھیار تھا کیونکہ بہ وقت ضرورت اسے چھوڑا بھی جاسکتا تھا۔ ریلنگ سے نیچے آتے ہی مجھے ایک وسیع ہال دکھائی دیا۔ یہ ان میزھیوں کے چاروں طرف تھا۔ اوپر جو کمرے تھے یہاں ان کے نیچے بھی ہال تھا اس لیے اس کی وسط بہت زیادہ ہو گئی۔ مگر جہاں تک میں دیکھ رہا تھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف میزھیوں کا ایک بڑا حصہ غائب تھا اور آس پاس بھی دھماکے کی تباہی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں ٹپلی میزھیوں کے پاس آیا تو ریلنگ پر تک کر ہال میں اتر آیا۔ رسی چھوڑ دی تھی۔ اتنے میں باقی سب بھی نیچے آ چکے تھے۔ دوسری طرف کئی افراد تھے جو وائس بم کی تباہ کاری کا شکار ہو گئے تھے اور ان میں سے کوئی ہوش میں نہیں تھا۔

میں گھوم کر اس طرف آیا جہاں فتح خان کا ایک آدمی خنجر نکالے ان کی گردن کاٹنے کی تیاری کر رہا تھا مگر میں نے اسے روک دیا اور ان پانچ افراد کو چیک کیا جو پوری طرح مسلح تھے۔ ان کے پاس گیس ماسک اور ٹائٹ ویڈن بھی تھے مگر وائس بم ان کے لیے غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کے کانوں سے خون نکل آیا تھا شاید اس کے کان کا پردہ پھٹ گیا تھا۔ یہاں مکمل تاریکی تھی کیونکہ فیوز اڑا ہوا تھا۔ میں نیچے آتے ہوئے تار کا ٹکڑا لے آیا تھا۔ اس کے پس کر کے دو افراد کو دیئے اور ان کو سمجھایا کہ نیچے جاتے ہوئے جہاں روشنی نظر آئے وہ کسی بھی سائٹ میں انہیں ڈال کر آن کر دیں۔ اس حصے کا فیوز اڑ جائے گا۔ ویسے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ کنور پیلس جیسی عمارت کا بجلی کا نظام اتنا ناقص تھا کہ ایک ہی فیوز پر دو فلور چل رہے تھے۔ اس لیے جب فیوز اڑا تو دونوں فلور تاریکی میں ڈوب گئے۔ جب تک میں بے ہوش افراد کو چیک کر رہا تھا باقی سب اس فلور کے سامنے نظر آنے والے کمرے اور حصے چیک کر رہے تھے۔

اس سے نچلے فلور پر روشنی دکھائی دے رہی تھی اور اپنی بلندی سے وہ گراؤنڈ کے بجائے میزائٹن فلور لگا رہا تھا۔ وائس بم کی آواز نہ صرف اس عمارت بلکہ اس کے آس پاس بھی گئی ہوگی اور یقیناً اب نیچے والے ہوشیار ہو گئے ہوں گے۔ اس کے باوجود یہ اچھا حربہ تھا اگر ان کے پاس توڑ ہوتا تو وہ پہلے سے کر کے رکھتے۔ اسے دوبارہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بیتے نے چند منٹ بعد رپورٹ دی۔ ”اب یہاں کوئی نہیں ہے۔“

”ہمیں نیچے جانا ہوگا۔“ میں نے میزھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر گورکھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے نیچے

اتارو..... یہ ہماری ڈھال ہوگا۔“

وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ رسی کاٹ کر اسے نیچے اتارا۔ اس کے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے تھے کہ وہ خود کو آزاد نہ کرا سکے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم آگے چلو گے لیکن کوئی آواز نہ نکالنا اور نہ ہی بھاگنے کی کوشش کرنا ورنہ

فوری مارے جاؤ گے۔“

وہ دہشت زدہ تھا مگر میری بات سمجھ گیا اس نے سر ہلایا تھا۔ اسے آگے رکھتے ہوئے ہم دبے قدموں میز ہیوں سے اترنے لگے۔ سب نے گیس ماسک منہ پر فٹ کر لیے تھے۔ چند لمحوں بعد ہم اس میزائٹن فلور پر تھے۔ جس میں میز ہیوں کے چاروں طرف چھوٹی راہداری تھی اور اس سے چاروں طرف مختلف راستے نکل رہے تھے۔ یہاں بھی کوئی نظر نہیں آیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ بیڑے نے ہاتھ کے اشارے سے فتح خان کے آدمیوں کو مختلف سمتوں کو چپک کرنے کا حکم دیا۔ وہ راہداری میں پھیل گئے۔ وہ مختلف راستوں پر دیکھ رہے تھے۔ یہاں بھی گھپ اندھیرا تھا لیکن ٹائٹ ویژن سے سب صاف نظر آ رہا تھا۔ میں میز ہیوں پر تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب دشمن کی طرف سے مزاحمت کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ ایسا تو ممکن نہیں تھا کہ دشمن سکون سے بیٹھ گیا ہو۔ وہ نیچے تھے اور ہماری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

دیکھا جائے تو یہ ناقص حکمت عملی تھی لیکن بڑا کنور ایک چیز سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ سادی اس کے ساتھ تھی اور وہ بھی نچلے فلور پر تھی اس کی وجہ سے ہم اس فلور پر حملے کے دوران کوئی تباہ کن ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے تھے جس کی تباہی کا احاطہ وسیع ہو۔ وہاں ہم صرف آتشیں ہتھیار استعمال کر سکتے تھے اور ان کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود بڑے کنور کو کچھ آدمیوں کو یہاں چھوڑنا چاہیے تھا مگر ایسا لگ رہا تھا اس نے اپنی ساری قوت ایک جگہ جمع کر لی تھی۔ مگر منطق کہہ رہی تھی ایسا ممکن نہیں ہے۔ نیچے کوئی نہ کوئی ٹریپ ہوگا۔ کیا اس صورت میں ہم سب کا ایک ساتھ ہی نیچے جانا مناسب تھا؟ میں نے بیڑے کو بلایا۔ ”میں سوچ رہا ہوں ہمیں خفیہ راستہ بھی استعمال کرنا چاہیے۔“

”وہ کیوں شوبی؟“

”نیچے وہ ہمارے منتظر ہیں اور انہوں نے جان لیا ہے کہ ہم ان میز ہیوں سے نیچے آرہے ہیں۔ اس لیے خفیہ دروازے والی میز ہیوں پر ان کی توجہ اتنی نہیں ہوگی ہم اس طرف سے بھی حملہ کریں تو یہ ان کے لیے غیر متوقع ہوگا۔“

”بات تو سمجھ میں آتا ہے۔“ بیڑے نے سر ہلایا۔

”میں ایک آدمی کے ساتھ اس طرف سے جاتا ہوں کیونکہ میں وہ جگہ دیکھ چکا ہوں۔ تم باقیوں کے ساتھ اسی طرف سے نیچے اترو مگر بہت احتیاط سے کسی ٹریپ کا خیال رکھنا اور اس قیدی کو آگے رکھنا۔ اگر کچھ ہوا تو یہی سب سے پہلے نشانہ بنے گا اور تم لوگ ہوشیار ہو جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے شوبی۔“ بیڑے نے مستعدی سے کہا۔

میں نے فتح خان کے آدمیوں میں سے ایک نوجوان کو پاس بلایا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”سنگین خان۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ اسم باسٹمی تھا۔ نوجوانی کے باوجود چہرے کے تاثرات سنگین تھے۔ جسم دبلا لیکن گٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو کپڑے کے نیچے پتھر لگا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ ہم اوپر والے راستے سے نیچے جائیں گے۔“

ہم واپس آئے اور رشتی کی مدد سے اوپر پہنچے۔ میں نے ریڈیو پر بیڑے سے کہا۔ ”م محفوظ حد تک آگے جاؤ اور

جب کسی کی موجودگی محسوس ہو تو رک جانا جب تک میں نہ کہوں آگے مت جانا۔“
”یس سر۔“ بیتو نے کہا۔

کمرے سے میزھیوں کی طرف کھلنے والا خفیہ راستہ کھولا۔ یہ یقیناً بجلی سے کام کرتا تھا اور اس کی بجلی کا سسٹم بھی الگ تھا ورنہ یہاں کا فیوز اڑ جانے کے بعد اسے بھی کام نہیں کرنا چاہیے تھا مگر وہ کام کر رہا تھا۔ میں آگے تھا۔ پہلے نیچے دیکھا مگر وہاں کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا اور سب سے نچلے فلور پر روشنی ہو رہی تھی۔ خفیہ دروازے کو دوسری طرف سے کھولنے یا بند کرنے کا میکنزم چمپا ہوا تھا اس لیے مجبوراً اسے کھلا چھوڑنا پڑا۔ شاید کچھ دیر بعد وہ خود بند ہو جاتا۔ سنگین مجھ سے چند میٹر حیاں پیچھے تھا۔ وہ ذرا بے احتیاطی سے چل رہا تھا جس سے آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے مڑ کر اسے اشارہ کیا کہ وہ بالکل بے آواز چلے۔ اس نے سر ہلایا اور اب احتیاط سے قدم رکھنے لگا۔ ہر دس بارہ میٹرھیوں کے بعد میں سن گن لیتا تھا کہ نیچے کوئی ہے تو نہیں۔

میں اتنا نیچے آیا کہ مجھے راہداری دکھائی دینے لگی۔ یہاں کسی قدر روشنی تھی، میں نے ٹائٹ ویڈن آف کر دیا۔ پھر جب تک کر دیکھا۔ اگر کوئی اس طرف مگران تھا تو اسے میرے پاؤں پہلے نظر آتے۔ جہاں تک نظر جاتی تھی راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دو میٹر حیاں مزید اتر کر دیکھا اور اس بار مجھے اس کمرے کے سامنے دو افراد دکھائی دیئے جس میں نیچے جانے والا خفیہ راستہ تھا۔ وہ خود کار رائلٹوں سے مسلح اور پوری طرح چوکس تھے۔ ان کی نظریں بھی اسی طرف مرکوز تھیں۔ گویا انہیں اس طرف سے خطرہ تھا۔ اگر میں بے احتیاطی سے اترتا تو وہ مجھے دیکھ لیتے۔ شاید میزھیوں کے ٹوٹے بلبوں سے انہوں نے جان لیا تھا کہ کوئی یہاں سے گزرا ہے لیکن عجیب بات ہے انہوں نے نیچے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے ذرا اوپر ہو کر بیتو سے رپورٹ لی۔ اس نے بتایا۔ ”شوبی ہم نیچے آگیا ہے مگر یہاں کئی آدمی ہے اور ایسا لگ رہا ہے ہمارا انتظار کر رہا ہے۔“
میں فکر مند ہو گیا۔ ”کتنے آدمی ہیں؟“

”پانچ چھ ہے۔“

میری فکر مزید بڑھ گئی تھی۔ ”بیتو ڈیجیٹل میپ پر دیکھو، کیا اس میں یہ خفیہ میزھی موجود ہے۔“
”ایک منٹ ہم دیکھتا ہے۔“ اس نے کہا اور کچھ دیر بعد بولا۔ ”نہیں شوبی ایسا کوئی میزھی نہیں ہے۔ البتہ اس سے آگے والا راہداری موجود ہے جدھر سے آپ آیا۔“
”راہداری میں میزھیوں کی طرف سے الٹی طرف کا تیسرا کمرہ ہے۔“
”بالکل ہے۔“

”اس کے واش روم میں آؤ۔“

”آگیا۔“

”اس میں ایک کونے میں تین دیواروں والا حصہ بنا ہوا ہے سامنے الٹے کونے پر؟“

”نہیں شوبی اس میں ایسا کوئی چیز نہیں ہے۔“

”خبیث۔“ میں غرایا۔

”شوبی ہم کیا کیا؟“ اس نے احتجاج کیا۔

”تمہیں نہیں ایک اور شخص کو کہہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بیٹو واپس آؤ، آگے مت جانا۔۔۔۔۔ اور آکر اسی خفیہ راستے سے نیچے آؤ۔۔۔۔۔ میں پھر کہہ رہا ہوں آگے مت جانا۔“

”ہم آتا ہے۔“ بیٹو بولا اس نے کچھ اور بھی کہا تھا لیکن اس کی آواز فائرنگ کے بے پناہ شور میں گم ہو گئی۔ آواز اتنی شدید تھی کہ یہاں تک بغیر ریڈیو کے بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دو تین بار بیٹو کو پکارا۔ وہ بھی جواب میں کچھ کہہ رہا تھا مگر کچھ میں نہیں آرہا تھا۔ بہر حال اس کی آواز سے مجھے تسلی ہوئی تھی کہ وہ ٹھیک تھا۔ سنگین اس وقت نیچے کی نگرانی کر رہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔

”وہ دونوں آگے آرہے ہیں۔“

”سنگین دونوں کو گراتا ہے۔ بالکل موقع نہیں دیتا ہے۔ میں یہاں سے نیچے کودوں گا۔“ میں نے سیڑھی کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم نیچے آکر دیوار کی آڑ سے انہیں نشانہ بناؤ گے۔ دو طرف سے حملہ ہوگا تو وہ جوابی کارروائی نہیں کر سکیں گے، میری بات سمجھ گئے؟“

”ہم سمجھ گیا۔“

”گڈ! جیسے ہی میں نیچے کودوں اور وہ میری طرف متوجہ ہوں گے تب تم نیچے جاتے ہوئے انہیں نشانہ بناؤ گے۔ دیر کرو گے تو میں مارا جاؤں گا۔“

”آپ فکر نہ کرو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میں نے سر ہلایا اور رینگ سے ہوتے ہوئے نیچے چھلانگ لگادی۔ ابھی میرے پاؤں فرش سے نکلے تھے کہ سنگین کی رائفل گولیاں اگلنے لگی۔ دونوں گارڈز مجھ سے چھ سات گز دور تھے اور مجھے دیکھتے ہی انہوں نے رائفلس سیدھی کرنا شروع کر دی تھیں۔ مگر اس سے پہلے وہ فائرنگ کرتے سنگین نے دونوں کو نشانہ بنالیا تھا۔ وہ جھٹکے کھاتے پیچھے گئے تھے۔ حفظ ما تقدم میں، میں کسی حد تک مڑی سیڑھی کی دیوار کے ساتھ چپک گیا تھا مگر انہیں فائرنگ کا موقع نہیں ملا تھا۔ سنگین نے ان کے سروں کو نشانہ بنایا تھا کیونکہ بلٹ پروف کی موجودگی عین ممکن تھی۔ پاس جاتے ہوئے اس نے رائفل کو سنگل موڈ پر کرتے ہوئے دونوں کو مزید چند گولیاں ماریں۔ میں نے آڑ سے نکلتے ہوئے سیڑھیوں سے آگے نکلنے والے راستے کی طرف دیکھا جہاں سے فائرنگ کا بے پناہ شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دوبارہ بیٹو کو پکارا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”ہم اوپر آگیا ہے پر قیدی اور دو ساتھی مارا گیا ہے۔“

”اوہ! اب جلدی کرو۔۔۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔“ میں نے کہا اور رائفل سیدھی کر کے ان تین گارڈز پر برست مارا جو سامنے سے نمودار ہوئے تھے۔ دو گروے اور تیسرا پلٹ کر بھاگا۔ ان کی طرف سے چلائی چند گولیاں میرے آس پاس سے گزر گئی تھیں۔ مجھے عقب سے عجیب سی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سنگین دونوں ہاتھوں سے اپنا کلا بدلا رہے ہوئے تھا اور اس سے خون پھوٹ رہا تھا۔ گولی اس کی گردن سے گزر گئی تھی۔ وہ گرنے لگا تو میں نے تیزی سے اسے سنبھالا اور نیچے لٹا دیا۔ اس نے گردن اتنی مضبوطی سے پکڑی تھی کہ مجھے زخم دیکھنے کے لیے باقاعدہ زور لگا کر اس کے ہاتھ ہٹانا پڑا تھا اور فوراً ہی خون فوارے کی طرح اچھلا تھا۔ زخم بہت بڑا اور خطرناک تھا۔ اس کا بچنا محال لگ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر ایک منٹ سے بھی پہلے اس نے دم توڑ دیا۔ میں گہری سانس لے کر پیچھے ہوا اور پھر اس

کی رائفل، اضافی ایمونیشن اور بم لے لیے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میری رائفل خالی تھی اس کا میگزین تبدیل کیا۔ پھر میں نے بیٹو سے پوچھا۔ ”کہاں ہو؟“

”سیرھیوں سے نیچے آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”تیزی سے آؤ، یہاں بس میں ہوں۔“

کچھ دیر بعد بیٹو اوپر سے نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے فتح خان کے بچ جانے والے دو ساتھی تھے۔ سنگین کی لاش دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے کھڑے تھے۔ میں نے گہری سانس لی۔ ”مجھے لگ رہا ہے مجھے ٹریپ کیا گیا ہے اور ہمیں جان بوجھ کر اوپر الجھایا گیا تھا۔“

”مگر کیوں؟“

”تاکہ بڑا کنور سادی کو لے کر سیف ہاؤس میں جاسکے۔“ میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

”اس فلور کی لائٹ بھی اڑا دو۔“

فتح خان کے ایک آدمی نے تاریکی میں مدد سے یہاں کا بھی فیوز اڑا دیا۔ روشنی بند ہوتے ہی ہم نے نائٹ ویژن آن کر لیے۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں رکا۔ پھر بیٹو کو اشارے سے پاس بلا دیا۔ ”فائرنگ کون کر رہا تھا؟“

”ہم کو لگ رہا ہے وہاں آٹومیٹک رائفل لگا تھا جیسا ڈیوڈ شانے لگایا تھا کیونکہ وہ پانچ آدمی فائر نہیں کیا۔“

”ایسا ہی کوئی ٹریپ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ آلہ کہاں ہے جو دیواروں کے پار زندہ چیزیں دکھاتا ہے۔“

بیٹو نے اپنے بیک سے وہ آلہ نکال کر مجھے دیا۔ میں نے اسے آن کیا اور کمرے کی طرف رخ کیا مگر وہاں کوئی فرد نہیں تھا۔ میں نے راہداری کے باقی کمرے چیک کیے۔ وہ بھی خالی تھے۔ یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ فلور خالی ہو گیا ہے لیکن کسی ٹریپ کی موجودگی عین ممکن تھی۔ فتح خان کے آدمی سیرھیوں کے پاس تھے۔ بیٹو فکر مند تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شوٹی اب کیا کرتا ہے؟“

”ہمیں نیچے جانا ہے لیکن شاید یہ اتنا آسان نہ ہو۔“ میں نے کہا اور رتی نکال کر ایک ہینڈ گریبنڈ کمرے کے دروازے کے ہینڈل سے لگایا۔ پھر اس کی پن سے رسی منسلک کی اور اسے چھوڑتے ہوئے سیرھیوں تک آئے، یہاں محفوظ پوزیشن لے کر میں نے پن کھینچ لی۔ چند لمحوں بعد زوردار دھماکا ہوا اور دروازہ اڑ گیا۔ دھویں اور گرد کا ایک ریلّا آ گیا تھا۔ اس کے ذریعے ہی ہم تیزی سے آگے آئے۔ مجھے خدشہ تھا کہ دروازے کے ساتھ کوئی ٹریپ نہ لگا دیا گیا ہو۔ اسی لیے میں نے دروازہ ہی اڑا دیا اگر اس کے ساتھ کوئی ٹریپ ہوتا تو وہ بھی اڑ جاتا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا میرا اندازہ غلط تھا۔ ماسک کی وجہ سے ہم دھویں اور گرد سے بھی محفوظ رہے تھے۔ ایک آدمی کو راہداری میں چھوڑا تھا تاکہ کوئی بے خبری میں نہ آجائے۔ میں بیٹو کے ساتھ واش روم میں آیا جہاں خفیہ راستے والا خانہ تھا۔ بیٹو نے دیکھا اور بولا۔

”یہ تو میپ میں نہیں تھا۔“

”اسی لیے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ ہمیں دھوکا دیا گیا ہے۔“

”اب ہم سمجھ گیا آپ نشی کو گالی دے رہا تھا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”وہی شخص اس مشن کی ناکامی کا ذمے دار ہے۔“

”پر شوبی اسے کیا فائدہ ہوا..... وہ بھی تو کنوروں کا دشمن ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ اس نے ڈیوڈا شکے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلائی ہے اور وہ اس زعم میں رہ گیا کہ

اسے کون دھوکا دینے کی جرأت کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نشی دل جی کا اپنا کوئی مقصد ہے جو ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا لیکن جلد سمجھ میں آ جائے گا۔“

”شوبی یہ کیسے کھلے گا؟“

”یہ تو تجھے بھی نہیں معلوم لیکن اسے اڑایا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس صورت میں اندر موجود افراد فوراً

ہوشیار ہو جائیں گے۔ راستہ ایسا ہے کہ اس کا دفاع آسان ہے۔“

”شوبی ذیل حملہ کرو۔“ بیٹو نے تجویز دی۔ ”پہلے اسے اڑاؤ پھر اندر گرینڈ ہیپنک دو۔“

میں نے انکار کیا۔ ”نہیں، مجھے خدشہ ہے سادی نیچے نہ ہو۔“

”اوہ، ہم دیدی کو بھول گیا تھا۔“ بیٹو بولا۔

”پہلے اسے کھولنا ہو گا۔“ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ یہاں گرینڈ لگانے کی جگہ نہیں تھی۔ بیٹو

نے اس کا حل نکالا۔ وہ سیفٹی نینک کا ڈھکن اٹھا لایا اور اسے دروازے کے ساتھ رکھ دیا۔ پھر گرینڈ اس میں پھنسا یا اور رسی گرینڈ کی چابی سے باندھی۔ اسے کمرے تک لائے اور پھر رسی کھینچ لی۔ دھماکا ہوتے ہی بیٹو نے

داش روم کا دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔

”اب سارا دھواں اور گرد نیچے جائے گا۔“

چند منٹ بعد ہم اندر داخل ہوئے تو صاف سحرے اور چمکتے دسکتے داش روم کا حشر ہو گیا تھا۔ خفیہ

دروازے میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا تھا جس سے ایک آدمی گزر کر جاسکتا تھا۔ میں نے زندہ اجسام کی نشان دہی

کرنے والے آلے کو آگے کیا۔ وہ بتا رہا تھا کہ تقریباً پچیس فٹ دور دروزندہ جسم تھے اور وہ حرکت کر رہے تھے۔ وہ

بیڑھیوں والے راستے سے دہرے تھے۔ اب یہ دو فرد کون تھے میں ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ بیٹو

نے مشورہ دیا۔ ”ان کو وارننگ دو کہ ہتھیار پھینک کر سامنے آ جائیں ورنہ اگلا ہم ان کے کٹلے کر دے گا۔“

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور دونوں افراد تیزی سے دہاں سے دور ہٹ گئے۔ وہ اس چھوٹے

ہال میں آنے والی سرنگ کی طرف چلے گئے تھے اور پھر وہ آلے کی ریخ سے نکل گئے۔ مگر خطرہ تھا نیچے بھی خود کار

رائفل کی موجودگی عین ممکن تھی۔ اس قسم کے ہتھیاروں کو مستقبل کی جنگ کے ہتھیار کہا جاتا ہے لیکن یہ جنگوں سے

پہلے عام زندگی میں استعمال میں ہو رہے تھے۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”میں نیچے جا رہا ہوں۔“

بیٹو کے ذہن میں بھی ٹریپ کا خیال تھا۔ اس نے اختلاف کیا۔ ”ہم جائے گا۔“

”میں جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تم اوپر رہو اور جب میں کہوں تو نیچے آؤ ان دونوں کو

بھی بلاؤ۔“

بیٹو سمجھ گیا کہ میں نہیں مانوں گا۔ مجبوراً اس نے ان دونوں کو بلایا اور میں دروازے کے خلا سے ہوتا ہوا

سیڑھیوں پر آگیا۔ یہاں ملبا بکھرا ہوا تھا اور مجھے سنبھل کر اترنا پڑ رہا تھا۔ میں نے زندہ اجسام کی نشان دہی کرنے والا آلہ آگے رکھا تھا اور وہ بتا رہا تھا کہ فی الحال اس کی حد میں کوئی زندہ چیز نہیں تھی۔ چھوٹا ہال خالی تھا۔ میں نیچے تک آیا اور اطمینان کا سانس لیا۔ وہاں کوئی ٹریپ نہیں تھا۔ میں نے ریڈیو پر سرگوشی میں بیٹو کو ان دونوں سمیت نیچے آنے کو کہا۔ چند لمبے بعد وہ بھی نیچے تھے۔ میں نے اشارے سے سب کو بولنے سے منع کیا اس کا پورا امکان تھا کہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہو۔ بیٹو نے فولادی دروازے کی طرف دیکھا اور اشارے سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

میں نے جوابی اشارے سے بتایا کہ ممکنہ طور سیف ہاؤس ہے۔ میں دیوار کے ساتھ رہتے ہوئے آلہ لے کر سرنگ کی طرف بڑھا۔ سرنگ کے پاس آتے ہی اس پر دو دھبے نمایاں ہوئے تھے۔ وہ مشکل سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھے جہاں سے سرنگ ذرا مڑ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ کسی قدر آڑ سے مجھے ایک گاڑی کا پاؤں دکھائی دیا۔ میں نے بلے کا ایک کلز لے کر ان کی طرف اچھال دیا۔ کلز اگر اتو وہ بھڑک کر پیچھے ہوئے تھے۔ پھر ایک نے رائل نکال کر ہال کی طرف برسٹ مارا۔ اس بند جگہ فائرنگ کا شور بے پناہ تھا۔ جیسے ہی اس کی رائل خاموش ہوئی میں نے جوابی برسٹ مارا۔ پھر آلے پر دیکھا وہ پیچھے ہٹ رہے تھے اور پھر آلے کی حد سے نکل گئے۔ میں نے بیٹو کو دہس رکنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھا۔ میں نے رائل سنکل موڈ پر کر لی تھی۔ سرنگ کے موڈ کے پاس آ کر میں نے پھر آلہ دیکھا وہ دونوں اب پندرہ گز کے فاصلے پر تھے۔

میں نے اچانک سامنے آ کر سامنے والے کے پھر پر فائر کیا اور اس سے پہلے وہ جوابی کارروائی کرتے میں دوبارہ آڑ میں آگیا تھا۔ اس میں مشکل سے ایک لمبہ لگا تھا۔ گولی نشانے پر بیٹھی اور گاڑی کی چیخ گونجی تھی۔ اس کے ساتھی نے پھر برسٹ مارا۔ میں آلے پر دیکھ رہا تھا۔ برسٹ مارنے کے بعد دوسرا گاڑی اپنے ساتھی کو سنبھال رہا تھا۔ ممکنہ طور پر اس کی توجہ اب میری طرف نہیں تھی۔ میں دوبارہ آڑ سے نکلا اور اس بار اسے نشانہ بنایا۔ اس بار بھی میں نے اوپری جسم کے بجائے پیروں کا نشانہ لیا تھا۔ گاڑی اپنے زخمی ساتھی کو سہارا دے کر لے جا رہا تھا اور اس کی پشت میری طرف تھی۔ گولی اس کی ران میں اتر گئی اور وہ کراہ کر اپنے ساتھی سمیت گرا۔ اب وہ اپنی رائل سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر رائل کی نال ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ دوسرا پہلے ہی بے حال تھا اس نے ہاتھ اٹھا دیئے اور بولا۔ ”مجھے مت مارتا۔“

”تم صرف ایک شرط پر زندہ رہ سکتے ہو۔“ میں نے رائل کی نال اس کے سینے سے لگادی۔ ”مجھے بڑے کنور کا پتا بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

”بڑا کنور سیف ہاؤس میں جا چکا ہے۔“ اس گور کے گاڑی نے پڑھے لکھے انداز میں کہا۔ اس کی اردو یا ہندی صاف تھی۔ اس نے میرے خدشے کی تصدیق کر دی تھی۔ لیکن میں نے اسے جھٹلایا۔

”بکواس! اتنے گاڑی کے ہوتے ہوئے اسے سیف ہاؤس میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ تو وہی جانے۔“ گاڑی نے کراہ کر کہا۔ گولی نے اس کے گھٹنے کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ شدید تکلیف

میں تھا۔

”باقی گاڑی کہاں ہیں، کم سے کم بیس افراد اور ہونے چاہئیں اور یہاں صرف تم دو ہو؟“

”پندرہ گارڈز بڑے کنور کے ساتھ ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”باقی سات سرنگ کے دوسرے حصوں میں ہیں۔“

”سیف ہاؤس کا دروازہ کیسے کھلتا ہے جب کہ یہ ظاہر کوئی چیز نہیں ہے دروازہ کھولنے والی۔“
 ”بڑے کنور کے پاس اس کا ریوٹ کنٹرول ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”صرف اس کی مدد سے یہ دروازہ کھولا اور بند کیا جاسکتا ہے۔“

میرے مزید کچھ سوالوں کے جواب میں اس نے سیف ہاؤس کی نوعیت بیان کی۔ یہ چاروں طرف سے دس سینٹی میٹر موٹی خاص اسٹیل کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اس کا رقبہ تقریباً دو سو مربع گز تھا۔ اس میں ایک اسٹیل سوٹ اور محافظوں کے کمرے اور ایک خاص کنٹرول روم بھی تھا جس سے پورے پبلک کے خاص خاص حصوں پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ یہاں سے کنٹرول ہونے والے کمرے اور مائیک خفیہ تھے اور سوائے چند خاص افراد کے کسی کو ان کی لوکیشن کا علم نہیں تھا۔ سیف ہاؤس میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ یہ بم کے حملے سے بھی محفوظ تھا۔ اسے پبلک پر قبائلیوں کے حملے کے بعد تعمیر کرایا گیا تھا اور اس کے لیے خاص طور سے جرمنی سے انجینئر اور سامان آیا تھا۔ تعمیراتی مزدور بھی نامعلوم مقام سے لائے گئے تھے۔ جنہیں کام کے بعد یہاں سے لے جایا گیا تھا۔ اس کے خاص اسٹیل کو صرف تین ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا شعلہ کاٹ سکتا ہے اور اس میں سوراخ کرنے کے لیے جتنی گیس درکار ہوگی اسے حاصل کرنا ہی بہت مشکل ہے۔ دوسرے لفظوں میں سیف ہاؤس تک رسائی ناممکن تھی۔

”کیا باہر کسی طریقے سے اندر رابطہ کیا جاسکتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”چھوٹے ہال میں مائیک لگے ہوئے ہیں اور وہاں موجود ہر فرد کو اندر دیکھا جا رہا ہو گا۔“ گارڈ نے جواب دیا تو میں چونکا اور ریڈیو پر بیٹو سے کہا۔
 ”تم تینوں فوراً سرنگ میں آ جاؤ۔“

بیٹوان دونوں کو لے کر آ گیا۔ میں نے اسے مختصراً گارڈ سے حاصل شدہ معلومات سے آگاہ کیا۔ بیٹو مضطرب ہو گیا۔ ”شوہن اب کیا کرے وہ دیدی کو اندر لے گیا ہے۔“
 ”یہی نہیں بڑا کنور ہماری یہاں موجودگی سے بھی واقف ہے۔ مجھے یقین ہے ان سرنگوں میں خفیہ کمرے در مائیک ہوں گے جنہیں تلاش کرنا ممکن نہیں ہے۔“

”ہمارے بارے میں بے شک جان جائے پر ہم اندر کیسے جاسکتا ہے؟“

یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا۔ مگر اس سے پہلے کچھ سوال اور بھی ذہن میں آرہے تھے۔ میں نے گارڈ سے پوچھا۔ ”تم لوگ آپس میں کس طرح رابطہ کرتے ہو؟“

اس نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا لیکن نہایت جدید واک ٹاکی سیٹ نکالا۔ ”تمام گارڈز کے پاس یہ ہوتا ہے ہم اسی سے ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں۔“

میں نے اسے نظر جما کر دیکھا۔ ”تم مجھے پہچانتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آپ ادھر بڑے کنور کے پاس تھا۔ میں نے آپ کو کئی بار دیکھا تھا۔“

”میں بڑے کنور کا دوست نہیں ہوں لیکن میں اس کا جانی دشمن بھی نہیں ہوں، میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ

میرا پیچھا چھوڑ دے لیکن کچھ لوگ اس کی جان کے دشمن ہیں اور وہ اسے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان میں سر فہرست نشی دل جی ہے۔ یہاں حملے کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا اور ہم اسی وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ گھر کا بھیدی تھا۔ مگر اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی استعمال کیا ہے۔ اس وقت پیلس میں موجود میرے سارے ساتھی مارے جا چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان کی ہلاکت کے پیچھے نشی دل جی ہے۔ اس سے پہلے اس نے ہمارے ہاتھوں کنور پیلس کی سکیورٹی کو ختم کر لیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت یہاں آنے والا ہے اور اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں ہے بلکہ یہاں پیلس میں اس کے چھپے حای موجود ہیں جو اس کی مدد کریں گے۔

گارڈ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”آپ مجھے کیوں بتا رہے ہو، میں کیا کر سکتا ہوں۔“
میں کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہیں نہیں اسے بتا رہا ہوں جو سب کچھ کر سکتا ہے۔ بڑے کنور کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟“

جواب میں خاموشی رہی تھی۔ میں نے پھر کہا۔ ”میں نشی دل جی کا منصوبہ سمجھ چکا ہوں اور تم یہ مت سمجھو کہ تم سیف ہاؤس میں محفوظ رہو گے، مجھے یقین ہے اس کے پاس تمہارے لیے بھی کوئی سر پرانز ہوگا۔ دیر کرو گے تو پھر موقع نہیں ملے گا ابھی وقت ہے مجھ سے بات کر لو۔“

ایک بار پھر خاموشی طاری رہی تھی لیکن میں تیسری بار بولنے جا رہا تھا کہ میرے ہاتھ میں موجود واکی ٹاکی سے ہپ ابھری۔ میں نے اس کے ریسیور کا بٹن آن کر کے کان سے لگایا۔ ”ہیلو.....“
”شہباز.....“ دوسری طرف سے بڑے کنور کی مخصوص ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ میں چھوٹے ہال کی طرف چلا آیا۔

”اس کا مطلب ہے تم نے سنا ہے جو میں نے کہا ہے؟“
”ہاں میں نے سب سن لیا ہے اور میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“
”میرا خیال ہے وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب تم مجھ سے متفق ہو جاؤ گے۔ میں نے جو کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔“

”پیلس پر حملہ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہے؟“
”ہاں نشی دل جی ہمارے ساتھ شامل ہے۔“
”لیکن اصل میں حملہ تم نے کیا ہے، تم سادھنا کو لے جانا چاہتے ہو؟“
”چلو تم ایسا ہی سمجھو..... ہمارا منصوبہ کامیاب رہا..... مگر عین موقع پر سب الٹ پلٹ گیا۔ باہر سے میزائل مار کر اندر موجود دونوں اے پی سی تباہ کر دیں۔ اسنا پرنے نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔“ میں نے کہا۔
”یہ بتاؤ کیا رامن تمہارے ساتھ ہے؟“
”نہیں وہ کہیں اور ہے۔“

”پتا نہیں تم ٹھیک کہہ رہے ہو یا نہیں بہر حال میں حملہ آوروں کے ساتھ نہیں تھا بلکہ بد قسمتی سے اس سے پہلے پیلس کے دو آدمیوں نے مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ وہ مجھے یہاں لائے اور رامن نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا اور ان دونوں کو قید کر دیا کہ وہ تمہیں نہ آگاہ کر سکیں۔ میں قید خانے والی عمارت میں تھا۔“

بڑے کنور کے لہجے میں حیرت آئی۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”اس کا ثبوت سرنگ میں میری موجودگی تھی۔ مجھے تو نیلی کا پڑ سے اترنے والی ٹیم کے ساتھ آنا تھا لیکن میں قید خانے کی عمارت میں تھا اور جب وہ میزائل حملے میں تباہ ہوئی تو میں نے اتفاق سے خفیہ راستہ تلاش کر لیا۔“

”شہباز مجھے لگ رہا ہے تم سچ نہیں کہہ رہے ہو۔“

”اس کے برعکس مجھے لگ رہا ہے تم میری بات کو تسلیم کر رہے ہو ورنہ اب تک مجھے جھٹلا چکے ہوتے۔

بہر حال میرے آدمی دو بکتر بند گاڑیوں میں اندر آئے اور تمہیں سن کر تعجب ہو گا وہ ان ہی میزائلوں کا نشانہ بن گئے جن سے پبلک کی عمارتوں کے داخلی دروازے تباہ کیے گئے تھے، مقصد اندر موجود لوگوں کو باہر نکلنے سے روکنا تھا۔ جو اسنا پھر تمہارے گاڑیوں کو نشانہ بنا رہے تھے انہوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی اور مجھے مجبوراً قید خانے والی عمارت میں واپس آنا پڑا تھا۔ کیا تم مجھ سے کہہ سکتے ہو کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟“

بڑا کنور کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تھا پھر اس نے پوچھا۔ ”منشی دل جی کس طرح سے تمہارے ساتھ

شامل ہوا؟“

”اس کے ساتھ دو درجن یا اس سے زائد مقامی مسلح افراد ہیں اور اس کی ذمہ داری کنور پبلک کے باہر کسی مدد کو یہاں تک آنے سے روکنا تھا جیسے پولیس یا کوئی بھی جو کنور پبلک آنا چاہے۔ یہ بتاؤ کیا تمہارا اب پبلک سے باہر رابطہ نہیں ہے، تم مدد طلب نہیں کر سکتے؟“

”تمہارے ساتھ آدمی کہاں سے آئے؟“ اس نے میرا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

”یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے۔ کنور میں تمہارا دشمن نہیں ہوں میں صرف سادی کو واپس لینے آیا ہوں۔ وہ میری بہن اور میرے دوست کی بیوی ہے۔ تم اچھی طرح جان گئے ہو گے کہ وہ اس زندگی سے کتنا خوش ہے وہ اپنا ماضی بھول چکی ہے۔ سادی کے ناتے میں نے کبھی تمہاری یاراج کی جان لینے کی کوشش نہیں کی حالانکہ مجھے بہت مواقع ملے۔ مجھے یہ معلوم بھی تھا تم دونوں مجھ سے دشمنی سے باز نہیں آؤ گے۔“

”مجھے تسلیم ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”لیکن منشی دل جی تمہارے پورے خاندان کا دشمن ہے۔ اس کا مقصد اس جائیداد اور جاگیر پر قبضہ کرنا

ہے۔“

”وہ کسی صورت ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ میرے بعد راج اور اس کے بعد اس کے لڑکے اس جاگیر کے وارث

ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن منشی دل جی کی باتوں سے لگا کہ اسے پورا یقین ہے وہ اس جاگیر کا مالک بن

جائے گا۔ ورنہ تم سوچو وہ اس خطرناک مہم میں کیوں ہمارا ساتھ دیتا۔“

بڑا کنور کسی قدر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ جب وہ نہیں بولا تو مجھے کہنا

پڑا۔ ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”مجھے تمہاری بات کا کسی حد تک یقین آ گیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اس صورت میں تم فوری یہاں سے نکلو اور میرے ساتھ چلو۔“

”میں اور سادھنا سیف ہاؤس میں محفوظ ہیں۔“

”یہ بتاؤ کہ منشی دل جی سیف ہاؤس سے واقف ہے؟“

”بالکل واقف ہے۔“

”کیا یہ اسی کی مگرانی میں تعمیر ہوا ہے؟“

”نہیں یہاں تمہارا اندازہ غلط ہے اسے ایک جرمن انجینئر نے ڈیزائن اور اپنی مگرانی میں تعمیر کرایا ہے۔“

منشی دل جی کا اس کی تعمیر میں کوئی کردار نہیں تھا۔“

”پھر بھی وہ اس کے فنکشنز کے بارے میں تو جانتا ہے نا..... مجھے یقین ہے وہ سیف ہاؤس میں رسائی

حاصل کر سکتا ہے۔“

”وہ یا کوئی دوسرا فرد یہاں نہیں گھس سکتا۔“ اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”اگر وہ یہاں گھس نہیں سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ وہ پھر یہاں کیوں آ رہا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم کچھ

زیادہ ہی خوش فہمی کا شکار ہو۔ سیف ہاؤس یا ایسی چیزیں انسان کے ارادے سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتی ہیں۔

کہنے کو تمہاری سیوری بھی بہت مضبوط ہے لیکن دیکھ لو ضرورت کے وقت یہ کام نہیں آئی۔“

بڑے کنور سے گفتگو کرتے ہوئے میرے ذہن میں پھر وہی سوال آ رہا تھا کہ جب منشی دل جی اس جاگیر کا

مالک نہیں بن سکتا تھا تو وہ یہ ساری تنگ و دو کیوں کر رہا تھا؟ منشی دل جی نہایت شاطر اور گریہ مسکینی لیے ہوئے ایسا

فحص تھا جس کے ظاہر و باطن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ کسی بڑے مقصد کے تحت ہی یہ سب کر رہا تھا۔

صرف بدلہ لینے کے لیے وہ اس حد تک نہیں جا سکتا تھا۔ بڑے کنور نے میری بات پر کہا۔ ”مجھے خوش فہمی نہیں ہے

لیکن سیف ہاؤس سچ سچ محفوظ ہے۔ تم جانتے ہو امریکی صدر کی رہائش گاہ وائٹ ہاؤس کے نیچے بھی ایسا ہی ایک

سیف ہاؤس ہے تم اسے تقریباً اتنا ہی محفوظ سمجھ سکتے ہو۔“

”یہ بحث بے کار ہے کہ سیف ہاؤس کتنا سیف ہے۔ مجھے یہ خیال پریشان کر رہا ہے کہ منشی دل جی کا

یہاں ایسا کون سا مفاد ہے جس کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا۔ تم نہیں جانتے اس مشن کو ناکام بنا کر اس نے

صرف مجھے ہی نہیں ایک اور بہت بڑی شخصیت کو اپنا دشمن بنا لیا ہے اور ایسا وہ بلا مقصد نہیں کر سکتا۔ کیا تم بتا سکتے ہو

کہ کنور پیلس یا تم سے منشی دل جی کا ایسا کون سے مفاد وابستہ ہے؟“

بڑا کنور کچھ دیر خاموش رہا تھا پھر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں ایسے کسی مفاد سے واقف نہیں

ہوں۔“

”اگر تم سچ سچ کسی ایسے مفاد سے ناواقف ہو تو جلد تم واقف ہو جاؤ گے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز

میں کہا۔ ”کیا تمہارے دوسرے گارڈز جن کے پاس یہ واک ٹاکی ہے ہماری گفتگو سن سکتے ہیں؟“

”نہیں جب تک کال ندکی جائے کوئی ہماری بات نہیں سن سکتا۔“

”کیا تم سیف ہاؤس سے پیلس کے بیرونی حصوں پر نظر رکھ سکتے ہو؟“

”ہاں یہاں ایسا سٹم ہے جو پیلس کے سوسے زائد حصوں کو دکھا سکتا ہے۔“

”تب بہتر ہو گا تمہارے آدی مسلسل کیمروں پر نظر رکھیں۔“

”شہباز تم میری اتنی خیر خواہی کیوں کر رہے ہو؟“ بڑے کنور نے بہت دیر بعد کام کا سوال کیا۔

”مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے، مجھے صرف سادی کی فکر ہے کہ وہ محفوظ رہے۔ نشی دل جی جتنا تمہارا دشمن ہے اتنا ہی تمہارے بہن بھائیوں کا بھی دشمن ہے۔ اگر اس نے یہاں ٹیک اوور کر لیا تو وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

”مجھے یقین نہیں ہے کہ نشی ایسا کر سکتا ہے۔“

”میں ہنسا۔“ تمہارا مطلب ہے کہ وہ اپنا کا پجاری.....“

”میرا مطلب ہے وہ یہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔“ بڑے کنور نے ناگواری سے کہا۔ ”تم اسے

کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہو۔“

”تمہارے باقی گارڈز کہاں ہیں؟“

”تمہیں ان سے کیا ہے؟“

”اگر تم چاہتے ہو کہ مزید کوئی اور یہاں داخل نہ ہو تو انہیں اس سرنگ کے تمام داخلی راستوں کی نگرانی کا حکم دو۔“ میں نے کہا۔

”سیف ہاؤس کے سامنے والے چھوٹے ہال میں، میں اور میرے ساتھی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا۔

میں نے فتح خان کے آدمیوں کو حکم دیا کہ دونوں زخمی گارڈز کو چھوٹے ہال میں لے آئیں۔ وہ انہیں یہاں لے آئے۔ زخموں کی مرہم پٹی تو ممکن نہیں تھی لیکن خون روکنے کے لیے ان کے زخموں پر گدیاں رکھ کر اوپر سے پیپ کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ان سے اسلحہ لے لیا تھا۔ میں اس معاملے میں ان پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تک وہ مارے خلاف لڑتے رہے تھے ان کے کتنے ہی ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بڑے کنور کی طرف سے میں ہتھیار ڈالنے کا کوئی حکم بھی نہیں ملا تھا اس لیے وہ بدستور دشمن اور حالت جنگ میں تھے۔ میں نے انہیں دربار کر دیا کہ اگر انہوں نے کوئی غلط حرکت کی تو نتیجے کی ذمہ داری ان پر ہوگی۔ بیٹو زندہ اجسام کی نشان دہی کرنے والے آلے کے ساتھ بیڑھیوں پر تھا تا کہ کوئی بے خبری میں اس طرف سے نہ آجائے۔ باقی سرنگ کی نگرانی کرنا آسان تھا۔ فتح خان کے دونوں آدی وہیں لگا دیئے تھے اور میں ہال میں تھا۔ میں فولادی وائے کا معائنہ کر رہا تھا۔ یہ اتنا چمک دار تھا جیسے اسٹیل کے بجائے چاندی سے بنا ہو۔ ہاتھ پھیرنے پر بھی یہ بے سلس دے رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے لیے بیٹو سے آلہ لے کر اسے سیف ہاؤس پر چیک کیا تو اس کے سر کی طرف چند زندہ اجسام دکھائی دیئے مگر یہاں آلے کی ریخ صرف دس فٹ رہ گئی تھی۔ میں نے آلہ بیٹو کو پس کر دیا۔

”شوہی۔“ کچھ دیر بعد بیٹو نے ریڈیو میں کہا۔ ”ادھر کچھ لوگ ہے۔“

میں تیزی سے بیڑھیوں پر آیا۔ بیٹو تباہ شدہ دروازے کے نیچے بیٹھا تھا اور اس نے آلے کا رخ سامنے کر

رکھا تھا۔ اس پر تین سرخ نقطے حرکت کر رہے تھے۔ وہ پچیس فٹ سے زیادہ دور تھے اس کا مطلب تھا وہ کمرے سے باہر راہداری میں تھے۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”اگر یہ واٹس روم میں آئیں تو گریڈ استعمال کرنا۔“

”شوہی، ان میں فتح خان نہ ہو۔“

”اگر وہ ہوتا تو ریڈیو پر رابطہ کر سکتا تھا اور دوسرے یہ تین ہیں باقی دو کون ہیں۔ نہیں یہ دشمن ہیں۔“ میں نے کہا۔ اسی لمحے واکی ٹاکی نے ہپ دی۔ میں اسے لے کر نیچے آیا۔ ”کیا ہوا؟“

”کنور پیلس کے بیرونی کیمرے ایک ایک کر کے ناکارہ ہو رہے ہیں۔“ بڑے کنور نے پہلی بار کسی قدر فکر مندی سے کہا۔

”ایسا صرف گھر کا بھیدی کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”باہر تمہارے جو آدمی ہیں ان سے رابطہ ہے؟“

”کچھ سے رابطہ ہے لیکن وہ سب عمارتوں میں محصور ہیں۔“

”پھر بھی انہیں حکم دو کہ وہ چیک کریں۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”یہاں سرنگ میں سیف ہاؤس سے باہر کتنے آدمی ہیں؟“

”سات آدمی ہیں دو تمہارے ساتھ ہیں۔“

”اور پندرہ تمہارے ساتھ ہیں۔“

”ان کو بھول جاؤ دروازہ نہیں کھلے گا۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”میرے ساتھ تمہارے دونوں آدمی زخمی ہیں ان کے پیروں میں گولیاں لگی ہیں اور وہ میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ میرے ساتھ تین آدمی ہیں۔ اس طرح ملا کر کل گیارہ افراد ہوئے۔ پھر تمہارے آدمی مجھ پر اور میرے آدمیوں پر اعتماد بھی نہیں کریں گے۔ اس صورت میں ہم مل کر باہر سے آنے والوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟“

”میں اپنے آدمیوں سے بات کرتا ہوں۔“ اس بار بڑے کنور نے خود پیشکش کر دی۔ ”وہ زخمی ہونے کے باوجود تم سے مل کر آنے والوں کا مقابلہ کریں گے۔ باقی بھی تمہارے ساتھ مل کر اس جگہ کا دفاع کر سکتے ہیں۔“

لیکن میں بڑے کنور کے آدمیوں پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ان سے کہو کہ وہ جہاں ہیں وہیں اپنا کام کریں اس جگہ کی ذمہ داری ہماری ہے۔ وہ میرے کام میں مداخلت نہ کریں اور میں ان کو نہیں چھیڑوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بڑے کنور نے کہا۔ ”کیمرے ناکارہ ہونے کا عمل جاری ہے اور اس وقت نصف کیمرے ناکارہ ہو چکے ہیں۔“

”تم مانویا نہ مانویہ نشی دل جی کا کام ہے وہی گھر کا بھیدی ہے۔“ میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ مجھے اوم آنے والوں کی فکر تھی۔ بیٹو ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے مجھے اطلاع دی۔

”وہ کمرے میں آ گیا ہے۔“

میں اوپر آیا اور بیٹو سے آہ لے لیا جس کی اسکرین پر تین سرخ دھبے حرکت کر رہے تھے۔ میں نے ہچا نیچے بھیج دیا۔ تینوں افراد کمرے میں حرکت کر رہے تھے جیسے کمرے کی تلاشی لے رہے ہوں۔ کوئی آواز نہیں

کیونکہ واش روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے گرینڈ نکال لیا تھا میرا ہنایہ آخری گرینڈ تھا لیکن سنگین سے حاصل کیے چار گرینڈ، چار اسموک بم اور ایک واٹس بم باقی تھا۔ واٹس بم کی جگہ نہیں تھی اس لیے اسے جیکٹ کی کلائی میں موجود پاکٹ میں رکھ لیا تھا۔ جیکٹ پھولی سی تھی اس لیے کلائی پر غور کیے بغیر اس کی موجودگی کا پتا چلانا ممکن نہیں تھا۔ تینوں میں سے ایک واش روم کے پاس تھا۔ اچانک اس نے دروازہ کھول کر کوئی چیز اندر پھینکی اور میری جھٹی حس نے خبردار کیا۔ میں نے بے ساختہ میز ہیروں سے نیچے چھلانگ لگائی اور ابھی نصف راستے میں تھا کہ خوفناک دھماکا ہوا۔ خفیہ دروازے سے آگ کا ایک طوفان برآمد ہوا تھا جس نے چھوٹے ہال تک میرا پیچھا کیا اور اگر میں لڑھک کر ایک طرف نہ ہو جاتا تو یہ مجھ تک آ جاتا۔ نیچے گرتے ہی میں اٹھا تھا اور چلا کر بیٹہ کو آواز دی۔

”ہم ادھر ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ فتح خان کے دونوں آدمی دوڑے آرہے تھے میں نے دھاڑ کر کہا۔
”تم یہاں کیوں آرہے ہو واپس جاؤ۔“

وہ واپس بھاگے تھے۔ میں نے میز ہیروں کی طرف دیکھا۔ آلہ کہیں گر گیا تھا اور اب نظر نہیں آرہا تھا۔ بلے میں اسے تلاش کرنا مشکل تھا اور اس کے لیے وقت چاہیے تھا۔ یہاں وقت بالکل نہیں تھا اور پر والے کسی لمحے نیچے آسکتے تھے اور اگر وہ ایسا ہی ایک بم یہاں پھینک دیتے تو ہمارے بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ جیسے ہی دھواں کم ہوا اور واش روم میں لگی آگ کی روشنی دکھائی دینے لگی میں نے گرینڈ اندر پھینک دیا۔ اس دوران میں واکی ٹاکی مسلسل بپ دے رہا تھا لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔ دھماکے سے پہلے میں آڑ میں ہو گیا تھا اور مجھے خوشی ہوئی جب دھماکے کے ساتھ جیٹیں بھی سنائی دی تھیں۔ وہ نیچے آنے کی کوشش کر رہے تھے اور گرینڈ کا نشانہ بن گئے تھے۔ اس بار زیادہ تباہی پھیلی تھی اور واش روم کا خاصا بڑا حصہ بلے کا ڈھیر بن گیا تھا۔ میری کوشش تھی کہ یہ راستہ بند ہو جائے۔

اوپر والوں کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو میں بلے میں آلہ تلاش کرنے لگا۔ وہ مشکل سے چار بائی چھ انچ کا تھا اور اس کا ایک طرف والا حصہ مکمل اسکرین تھا۔ دیکھنے میں مضبوط لگتا تھا لیکن کہا گیا جاسکتا تھا کہ اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میری کوشش ناکام رہی۔ آلہ پتا نہیں کہاں گیا تھا؟ بیٹہ میرے ساتھ تھا اور وہ اوپر کی گمرانی کر رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شوٹی ادھر تو راستہ بند ہو گیا ہے۔“

”نہیں ابھی کھلا ہے اسے بند کرنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے ان تین کے پیچھے اور لوگ بھی آئے ہوں گے۔“
”کیسے بند کرو گے؟“

”مجھے اوپر جانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کمرے میں آگ لگ جائے تو زیادہ اچھا ہوگا وہاں فرنچیز اور کارپٹ کے ساتھ پردے ہیں۔ اس کے بعد وہاں سے اندر آنا ممکن نہیں ہوگا۔“
”آگ کیسے لگائے گا؟“

”یہ تو اوپر جا کر دیکھنا ہوگا۔“ میں نے واش روم سے آتا شعلوں کا انکاس دیکھ کر کہا۔ ”گرینڈ کے استعمال سے آگ لگ سکتی ہے لیکن بعض اوقات لگی آگ بھی بجھ جاتی ہے۔“

میں نے رائفلیں بیٹہ کو تھما دیں یہ مشکل کر رہی تھیں۔ پستول نکال کر میں اوپر کی طرف بڑھا۔ اب میز ہیروں پر اتنا ملبا آ گیا تھا کہ اس کے قد پر ہی ختم ہو کر رہ گئے تھے اور مجھے بہت احتیاط سے اوپر جانا پڑ رہا تھا

ورنہ پاؤں سلپ کرتا تو میں واپس نیچے آتا۔ نیچے گرنے سے میری چوٹوں میں اضافہ ہوا ہوگا لیکن اس وقت مجھے ان کا ہوش نہیں تھا۔ بہر حال کوئی چوٹ یا زخم ایسا نہیں تھا جو مجھے حرکت کرنے سے روک دیتا۔ دھماکوں نے دروازے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا مگر اندر ایک بڑا لمبے کا ڈھیر رکاوٹ بن کر موجود تھا۔ میں نے پہلے اندر جھانکا اور اس کے لیے ٹائٹ ویژن بند کیا وہاں روشنی تھی۔ واش روم میں جا بجا آگ لگی تھی اور گوشت جلنے کی بو آرہی تھی۔ یہ بوان کے گوشت کی تھی جو فرشتہ اجل کے پیام بر بن کر آرہے تھے مگر خود اس کا شکار ہو گئے۔ میرا دل پہلے ہی خراب ہو رہا تھا میں نے یہ مشکل خود کو قے کرنے سے روکا۔

سانس روک کر میں اندر داخل ہوا اور خاصی مشکل سے اندر آیا۔ مجھے گرالمبا ہٹانا پڑا تھا۔ سیڑھیوں کا ابتدائی حصہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ ایک اور گرینیڈ اسے مکمل طور پر بند کر سکتا تھا۔ اندر دو لاشیں تھیں اور دونوں کی حالت بری تھی۔ ایک نب میں پڑا تھا اور دوسرا کموڈ پر گرا ہوا تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ تیسرے فرد کو نہ پا کر میں محتاط ہو گیا تھا لیکن اس کی لاش کمرے میں واش روم کے دروازے پر پڑی تھی اس نے غالباً اندر جھانکا تھا کہ گرینیڈ کا نشانہ بن گیا اس کا چہرہ تقریباً اڑ گیا تھا۔ اس سے نظر بچاتے ہوئے میں اندر آیا اور بیڈ شیٹ کھینچ کر اسے واش روم میں لایا اور آگ دکھا کر دوبارہ بیڈ روم میں آیا۔ میں نے پہلے پردوں کو آگ دکھائی۔ پھر جلتی چادر کو بیڈ پر پھینک دیا۔ لکڑی کی ایک تپائی آگ میں رکھی تو اس نے کچھ دیر میں آگ پکڑ لی تھی اسے ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ رکھا۔ الماری کے پت کھولے اندر سوٹ لنگ رہے تھے میں نے ایک سوٹ نکال کر اسے آگ دکھائی اور الماری میں پھینک دیا۔ اتنی دیر میں اندر اچھا خاصا دھواں بھر گیا تھا اور اگر میرے منہ پر گیس ماسک نہ ہوتا تو سانس لینا بھی محال ہو جاتا۔ اوپر سے گرمی بھی ہو گئی تھی۔

میں بیڈ کے دوسری طرف تھا کہ اچانک ہی دروازہ کھلا اور میں وہیں نیچے گر گیا۔ بیڈ سے اٹھتے شعلوں نے میرا پردہ رکھ لیا تھا۔ کسی نے اندر جھانکا اور فلمی انداز میں بولا۔ ”ادھر تو زک بن رہا ہے..... باپو اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟“

”زک میں۔“ میں نے دل میں کہا اور بیڈ کی آڑ سے سرکتے ہوئے اسے پستول سے نشانہ بنایا کیونکہ اس نے زک میں قدم رکھ دیا تھا اور فوراً ہی وہ زک میں داخل ہو گیا۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی تھی۔ وہ پلٹ کر گرا تو کسی نے باہر سے برسٹ مارا۔ میرے پاس صرف پستول تھا اور یہ خود کار داخل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور ایک گرینیڈ باہر پھینک دیا۔ گرینیڈ گرتے ہی کوئی چلایا اور افراتفری مچی تھی وہ بھاگ رہے تھے۔ دھماکا ہوتے ہی میں اٹھ کر بھاگا کیونکہ میرے پاس بس یہی چند لمحے تھے۔ کمراپوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ واش روم میں داخل ہو کر میں راستے تک آیا اور اس سے باہر نکل کر گرینیڈ سے پن نکال کر عین دروازے کے لمبے کے اوپر رکھ دیا اور پھر خود تقریباً پھسلتا ہوا نیچے پہنچا تھا کہ اوپر دھماکا ہوا۔ لمبے کی بارش میں بھیگتا ہوا میں دیوار کی آڑ میں ہوا تھا۔ سر پر کچھ لگا تھا دھکن کے ساتھ نمی کا احساس ہوا۔

میں نے چھو کر دیکھا زخم سے خون نکل رہا تھا مگر یہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ گرد اور دھواں جھوٹے ہال تک آرہا تھا۔ دونوں زخمی گارڈ زکھائیں رہے تھے اور بیٹو وہاں نہیں تھا۔ میں نے ریڈیو پر اسے آواز دی۔ ”تم کہاں ہو؟“

مگر بیٹو کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ میں مضطرب ہو گیا۔ میں نے فتح خان کے آدمیوں سے پوچھا۔ ”تم دونوں کہاں ہو؟“

اس بار بھی جواب نہیں آیا۔ میں نے جیکٹ سے ریڈیو نکالا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گزرنے پڑنے کے دوران میں اسے ضرب لگی تھی اور وہ آف تھا۔ میں نے اسے آن کیا مگر اس کی روشنی نہیں جلی۔ اسے تھپکا اور زور سے ہاتھ مارا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ ریڈیو نے بہت غلط موقع پر جواب دیا تھا۔ بیٹو کو میں نے یہاں رہنے کو کہا تھا۔ وہ بنا کسی وجہ کے یہاں سے نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے ہوش والے گارڈ سے پوچھا۔ ”میرا ساتھی کہاں گیا ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم، وہ اچانک سرنگ کی طرف چلا گیا۔“

یقیناً بیٹو کو فتح خان کے ساتھیوں کی طرف سے کوئی پیغام ملا ہوگا۔ میں کیونکہ اوپر مصروف تھا اس لیے بیٹو یا تو مجھے سے رابطہ نہیں کر سکا یا اسی وقت ریڈیو خراب ہوا اور وہ مجھے بتا نہیں سکا۔ دھماکے نے سیزم کی اوپری حصے کو گرا کر راستہ بند کر دیا تھا۔ اب کوئی بے خبری میں نہیں آسکتا تھا جب تک وہ راستہ صاف نہیں کرتا۔ اس طرف سے اطمینان کے بعد میں سرنگ کی طرف بڑھا۔ فتح خان کے آدمی مشکل سے بیس گز دور تعینات تھے مگر اب مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیٹو سمیت دونوں غائب تھے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے ایک چھوٹی سی سیاہ شے نیچے پڑی دکھائی دی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو مجھے لگا جیسے یہ ریڈیو کا کوئی حصہ ہو۔ میں نے اپنا ناکارہ ریڈیو نکال کر اس سے موازنہ کیا تو جیج ریڈیو کا ایک ٹکڑا ثابت ہوا تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔ اس ٹکڑے کا پایا جانا کسی گڑبڑ کی نشان دہی کر رہا تھا۔ یہاں کچھ ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہ ٹوٹا تھا۔ اس کے باقی ہیں سمیٹ لیے گئے تھے لیکن یہ رہ گیا تھا۔ میرے پاس صرف پستول تھے اور دونوں رائفلیں بیٹو کو دے گیا تھا اور اب وہ اسلحہ سمیت غائب تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس وقت سب میری توقع کے خلاف جا رہا تھا۔ پہلے میں پکڑا گیا، پھر حملہ ناکام رہا اور کرنل اپنے آدمیوں سمیت مارا۔ پھر فتح خان آتے ہی غائب ہو گیا اور اس کا کچھ بتا نہیں چلا۔ بڑے کنور نے بہت چالاکی سے مجھے اس چھوٹے ہال سے ہٹایا اور سادی سمیت سیف ہاؤس میں چلا گیا۔ اب بیٹو غائب تھا۔ میں نے پستول سامنے رکھا تھا اور بے قدموں چل رہا تھا۔ اچانک مجھے واکی ٹاکی کا خیال آیا اور میں نے اسے نکال کر اس کا معائنہ کیا۔ اس پر ایک سے لے کر صفر تک نمبر موجود تھے۔ میں نے ایک نمبر دبایا اور کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بپ جاری تھی۔ پھر بڑے کنور نے کال ریسیو کی۔ اس نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ”شبہاؤ تم کہاں تھے؟“

”میں اوپر سے آنے والا راستہ بند کر رہا تھا۔ دشمن نے وہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے، میں نے سیزمیاں تباہ کر دی ہیں۔“

”وہ سرنگ میں گھس آئے ہیں۔ تمہارا ساتھی ٹریپ ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں کال کر کے خبردار کرنا چاہا لیکن تم کال ریسیو نہیں کر رہے تھے۔“

”وہ اسے کہاں لے گئے ہیں؟“

”میں نہیں جانتا کیونکہ اب سرنگ میں لگے کیمرے بھی ناکارہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔“ بڑے کنور نے

مضطرب لہجے میں کہا۔ ”صرف چند سڑکوں کے کیرے کام کر رہے ہیں۔“

”میں جس جگہ ہوں کیا یہاں کا کیرا کام کر رہا ہے؟“

”نہیں تم نظر نہیں آ رہے ہو۔ تم کہاں ہو؟“

میں نے اسے اپنی لوکیشن بتائی۔ ”یہاں روشنی بند ہے شاید اس لیے کیرا کام نہیں کر رہا ہے؟“

”یہ کیرے تار کی میں بھی کام کرتے ہیں۔“

ٹائٹ ویڈن گرد کی وجہ سے دھندلا گئی تھی۔ میں نے اسے اتار کر پھونک مار کر صاف کیا اور دوبارہ لگایا۔

”جہاں کیرے کام کر رہے ہیں وہاں کوئی نظر آ رہا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے خطرہ سر پر آ چکا ہے۔ اب بھی وقت ہے تم سادی کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔۔۔۔۔“

ممکن ہے کچھ دیر بعد وقت تمہارے ہاتھ میں نہ رہے۔“

”میں اور سادھنا یہاں محفوظ ہیں۔“ اس نے پہلے والا جواب دیا اور کسی قدر توقف کے بعد بولا۔

”شہباز، میری آفر ہے تم اندر آ جاؤ لیکن اس کے لیے اپنے پاس موجود تمام ہتھیار پھینک دو۔“

”مجھے تمہاری پیشکش منظور نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے ساتھی کی فکر ہے۔“

”میرا نہیں خیال کہ وہ اب بچا ہوگا۔ اس پر بیک وقت تین آدمی ٹوٹے تھے اور وہ بہت مشکل سے ان کے

قابو میں آیا تھا۔“

”یہاں دو آدمی اور تھے وہ کہاں چلے گئے؟“

”وہ اس سے پہلے یہاں سے جا چکے تھے اور پھر کسی کیرے میں نظر نہیں آئے۔“ بڑے کنور نے کہا۔

”تمہارے ساتھی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے ریڈیو پر پیغام ملا ہے۔“

صورت حال سامنے آرہی تھی اور اسی لحاظ سے میری تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بیٹو کو ریڈیو سے بلا کر

ٹریپ کیا گیا تھا اور ایسا صرف کوئی ایسا فرد کر سکتا تھا جس کے پاس یہ ریڈیو ہوتا۔ یعنی ہمارا ہی کوئی ساتھی۔ اب وہ

کون تھا؟ کیا فتح خان کا کوئی ساتھی بھی بک گیا تھا اور ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ فتح خان کے تمام ساتھی جرائم پیشہ

تھے اور وہ میسے کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہوتے تھے۔ اگر انہیں منشی دل جی کی طرف سے منہ مانگی قیمت دی گئی

ہو تو ان کے نہ بکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگر یہ بات درست تھی تو میں خود اپنی آستین میں سانپ لے کر آیا تھا۔

دونوں رائفلیں میں نے بیٹو کے حوالے کر دی تھیں اور اب میرے پاس صرف دو پستول اور ان کے میگزین تھے۔

دو گرینڈ اور چار عدد اسموک گرینڈ تھے۔ میں نے پستول نکال لیا اور آگے بڑھا۔ واکی ٹاکی پر بڑے کنور سے

رابطہ تھا۔ میں نے پوچھا۔

”جس وقت میرے ساتھی کو بلایا گیا یہاں کے کیرے کام کر رہے تھے؟“

”ہاں اس وقت کیرے کام کر رہے تھے۔“ بڑے کنور نے جواب دیا۔ ”اس کے فوراً بعد یہ کیرے

ناکارہ ہوئے اور میں بس اتنا دیکھ سکا کہ تین افراد اسے پکڑ کر لے جا رہے تھے۔“

بڑے کنور کے ان الفاظ سے مجھے امید ہوئی کہ بیہ خیریت سے ہوگا۔ اگر اسے مارنا ہوتا تو وہیں مار

ہے۔ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”اے لے جانے والوں کی شناخت نظر آ رہی تھی؟“

بڑا کنور کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”بہ ظاہر وہ پبلس کے آدمی لگ رہے تھے لیکن وہ میرے آدمی نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے چار میرے رابطے میں نہیں ہیں۔ جن تین سے رابطہ ہے وہ جمنازیم والی عمارت کے پاس ہیں۔“

جمنازیم والی عمارت مرکزی پبلس کے پیچھے تھی۔ بہ ظاہر وہ ایک کونے میں تھی اور وہاں سے حملہ کرنا بے کار بھی ہو سکتا تھا۔ اصل اہمیت پبلس کی سامنے والی عمارتوں خاص طور سے گیسٹ ہاؤس اور تقریبات کے لیے مخصوص عمارت کی تھی۔ مجھے یاد ہے رامن اسی عمارت میں تھا۔ میں نے ذہن پر زور ڈالا کہ اس کی سرنگ کون سی والی تھی۔ مرکزی سرنگ کے چاروں طرف کوئی درجن بھر سرنگیں نکل رہی تھیں۔ آتے وقت وہ سرنگ دائیں طرف تھی اور اب اسے بائیں طرف ہونا چاہیے تھا۔ میں اندازے سے اس سرنگ میں داخل ہوا۔ یہاں بلب روشن تھے۔ میں راستے میں آنے والے سارے بلب توڑتا آیا تھا یہاں کے دونوں بلب بھی توڑ دیئے اب سرنگ میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹائٹ ویژن آن کیا اور سیڑھیوں کا معائنہ کیا۔ یہاں مٹن سیڑھیوں پر نہیں تھا بلکہ اوپر سے چوٹی سیڑھی کے ساتھ دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ تھا اور ٹائٹ ویژن کی وجہ سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے تین بار دیا اور فوراً ہی ہلکی سی سنسنیٹ کے ساتھ دروازہ کھلنے لگا۔ میں نے پستول سامنے کر لیا۔

عام حالات میں، میں کبھی اس طرح اندھا قدم اٹھانا پسند نہ کرتا لیکن اب حالات کچھ اور تھے۔ سادی اپنے بھائی کے پاس اور فی الحال محفوظ تھی لیکن بیٹے کے بارے میں مجھے خدشہ تھا کہ وہ بدترین دشمنوں کے قبضے میں جا چکا تھا اور اس کا گرم خون اسے کسی مشکل میں پھنسا سکتا تھا۔ مصلحت اسے کبھی آئی نہیں۔ اسے بچانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھا۔ دروازہ کھلا اور میں نے ٹائٹ ویژن آف کر دی کیونکہ دوسری طرف تیز روشنی تھی۔ یہ بھی ایک سبب تھا لیکن خالی کمر تھا اور یہاں خفیہ دروازہ ایک طرف موجود دیوار گیر الماری کے ساتھ ویسے ہی چوکور سے حصے میں کھل رہا تھا جہاں ایسے تمام خفیہ دروازے کھلتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک طرف تو ان دروازوں کو خفیہ رکھا جا رہا تھا اور دوسری طرف انہیں یوں چوکور خانوں میں رکھا گیا تھا اور یہ ہر جگہ نمایاں تھے۔ ہٹا نہیں اس میں کیا مصلحت تھی؟ کمر خالی تھا۔ حالانکہ رامن نے یہاں کچھ افراد کو نگران بنایا تھا۔ فرش کے قالین پر ایک جگہ دھبا تھا۔ قالین کا اپنا رنگ ہلکا جامنی تھا اس لیے یہ دھبا غیر نمایاں تھا۔ میں نے اسے چھو کر دیکھا تو ہلکا سا گلیا تھا اور میری انگلی پر سرخ رنگ لگا جس سے لہو کی مہک آ رہی تھی۔ یہ وہی کمر تھا جہاں رامن نے اپنے آدمی کو خفیہ دروازہ کھولنے کی پاداش میں شوٹ کیا تھا۔ قالین پر اسی کا خون تھا۔

کمرے کی سجاوٹ اور دیواروں پر موجود فرش تصاویر بتا رہی تھیں کہ یہ کمر اعیاشی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ میں دروازے تک آیا اور باہر کی ن گن لی۔ مجھے لگا جیسے کہیں دور کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔ میں نے کان لگا کر سننا چاہا مگر آوازیں واضح نہیں تھیں۔ میں نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو ایک بڑا ہال دکھائی دیا۔ کچھ افراد ہال کے اوپری حصے میں تھے۔ یہ سطحوں والا ہال تھا جس میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے حصے میں جاتے تھے اور یہ حصہ کسی گیلری کی طرح اس ہال کے چاروں طرف تھا۔ دروازہ کھولتے ہی آوازیں نمایاں ہو

گئیں۔ بولنے والا راسن تھا اور وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ ”بول کتے..... ورنہ تیرا بھیجا نکال دوں گا۔“
جواب میں کسی کے بھوں بھوں کرنے کی آواز آئی۔ کوئی جج جج کتے کی طرح بھونک رہا تھا۔ میں شناخت نہیں کر پایا لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہ بیوہ تھا جو راسن کو چڑانے کے لیے یہ حرکت کر رہا تھا۔ پھر چٹان کی آواز آئی۔ میں نے بیوہ کو کہتے سنا۔ ”کتا تو تُو ہے جو ایک آدمی کو باندھ کر اسے تھڑ مار رہا ہے، ہاتھ کھول پھر تجھے بتاتا ہوں۔“

”لڑکے، شہباز کو کال کر ورنہ یہ تجھے مار دے گا۔“ مجھے منشی دل جی کی آواز آئی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اس دروازے کے عین اوپر والی گیلری میں موجود تھے۔ اس لیے مجھے دسائی نہیں دے رہے تھے مگر ان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ منشی دل جی کی دھمکی پر بیوہ نے بے پروائی سے کہا۔
”ماروے..... پر یہ کتا ہے اسے پٹا ڈال کر رکھو۔“

راسن نے مشتعل ہو کر بیوہ کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ مار پیٹ کے ساتھ بیوہ کے کراہنے کی دہلی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ پھر منشی دل جی نے کہا۔ ”بس۔“
راسن رک گیا تو بیوہ نے پھر اسے چھیڑا۔ ”تم تو کتے سے گیا گزرا ہے اس کے گلے میں بھی پٹا ہے تم بغیر پٹے کا ہے۔“

”بکواس بند کرو۔“ منشی دل جی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”راسن اگر یہ میرے تین منٹے تک شہباز کو کال کرنے پر آمادہ نہ ہو تو اسے شوٹ کر دینا۔“

میں بے ساختہ باہر نکل آیا اور فوراً ایک طرف موجود دوسلخ افراد چونک کر میری طرف متوجہ ہوئے لیکن اس سے پہلے وہ اپنی رائفلیں سنبھالتے میں نے دونوں کو شوٹ کر دیا۔ میری مہارت سے زیادہ اتفاق کو دخل تھا کہ دونوں کے سروں پر گولیاں لگیں اور وہ نیچے گر کر ساکت ہو گئے۔ فوراً ہی سامنے گیلری سے چند افراد نمودار ہوئے ان کے پاس خود کار اسلحہ تھا اور اب ہال میں ٹھہرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ میں دوڑا اور واپس کمرے میں آ گیا۔ عقب میں کئی رائفلیں ایک ساتھ گرجی تھیں مگر اتنی دیر میں، میں واپس آ چکا تھا۔ فائرنگ کے ساتھ لوگوں کے چلانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ گولیاں کھلے دروازے سے گزر رہی تھیں۔ میں نے دواسموک گرینڈ کیے بعد دیگرے ہال میں پھینک دیئے۔ جو لوگ کمرے کی طرف آرہے تھے وہ پلٹ کر واپس بھاگے۔ فائرنگ رک گئی تھی اور راسن کے دہانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنے آدمیوں سے پوچھ رہا تھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ حالات کی تبدیلی کے پیچھے منشی دل جی تھا اور راسن ایک بار پھر اس کا دست راست ثابت ہوا تھا گویا اس نے بڑے کنور کو بھی دھوکا دیا تھا۔ بہ ظاہر وہ اس کا ملازم تھا لیکن اندر سے وہ منشی دل جی کے ساتھ تھا۔ اسی نے اندر کی فورس کو اس طرح استعمال کیا تھا کہ وہ ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی۔ جو وفادار تھے ان کو بچا لیا تھا اور جو بڑے کنور کے وفادار تھے انہیں پہلے ہمارے ہاتھوں مروایا اور پھر کرنل اور اس کے آدمیوں کا بھی صفایا کر دیا۔ اب حالات مکمل طور پر منشی دل جی اور راسن کے ہاتھ میں تھے۔ یقیناً منشی دل جی کے ساتھ اس کے وہ آدمی بھی ہوں گے جنہیں باہر رہ کر ہمیں بیک اپ دینا تھا۔ اب بیک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بیوہ کی جان بچانے کے لیے یہ کام کیا تھا لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جلد

یادیرہ میرے گرد گھیرا تنگ کرتے، مجھے ہتھیرا ڈالنے پڑتے ورنہ مارا جاتا۔

”یہ شہباز ہے۔“ منشی دل جی نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ ”شہباز! تم میری آواز سن رہے ہو؟“

میں چپ رہا تو اس خبیث نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ ”ٹھیک ہے میں تین تک گنوں گا اور اس لڑکے کا سراڑا دوں گا۔“

”شوہنی اگر آپ ادھر ہے تب بھی اس کا بات مت سننا۔“ بیٹو نے چلا کر کہا۔

”ایک..... دو..... تین۔“ منشی دل جی نے کہا

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کے تین گننے سے پہلے چلا کر کہا۔ ”میں یہاں موجود ہوں۔“

”شہباز جی۔“ منشی دل جی کے لہجے میں روایتی مکاری آگئی۔ ”بہتر ہے ہتھیرا پھینک کر سامنے آ جاؤ۔“

”ناک تم مجھے مار دو۔“

”میرا تمہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ منشی دل جی نے کہا۔ ”ورنہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا ہم

جانتے تھے کہ تم سرگم میں ہو اور وہاں بچنے کی کوئی جگہ نہیں، جب رامن نے تمہیں پکڑا تھا تب ہی مار دیتے۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ رامن کو اس حملے کے بارے میں علم نہیں تھا اس نے تو اپنے طور پر یہ کامیابی حاصل کی تھی۔“

”رامن کو ہاتھ صرف دقت کا پتا نہیں تھا۔“ منشی دل جی نے گھبرائے بغیر کہا۔ ”رازداری کی وجہ سے حملہ

خفیہ رکھا گیا تھا۔ کنور پبلش میں ایسی سیوری ہے کہ کہیں کی جانے والی بات بھی سنی جاسکتی ہے۔“

”اس کے باوجود رامن نے قید خانے میں مجھ سے کھل کر بات کی تھی۔“

”قید خانے کا سٹم آف کر دیا گیا تھا۔“ منشی دل جی نے کہا۔ ”شہباز جی تم دقت ضائع کر رہے ہو۔ تم

چاہتے ہو کہ تمہارا ساتھی زندہ رہے تو ہتھیرا پھینک کر باہر آ جاؤ۔“

اس وقت مجھے داس کم کا خیال آیا تھا اور میں اسے کھائی سے نکالنے جا رہا تھا کہ عقب سے دروازہ کھلنے کی

سنسناتی آواز آئی۔ ہال میں دھواں پھیلا ہوا تھا اور وہ اب کمرے میں بھی آ رہا تھا مگر ماسک کی وجہ سے بچت تھی۔

دوسری طرف منشی دل جی کی پُرسکون آواز بتا رہی تھی کہ اسے بھی اس نیس سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے

میں دیوار کی آڑ سے حرکت کرتا کھلے دروازے سے گولیوں کی بو چھاڑ آئی اور میں واپس اپنی جگہ دیکھنے پر مجبور ہو

گیا۔ دروازے کے سامنے سے گزرے بغیر میں خفیہ دروازے تک نہیں جاسکتا تھا۔ وہ چند سیکنڈ میں کھل گیا اور

مجھے رامن کی آواز آئی۔ ”شہباز اب تم میرے نشانے پر ہو۔ کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں شوٹ کرنے پر مجبور ہو

جاؤں گا۔“

اندر دھواں بھرنے سے منظر صاف نظر نہیں آ رہا تھا لیکن رامن کی آواز اسی کونے سے آرہی تھی۔ جب

تک منشی دل جی نے مجھے باتوں میں لگایا تھا وہ کہیں اور سے ہو کر سرگم کے اس خفیہ راستے تک آ گیا تھا۔ میں

ساکت رہا تو رامن نے پھر لاکارا۔ ”شہباز! آخری بار کہہ رہا ہوں ہتھیرا پھینک دو۔ تم اتنے ضروری نہیں ہو۔“

یہ بات تو میں بھی جانتا تھا کہ میں صرف بڑے کنور کے لیے ضروری تھا اس کے علاوہ یہاں موجود کسی

دشمن کے لیے ضروری نہیں تھا بلکہ مجھے تعجب تھا کہ وہ مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے تھے؟ میں نے ٹھنڈی سانس لی

اور پستول پھینک دیا۔ راسن نے کہا۔ ”دوسرا پستول بھی۔“

میں نے وہ بھی پھینک دیا تو اس نے مجھے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے اس کی بھی تعمیل کی۔ فوراً ہی دروازے سے دو افراد اندر آئے ایک نے میرے سر پر رائفل کی نال رکھ دی اور دوسرے نے میری جامہ تلاشی لی اور اس نے تمام گریینڈز نکال لیے تھے۔ پھر میری ٹانگوں سے بندھے فخر نکالے ایک میرا تھا اور دوسرا راپوری جو میں نے راسن سے حاصل کیا تھا۔ مجھے نہتا کر کے ہال میں لایا گیا۔ اس دوران میں وہاں موجود ایگزیسٹ فین چلا دیئے گئے تھے جو تیزی سے گیس کھینچ کر باہر پھینک رہے تھے۔ ویسے سب نے گیس ماسک پہن رکھے تھے۔ حد یہ کہ بیٹو کے پاس بھی تھا جیسے ہی میں نے اسموک بم پھینکے اس نے ماسک منہ پر چڑھا لیا تھا۔ چند منٹ میں ہال گیس سے صاف ہو گیا۔ فشی دل جی کے اشارے پر اس کے ایک آدمی نے منہ سے ماسک ہٹا کر گہری سانس لی اور جب اسے کچھ نہیں ہوا تو باقی سب نے بھی ماسک اتار دیئے تھے۔ بیٹو کے ہاتھ پیچھے کر کے پلاسٹک کی کس جانے والی جھٹھڑی سے باندھ دیئے گئے تھے یہی سلوک میرے ساتھ کیا گیا۔ میں نے خود ہاتھ رضا کارانہ پیچھے کر لیے تھے۔ ایک آدمی نے اس پر کس کر جھٹھڑی باندھی مگر میں نے ہاتھ سخت کر لیے تھے۔ اس لیے جھٹھڑی پوری طرح نہیں کسی تھی۔ مگر یہ بات وہ محسوس نہیں کر سکا اسے لگا کہ اس نے جھٹھڑی کس کر باندھی ہے۔ میں نے فشی دل جی کی طرف دیکھا۔

”تم کامیاب رہے۔۔۔۔۔ تم نے ہمیں استعمال کیا اور یہاں تک پہنچ گئے۔“

”ہاں میں کامیاب رہا۔“ اس نے تکبر سے کہا۔ ”لیکن اصل مرحلہ ابھی باقی ہے۔“

”سیف ہاؤس میں گھسنے کا؟“

”وہ بھی مسئلہ نہیں ہے۔“ فشی دل جی نے کہا۔ ”ابھی تم دیکھو گے۔“

”باہر سے بکتر بند گاڑیوں پر میزائل کس نے مارے تھے؟“

”میرے آدمیوں نے۔“ فشی دل جی بولا۔ ”اس کرنل کو بڑی خوش فہمی تھی کہ یہ ہتھیار کوئی مقامی استعمال

نہیں کر سکتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”یہ گورے خود کو کچھ زیادہ ہی اونچا سمجھتے ہیں اور اسی چکر میں منہ

کے بل گرتے ہیں۔ میں مسلسل کرنل کو سمجھا رہا تھا کہ تم پر اعتماد نہ کرے۔ مگر اس نے میری نہیں سنی۔ وہ تمہیں بے

ضرر سمجھ رہا تھا۔“

”کرنل اور اس کے ساتھی نرک جا چکے ہیں۔“ فشی دل جی نے تصدیق کی۔ ”ان میں سے کوئی نہیں

بچا۔۔۔۔۔ جو باہر تھے انہیں میرے آدمیوں نے مار کر ان کی جگہ لے لی اور پھر ان کے ہتھیار ان پر ہی استعمال

کیے۔“

مجھے خیال آیا کہ کنور ہیلز کے گارڈز مختلف عمارتوں میں مقید تھے لیکن وہ وہاں سے مزاحمت کر سکتے تھے

پھر فشی دل جی کے آدمی کیسے اندر آئے۔ اس کے ساتھ اس وقت درجن سے زیادہ افراد تھے اور یہ سب مقامی

تھے۔ انہوں نے مختلف طرح کے لباس پہن رکھے تھے اور وہ صورت سے جراثیم پیشہ لگ رہے تھے۔ مجھے فتح خان

کے باقی دو آدمی بھی نظر نہیں آئے اس کا مطلب تھا وہ مارے جا چکے تھے۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا، چہرے پر

مار پیٹ کے نشانات تھے وہ آسانی سے قابو میں نہیں آیا ہوگا۔ ”میرے ساتھی کو کیسے قابو کیا؟“
 ”بہت آسانی سے۔“ منشی دل جی مسکرایا۔ ”اسے ریڈیو کی مدد سے بلایا..... تمہاری آواز سن کر یہ دوڑا آیا۔“

”میری آواز؟“ میں نے بے یقینی سے کہا۔

”ہاں ریکارڈڈ آواز تھی۔“

”فتح خان کے آدمی کہاں ہیں اور وہ خود کہاں ہے؟“

اس بار منشی دل جی نے صرف شانے اچکائے۔ میں نے ہمیشہ اسے گرتے پایا جے میں دیکھا تھا آج پہلی بار وہ پتلون اور جیکٹ میں تھا۔ جیکٹ کی ایک جیب لٹکی ہوئی تھی یعنی اس میں کوئی ہتھیار تھا لیکن بہ ظاہر وہ خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا اور اسے ضرورت نہیں تھی۔ درجن بھر مسلح گروہ وہ باہر سے لایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ سب پر سپر تھا یہاں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جسے وہ جواب دے اور اس خیال سے اس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے نہایت چالاکی سے ہمیں استعمال کیا تھا اور بہ ظاہر کامیاب رہا تھا لیکن میرا ایمان ہے قدرت اگر کسی گھٹیا شخص کو کچھ دیر کے لیے اوپر لاتی بھی ہے تو وہ زیادہ دیر اس جگہ نہیں رہ سکتا ہے اس کا گھٹیا پن اس کے زوال کا باعث بن جاتا ہے۔ منشی دل جی نے ایک چھوٹا سا داک ٹاکی نکال کر کسی سے پوچھا۔ ”نیچے کیا رہا؟“

دوسری طرف سے جواب سن کر اس نے داک ٹاکی رکھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”انہیں نیچے لے چلو۔“ میں نے محسوس کیا کہ راسن اس کے ساتھ تھا لیکن اس کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ حالانکہ اس نے ابھی جان پر کھیل کر مجھے قابو کیا تھا۔ اگر میں اس کی طرف ایک گرینڈ پھینک دیتا تو اس کا بچنا محال تھا۔ مگر یہاں وہ راسن کو نظر انداز کر رہا تھا۔ راسن کے علاوہ پبلس گارڈ کی وردی میں چار افراد اور تھے۔ منشی دل جی نے نیچے کا پوچھا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے کچھ آدمی نیچے بھی تھے اور وہ بڑے کُور کے وفاداروں کا صفایا کر چکے تھے۔ ابھی ہم نیچے جا رہے تھے۔ میں نے منشی کی طرف دیکھا۔ ”تم لوگ اندر کیسے آئے؟ سیدھے راستے سے آنا تو ممکن نہیں ہے۔“

وہ عیاری سے مسکرایا۔ ”تم نے ٹھیک کہا..... میں اسی سرنگ سے آیا ہوں۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”اس کا مطلب ہے پبلس سے باہر جانے کے لیے ایک خفیہ راستہ موجود ہے؟“

”ہاں لیکن ان بھائیوں کو اس کا علم نہیں ہے۔“ منشی جی نے فخر سے کہا۔ ”یہ راستہ صرف مجھے معلوم ہے۔“

”ممکن ہے کوئی اور راستہ بھی ہو اور تمہیں اس کا علم نہ ہو۔“

میری بات پر وہ فکر مند ہوا تھا۔ ہم اس کمرے میں آئے جہاں سے خفیہ راستہ نیچے جا رہا تھا۔ پہلے راسن اپنے آدمیوں کے ہمراہ نیچے اتر گیا۔ پھر ہم باری باری نیچے آئے۔ منشی دل جی کے آدمی آگے پیچھے پھیل گئے تھے۔ ان کی قیادت ایک کالا اور موٹا سا شخص کر رہا تھا اس کے چہرے پر اس کے اعمال خباثت لکھے ہوئے تھے۔ یہاں تاریکی تھی اور ان لوگوں نے اپنی رائفلوں پر لگی نارچیں روشن کر لی تھیں۔ منشی دل جی نے مجھ سے پوچھا۔ ”کوئی

اور راستہ کہاں ہو سکتا ہے؟“

”سیف ہاؤس سے.....“ میں نے جواب دیا۔ ”سیف ہاؤس بھی سو فیصد محفوظ نہیں ہے۔“

”اس سے کوئی راستہ نہیں ہے۔“ منشی جی نے نفی میں سر ہلایا۔

ہم سیف ہاؤس والے ہال کی طرف جا رہے تھے۔ منشی دل جی کے آدمی پہلے ہی چلے گئے تھے۔ اب مختلف راستوں پر اس کے آدمی موجود تھے۔ تاکہ اگر کوئی اوپر سے آنے کی کوشش کرے تو اسے روکیں۔ اچانک آگے فائرنگ کا شور گونجا۔ میں نے منشی دل جی کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا تھا؟“

”میرے آدمیوں کو پتہ اس کا کوئی آدمی مل گیا ہوگا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”وہ راستہ صاف کرنے آگے گئے ہیں۔“

”آدمی مل گیا ہوگا یا انہوں نے ان دونوں سے اور زخمی گارڈز کو مار دیا ہے جو کسی کا نقصان نہیں کر سکتے تھے۔“

”ممکن ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ویسے تمہیں ان کے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم چھوٹے ہال پہنچے اور وہاں رہ جانے والے دونوں گارڈز کی لاشیں دیکھ کر میرے ہونٹ ہنچ گئے تھے۔ میرے پاس موجود واک ٹاک بھی منشی کے آدمیوں کے قبضے میں جا چکا تھا مگر اسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ہال میں آتے ہی بلند آواز سے کہا۔ ”بڑے کنور جی..... آپ کا خادم حاضر ہے۔“

منشی دل جی کی اردو صاف تھی۔ وہ رخ اور وض دونوں روانی سے بول رہا تھا اس نے انہیں کھ اور ج میں تبدیل نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر بعد کسی پوشیدہ اسپیکر سے بڑے کنور کی ٹھہری آواز آئی۔ ”منشی تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”آپ جانتے ہیں بڑے کنور جی..... مجھے کس چیز نے آنے پر مجبور کیا ہے۔“ منشی دل جی نے مخصوص

عیاری سے کہا۔ ”کیا آپ اپنے پرانے خادم کو اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟“

”منشی تم جانتے ہو یہاں کوئی نہیں آ سکتا تم نے بے کار میں زحمت کی ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”جلد یا بدیر آپ باہر آنے پر مجبور ہو جائیں

گے۔“

”مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔“ بڑے کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے تم نے کمرے اور کیونٹیکیشن سسٹم ناکارہ کر دیا ہے لیکن سیف ہاؤس کا دروازہ کھولنے کا ریوٹ صرف میرے پاس ہے۔ جب تک میں نہ چاہوں یہ نہیں کھل سکتا۔“

”ایسا نہ کہیں بڑے کنور جی، میرا نام منشی دل جی ہے۔ ایسے ہی آپ کا منشی نہیں بن گیا تھا۔ کچھ گن مجھ میں

بھی ہیں۔ ہر تالا اور ہر دروازہ کھل سکتا ہے۔“

”اسے نہیں کھوں سکتے..... یہ اتنی موٹی فولادی شیٹ کا بنا ہوا ہے کہ طاقتور ترین بم بھی اس پر اثر نہیں کر

سکتا۔ صرف آکسی ٹلین کا شعلہ اسے کاٹ سکتا ہے اور اتنا بڑا پٹن کاٹنے میں جس سے ایک آدمی گزر کر اندر آ سکے

دوٹن سے زیادہ گیس درکار ہوگی۔“

اس گفتگو کے دوران میں اور بیٹو ایک کونے میں کھڑے تھے اور منشی کے دو مسٹڈے ہم پر لگے ہوئے تھے۔ میں غیر محسوس انداز میں بیٹو کے پاس آنے لگا۔ اس نے بھی محسوس کر لیا۔ اس نے کسی قدر سر موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ریڈیو کا ایئر فون اس کے کانوں میں تھا اسی طرح میں نے بھی اپنے کانوں میں لگا رکھا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر اسے متوجہ کیا تو بیٹو نے غیر محسوس انداز میں ذرا پیچھے ہو کر دیکھا اور پھر شاید اسے میری کلائی میں موجود وائس بم کا پتا چل گیا۔ اس نے سر ہلا کر مجھے اشارہ دیا تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ درجنوں نارنجیں روشن ہونے سے ہال میں خاصی روشنی ہو گئی تھی۔ ورنہ دھماکے کے بعد یہاں کی روشنیاں بھی بند ہو گئی تھیں۔ شاید بجلی کی لائن متاثر ہوئی تھی۔ مگر ایک مسئلہ تھا میں خود سے یہ ہم نہیں نکال سکتا تھا یہ کلائی کے درمیان میں جیکٹ کی آستین میں موجود ایک جیب میں تھا۔ یہ جیب ایک چھوٹی سی زپ سے بند تھی۔

اول تو میری اس جگہ تک رسائی نہیں تھی اور دوسرے اگر میں زپ کھول بھی لیتا تب بھی بم نکالنا بہت مشکل کام تھا۔ یہ کام بیٹو کر سکتا تھا مگر وہ میرے پاس آتا اور پیچھے ہوتا تو مگر ان چوکنہا ہو جاتے۔ وہ خاص طور سے ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ منشی نے بندھی حالت میں بھی ہمیں چھوٹ نہیں دی تھی۔ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کس طرح ذرا سے موقع سے فائدہ اٹھا کر بازی پلٹ سکتا تھا اس لیے وہ ذرا سا موقع دینے کو بھی تیار نہیں تھا۔ میں نے بیٹو سے پوچھا۔ ”جب تم کو جھوٹا پیغام ملا تو تم سرنگ کی طرف گئے تھے۔ وہاں فتح خان کے آدمی موجود تھے۔“

”وہ غائب تھا۔“ بیٹو نے کہا۔

”منہ بند رکھو۔“ ایک نگران غریبا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے بیٹو سے اگلا سوال کیا۔

”ان کی طرف سے کوئی پیغام ملا تھا؟“

”نہیں۔“ بیٹو نے کہا۔ ”جیسے ہی ہم ایک موڑ کے پاس پہنچا اچانک تیز روشنی ہوئی اور جب تک ہم اپنا ٹائٹ ویژن آف کرتا تین آدمی ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے پہلے ہم کو قابو کیا اور پھر سارا ہتھیار چھین لیا۔ ہم نے اعتراض کیا تو یہ ہوا۔“ اس نے اپنا منہ آگے کیا جس پر زخموں اور نیل کے نشانات تھے۔ نگران غراتا ہوا آگے آیا تو ہم دونوں جلدی سے چپ ہو کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ وہ کچھ دیر ہمیں گھورتا رہا پھر اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ میں نے دیکھا۔ منشی دل جی کہیں چلا گیا تھا اور رامن بھی وہاں نہیں تھا۔ میں فکر مند ہو گیا۔ منشی دل جی کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ سیف ہاؤس کے اندر پہنچ جائے گا۔ اس کی اور بڑے کی کنور کی گفتگو میں بعض معنی زبانتیں بھی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا منشی دل جی جس مقصد کے لیے آیا تھا بڑے کنور بھی اس سے واقف تھا۔ اب اسے جو ہوا تھا اس میں کئی باتیں بہت غیر متوقع ہوئی تھیں۔ مگر کچھ باتیں ایسی تھیں جو ہوئی تو تھیں مگر وہ واضح نہیں تھیں وہ میرے اندر کہیں کھلک رہی تھیں۔ حالات کی تیزی مجھے سوچنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

چند منٹ بعد منشی دل جی رامن کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں آپس میں آہستگی سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا ان میں کسی بات پر اختلافی بحث ہو رہی ہے۔ رامن خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ قریب نے پردہ منشی دل جی سے دور ہو گیا اور منشی دل جی جا کر سیدھا سیف ہاؤس کے فولادی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

اس نے بڑے کنور کو مخاطب کیا۔ ”بڑے کنور جی میں آپ سے آخری بار کہہ رہا ہوں یہ دروازہ کھول دیں، میں عدہ کرتا ہوں آپ کو اور سادھنا کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں صرف اپنا مقصد حاصل کروں گا اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا یہ جاگیر آپ کی رہے گی۔“

”تمہارا مقصد کبھی پورا نہیں ہوگا۔“ بڑے کنور نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

منشی دل جی نے گہری سانس لی۔ ”میں نے تمہاری جتنی خیر خواہی کرنی تھی کر لی۔ اب تم مجھ سے شکایت نہیں کر سکو گے۔“ اس نے کہتے ہوئے اپنے لباس سے واکی ٹاکی نکالا اور اس کا ایک ٹنن دبا کر بولا۔ ”سب کو شوٹ کر دو اور دروازہ کھلوادو۔“

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا اور میں چلایا۔ ”کنور ہوشیار سلوی کو لے کر چہرہ.....“

میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا۔ سیف ہاؤس کے اندر سے فائرنگ کا شدید شور سنائی تھی اور پھر ایک چیخ سنائی دی جو سادی کی تھی۔



منشی دل جی سیف ہاؤس کے دروازے کے سامنے یوں تن کر کھڑا ہوا تھا جیسے اس نے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو اور اب اس کے سامنے فاتحانہ کھڑا ہو۔ اندر سے فائرنگ کا شور باہر تک سنائی دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا جیسے اندر کئی گنوں کے دہانے کھل گئے ہوں۔ فائرنگ کا شوراٹا تھا کہ اس میں کچھ سنائی دینا محال تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ پس منظر میں انسانی چیخوں کا شور بھی تھا۔ سادی کی چیخ اس وقت سنائی دی تھی جب فائرنگ کا آغاز ہوا تھا۔ اس کے بعد شور بڑھتا چلا گیا تھا کیونکہ ایک کے بعد کئی ہتھیار آتشیں نغمہ سرائی میں مصروف ہو گئے تھے۔ میں نے اور بیٹو نے منشی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اس کے آدمی درمیان میں آ گئے۔ انہوں نے ہتھیاروں کی نوک سے ہمیں واپس دھکیل دیا۔ بیٹو بھی مضطرب تھا اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”شوہی یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے، منشی جی کے آدمی اندر بھی ہیں۔ انہوں نے بڑے کنور کے وفاداروں پر فائر کھول دیا ہے۔“ میں نے تشویش سے کہا اور منشی دل جی کو آواز دی۔ ”اگر سادی کو کوئی نقصان ہوا.....“

”تو میں ذمے دار ہوں۔“ منشی دل جی نے پلٹے بغیر کہا۔ ”تم فکر مت کرو بڑے کنور اور سادھنا کو کچھ نہیں ہوگا۔“

اس وقت تک فائرنگ کا شور کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ منشی دل جی واک ٹاک تھاے خاموش کھڑا تھا جیسے فائرنگ رکنے کا انتظار کر رہا ہو۔ تقریباً آدھے منٹ بعد اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ منشی نے پوچھا۔ ”کیا رہا.....“

”سب مارے گئے۔“ واک ٹاک سے دھیمی آواز آئی۔ ”اجیت بھی مارا گیا۔“

”بڑا کنور اور سادھنا؟“

”وہ اپنے کمرے میں موجود ہیں۔“ دوسری طرف موجود شخص نے کہا۔

”دروازہ کھلو آؤ۔“ منشی دل جی نے حکم دیا۔ اس نے کسی اجیت کے مارے جانے پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید اجیت اس کا وفادار تھا جو بڑے کنور کے وفاداروں کی جوابی فائرنگ سے مارا گیا۔ مگر منشی دل جی جیسے لوگوں کے لیے انسان کی اہمیت کبھی گھڑ سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے اجیت کے مرنے پر ذرا بھی تشویش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے فکر بڑے کنور اور سادی کی تھی۔ کچھ دیر بعد اسی آدمی نے اطلاع دی۔

”انہوں نے چمبر اندر سے بند کر لیا ہے۔“

”تو اسے کھلو آؤ۔“ منشی غرایا۔

”یہ نہیں کھلوا سکتے۔“ بڑے کنور کی آواز آئی۔ ”اسے صرف ہم سے اڑایا جاسکتا ہے لیکن اس صورت میں اندر موجود کوئی فرد زندہ نہیں بچے گا۔“

”سادی ٹھیک ہے۔“ میں نے پوچھا۔ یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ بڑا کنور سادی سمیت اپنے چہر میں بند ہو گیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں شوبی.....“ سادی کی روہاسی آواز آئی۔ ”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”تمہارے لیے سادی۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔“

”آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ سادی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں محفوظ ہوں۔“

”اگر تم اندر محفوظ ہو تو دروازہ کسی صورت مت کھولنا۔“ میں نے بڑے کنور سے کہا۔ ”تم کسی زہریلے ناگ پر بھروسہ کر سکتے ہو اس شخص پر نہیں۔“

”اب میں جان گیا ہوں۔“ بڑے کنور نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”اس نے مجھے بہت دھوکے سے ڈسا ہے لیکن یہ مجھے زندہ حاصل نہیں کر سکتا ہے۔“

”بکواس بند کرو۔“ منشی غرایا اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس نے بڑے کنور سے کہا۔ ”دروازہ کھولو ورنہ میں ان دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔“

”احقنا نہ دھمکی ہے۔“ میں ہنسا۔ ”گلتا ہے ناکامی نے تمہارا دماغ الٹ دیا۔ بھلا بڑے کنور کو میری اور بیٹو کی جان کی کیا پروا ہوتی۔“

”بیٹو بھی یہاں ہے؟“ سادی نے اضطراب سے پوچھا۔

”ہم ادھر ہے دیدی۔“ بیٹو نے جواب دیا۔

”میرے خدام تم بھی ادھر چلے آئے۔“ سادی مزید پُر تشویش ہو گئی۔ ”اگر میں پھنس گئی ہوں تو لازمی تھا کہ سب یہاں چلے آتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”بڑے کنور تم باہر کسی سے رابطہ کر کے مدد طلب نہیں کر سکتے ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تمام کیونیکیشنز بلاک ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”ہنگامی حالات کے لیے پبلیس میں ایک جامر ہے جو تمام مواصلاتی رابطوں کو جو ہائپر بینڈ پر کیے جا رہے ہوں جام کر دیتا ہے۔ اس سے موبائل سروس، سیٹلائٹ موبائل اور انٹرنیٹ سروس بلاک ہو جاتی ہے۔“

”لیکن ہمارے ریڈیو تو کام کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ عام ایف ایم بینڈ پر کام کرتے ہیں۔“ بڑے کنور نے وضاحت کی۔ ”ان لوگوں نے سب سے پہلے اس جامر پر قبضہ کر کے اسے آن کر دیا تھا۔“

”مگر پبلیس کی بجلی اور جزیئر تو آزاد اپنے گئے ہیں پھر وہ کیسے کام کر رہا ہے؟“

”اس کے ساتھ اس کا اپنا جزیئرنگ پونٹ ہے جو اسے مسلسل پچاس گھنٹے بجلی مہیا کر سکتا ہے۔“

”پچاس گھنٹے میں ہم بجلی بحال کر سکتے ہیں۔“ منشی دل جی بولا۔ ”اس لیے باہر سے رابطے کو بھول جاؤ۔ بڑے کنور دروازہ کھول دو ورنہ میں سچ کہتا ہوں شہباز کو مار دوں گا اور تمہارے علاج کی آخری امید بھی ختم ہو جائے گی۔“

”میں دروازہ کھول دوں تاکہ تم مجھے اور سادی کو مار دو؟“ بڑے کنور نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ ہمیشہ مجھے دھوکا ہی دیتے رہو گے؟“

”دوسری صورت میں تم اندر ہی مرو گے۔“ منشی دل جی نے دھمکی دی۔ ”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس دروازے میں ایک سوراخ کر کے اندر زہریلی گیس چھوڑ دی جائے گی اور تم میں سے کوئی نہیں بچے گا۔“

”نہیں باس۔“ اندر موجود منشی دل جی کا آدمی چلایا۔ ”ایسا نہ کرنا۔“

”تب اس سے دروازہ کھلواؤ ورنہ اس کے ساتھ تم بھی مرو گے۔“

”تم یہ حماقت نہیں کرو گے۔“ بڑے کنور نے پُر سکون انداز میں کہا۔

”ہاں میں ابھی یہ حماقت نہیں کروں گا۔“ منشی دل جی نے کہا۔ ”لیکن تم باہر نہیں آؤ گے تو میں یہی کروں گا اور پھر میں تلاش کر کے راج کنور کو بھی مار دوں اور آخر میں اس کے بچوں کو بھی..... اس کے بعد اس جاگیر کا میرے سوا کون وارث رہے گا۔ سب بالآخر میرے قبضے میں آئے گا۔ دوسری صورت وہی ہے جو میں چاہتا ہوں مجھے دے دو اور میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“ بڑے کنور نے جواب دیا۔

وہاں موجود تمام افراد منشی اور بڑے کنور کی گفتگو سننے میں مصروف تھے۔ ان میں ہمارے دو نگران بھی شامل تھے۔ بات کرتے ہوئے منشی نے اچانک راسن کو قریب بلایا اور اسے سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا اور وہاں سے نصف درجن آدمی لے کر چلا گیا۔ منشی نے یقیناً اسے کوئی کام سونپا تھا۔ اوپر سے نیچے آنے والے نصف درجن افراد پہلے ہی مختلف جگہوں پر نگرانی کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اب وہاں منشی کے علاوہ پانچ افراد اور تھے جن میں سے دو ہمارے نگران تھے۔ میرے خیال میں یہ موقع تھا۔ میں ایک بار پھر بیڑی کی طرف سرکنے لگا۔ ہمارے درمیان مشکل سے ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں بہ ظاہر منشی کی طرف متوجہ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم بڑے کنور سے کیا چاہتے ہو؟“

”وہ جانتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں، تمہارا جاننا ضروری نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے میں تمہاری مدد کر سکوں۔ اگر وہ کوئی قیمتی چیز ہے تو میں بلا تامل اسے حاصل کرنے میں مدد کر سکتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک ساری دنیا کی دولت بھی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“

”تم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے ہو۔“ منشی کے بجائے بڑے کنور نے کہا۔

”کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے میں کر ہی دوں..... لیکن اس کے لیے میرا خبر ہونا ضروری ہے۔ اتنا تو تم اور منشی جی بھی جانتے ہو میں لالچی آدمی نہیں ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ ورنہ راج کنور کے عشرت کدے میں بے پناہ دولت تھی جسے بانو نے آگ لگا دی میں چاہتا تو ساری دولت بھی لے جا سکتا تھا لیکن میں نے بس کچھ رقم لی تھی۔ مزے کی بات ہے وہ بھی تقریباً بے کار رہی اور آخر میں جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔“

میں بول رہا تھا اور بولنے کے دوران بیٹو کے آگے آ رہا تھا۔ فشی دل جی غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ معاملہ بہت بڑی دولت کا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تو میرا اندازہ درست تھا تم نے ہمیں بے وقوف بنایا کہ تم جاگیر پر قبضہ کرنا چاہتے ہو اور یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔“

”شہباز جی تم بہت خطرناک آدمی ہو۔“ فشی جی نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کسی وجہ سے مجھے زندہ رکھنے پر مجبور تھا ورنہ اب تک مجھے مار چکا ہوتا۔ ”کیا تمہیں اندازہ ہے یہ کتنی بڑی دولت ہو سکتی ہے؟“

”کتنی ہوگی بلین ڈالرز میں ہوگی اور میرا خیال ہے یہ تراشیدہ یا تراشیدہ ہیروں کی صورت میں ہوگی۔“

فشی دل جی اچھل پڑا تھا۔ ”تم جاننے ہو اس کا مطلب ہے تم جھوٹ بول رہے تھے؟“

”یہ میرا اندازہ ہے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کنوروں کی جاگیر پر کچھ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ صرف یہاں موجود ہیروں کی کان ہے جس سے دولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ نہ جانے کتنے عرصے سے اس کان سے ہیرے نکالے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے وہی ہیرے یہاں موجود ہیں اور تم بڑے کنور سے انہیں ہتھیلنا چاہتے ہو۔ یہاں کے فشی ہونے کی وجہ سے تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گا کہ یہ ہیرے کتنی مالیت کے ہیں اور کہاں رکھے گئے ہیں؟“

”مجھے معلوم ہے۔“ اس نے سر آدھ بھری۔ ”لیکن میں حاصل نہیں کر سکتا۔“

بات رفتہ رفتہ کھل گئی تھی۔ تو فشی دل جی اصل میں ہیروں کے چکر میں آیا تھا۔ کاش کہ میں اسے وادی والے راج اور اس کی بہن کا انجام دکھا سکتا۔ مگر شاید اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لالچ ایسی چیز ہے جو سامنے کھڑی موت کی پروا بھی نہیں کرتی ہے۔ یہاں بھی لالچ کی جنگ چل رہی تھی اور اب تک سو سے زیادہ افراد اس کی بیھنٹ چڑھ چکے تھے۔ مزید نہ جانے کتنے چڑھنے والے تھے۔ تیس کے قریب تو میرے ساتھ آنے والے افراد تھے۔ باقی کا حلق کنور بیل کی سکورٹی اور فشی دل جی سے تھا۔ اس کے کم سے کم چھ آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ میں گفتگو کے دوران کسی حد تک بیٹو کے سامنے آ گیا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ میری جیبٹ کی آستین سے واکس بم نکالنے کے بیٹو کو بھی پشت کرنا پڑتی اور ایسا کرتے ہی ہمارے مگران چوکنا ہو جاتے۔ فی الحال اس مسئلے کا حل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ افراد کم ہونے سے وہاں روشن ٹارچوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی اور روشنی کم تھی۔ اس کے باوجود ہم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے گفتگو جاری رکھی۔

”وہ ہیرے یہاں سیف ہاؤس میں ہیں۔“

”نہیں وہ اوپر ہیں۔“ فشی نے کہا۔

”تب تمہیں بڑے کنور کی کیا ضرورت ہے اگر وہ کسی سیف میں بھی ہیں تو تم حاصل کر سکتے ہو۔“

”وہ جس سیف میں ہیں یہ انہیں حاصل نہیں کر سکتا۔“ بڑے کنور نے کہا اور ناخوش گوار لہجے میں فشی سے

کہا۔ ”تمہیں اپنی زبان بند رکھنا چاہیے تھی صرف شہباز ہی نہیں تمہارے ساتھ موجود لوگ بھی سن رہے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو یہ میرے وفادار ہیں۔“

”جیسے تم میرے وفادار تھے؟“ بڑے کنور نے طنز کیا۔ ”ان ہیروں کے لالچ نے تمہیں غداری پر مجبور کر

دیا اسی طرح کوئی اور لالچ میں تم سے غداری کر سکتا ہے۔“
 ”میں تمہاری طرح اندھا اعتماد کرنے والا شخص نہیں ہوں۔“ منشی جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میرے
 آدمی اچھی طرح جانتے ہیں مجھ سے غداری کا کیا انجام ہوگا۔“
 ”انجام کا خیال کسی کو نہیں روک سکتا ہے۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”ورنہ آج دنیا میں اسن
 ہوتا۔“

”ہائے۔“ اچانک بیڑہ کر رہا۔ اس نے دوسری طرف جھکتے ہوئے ایسی آواز نکالی جیسے قے کر رہا ہو۔
 ”کیا ہوا؟“

”انہوں نے پیٹ پر مکا مارا تھا۔“ بیڑہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”اندر کچھ ہو رہا ہے۔“
 میں منشی دل جی کی طرف گھوما۔ ”تمہارے آدمیوں نے میرے ساتھی کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے۔“
 ”لڑائی میں ایسا ہوتا ہے۔“ منشی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”تمہارے ہاتھوں میرے کئی آدمی مارے گئے
 ہیں۔“

بیڑہ دوسری طرف جھکا ہوا قے کرنے کی آوازیں نکال رہا تھا مگر اس کے پشت سے بندھے ہاتھ میری
 کلائی ٹٹول رہے تھے وہ جب کی زپ تلاش کر رہا تھا اس کی جیکٹ کی کلائی پر بھی ایسی زپ تھی اس لیے اسے
 زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے کسی قدر ہاتھ اوپر کر کے زپ کھولی اور اندر سے وائس بم نکال لیا۔ میں نے
 یہ ظاہر منشی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تمہارے آدمی زرخرید ہیں..... اس لیے تمہیں ان کی پروا نہیں ہوگی میرا ہر ساتھی
 قیمتی ہے وہ میری مرضی کے بغیر انگلی بھی نہیں ہلاتے ہیں۔ اگر میں جان مانگوں تو جان بھی دے دیں۔“

منشی دل جی نے اس بے نگاہی بات کا کوئی جواب نہیں، مجھے اس کے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تو
 بیڑہ کو اشارہ دے رہا تھا جو اس نے سمجھ لیا اور نکالا ہوا وائس بم مجھے تھما دیا۔ بم لیتے ہی میں ذرا پیچھے ہو گیا تھا۔ اب
 بیڑہ بھی سیدھا تھا اور دیوار سے ٹک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے منشی کے کم آدمیوں سے خوشی
 ہوتی لیکن اب میری خواہش تھی کہ کاش وہ سب یہاں ہوتے۔ مگر اکثریت یہاں سے دور تھی اور وہ بم کا شکار
 نہیں ہوتے۔ یہاں ہونے کی صورت میں وہ سب ناکارہ ہو جاتے۔ میں نے بم کے فوری استعمال کے بجائے
 کچھ دیر انتظار کر لینا مناسب سمجھا اور منشی سے پوچھا۔ ”پیس پر تمہارا کھل قبضہ ہو گیا ہے پھر تم نے اپنے آدمیوں کو
 کہاں بھیجا ہے؟“

”یہاں بڑے کنور کے کچھ وفادار ہیں ان کا صفایا ضروری ہے۔“ اس نے کہا۔ یعنی اس کے آدمی اوپر گئے
 تھے۔

”اس کا مطلب ہے تم سب کو نہیں خرید سکے..... صرف رامن اور اس جیسے کچھ ضمیر فروش تمہارے ساتھ
 شامل ہوئے۔“

”سب کو خریدنے کی ضرورت نہیں تھی میں نے بس کام کے آدمی چنے اور کسی نے بکنے سے انکار نہیں
 کیا۔“

”دولت چیز ہی ایسی ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”مگر کیا رامن بھی دولت کے لالچ میں تمہارے ساتھ

”ایا ہے؟“

”دولت کے بری لگتی ہے۔“ منشی جی نے شانے ہلائے۔

”میرا خیال ہے تم اسے بھی صاف کر دو گے کیونکہ وہ تم سے زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ اگر اس کی نیت خراب ہوگئی تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

منشی دل جی نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز جی تم کچھ زیادہ ہی نہیں سوچتے ہو؟“

”صرف زیادہ ہی نہیں میں درست سوچتا ہوں۔ اب تک میرے تمام خیالات درست ثابت نہیں ہوئے

ہیں کیا؟“

”کچھ زیادہ ہی درست ثابت ہوئے ہیں۔“ منشی نے پُر خیال انداز میں کہا۔

”منشی میرا ایک خیال یہ بھی ہے کہ تم کسی کو نہیں چھوڑو گے۔ ان سب کو بھی مار دو گے تاکہ کوئی راز دار نہ

رہے ورنہ لوگ اس دولت کے لالچ میں تمہارا پیچھا کرتے رہیں گے۔“

”سوچتے رہو ضروری نہیں ہے کہ تمہاری ہر بات درست ثابت ہو۔“

منشی نے مجھے جھٹلادیا تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا وہ بالآخر یہی کرے گا۔ ورنہ وہ یوں دوسروں کے سامنے یہ

راز فاش نہ کرتا۔ اس نے اور بڑے کنور نے اس راز سے پروہ نہیں اٹھایا تھا کہ جب ہیرے اوپر کسی جگہ محفوظ تھے

تو منشی خود انہیں کیوں حاصل نہیں کر رہا تھا جب کہ وہ اس جگہ سے واقف بھی تھا۔ ایسی کیا وجہ تھی کہ بڑے کنور کو

قبضے میں کرنا ضروری تھا۔ وائس بم فوری استعمال نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مجھے خدشہ تھا منشی کے آدمی پاس ہی

ہوں گے۔ وہ فوری آسکتے تھے اور مجھے ویتو کو ان ہتھکڑیوں سے آزاد ہونے میں کچھ وقت لگتا۔ اس کے بعد ہم

اس قابل ہوتے کہ آنے والوں کا مقابلہ کر سکتے۔ مگر اب منشی نے بتایا تھا کہ اس کے بیشتر آدمی اوپر پیلس میں

بڑے کنور کے بچے کچھ وفاداروں کا صفایا کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ موقع اچھا تھا۔ میری تو خواہش تھی کہ

راہن بھی یہاں ہوتا مگر اس کا نہ ہونا بھی اچھا تھا۔ اگر وہ کسی طرح بچ نکلتا تو ہماری لیے بڑی مشکل کھڑی ہو

جاتی۔

کسی قدر غور کرنے کے بعد میں نے وائس بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی پن نکالنے کے پانچ

سیکنڈ بعد یہ پھٹ جاتا۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھ کر خفیف سا سر ہلایا اس نے جواباً سر کو اتنی ہی جنبش دی اس کا

مطلب ہے وہ تیار تھا۔ میں نے پن نکالی اور ذہن میں گننے لگا۔ تین تک گنتے ہی میں نے گھوم کر ہم درمیان میں

پھینک دیا اور بیٹو سے کہا۔ ”سانس روک لو۔“

میں نے کہتے ہی سانس روک لی تھی۔ میرے کانوں میں ریڈیو کے اڑفون پلگ لگے ہوئے تھے۔ اس

کے باوجود صرف چند فٹ کے فاصلے سے بم کی شک دیو نے مجھے دھکیلا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے خاصے فاصلے

سے سنا تھا اور اس وقت بھی اس کی آواز قابل برداشت نہیں تھی۔ بس یہ کہ اس نے حواس باختہ نہیں کیا تھا۔ مگر اس

وقت خود پر قابو پانے کے لیے مجھے باقاعدہ جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ٹھوس چیز کانوں کے

راستے میرے دماغ میں داخل ہونے کے لیے زور لگا رہی ہو۔ میں زمین پر گر گیا تھا اور گول مول ہو کر خود کو آواز

سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر یہ صرف اضطراری حرکت تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میرے ہاتھ آزاد

ہوتے تو میں کانوں پر رکھ کر کسی حد تک بچ سکتا تھا۔ میری آنکھیں بھی بند ہو گئی تھیں اور دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بیٹو کا مجھے نہیں پتا تھا مگر میرے ذہن پر جیسے دھند سی چھا رہی تھی اور میں اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ آواز رک گئی ہے لیکن دماغ میں اب بھی اس کی گونج تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں نہ ہوں۔ مگر میں اپنی حالت کی پروا کیے بغیر اٹھا اور تیزی سے نزدیک پڑے منشی کے آدمی کی طرف بڑھا۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھا اور ساکت تھا۔ میں نے الٹا بیٹھ کر اس کی جیسیں ٹٹولیں مگر اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے میں اپنے ہاتھوں کی ہتھکڑی کاٹ سکتا۔ کھینچ کر باندھ دی جانے والی یہ ہتھکڑی مضبوطی میں فولادی ہتھکڑی سے کم مضبوط نہیں ہوتی ہے۔ اگر اسے زور لگا کر اتارنے یا توڑنے کی کوشش کی جائے تو یہ اور کھائیوں میں گڑتی ہے۔ میں دوسرے کی طرف بڑھا مگر اس کے پاس بھی چاقو یا دھار والی کوئی چیز نہیں تھا۔ کان ابھی تک سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی آواز آ رہی ہے۔ مگر وہ آواز واضح نہیں تھی۔ منشی دل جی سیف ہاؤس کے فولادی دروازے سے نکلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ہونٹ مل رہے تھے مگر کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

اصل میں بیٹو چلا رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی بات نہیں سن رہا ہوں تو وہ اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا۔ سب کی ٹارچیں رافٹوں کے ساتھ نیچے پڑی تھی اور روشنی مزید محدود ہو گئی تھی۔ میں نے ٹارچیں ایک ایک کر کے بند کرنا شروع کر دیں اور آخری ٹارچ بند کی تھی کہ عقب سے بیٹو مجھ سے ٹکرایا۔ میں بھڑک کر پیچھے ہٹا مگر پھر بیٹو کی آواز سن کر رک گیا۔ اس کی آواز بگڑ کر میرے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔ میں فوکس کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ پھر بیٹو نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہاتھ سے پستول چلانے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا نہیں۔ اس پر اس نے میرا ہاتھ چھوڑا اور خود پستول کر ایک رافٹ پر لگی ٹارچ آن کی۔ پھر اس نے زمین پر بیٹھ کر کسی طرح دونوں ہاتھ کمر اور پیروں سے گزار کر سامنے کر لیے۔ یہ بہت مشکل کرتب تھا اور بیٹو جیسے چھری سے جسم کا آدمی ہی دکھا سکتا تھا یہ میرے بس سے باہر تھا۔ پھر وہ منشی دل جی کی طرف بڑھا۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے منشی کی جیکٹ ٹٹولی اور اس سے پستول نکال لیا۔ اس وقت تک دماغ کسی حد تک قابو میں آ گیا تھا اور میں نے بیٹو سے پوچھا۔

”پستول کا کیا کرو گے؟“

مجھے اپنی ہی آواز اجنبی اور لہراتی محسوس ہوئی تھی لیکن اب یہ کسی حد تک واضح تھی۔ بیٹو نے کہا۔ ”اس کی مدد سے آزاد ہو گا، آپ نماز کے انداز میں لیٹ کر ہاتھ اوپر کر لو۔“

پہلے میں سمجھا نہیں کہ نماز کے انداز میں لیٹنے سے اس کی کیا مراد ہے لیکن پھر میں سمجھ گیا میں سجدے میں گیا اور سر زمین پر ٹیک کر دونوں ہاتھ عقب میں ہوا میں بلند کیے۔ بیٹو نے ٹارچ کا رخ اس طرف کیا۔ میں نے دونوں کھائیوں کو مکمل حد تک الگ کیا اور بیٹو نے پستول کا دستہ میری کمر پر رکھ کر نال کا رخ اوپر کی طرف کیا اور میرا ہاتھ بچاتے ہوئے ہتھکڑی پر فائر کیا۔ اس کے باوجود گولی میری بائیں کھائی کو چھوتی گزری اور ایسا لگا جیسے کسی نے دھتکتی سلاخ سے چھو دیا ہو۔ مگر ساتھ ہی گولی نے ہتھکڑی کو کاٹ دیا اور ایک جھٹکے سے میرے ہاتھ آزاد

ہوئے۔ میں تیزی سے اٹھا اور باقیوں کی تلاشی لی تو ایک کے پاس چاقو مل گیا۔ اس سے بیٹو کی بندشیں کاٹیں اور نارنج بند کرتے ہوئے ٹائٹ ویژن آن کر لیا۔ یہ ابھی تک ہمارے سروں پر تھے اور منشی کے آدمیوں نے انہیں یا ریڈ پولینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پانچ افراد کے پاس پانچ رائفلیں تھیں۔ ہتھول صرف منشی کے پاس تھا۔

اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ہر ایک کے پاس رائفلوں کے اضافی میگزین بھی تھے۔ ہم نے وہ بھی نکال لیے۔ کیونکہ ہم دو تھے اس لیے صرف دو رائفلیں چھوڑ کر باقی رائفلوں کے میگزین نکال کر انہیں بے کار کر دیا تھا۔ منشی کے پانچوں آدمی بے ہوش تھے۔ البتہ منشی کسی قدر ہوش میں تھا۔ مجھے بڑے کنور اور سادی کا خیال آیا۔ پتا نہیں ان کا کیا حال تھا انہوں نے بھی اسپیکر پر وائس بم کی آواز سنی تھی میں نے بڑے کنور کو پکارا۔ ”تم میری آواز سن رہے ہو..... کیا تم ہوش میں ہو؟“

بڑے کنور کی آواز نہیں آئی تو میں نے سادی کو پکارا۔ ”سادی تم ٹھیک ہو..... میری آواز سن رہی ہو۔“ جواب میں کسی نے گنگنائی ہوئی بہت مدہم آواز نکالی۔ بیٹو بولا۔ ”یہ دیدی ہے۔“

مجھے بھی آواز نسوانی لگی تھی۔ میں نے بے تابی سے کہا۔ ”سادی پلیز اونچا بولو..... تم ٹھیک ہونا.....؟“ ”میں..... ٹھیک..... ہوں۔“ اس بار سادی نے کمزوری آواز میں کہا۔ ”بڑے بھیا بے ہوش ہیں وہ مل نہیں رہے۔“

”سادی کیا تم دیکھ سکتی ہو..... اندر موجود منشی کے آدمیوں کا کیا حال ہوا ہے؟“ ”نہیں..... مجھے نہیں معلوم کہ یہاں سے کیسے دیکھنا ہوگا۔“ سادی کا مطلب تھا کہ وہاں اسکرینیں موجود تھیں لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ سیف ہاؤس کے باقی حصوں کو کیسے دیکھا جاسکتا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ”سادی وہ ریوٹ کہاں ہے جس سے سیف ہاؤس کا دروازہ کھولا جاتا ہے؟“ ”وہ بڑے بھیا کے پاس ہے۔“ سادی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میں نے اسے نکال لیا ہے لیکن اس پر کئی بٹن ہیں۔“

”اس کی ساخت بتاؤ۔“ ”اس پر چھ بٹن ہیں۔ دو اوپر لگے ہیں ان کا کلر ریڈ ہے نیچے کے دو گرین ہیں۔ اور آخر کے دو بلو ہیں۔“ ”چھ بٹن کا مطلب تھا کہ باقی بٹنوں کا کوئی نہ کوئی مقصد تھا اور سوچے سمجھے بغیر انہیں استعمال کرنے سے کچھ اور بھی ہو سکتا تھا میں نے کہا۔ ”سادی کوئی بٹن مت دبانا..... بڑے کنور کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو..... جلدی، ہمارے پاس وقت کم ہے۔“ ”میں کیسے ہوش میں لاؤں۔“

”وہاں پانی ہو گا وہ منہ پر چھڑک اور پلانے کی کوشش کرو اس سے اسے ہوش آ جائے گا۔“ میں نے ہدایت کی حالانکہ یہ آواز کا شاک تھا اور دماغ براہ راست متاثر ہوا تھا۔ بڑا کنور ویسے ہی بیمار شخص تھا اور بوڑھا بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں سادی صحت مند اور جوان تھی۔ اس لیے وہ آواز جھیل گئی اور جلدی ہوش میں آ گئی۔ پھر انہوں نے براہ راست آواز کو نہیں سنا تھا اسپیکر سے گزر کر وہ کسی قدر کم ہو گئی ہوگی۔ مجھے امید تھی کہ بڑے کنور کا حال منشی اور اس کے ساتھیوں کا سنا نہیں ہوا ہوگا۔ سادی اپنا کام کر رہی تھی اور ساتھ ہی بڑے کنور کو آوازیں دے رہی تھی۔

بیٹو سرنگ کی طرف چلا گیا تھا اگر کوئی اس طرف سے آئے تو ہم قبل از وقت خبردار ہو جائیں۔ واکس بم کو پھٹے دس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور ابھی صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ باہر یقیناً روشنی ہو چکی تھی۔ لیکن اب تک کوئی اس طرف نہیں آیا تھا۔

جب تک سادی بڑے کنور کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ ایک بار تسلی سے فشی دل جی اور اس کے آدمیوں کی تلاش لے لوں۔ میں نے یہ کام کیا اور فائدہ ہوا۔ فشی کے پاس سے ایک چمپا ہوا پستول اور نکل آیا اور وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ مگر اس کی کھلی آنکھوں میں اب بھی پتلیاں قابو میں نہیں تھیں۔ اسے ہوش میں آنے میں مزید وقت درکار تھا۔ اس کے آدمیوں میں سے دوسرے چکے تھے۔ ان کے کانوں اور ناک سے خون نکل آیا تھا۔ شاید دماغ آزادی کی شدت برداشت نہیں کر سکا تھا۔ انہیں مردہ پا کر میرے روٹنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ہم اس تباہ کار چیز سے صرف اس لیے بچ گئے کہ ہمارے کانوں میں ازفون تھے۔ باقی تین مکمل طور پر بے ہوش تھے۔ واکس بم ان کے درمیان میں پھنسا تھا اور وہ براہ راست نشانہ بنے تھے۔ فشی تقریباً بارہ تیرہ فٹ کی دوری پر تھا۔ اس لیے اس کی بچت ہو گئی تھی وہ مر نہیں تھا اور نہ ہی مکمل طور پر بے ہوش ہوا تھا۔

”سادی بڑے کنور کو ہوش آیا؟“

”نہیں شوبی..... پتا نہیں کیا ہے، بالکل رسپانس نہیں دے رہے ہیں۔“ اس نے فکر مند لہجے کہا۔ ”کیا میں ریوٹ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کروں۔“

”نہیں۔“ میں نے منع کر دیا۔ ”پتا نہیں باقی بین کس لیے ہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تباہ کرنے والا عمل شروع ہو جائے۔ تم بڑے کنور کو ہوش میں لانے کی کوشش جاری رکھو اور ہاں تم دونوں جس چمبر میں ہو اس کا دروازہ اسی ریوٹ سے بند ہوتا اور کھلتا ہے؟“

”نہیں یہ تو ہاتھ سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے اس کے اندر سیف جیسا ہینڈل لگا ہوا ہے۔“ سادی نے

بتایا۔

”اندر کوئی ہتھیار ہے؟“

”بڑے بھیا کے پاس ایک پستول ہے میں نے وہ بھی نکال لیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہو۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں یہیں ہوں..... مطلب ان سرنگوں میں ہی ہوں اور تم اطمینان رکھو میں تمہیں لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

”اس کے برعکس آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں تو مجھے اطمینان ہوگا۔ آپ اب بھی خطرے میں ہیں۔“ سادی نے کہا اور پہلی بار پوچھا۔ ”یہ آواز کسی تھی خدا کی پناہ ایسا لگا جیسے براہ راست دماغ پر آ کر لگی ہو۔ میرے تو ہوش گم ہو گئے تھے۔“

”یہ ایک طرح کا بم تھا جو چھٹ کر بہت تیز آواز نکالتا ہے۔“

”اتنی دیر تک؟“ سادی کو تعجب ہوا تھا۔

”آواز تو پانچ سیکنڈ ہوتی ہے لیکن لگتا ہے کہ نہ جانے کتنی دیر جاری رہی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اب خاموش ہو جاؤ اور اگر مائیک آف کر سکتی ہو تو اسے آف کر دو لیکن اسپیکر آن رکھنا۔“

”میں کوشش کرتی ہوں۔ مجھے اس سسٹم کا زیادہ نہیں پتا ہے۔“

”بڑے کنور کے پاس ایک واک ٹاکی بھی تھا۔“

”وہ ہے۔“

”میں اسی پر رابطہ کروں گا۔“ میں نے کہا۔ میں نے اپنا واک ٹاکی حاصل کر لیا تھا جس پر بڑے کنور سے بات کرتا تھا۔ اس نے اس وقت نہیں بتایا تھا کہ یہاں اسپیکر سسٹم بھی ہے جس پر وہ براہ راست بات کر سکتا ہے۔ شاید اس وقت وہ براہ راست بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر فشی اور اس کے آدمیوں کو چیک کیا۔ فشی اب کسی قدر ہوش میں تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ ہشت زدہ نظر آنے لگا کیونکہ میں اسے نظر نہیں آ رہا تھا اس نے لگتے زدہ لہجے میں کہا۔

”سک..... کون..... ہو؟“

”تمہاری موت۔“ میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو سرنگ کے اس حصے سے دور ہٹ جائیں۔“

”سک..... کیس..... کیسے..... کہوں؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے اس کا واک ٹاکی اس کے منہ کے آگے کیا۔ ”اس کی مدد سے.....“

مگر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ٹھیک سے بات کر سکتا۔ اس کے آدمی ہوشیار ہو جاتے۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ خود بات کر لوں۔ میں نے واک ٹاکی آن کیا اور بولا۔ ”فشی کے کوئیری آواز سن رہے ہوں؟ غور سے سنو..... فشی میرے قبضے میں ہے اور اگر کسی نے سیف ہاؤس کی طرف آنے کی کوشش کی تو میں اسے مار دوں گا۔“

”شبہاز۔“ دوسری طرف سے راسن کی آواز آئی۔ ”تم یہاں سے نکل نہیں سکتے اس لیے بہتر ہوگا ہتھیار ڈال دو۔“

”فشی کے ہوتے ہوئے؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں موجود لوگوں کا باس فشی نہیں ہے بلکہ میں ہوں اور جو چیز وہ حاصل کرنا چاہتا تھا اب وہی میں حاصل کر لوں گا۔“

یہ اطلاع تشویشناک تھی کہ راسن نے اتنی دیر میں فشی کے آدمیوں کو خرید لیا تھا۔ یقیناً اس نے انہیں حصے کا لالچ دیا ہوگا بے شک ان کے حصے میں بعد میں موت آتی لیکن اس وقت وہ جان پر کھیل کر بھی یہ بے پناہ دولت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے دانت پیسے، یہ منحوس دولت میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو فشی کبھی ہمارے پیچھے نہ آتا۔ نہ راسن اس کے ساتھ مل کر سازش کرتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے اس صورت حال سے نمٹنا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”اول تو مجھے تمہاری اس بات کا یقین نہیں ہے۔“

”ایسا کرو تم فشی کو سرنگ کے موڑ تک بھیج دو میں خود اسے شوٹ کر دیتا ہوں تب تمہیں میری بات کا یقین

آجائے گا۔“

”دوسرے تمہاری مجبوری بھی وہی ہے۔ بڑا کنور اور سادی اندر ہیں اور وائس بم نے ان کے بھی ہوش اڑا دیئے ہیں۔ وہ جواب نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر تم اس دولت تک کیسے پہنچو گے؟“

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔“ رامن فکر مند ہو گیا۔ ”اگر انہیں کچھ ہوا تو وہ دولت پھر کوئی حاصل نہیں کر سکے گا۔“

”تم سوچ لو اگر تم یا کوئی دوسرا اس طرف آیا تو اسے پہلے مجھ سے غمنا پڑے گا۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔

”تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اگر تم منشی سے ملے ہوئے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے کس شخص کو دھوکا دیا ہے اور اسے اب تک پتا چل گیا ہوگا۔ بے شک تم لوگوں نے یہاں موجود تمام رابطے کاٹ دیئے ہیں مگر وہ بھارتی حکومت سے بات کر سکتا ہے اور اس کی بات کوئی نظر انداز نہیں کرے گا۔“

”تم ڈیوڈ شاکی بات کر رہے ہو تو وہ یہاں بھارت میں اتنی بڑی توپ نہیں ہے۔“

”چھوٹی سی سبھی..... لیکن بھارتی حکومت کو کنور خاندان کی فکر تو ہوگی اور تم بھول رہے ہو راج کنور بھی اسی کے پاس ہے۔ اگر اس نے راج کنور کو رابطے کی اجازت دی تو تم لوگ بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”مشکل میں تم پڑو گے۔“ رامن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ایک بار تم بھارتی ایجنسیوں کے قبضے میں آگئے تو تمہاری روح بھی ان کے قبضے سے نہیں نکل سکے گی۔“

”دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا اور واکی ٹاکی آف کر دیا۔ رامن کی بات نے مجھے بھی فکر مند کر دیا تھا۔ جتنا میری بات نے اسے پریشان کیا تھا اتنا ہی اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ ہم جتنی دیر یہاں رکے یہاں سے نکلنا اتنا ہی مشکل ہو جاتا۔ خاص طور سے میرے لیے۔ میں واپس ہال کی طرف آیا۔ گزشتہ رات سے میں نے چند کھونٹ پانی پیا تھا اور میرا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ مگر یہاں پانی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے منشی کے آدمیوں کو بھی ٹھٹھا لیا تھا لیکن وہ کبھی بھی خالی تھے۔ ہماری طرح مکمل تیاری سے نہیں آئے تھے۔ بیٹو کا بیگ گرفتاری کے بعد چھین لیا گیا تھا اس میں پانی اور کھانے کا سامان تھا۔ وہ بیگ نہ جانے کہا تھا۔ منشی اب ہوش میں تھا۔ میں رامن سے جو گفتگو کر رہا تھا اس کا ایک حصہ اس نے بھی سنا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”وہ کیا کہہ رہا تھا؟“

”منشی جی بازی پلٹ گئی اور تاریخ نے خود کو دہرایا ہے۔ رامن نے تمہارا تختہ الٹ کر تمہارے آدمیوں کی کمان سنبھال لی ہے اور اب وہ خود ان ہیروں کے چکر میں ہے۔“

منشی دل جی کے منہ سے رامن کے لیے ناگفتی نکل تھی مگر میں متاثر نہیں ہوا۔ ”مجھے شک ہے کہ وہ ڈراما کر رہا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ میں تمہیں سرنگ کے موڑ تک بھیج دوں۔ وہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر کے ثبوت دے سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ منشی خوفزدہ ہو گیا۔ ”اس نے سچ بچ بھارت کر دی ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔“

”تب تم نے اس پر بھروسہ کیسے کیا؟“

”کیونکہ وہی اندر سے ہماری مدد کر سکتا تھا۔ اس کے بغیر ہم اتنی آسانی سے پیلس گارڈز کا صفایا نہیں کر

کہتے تھے۔“

نشی میرے قابو میں تھا اس لیے میں اس سے سوالات کر سکتا تھا۔ ”تم نے ڈیوڈ شاٹک رسائی کیسے حاصل کی؟“

”مجھے معلوم تھا کہ وہ عرصے سے یہاں ہے اور اصل میں تمہارے پیچھے آیا ہے۔ جب تم یہاں لائے گئے تھے تب اس نے بڑے کنور سے رابطہ کیا تھا اور میں بھی واقف ہو گیا تھا۔“

”تب تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ میں اس کے قبضے میں ہوں۔“

”یہاں پیلس میں میرے آدی تھے، ان سے مجھے معلوم ہو گیا کہ تم واپس آ گئے ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر تم یہاں ہو گے تو صرف ڈیوڈ شاٹ سے رابطہ کر سکتے ہو۔“

”تمہارا اندازہ غلط ہے میرا اس سے رابطے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اس نے مجھے پکڑوایا تھا فتح خان کی مدد سے۔“

”مگر میرا یہ اندازہ تو درست ثابت ہوا کہ تم ڈیوڈ شاٹ کے پاس ہو۔ اس کے بعد میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے اس سے رابطہ کیا اور اسے ایک آدی کی ضرورت تھی جو کنور پیلس سے واقف ہو۔“ نشی دل جی نے جلدی جلدی کہا۔ ”میری بد قسمتی کہ میں سارے پلان سے واقف تھا اور میں کامیاب بھی رہا مگر میرے آدی تمہاری ٹھیک سے تلاشی نہ لے سکے۔“

”درست کہا یہ ان کی نااہلی تھی لیکن اصل میں یہ قدرت کا کھیل ہے، وہ تم جیسے لوگوں کو آزاد چھوڑ دے تو تم درندوں کی طرح آس پاس کے لوگوں کو پھاڑ کھاؤ۔“ میں نے کہا۔

نشی دل جی نے گہری سانس لی۔ ”مجھے معلوم ہے تم مجھے چھوڑو گے نہیں، لیکن میں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہارا اصل دشمن کنور خاندان ہے۔“

”جس کے تم بھی ایک رکن ہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ راج کنور کہاں ہے؟“

”میں نہیں جانتا وہ ڈیوڈ شاٹ کی تحویل میں تھا۔“ نشی جی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

”لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ اب ڈیوڈ شاٹ کی تحویل میں نہیں ہے اس نے اسے چھوڑنے کا کہا تھا۔“

”ہاں لیکن اسے چپ لگا کر چھوڑا گیا تھا۔“

”ایسی چپ تلاش کرنا اور اسے ناکارہ بنانا آج کل بچوں کا کھیل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ راج کنور سے ڈیوڈ شاٹ کی کوئی ذیل ہو چکی تھی اور اسی وجہ سے اس نے اسے چھوڑا ہے۔ ورنہ وہ ہاتھ آئے دشمن کو یوں چھوڑنے کا قائل نہیں ہے۔“

نشی جی نے غور کیا۔ ”تمہارا مطلب ہے ڈیوڈ شاٹ بھی ڈبل کھیل کھیل رہا ہے؟“

”اس کھیل میں سب ہی ڈبل کھلاڑی ہیں۔“

”اب تم کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اگر طبعی موت تک زندہ رہنا چاہتے ہو تو کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ میں تمہیں بارودوں۔ اس وقت موت کا فرشتہ جسے تم ایم دوت کہتے ہو آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔“

نشی کو خبردار کر کے میں سرگ تک آیا اور سادی کو واکی ٹاکی سے کال کی۔ میں نے ایک نمبر دیا جو اصل میں بڑے کنور کے واکی ٹاکی کا نمبر تھا۔ سادی نے کال ریسوی کی۔ میں نے پوچھا۔ ”بڑے کنور کو ہوش آیا؟“

”نہیں..... لیکن ہٹے جلنے لگے ہیں۔“

”کوشش کرتی رہو۔“ میں نے کہا۔ ”اسے جلد از جلد ہوش میں لاؤ تب ہی ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“

”شوہی اگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا تو؟“ سادی نے ہچکچا کر پوچھا۔

”ریسٹ کنٹرول اور پتول تمہارے پاس ہے تم مجبور کر سکتی ہو اگر ذرا ہمت کرو تو.....“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ”ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں۔“

”شاباش گڑیا تم کر سکتی ہو..... ضروری نہیں ہے تم بڑے کنور کو دھکاؤ..... اپنی عقل سے کام لو اور اسے راضی کرو۔ اگر دیر ہوئی تو ہمارا کلنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہاں ہر طرف دشمن ہیں۔“

”ٹھیک ہے شوہی میں سمجھ گئی۔“

واکی ٹاکی بند کر کے میں نشی دل جی کے پاس آیا۔ اسے نظر نہیں آ رہا تھا مگر میری آہٹ محسوس کر کے وہ جلدی سے بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”اندر تمہارے کتنے آدمی ہیں؟“

”تین، ایک مر گیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کا واکی ٹاکی آگے بڑھایا۔ ”ان سے بات کرو اور صورت حال پوچھو..... باہر کے بارے میں کوئی اشارہ مت دینا۔“

اس نے سر ہلایا اور واکی ٹاکی کا ایک بٹن دبایا۔ ”اندر کیا ہو رہا ہے۔“

”باس وہ جہر میں ہیں۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”ہم اسے نہیں کھلو سکتے۔“

”کنور کے آدمیوں کو چپک کر لیا کوئی زندہ تو نہیں ہے۔“

”دو زندہ تھے ان کی گردن کاٹ دی ہے۔“ دوسری طرف سے نشی کے آدمی نے یوں آرام سے کہا جیسے گردن نہیں گا جرمولی کاٹنے کی بات کر رہا ہو۔

”گڈ پوری طرح ہوشیار ہو۔“ نشی نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔ میں نے اس سے واپس لے لیا۔ قابو میں آتے ہی نشی پھر سے گرہ مسکین بن گیا تھا۔ اس نے لجاجت سے کہا۔ ”شہباز جی..... اب میری آپ سے دشمنی نہیں رہی ہے تو کیوں نہ ہم مل کر اپنے دشمنوں کے خلاف لڑیں؟“

نشی کی پیشکش قابل غور تھی۔ بے شک اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کے آدمی بغاوت کر کے رامن سے مل گئے تھے مگر وہ یہاں کا بھیدی تھا۔ یہاں کے بارے میں جو وہ جانتا تھا وہ شاید دونوں کنور برادران بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر میں نے فوری رد عمل نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ ”نشی تمہیں اب خیال آ رہا ہے کہ میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کچھ دیر پہلے تم یہ بات بھولے ہوئے تھے۔“

”میں نے پھر بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر دشمنی ہوتی تو پکڑتے ہی میرے آدمی نہیں مار دیتے۔“

یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔ لیکن اس پر مجھے یقین تھا کہ نشی نے کسی وجہ سے مجھے اور بیو کو مارنے سے گریز کیا تھا۔ وہ ہم سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اگر یہ فائدہ اس کے ذہن میں نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ

ہمیں ایک لمحہ زندہ رہنے کی اجازت نہ دیتا۔ فی الحال مجھے آئیڈیا نہیں تھا کہ اس کا مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے کسی معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بڑے کنور کو میرا خون درکار تھا اور مجھے سادی واپس چاہیے تھی۔ باقی اس جاگیر اور اس کے دولت کے تنازعے سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ میری بلا سے جو اس پر قابض ہو جاتا اور دوسرے کے ساتھ جو چاہے سلوک کرتا۔ منشی نے اپنی چال چلی تھی مگر وہ رامن پر آکر پھنس گیا۔ اگر میں وائس بم استعمال نہ بھی کرتا تو اس کے خلاف بغاوت ہو چکی تھی۔ مجھے بس اتنا فائدہ ہوا کہ میں ایک محدود دائرے میں آزاد ہو گیا تھا لیکن اس سرنگ سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ ابھی تو میں نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اگر بڑے کنور نے سیف ہاؤس کھول دیا تو میں سادی کو لے کر یہاں سے کیسے نکلوں گا؟ مجھے اس دولت کا خیال آیا جس کے پیچھے سب آپس میں لڑ رہے تھے۔ میں نے منشی سے پوچھا۔

”ہیرے کہاں ہیں اور انہیں کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟“

”وہ اوپر بڑے کنور کے خاص کمرے میں ہیں۔ جو کچھ عرصے پہلے اس کا بیڈروم بھی تھا۔“

مجھے یاد آیا بڑے کنور کا سوچ و بچار والا کمرہ جس میں صرف ایک کرسی اور ایک آتشدان تھا۔ شمال کی طرف کھڑکی کھلتی تھی اور اس سے آتی سرد ہوا میں آتشدان کی گرمی کو زائل کرتی تھیں۔ بعد میں وہ بڑے کنور کا بیڈروم بن گیا تھا۔ ”اب وہ بیڈروم نہیں ہے؟“

”نہیں اسے دوبارہ اسی حالت میں لایا گیا تھا یہ راج کنور اور تم لوگوں کے جانے کے بعد ہوا تھا۔“

”ٹھیک ہے وہ ہیرے وہاں ہیں تو انہیں حاصل کرنا کیا مسئلہ ہے۔ مضبوط ترین تجوری کو بھی کاٹا جاسکتا ہے۔ بے شک اس میں وقت لگے گا لیکن وقت تمہارے لیے مسئلہ نہیں تھا۔“

منشی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کام سیف کاٹنے سے نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا مطلب ہے تجوری میں کوئی ٹریپ ہے..... کوئی بم ہے؟“

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”اس میں اندر فاسفورس کی ایک تہہ ہے اگر سیف کو غلط نمبر دیا گیا تو فاسفورس جل اٹھے گا اور ہیرے خاک ہو جائیں گے۔ یہ سب منٹ سے بھی پہلے ہو گا۔ تیز ترین طریقے سے بھی سیف کھولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“

اب میں سمجھ گیا تھا کہ بڑا کنور کیوں لازمی تھا۔ فاسفورس کی آگ بہت شدید ہوتی ہے۔ اسے بجھانا بھی ممکن نہیں ہوتا ہے۔ ہیرے اصل میں کاربن کی ایک صورت ہیں۔ ان میں اور کوئلے کی ترتیب میں کاربن کے تناسب کا فرق نہیں ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہیرے کاربن کی خالص صورت ہیں۔ اگر یہ بالکل خالص ہوں تو شفاف ہوتے ہیں اور اگر ان میں معمولی سی کسی دوسرے عنصر کی ملاوٹ ہو تو یہ رنگدار ہو جاتے ہیں۔ آگ انہیں کوئلے کی طرح جلا دیتی ہے۔ دنیا کا قیمتی ترین ہیرا کوہ نور جس کی مالیت کا اندازہ لگانا دشوار ہے اگر اسے صرف ایک منٹ کے لیے موسمِ بکی معمولی سی لوپر رکھا جائے تو اس کی مالیت ایک روپیہ بھی نہیں رہ جائے گی۔ یہ ٹریپ بڑے کنور نے یقیناً اسی وجہ سے لگایا تھا کہ اگر کوئی تجوری تک رسائی حاصل کر لے اور بغیر درست طریقہ کار کے اسے کھولنے کی کوشش کرے تو اس کے ہاتھ بھی سوائے ہیروں کی راکھ کے اور کچھ نہ آئے۔ میں نے سر ہلایا۔

”میں سمجھ گیا۔ لیکن کیا یہ طریقہ رکئی نہیں ہے۔ کوئی بھی غلط نمبر ملا کر اندر موجود دولت کو خاستہ کر سکتا ہے۔“

”شہباز جی آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے..... یہ جدید ترین سیف ہے۔ اس میں متوازی تین کوڈز ملائے جاتے ہیں۔ پہلا کوڈ غلط ملانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن دوسرے اور تیسرے کوڈز میں ایک لفظ یا نمبر غلط ملایا تو اندر آگ بھڑک اٹھے گی۔ پہلا کوڈ درست ملانے سے اگلا کوڈ ملانے کا موقع ملے گا ورنہ کچھ نہیں ہو گا۔“

نشی جی نے ٹھیک کہا تھا۔ میں ان معاملات میں اناڑی تھا۔ کیونکہ کبھی تجزیوں سے واسطہ نہیں رہا۔ میرے دفتر میں ایک لاکر تھا جس کی چابی زیادہ تر منیجر طاہر کے پاس رہا کرتی تھی۔ ادائیگیاں اسی کی ذمہ داری تھیں۔ حویلی میں خزانچی ماں جی تھیں۔ ان کے پاس ایک بہت پرانا مضبوط دھاتی ٹریک تھا۔ رقم اور قیمتی اشیاء اسی میں ہوتی تھیں۔ ایک بار تمام گھر والے کئی دن کے لیے کہیں گئے تھے اور ماں جی چابی ٹریک کے اوپر چھوڑ گئی تھیں۔ واپس آئیں تو وہیں رکھی ملی تھیں اور ایک روپیا بھی غائب نہیں تھا۔ اس وقت بھی حویلی میں تین ملازم چھوڑ کر گئے تھے۔

اس سیف اور اس کا سسٹم بنانے والوں نے ہر پہلو پر نگاہ رکھی تھی۔ اچانک واک ٹاک پرپ ہوئی تو میں اسے نکالتا ہوا سرنگ کے آغاز تک آ گیا وہاں بیٹو چوکس تھا۔ سادی کی کال تھی۔ اس نے کہا۔ ”شوبی بڑے بھیا ہوش میں آگئے ہیں۔“

”میری بات کراؤ۔“

چند لمحے بعد بڑے کنور کی نجیف آواز آئی۔ ”شہباز یہ کیا تھا؟“

”واؤس۔م۔“ میں نے بتایا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اشارہ نہیں دے سکا۔ یوں سمجھ لو کہ قدرت نے مجھے موقع دیا آزاد ہونے کا۔“

”کیا حالات تمہارے قابو میں ہیں؟“

”کم سے کم سیف ہاؤس کے سامنے کے تو ہیں۔ اوپر رامن اور اس کے آدمی ہیں۔“

”نشی کہاں ہے؟“

”وہ میری قید میں ہے لیکن اس لحاظ سے بے کار ہے کہ رامن اور اس کے آدمیوں نے بغاوت کر دی ہے۔ وہ اب ان ہیروں کے چکر میں ہیں جن کے لیے نشی نے یہ سارا کھیل کھیلا ہے۔“

”اوہ..... اب تم چاہتے ہو کہ میں سادھنا کو لے کر باہر آ جاؤں۔“

”اگر تم اندر رہنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن سادی کو باہر بھیج دو۔ تم جان گئے ہو وہ یہاں نہیں رہے گی اور رہے گی تو مرجائے گی۔ اسے اس کے شوہر کے پاس واپس بھیج دو اس کی خوشی اسی میں ہے۔ میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا تم جو مرضی چاہے کرتے رہنا۔“

”میں ایسا ہی کرتا اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اسے لے کر بحفاظت نکل سکو گے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

”لیکن شہباز ان حالات میں مجھے یقین نہیں ہے کہ تم اسے لے کر یہاں سے نکل سکو گے۔ ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور صرف دو آدمی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔“

”لیکن سیف ہاؤس میں رہنا بھی مسئلہ کا حل نہیں ہے۔“

”میں اور سادی یہاں محفوظ ہیں اگر تم یہاں سے نکل جاؤ تو میرا وعدہ ہے۔ پبلز کا کنٹرول حاصل کرتے ہی میں سادی کو واپس بھیج دوں گا۔“

مجھے تعجب ہوا۔ ”تمہیں ان حالات میں بھی امید ہے کہ پبلز کا کنٹرول حاصل کر سکو گے؟“

”تم یا کوئی اور یہاں اور میرے معاملات کے بارے میں نہیں جانتا ہے۔ ہاں مجھے یقین ہے اس میں جو میں گھنٹے سے زیادہ کا وقت نہیں لگے گا۔“

بڑے کنور کے لہجے میں اعتماد تھا۔ اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ یہ اعتماد شاید کسی باہر کی امداد کے بھروسے پر تھا۔ اب یہ مدد انتظامیہ کی طرف سے آتی یا کسی نجی ذریعے سے دونوں صورتوں میں، میں پبلز میں ہونے کی صورت میں مشکل میں پڑ جاتا۔ مگر یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے بڑے کنور سے کہا۔ ”تم باہر نہیں آؤ گے؟“

”ہاں اور تم خود سوچو کہ تم دو آدمی ہمارا کس طرح دفاع کرو گے۔ اگر تم مجھے نظر انداز کر دو تب بھی سادھنا تمہاری ذمہ داری ہوگی کیا تم اسے لے کر یہاں سے باہر جاسکتے ہو۔ اول تو پبلز سے نکلنا ہی مسئلہ ہوگا۔ اگر یہاں سے نکل گئے تو اس علاقے سے کیسے نکلو گے جہاں آنے جانے کے لیے بس چند سڑکیں ہیں۔ کسی کو آرام سے ردکا جاسکتا ہے اور اگر یہاں سے نکل گئے تو انڈیا سے کیسے نکلو گے۔“

”مجھے اللہ پر بھروسہ ہے وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گا۔“ میں نے کہا۔ ”تم سادی کو باہر بھیجو۔“

”تم اس کی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔“ بڑے کنور نے خبردار کیا۔ ”تم لوگوں کے بچ نکلنے کا چانس ایک فیصد بھی نہیں ہے۔“

”میں اس سے بھی کم پر چانس لیتا رہا ہوں۔“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“

”ٹھیک ہے تم سادھنا سے بات کر لو۔“ بڑے کنور نے واکی ٹاکس اس کے حوالے کر دیا۔ اس گفتگو کے دوران میں اپنے ذہن میں کچھ تجزیے جاری رکھے ہوئے تھا۔ رامن اور اس کے ساتھیوں کے یہاں نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اوپر کا کنٹرول حاصل کر رہے تھے۔ رامن کے ساتھ اس کے اور فشی کے آدھ بے گناہ آدمی ملا کر دو درجن سے زیادہ افراد ممکن نہیں تھے اور یہ بہت بڑے کنور پبلز پر مکمل کنٹرول کے لیے قطعی ناکافی تھے۔ انہیں یقیناً مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہوگا اور ان کی توجہ ہر طرف نہیں ہوگی۔ ایسے میں ہمارے پاس چانس تھا کہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا بڑا کنور جلد سیف ہاؤس کا دروازہ کھول دے، وہ جتنی تاخیر کرتا ہماری لیے اتنی ہی مشکل ہوتی۔ کچھ دیر بعد سادی کی آواز آئی۔

”شوبی میں کیا کروں؟“ وہ رو ہانسی ہو رہی تھی۔ ”میں بڑے بھیا کو سمجھا نہیں سکتی اور وہ سب بھی نہیں کر سکتی جو آپ کہہ رہے ہیں۔ شوبی پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں میرے مقدر میں واپس آنا ہوا تو میں واپس آ جاؤں گی۔“

”میں تمہیں لینے آیا ہوں اور لے کر جاؤں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”بڑے کنور سے پوچھو کہ وہ کس برتن پر یہ یقین سے کہہ رہا ہے کہ وہ جلد پبلز کا کنٹرول حاصل کر لے گا۔“

”میں بتاتا ہوں۔“ خلاف توقع فشی نے کہا اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”یہ سمجھتا ہے کہ اس نے سارے کام

چھپا کر کیسے ہیں؟“

میں چونکا اور اس کے پاس چلا آیا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“
 ”اس نے ایک حفاظتی دستہ بنایا ہوا ہے جس میں بھارتی آرمی کے سابق کمانڈرز شامل ہیں وہ یہاں سے
 کچھ دور ایک جگہ رہتے ہیں۔ یہ انہیں دن میں دوبارہ گنٹل بھیجتا ہے۔“
 ”تم سن رہے ہو۔“ میں نے واک ٹاکی میں کہا میں نے اس کا مٹن آن کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے
 بڑے کنور نے کسی قدر کمزور لہجے میں کہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”اگر تم ان کو گنٹل نہ بھیجو تو؟“

”وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں آ جائیں گے اور معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔“

”تم نے آخری بار گنٹل کب بھیجا؟“

”رات بارہ بجے۔“

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بج کر بارہ منٹ ہو رہے تھے۔ ”یعنی تم اگلا گنٹل دوپہر بارہ بجے
 بھیجو گے۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک بجے تک آ جائیں گے۔“ بڑے کنور نے کہا۔

”وہ کبھی نہیں آئیں گے۔“ میں نے فشی دل جی کی طرف دیکھا۔ ”میں نے ٹھیک کہا نا فشی جی؟“

”شہباز جی ٹھیک کہہ رہے ہیں وہ کبھی نہیں آئیں گے میرے آدمی انہیں راستے میں زکھ کی طرف روانہ کر
 دیں گے۔“

”تم نے سن لیا۔“ میں نے بڑے کنور سے کہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ فشی دل جی نے کہا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے وہ بے شک کمانڈرز ہوں گے اور جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے لیکن وہ بے
 نقاب ہو گئے ہیں اور ان کو نشانہ بنانا بہت آسان ہے۔ ایک یا چند ام ان کو راستے میں ہی صفحہ ہستی سے نابود کر دیں
 گے۔“

میری بات پر بڑے کنور کو چپ لگ گئی۔ صاف ظاہر تھا اس کی خوش فہمی ہوا ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ درست
 تھا۔ فشی دل جی ایسا بھیدی تھا جو تقریباً اصل مالک جتنا واقف تھا۔ بلکہ مجھے شبہ تھا بعض راز اس کے اپنے ہوں
 گے اور بڑا کنور بھی ان سے ناواقف ہوگا۔ بہ وقت ضرورت فشی جی نے اپنے بچاؤ کے لیے رکھے ہوں گے۔ میں
 نے بڑے کنور سے کہا۔ ”تم نے سن لیا اب باہر سے مدد آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ تب بھی کیا تم اندر
 ہی بیٹھے رہنا پسند کرو گے۔“

”مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دو۔“

”سوچو۔“ میں نے بد مزگی سے کہا۔ ”لیکن اتنی دیر مت کرنا کہ پھر کچھ کرنے کے لیے وقت ہی باقی نہ

”رہے۔“

میں بیٹو کے پاس آیا اور جیسی آواز میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو؟“
 ”شوبی اگر یہ مان جائے تو ابھی نکل سکتا ہے دیر ہو گئی اور اوپر والوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو پھر ادھر سے
 نکلنا بہت دشوار ہو جائے گا۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ وہ شاید ہی مانے اب ہم کیا کریں اندر گھس نہیں سکتے۔ سادی نرم دل ہے وہ اپنے بھائی
 کو مجبور نہیں کر پارہی ہے۔“

بیٹو نے کچھ دیر سوچا اور بولا۔ ”شوبی ہمارا دل کہتا ہے دیدی کو لے کر جائے، آگے آپ جو حکم کرو۔“
 ”میں تم کو یا اپنے کسی ساتھی کو حکم نہیں دے سکتا۔ ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں کہ بڑا کنور کیا فیصلہ کرتا ہے اس
 کے بعد ہم اپنا لائحہ عمل طے کریں گے۔“
 ”شوبی اگر کوئی اس طرف سے آئے تو.....“

”بنا وارننگ شوٹ کر دو، اگر محسوس کرو کہ وہ حملہ کرنے آرہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کسی بھی حربے کے
 لیے تیار رہنا..... گیس اور وائس بم اب ان کے پاس بھی ہوں گے۔ ہمارے پاس بس یہ رائفلیں اور پستول
 ہیں۔“

”ہم دونوں سے نمٹ سکتا ہے۔“ بیٹو نے سر ہلایا۔
 ہم اس جگہ محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ آگے رامن کے آدمی مورچہ بند ہوں گے اور وہ
 ہمیں اتنی آسانی سے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ مجھے اس ہال میں اترنے والے راستے کا خیال
 آیا جو گرینیڈز سے تباہ کر کے بند کر دیا تھا۔ میں طے پر چڑھ کر اوپر آیا، آگے بہ ظاہر راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن
 میں جھک کر اور گھس کر آگے بڑھا۔ اس موقع پر نائٹ ویژن خاصی کام آ رہی تھی، جلد میں نے ایک رخنہ تلاش کر
 لیا جو اوپر تک جا رہا تھا۔ میں ذرا نیچے آیا اور بیٹو کو آواز دی۔ وہ آیا تو میں نے سرگوشی میں اسے بتایا کہ میں اوپر
 جانے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس لیے وہ اب نیچے کا بھی خیال رکھے۔ بیٹو نے سر ہلایا۔ ”ہم
 دیکھ لے گا۔ پر آپ دیکھ کر جانا ایسا نہ ہو کہ ملے کرنے والا ہو۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ میں نے کہا اور دوبارہ اوپر کی طرف بڑھا۔ بعض جگہ پر ملے سرک رہا تھا۔ مگر اس
 میں نیچے مزید خلا نہیں تھا اس لیے گرنے کا خدشہ نہیں تھا۔ میں اس رخنے تک پہنچا اور دوسری طرف جھانکا مگر کچھ
 نظر نہیں آ رہا تھا بس ایسا ہی آڑا تر چھال ملے پڑا تھا۔ جگہ بہت تنگ تھی اور اگر آگے راستہ بند ملتا تو واپس آنا بھی
 آسان نہ ہوتا۔ مگر میں نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ رائفل پر نارنج گلی تھی مگر اسے روشن کرنے کا مطلب تھا
 کہ اگر سوراخ کے دوسری طرف کوئی موجود ہو تو اسے اپنی تشریف آوری سے خبردار کرنا۔ اس لیے میں نائٹ
 ویژن کے بل بوتے پر آگے سرک رہا۔ یہ رخنہ میری جیسی جسامت کے آدمی کے لیے چھوٹا تھا۔ بیٹو اس میں آرام
 سے آ جاتا اور کامی تو ٹھہلتا ہوا جاتا۔ مگر میں کسی کو آگے نہیں کر سکتا تھا یہ کام مجھے ہی کرنا تھا۔ اگر یہاں داخلے کا
 راستہ نکل آتا تو شاید ہماری بچت کی کوئی سبیل نکل آتی۔ مجھے امید تھی کہ اس راستے کو بند پا کر پہلے نشی اور اب
 رامن کے آدمی یہاں سے ہٹ گئے ہوں گے۔

مگر یہ میرا خیال تھا یہ بھی ہو سکتا تھا، کہ وہ اس راستے کو صاف کر کے خاموشی سے نیچے آنے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ یہاں جس طرح لمبے بکھرا ہوا تھا خاموشی سے نیچے آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں خود سرک رہا تھا اور اس سے آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اگر کوئی حد میں ہوتا تو وہ ان آوازوں کو سن لیتا۔ اس لیے میں نے اس حالت میں بھی اپنا پستول سامنے رکھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں سرکنا ہوا سیزھیوں کے اوپری حصے تک آ گیا ہوں۔ یہاں سے واش روم کچھ ہی دور تھا۔ بدبو نے میرے اندازے کی تصدیق کی تھی۔ گرینڈز کے فراغ دلانہ استعمال نے واش روم کی اندرونی ساخت تباہ کر دی تھی اور سیوریج لائنیں پھٹ گئی تھیں۔ یہ بدبو ان ہی سے اٹھ رہی تھی۔ بہر حال یہ ناقابل برداشت نہیں تھی شاید اس لیے بھی کہ یہ واش روم بہت کم استعمال ہوتا ہوگا۔

راستہ اب بہت تنگ ہو گیا تھا اور میں بہ مشکل ہی آگے بڑھ پارہا تھا۔ بالآخر میں اس خلا سے سر نکالنے میں کامیاب ہوا۔ یہ ایک چھوٹا سا خانہ تھا۔ میں نے غور کیا تو یہ وہی خانہ محسوس ہوا جس میں خفیہ دروازہ لگا ہوا تھا۔ خفیہ دروازہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا اور اس کے ہانڈرولک سسٹم کا آئل بہہ نکلا تھا۔ یہ جگہ چھپا رہی تھی۔ میں نے ماربل کا ایک ٹکڑا کوشش کر کے ہٹایا تو اتنا راستہ بنا کہ میں باہر نکل سکوں۔ دیواریں گرنے سے یہ خانہ آخری طرف سے بھی بند ہو گیا تھا اور اب صرف اس کی چھت کھلی تھی۔ میں نے ایک طرف دیوار پر ہاتھ ٹیکے اور سر آہستہ سے اوپر کیا۔ دوسری طرف واش روم کا کھلا حصہ تھا اگرچہ وہاں بھی لمبے بکھرا ہوا تھا لیکن یہاں سے بہتر صورت حال تھی اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ساتھ والے کمرے میں لگی آگ بجھادی گئی تھی۔ آگ جس طرح سے بھڑکی تھی اور میں نے پورے کمرے میں لگائی تھی اس کے از خود بجھنے کا امکان کم تھا۔ دھواں بھی نکل چکا تھا۔ میں احتیاط سے اس خستہ حال دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔

واش روم میں کوئی نہیں تھا اور کمرہ بھی خالی تھا۔ میں نے سب سے پہلے پانی کی تلاش کی، اکثر تل بھی تباہ ہو گئے تھے لیکن ایک تل ٹھیک مل گیا۔ میں نے اسے کھولا تو سرد شفاف پانی آ رہا تھا۔ میں نے پہلے چکھا اور پھر پیالین زیادہ پینے سے گریز کیا۔ واپس کمرے میں آیا۔ اس کا دروازہ جھلنے سے بچ گیا تھا اور بند تھا۔ میں نے اسے کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ یہاں بھی تاریکی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ پستول رکھ کر میں نے رائفل سنبھال لی تھی۔ یہاں کسی لمبے بھی کسی سے سامنا ہو سکتا تھا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ عمارت خالی تھی۔ میں راہداری سے گزر رہا تھا کہ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے اندر کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے اور اونچی آواز میں کر رہے تھے۔ ان کا انداز اذدارانہ نہیں تھا۔ میں نے ہینڈل گھمایا تو وہ لاک نکلا۔ اسی لمبے اندر سے کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔

”دروازہ کھولو۔“ کوئی چلا کر بولا مگر آواز باہر بہت کم آئی تھی۔ ”ہمیں کیوں قید رکھا ہے۔“

”تم لوگ کون ہو؟“ میں نے تالے کے سوراخ پر دونوں ہاتھوں سے پیالہ بنا کر رکھا اور اس میں منہ ڈال

رہا۔

”کیا..... کون ہو تم؟“

”میں ان میں سے نہیں ہوں جنہوں نے تمہیں یہاں قید کیا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اب اپنے

رے میں بتاؤ۔“

”ہم پیلس کے گارڈز ہیں۔“

”تمہیں قید کرنے والے کون ہیں۔“

”جو بعد میں آئے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم کتنے لوگ ہو؟“

”ہم پانچ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”ہمارے باقی سارے ساتھی مارے جا چکے ہیں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اکثر تو ہمارے ہاتھ سے مارے گئے تھے اور باقی فشی ورامن کے آدمیوں نے مارے

ہوں گے۔ میں نے پوچھا۔ ”تم جانتے ہو بڑا کنور کہاں ہے؟“

”وہ سیف ہاؤس میں جا چکے ہیں۔“

مجھے وہ آدمی باخبر لگا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ”تم لوگوں کے پاس ہتھیار ہیں؟“

”نہیں ہمارے ہتھیار چھین لیے گئے تھے۔“

”یہ دروازہ لاک ہے اسے اندر سے نہیں کھولا جاسکتا؟“

اس نے میرے احمقانہ سوال پر افسوس کیا۔ ”اگر کھول سکتے تو ہم یہاں قید ہوتے۔“

”پیچھے ہٹ جاؤ۔“ میں نے کہا اور لاک پر پستول کی ٹال رکھ کر فائر کیا۔ دوسرے فائر پر لاک ٹوٹ گیا

تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رائفل سنبھال لی۔ ایک خطرہ تو مجھے اندر والوں سے تھا دوسرا خطرہ یہ تھا کہ آس

پاس رامن کے آدمی ہوئے تو وہ فائر سن کر آجائیں گے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ پانچوں گورکھے باہر آ گئے۔

انہوں نے خاص گارڈز والی وردی پہن رکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی انہیں کیسے بخش دیا تھا جب کہ وہ خاص گارڈز

میں سے تھے۔ میں نے یہی سوال کیا تو مجھ سے بات کرنے والے نے کہا۔ ”ہم گیس کا شکار ہو گئے تھے اور جب

تک ہوش میں آتے دوسرے آچکے تھے۔“ بولنے والا تقریباً چالیس برس کا گٹھے ہوئے جسم کا شخص تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے اور تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”رام پال جو گنڈر..... ان میں کچھ پیلس کے لوگ تھے۔“

”باقی باہر سے آئے تھے اور وہ پہلے فشی اور اب رامن کے آدمی ہیں۔ پیلس پر حملہ میں نے کیا تھا لیکن میرا

مقصد صرف اپنی بہن کو واپس لے جانا تھا۔ فشی اور رامن بڑے کنور کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ انہوں نے

سارے مواصلاتی رابطے ختم کر دیئے ہیں اور اب باہر سے کوئی مدد نہیں آ سکتی ہے۔“

رام پال غور سے سن رہا تھا۔ ”میں تمہیں جانتا ہوں..... میں پیلس کا نائب سکیورٹی انچارج ہوں۔“

”بڑا کنور سیف ہاؤس کے چمبر میں مقید ہے کیونکہ اس کے ساتھ اندر جانے والے گارڈز میں تین غدار

اور فشی کے آدمی تھے انہوں نے باقی سب کو مار دیا ہے۔“

رام پال کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”ان میں میرا بھائی بھی شامل تھا۔“

”مجھے افسوس ہے لیکن ان میں سے کوئی نہیں بچا میں نے خود سنا تھا جو فائرنگ سے بچ گئے تھے انہیں ذبح

کر دیا گیا تھا۔“

کمرے میں روشنی تھی اور وہی روشنی باہر آ رہی تھی لیکن میں نے نائٹ ویژن آف نہیں کیا تھا کیونکہ آگے

تاریکی تھی۔ روشنی سے بچنے کے لیے میں ایک طرف ہو گیا تھا۔ رام پال یہ سن کر جذباتی ہو گیا۔ ”اگر یہ سچ ہے تو میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”یہ سچ ہے اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں بڑے کنور سے تمہاری بات کر سکتا ہوں۔“

”ہم تیار ہیں۔“

”تم اور تمہارے آدمی آگے چلیں گے۔ ابھی میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا جب تک بڑے کنور سے بات کر کے تمہاری تسلی نہ کرادوں۔“

وہ مان گئے اور میرے آگے روانہ ہوئے۔ کیونکہ ان کے پاس ٹائٹ ویٹرن نہیں تھا اس لیے ہم نے وہیں سے ٹارچیں اور ایمرجنسی لائٹس لے لیں۔ وہ واش روم اور اس کا حشر دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ رام پال غصیہ راستے سے واقف تھا۔ میں نے پہلے انہیں اس راستے کو ذرا وسیع کرنے کو کہا۔ پانچ افراد نے مل کر چند منٹ میں خاصا لمبہ نکال لیا اور راستہ چوڑا ہو گیا اب اس سے آسانی سے گزرا جاسکتا تھا۔ پہلے وہ پانچوں نیچے گئے۔ میں نے بیٹو کو آواز دے کر بتایا کہ پیلس کے پانچ گارڈز نیچے آ رہے ہیں۔ ان کے بعد میں نیچے گیا اور رام پال کے واک ٹاکی پر بڑے کنور سے رابطہ کر لیا۔ بڑے کنور کی آواز سن کر وہ ایمینشن ہو گیا اور اس نے اوپر کی صورت حال کی رپورٹ دی۔ پھر میں نے اس سے واک ٹاکی لے کر بڑے کنور سے کہا۔

”اب تم نے اندازہ لگالیا ہو گا کہ اوپر کیا صورت حال ہے۔ تم جتنی دیر کرو گے یہاں سے نکلنا اتنا ہی دشوار ہوتا جائے۔ فی الحال مرکزی پیلس میں بھی کوئی نہیں ہے یا پھر چند ایک لوگ ہیں ہم ان کا صفایا کر سکتے ہیں۔ اوپر اس چوہے دان کے مقابلے میں بہتر ہو گا۔“

”ہم اوپر کیسے جائیں گے تم نے راستہ بتا دیا ہے۔“ بڑے کنور نے اس بار انکار نہیں کیا۔

”تمہارے آدمیوں نے راستہ کسی قدر صاف کر دیا ہے ذرا کوشش کے بعد اس سے گزرا جاسکتا ہے۔ پھر ہم اسے بند کر دیں گے۔“

رام پال منشی دل جی کے پاس بیٹھا اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا ان لوگوں کو دیکھ کر منشی کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آ رہے تھے۔ رام پال نے مجھ سے کہا۔ ”یہ غیر ضروری ہے اسے یہیں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔“

”ہونا تو یہی چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ابھی مجھے اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے اس لیے یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“

اسی لمحے واک ٹاکی پر ہپ ہوئی۔ دوسری طرف سے بڑے کنور نے کہا۔ ”میں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں تم ہوشیار رہو۔“

میں نے اضافی اسلحہ رام پال اور اس کے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کو میگزین دیئے اور انہوں نے رائفلیں لوڈ کر لیں۔ پھر سب نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ میں نے منشی کو سامنے کیا اور اس سے کہا۔ ”دروازہ کھلنے جا رہا ہے۔ اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار ڈال کر باہر آ جائیں۔“ میں منشی کے بالکل پیچھے تھا۔ پھر میں نے واک ٹاکی پر بڑے کنور سے کہا۔ ”ریموٹ سے سیف ہاؤس کا دروازہ کھول دو مگر تم اور سادی اندر ہی رہو گے۔“

”میں کھول رہا ہوں۔“ اس نے کہا اور چند سیکنڈ بعد سیف ہاؤس کے دروازے سے ویسی ہی سنسناتی

ہوئی آواز آئی جیسی خفیہ دروازے کھلتے وقت آتی تھی۔ یہ دروازہ بھی یقیناً ہانڈرولک طریقے سے کھلتا اور بند ہوتا ہوگا۔ کسی اور طریقے سے اتنا وزنی دروازہ کنٹرول کرنا آسان نہیں تھا۔ میں اور میرے ساتھی ہوشیار تھے۔ میں نے بیت کو اس جگہ سے دور رکھا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی منشی دل جی نے چلا کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

”ہتھیار ڈال کر باہر آ جاؤ۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو باس؟“ اندر سے ایک آدمی نے کہا۔

”میں حکم دے رہا ہوں۔“ منشی نے اس بارغرا کر کہا۔ ”فورا ہتھیار ڈال کر باہر آ جاؤ۔“

وہ دونوں منشی کے وفادار تھے۔ اس لیے حکم کی تعمیل کی مگر جیسے ہی وہ دروازے پر نمودار ہوئے رام پال نے اچانک دو فائر کیے اور دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ گولیاں ان کے سروں پر لگی تھیں۔ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟“

”یہ میرے بھائی کے قاتل تھے میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”اس پر آپ مجھے جوسزادو گے مجھے قبول ہے۔“

میں نے خود پر قابو پایا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”یہاں ہر کوئی کسی نہ کسی کا قاتل ہے۔ خود پر قابو رکھو..... اچھا تھا اگر میں تمہیں خالی رائل نقل دیتا۔ اس طرح تم جذباتی ہوتے رہے تو بڑے کنور کی حفاظت کے لیے تم پر کس طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔“

رام پال سربھکائے کھڑا رہا۔ میں آگے آیا اور اندر کا حال دیکھ کر میری طبیعت مالش کرنے لگی تھی۔ وہاں ہر طرف لاشیں اور خون بکھرا ہوا تھا۔ یہ سب ان دونوں نے کیا تھا اور اس کا صلہ کیا ملا؟ وہ خود بھی لاشوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مینہ لاشوں اور خون سے بچتے ہوئے چہر کی طرف بڑھا اس کا فولادی دروازہ نمایاں تھا۔ میں نے بڑے کنور کو آواز دی۔ ”تم سن رہے ہو؟“

”ہاں سن رہا ہوں۔“ بڑے کنور نے جواب دیا۔

”یہاں سب کلیئر ہے باہر آ جاؤ۔“

”یہ فائرنگ کیسی تھی؟“

”رام پال نے جذباتی ہو کر منشی کے دونوں ساتھیوں کو مار دیا۔ یہاں مارے جانے والوں میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ اب تم اور سادی باہر آؤ تاکہ ہم اوپر جائیں۔“

اسی لمحے باہر سے بیت نے پکار کر کہا۔ ”کچھ لوگ ادھر آ رہا ہے۔“

”ان کو روکو۔“ میں نے کہا اور بڑے کنور سے بولا۔ ”جلدی کرو..... وہ لوگ آ رہے ہیں۔“

چہر کا دروازہ کھلا، سادی آگے تھی وہ آتے ہی مجھ سے چٹ گئی اور میرے بازو سے سر نکالیا۔ وہ دروہی تھی میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پاگل روتی کیوں ہے ابھی تیری دیکھ بھال کرنے والے زندہ ہیں جب نہ ہوں تب رونا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے لرز کر کہا۔ ”شوہی میں آپ کے لیے بہت دعا کرتی تھی۔“

”مجھے اسی کی ضرورت ہے اب چلو۔“ میں نے پیچھے کھڑے بڑے کنور کی طرف دیکھا۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

اس نے سر ہلایا لیکن سادی نے کہا۔ ”بڑے بھیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
میں نے رام پال سے کہا۔ ”تم لوگ بڑے کنور کو لے کر اوپر جاؤ، جب تک ہم آنے والوں کو روکتے
ہیں۔“

”سادھنا میرے ساتھ جائے گی۔“

”نہیں یہ میرے ساتھ جائے گی کیونکہ تم خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔“ میں نے کہا اور سادی سے
پوچھا۔ ”تمہارے پاس پستول ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں ہے۔“

”سیف ہاؤس لاک کر دو۔“ میں نے کہا تو بڑے کنور نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی ریموٹ
کے ساتھ کچھ کیا اور فولادی دروازہ سنسناتی آواز کے ساتھ بند ہونے لگا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد رام پال
بڑے کنور کو لے کر سوراخ کی طرف بڑھا۔ اس کے دو آدمی بڑے کنور کو سہارا دے رہے تھے۔ اس کے سوراخ
میں داخل ہونے کے بعد سادی نے آہستہ سے کہا۔ ”بڑے بھیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بہت مشکل سے ہوش
میں آئے تھے اور بہت دیر تک تو اٹھ بھی نہیں سکے تھے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کیسی ہوشیار ہو تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“
”نہیں اس لحاظ سے میں آرام سے تھی۔“ سادی نے کہا۔ ”میری خدمت کے لیے دو خادماں تھی، ڈاکٹر
اور نرس ہر وقت میرے ساتھ ہوتے تھے۔“ پھر اسے خیال آیا۔ ”بیٹو کہاں ہے؟“

”ہم یہاں ہے دیدی۔“ بیٹو نے سرنگ کی طرف سے کہا۔ ”ابھی ادھر سے ہٹ نہیں سکتا ہے۔“

بڑے کنور کے ساتھ رام پال دو ساتھیوں کے ساتھ گیا تھا۔ دو اور منشی دل جی نیچے تھے۔ وہ دونوں بیٹو کے
ساتھ تھے۔ میں نے سوراخ میں جھانک کر رام پال کو آواز دی۔ ”اپنا ایک آدمی بھیجوشی کو لے کر جائے گا۔“
کچھ دیر میں ایک آدمی آگیا اور میں نے اس کے ساتھ منشی کو روانہ کر دیا۔ پھر خود سادی کو لے کر روانہ ہوا۔
میرے پیچھے بیٹو آتا اور اس کے پیچھے رام پال کے باقی دو آدمی آتے۔ ان لوگوں کو اسلحہ دیتے ہوئے مجھے کچھ
خوشہ ہوا تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ میں آگے تھا اور سادی میرے پیچھے تھی۔ ہم جب نکلنے کے قریب
پہنچے تو میں نے بیٹو کو آواز دی۔ ”اب تم بھی آ جاؤ۔“

کچھ دیر میں بیٹو بھی یہاں تھا۔ رام پال اور اس کے آدمیوں نے راستہ مزید صاف کر دیا تھا۔ وہ بڑے
کنور سمیت جلے کمرے میں موجود تھے۔ بڑا کنور ہانپ رہا تھا۔ اسے آرام اور علاج کی ضرورت تھی لیکن فی الحال
دونوں ہی دستیاب نہیں تھے۔ بیٹو اور ان دونوں کے آتے ہی میں نے لمبے ڈال کر اس راستے کو بند کرنے کا حکم دیا
اور رام پال کے آدمی اس میں لگ گئے۔ وہ کنکریٹ اور سرامک کے بڑے بڑے ٹکڑے سوراخ میں ڈال رہے
تھے ساتھ ہی چھوٹے پتھر اور مٹی بھی ڈال رہے تھے۔ اب کوئی اس طرف سے آنا چاہتا تو اس کے لیے یہ کام
آسان نہ رہتا۔ میں ان کی نگرانی کر رہا تھا اور اب بیٹو سادی سے مل رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اسے رہا کرانے
کے لیے ہم نے کیا کیا کوششیں کی تھیں اور کن مراحل سے گزرے تھے۔ سادی خوش ہو رہی تھی اور ساتھ ہی فکر مند
بھی۔ اس نے بیٹو سے کہا۔ ”تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے دیدی..... آپ ہمارا دیدی ہو..... کوئی بھائی اپنی بہن کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟“

”یہاں سے نکلتا بہت مشکل کام ہے۔“

”شوبی دوبار پہلے یہ مشکل کام کر چکا ہے۔“ بیٹو نے فخر سے کہا۔ ”آپ نہیں جانتا شوبی کیا چیز ہے۔“

”مجھے کیوں نہیں پتا..... کیا میں ان کے ساتھ نہیں رہتی تم بھول رہے ہو مجھے دوبار گولی لگی تھی۔“

”تعریفیں بس۔“ میں نے کمرے میں آکر کہا اور بڑے کنور سے پوچھا۔ ”اب ہمیں کہاں جانا ہے؟“

”میرے رہائشی حصے میں۔“ اس نے کنور لہجے میں کہا۔ ”سب وہیں ہے..... اسلحہ بھی اور میری دوائیاں بھی۔“

”تم دوائیاں لے کر نہیں آئے تھے؟“

”نہیں جلدی میں رہ گئی تھیں۔“

”تب چلو۔“ میں نے کہا اور دونوں غیر مسلح گارڈز سے کہا۔ ”تم کنور کو سنبھالو گے۔ بیٹو اور سادی کنور کے ساتھ ہوں گے۔ رام پال تم ایک آدمی کو اور میرے ساتھ چلو۔“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں راستہ کلیئر کرنے جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور رام پال سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس ٹائٹ ویژن ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“

”ٹھیک ہے وہ بہن لو..... دوسرا تمہارے ساتھ ہوگا ہمیں اس فلور کی لائٹ اڑانی پڑے گی۔“

”وہ کیسے؟ فیوز بکس یہاں نہیں ہے۔“

”اس کی فکر مت کرو..... کسی کے پاس سکہ ہے۔“

سب کے پاس کوئی نہ کوئی سکہ تھا۔ میں نے ایک سکہ کمرے کے بلب ہولڈر میں لگا کر اوپر سے انرجی سیورف کر دیا۔ جیسے ہی مٹن آن کیا۔ کمرے کے ساتھ راہداری بھی تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ اس کمرے کی روشنی بند ہو گئی تھی جس میں یہ پانچوں قید تھے۔ گویا یہ فلور یا راہداری بجلی سے محروم ہو گئی تھی۔ رام پال نے ایک چھوٹی سی ٹائٹ ویژن کا گلز نکال پہن لی۔ یہ بہت اچھی کوالٹی کی نہیں تھی کیونکہ تاریکی میں یہ کسی بی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہم باہر نکل آئے۔ میز ہیوں تک آئے یہاں نیچے کے حصے میں فتح خان کے آدمی اور مقامی گارڈز کی لائٹیں ایک ڈیڑھ کی صورت میں جمع تھیں۔ میں نے رام پال کو اشارہ کیا کہ وہ میز ہیوں کو چیک کرے اور خود میز ہیوں کے نیچے سے گزرنے والی راہداری کی طرف بڑھا۔ یہ آگے جا کر بائیں طرف مڑ رہی تھی۔ اس طرف روشنی تھی۔ میں نے ایک وال لیپ کو اتار کر اس میں سکہ رکھ کر بلب لگایا تو یہاں کا فیوز بھی اڑ گیا۔

آگے کوئی نہیں تھا۔ میں رک گیا کچھ دیر میں رام پال بھی اپنے ساتھی کے ہمراہ آ گیا اور ہم اس راہداری کے کمرے چیک کرنے لگے۔ مگر یہ جگہ مکمل طور پر خالی تھی۔ میں نے رام پال سے پوچھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے تو اس نے مجھے بتایا کہ اس راہداری سے نکلنے کے بعد ہم دائیں طرف جائیں تو بڑے کنور کے لیے مخصوص حصے تک پہنچ جائیں گے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جا کر بڑے کنور کو لے آئے تب تک میں اس کے ساتھی کے ہمراہ یہیں

رکتا ہوں۔ رام پال چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اس کے آدمی کو وہیں چھوڑا اور خود بے قدموں آگے کی طرف بڑھا۔ یہ راہداری آگے جا کر پھر دو حصوں میں بٹ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر بائیں طرف دیکھا وہاں روشنی تھی۔ ہمیں اسی طرف جانا تھا۔ میں کوٹنے پر رک گیا۔ چند منٹ بعد رام پال باقی سب کو لے کر آگیا۔ وہ اور بیٹو سب کی رہنمائی کر رہے تھے کیونکہ اس تاریکی میں وہی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے بیٹو سے پوچھا۔ ”جب میں بڑے کنور سے بات کر رہا تھا تب تم نے کہا تھا کچھ لوگ اس طرف آرہے ہیں۔“

”شوبی وہ کم سے کم تین آدمی تھا وہ موڑ تک آیا مگر جب ہم نے آپ کو خبردار کیا تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور دوبارہ نہیں آیا۔“

میں فکرمند ہو گیا۔ اگر دشمن سرگرمی میں ہمارے پاس آگیا تھا تو اس طرح جھک دکھا کر واپس جانے کی کیا نیک تھی۔ اسے حملہ کرنا چاہیے تھا جب کہ وہ جانتا تھا کہ ہم یہاں محصور ہیں۔ رام پال نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”سر ہمیں آگے جانا ہوگا..... بڑے کنور کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“

میں نے دیکھا وہ بہ مشکل سہارا لیے کھڑا تھا۔ سادی بہر حال اس کی بہن تھی اور اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ بھی اس کے پاس تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”چلو لیکن بہت محتاط رہنا ہوگا۔“

میں اور رام پال آگے تھے۔ فشی ہمارے ساتھ تھا۔ جب کہ بیٹو اور رام پال کے دو مسلح ساتھی عقب میں تھے۔ وہ پشت کی حفاظت کرتے چل رہے تھے کیونکہ دشمن کسی بھی طرف سے آسکتا تھا۔ مجھے ذرا خوش فہمی نہیں تھی کہ رامن نے اس عمارت کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ یہیں وہ ہیرے تھے جو اس سارے فساد کی جڑ تھے۔ جہاں راہداری گھوم رہی تھی میں نے رام پال سے پوچھا۔ ”بڑے کنور کے حصے تک جانے کا اور کوئی راستہ ہے؟“

اس نے فشی میں سر ہلایا۔ ”صرف یہی ایک راہداری جاتی ہے۔ اس پر بھی سخت سکیورٹی ہوتی ہے۔ آخری حصے میں خاندان کا کوئی فرد بھی بغیر اجازت اور چیک کے نہیں جاسکتا ہے۔“

بڑے کنور کو سب سے زیادہ خطرہ خاندان والوں سے ہی تھا۔ راج کنور اس کا بھائی تھا اور فشی رشتے دار تھا اور دونوں اسے دنیا سے رخصت کر دینا چاہتے تھے۔ میں اور رام پال محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری رائفلوں کا رخ سامنے کی طرف تھا اور ہم ایک سیکنڈ کے نوٹس پر فائر کرنے کے لیے تیار تھے۔ ایک جگہ دو گارڈز کی لاشیں اپنے ہی خون میں غلٹاں پڑی تھیں۔ ان کے پاس سے گزر کر ہم اس چھوٹے دائرے نما ہال میں داخل ہوئے جس کے تین اطراف میں کمرے تھے اور ان میں وسط والا کمرہ بڑے کنور کا خاص کمرہ تھا۔ یہاں بھی تباہی کے آثار تھے اور جا بجا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ شاید یہاں بھی جنگ ہوئی تھی۔ وہاں روشنی تھی اس لیے سب نے نائٹ ویژن آف کر دیں۔ ابھی تک ہمیں کہیں مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ہم سب ہال میں آگے اور بڑا کنور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا کہ میں نے اسے روکا۔ ”نہیں پہلے چیک کرنے دو۔“

رام پال آگے بڑھا تھا کہ نجد ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے اسے کچھ نظر آیا ہو۔ میں نے تقلید کی اور فوراً ہی مجھے وہ چیز نظر آگئی۔ یہ ہال کے تقریباً وسط میں رکھا ایک گچی کے پانچ کلو کے ڈبے کے برابر کا ڈائنامائٹ بندل تھا جس کے ساتھ ایک سرکٹ منسلک تھا اور بیٹری سمیت سب واضح تھا۔ میں پلٹنے لگا تھا کہ مجھے رامن کی مکروہ آواز سنائی دی۔ ”نہ..... نہ شہباز..... مزید کوئی حرکت مت کرنا ورنہ میں ریموٹ کا بٹن دبا دوں گا اور اس جگہ موجود کوئی فرد

زندہ نہیں رہے گا۔ تم سب میری نظروں میں ہو اس لیے کوئی بھی حرکت نہ کرے۔“

”تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔“

”اچھا تمہارے پیچھے موجود فشی خاموشی سے سرک رہا ہے اسے روکو اگر مرنے نہیں چاہتے ہو تو.....“

میں نے مڑ کر فشی کو دیکھا تو وہ فوراً ساکت ہو گیا تھا۔ رامن نے درست کہا تھا۔ ”تم نے اسی لیے اپنے

آدمیوں کی جھلک دکھائی تھی کہ ہم اوپر آ جائیں؟“

”ہاں اور تم میری توقع پر پورے اترے۔“ اس نے کہا۔ ”شہباز میں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔

اپنا تمام اسلحہ پیچھے گیلری میں پھینک دو۔“

میں ٹریپ در ٹریپ کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ ایک ٹریپ سے نجات پاتا تو دوسرے میں پھنس جاتا۔

فشی کے مقابلے میں رامن زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے بہت چالاکی سے ہمیں پھانسا اور وہاں آنے

پر مجبور کر دیا جہاں وہ ہمیں اور خاص طور سے بڑے کنور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں اس نے ہمارے استقبال کے

لیے ایک بم ٹریپ رکھا تھا اور خود کہیں دور بیٹھ کر وہ اب ہمیں مجبور کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”رامن اگر تم نے اس

بم کو اڑا دیا تو ہم سب مر جائیں گے پھر تم وہ ہیرے کس طرح حاصل کرو گے۔“

”ابھی راج کنور ہے۔“ رامن نے لا پرواہی سے کہا۔ ”میں اس کی مدد سے ہیرے حاصل کر لوں گا۔“

”اے سیف کا کبھی نیشن نہیں معلوم ہے۔“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ راج کنور کو لازمی معلوم ہو گا اور اگر اسے بھی علم نہیں ہوا تب بھی میں اس سیف

کو لے جاؤں گا اور آج کل ٹیکنالوجی بہت ترقی کر چکی ہے میں اسے کھلوالوں گا۔ بہر حال تم سیف اور ہیروں کی

نہیں اپنی فکر کرو..... میں دیکھ رہا ہوں تم میں سے کسی نے ہتھیار نہیں پھینکے ہیں اب دس تک گنوں گا اور پھر

بوم..... ایک دو تین چار.....“

میں نے اپنی رائفل پھینک دی پھر باقی سب نے بھی میری پیروی کی۔ ہم نے اتنی زور سے پھینکی تھیں کہ

وہ سرکتی ہوئی گیلری میں چلی گئیں۔ رامن نے کہا۔ ”پستول بھی تم سب کے پاس پستول ہوں گے۔“

”صرف دو پستول ہیں۔“ میں نے کہا اور اپنا پستول پھینک دیا۔ بیٹو نے میری تھلید کی۔

”اوکے تم سب سر ہاتھ پر رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور اب کسی کے پاس سے پستول یا کوئی بھی ہتھیار

نکالا تو وہ اسی سے مارا جائے گا۔“

”اوکے..... اوکے۔“ میں نے دل ہی دل میں اس مکار آدمی کو سناتے ہوئے سادی سے کہا۔ ”پستول

پھینک دو کسی کے پاس کوئی چاقو ہے تو وہ بھی پھینک دو ورنہ اپنی موت کا خود ذمے دار ہو گا۔“

اس بار سادی نے پستول اور رام پال نے ایک بڑا فوجی چاقو نکال کر پھینک دیا تھا۔ یہ شاید اس کے پاس رہ

گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور سروں پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ

گئے۔ رامن نے سادی اور بڑے کنور کو بھی رعایت نہیں دی اور انہیں بھی اسی طرح بیٹھنا پڑا۔ چند منٹ بعد گیلری

کی طرف سے چار مسلح افراد برآمد ہوئے اور انہوں نے ہال میں چاروں طرف اس طرح پوزیشن سنبھال لی کہ

کوئی فرد یا اس کی حرکت ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ پھر دو افراد آئے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ میں

پہلے بھی ان لوگوں کو دیکھ چکا تھا۔ آنے والے دونوں سب کی مکمل جامع تلاشی لینے لگے۔ وہ کوئی جگہ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک سادی کی طرف بڑھا تو میں نے کہا۔ ”رامن سعدی کی تلاشی نہیں لی جائے گی۔“ ”ٹھیک ہے پھر اسے شوٹ کر دیتے ہیں۔“ رامن نے سر دلچے میں جواب دیا تو سادی کا رنگ اڑ گیا تھا۔ میں نے مجبوراً سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے لیکن اپنے آدمیوں سے کہو صرف تلاشی لیں مجھے مشتعل کرنے والا کوئی کام نہ کریں ورنہ ایسا نہ ہو تم ان کی وجہ سے ہیروں سے محروم ہو جاؤ۔“

”تم فکر مت کرو وہ صرف تلاشی لیں گے۔“

سادی کی تلاشی لینے والے نے اس کو بھی پوری طرح ٹٹولا تھا مگر اس کے انداز میں بد معاشی نہیں تھی اور نہ ہی اس نے غیر ضروری طور پر اسے دیر تک چھوا۔ اس کے باوجود سادی کے لیے یہ صبر آزمایہ مرحلہ تھا۔ دس منٹ میں یہ مرحلہ بھی مکمل ہو گیا۔ کسی کے پاس سے کچھ نہیں نکلا تھا۔ بڑے کنور کے ڈھیلے چوٹے کو بھی اچھی طرح ٹٹولا گیا تھا۔ اس کی قیمتی لکڑی اور ہاتھی دانت کے دستے کی بنی چھڑی ایک اچھا ہتھیار ہو سکتی تھی مگر تلاشی لینے والے نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ بڑے کنور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے استعمال کر سکتا۔ وہ بہ مشکل ٹھنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا اور اچانک ہی وہ نیچے لڑھک گیا۔ سادی نے فکر مندی سے کہا۔ ”آپ ٹھیک ہیں؟“

میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”رامن بڑے کنور کی حالت خراب ہو رہی ہے اسے دوا کی ضرورت ہے جو اس کے کمرے میں ہے۔“

”فکر مت کرو یہ میرے گانہیں۔“ رامن نے کہا۔ وہ اپنے طریقہ کار سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ تلاشی لینے کے بعد اس کے آدمی ہمارا اسلحہ سمیٹ کر لے گئے اور چار مسلح افراد اسی طرح ساکت اور چوکس کھڑے تھے۔ وہ ہیلز کے گارڈز میں سے نہیں تھے بلکہ منشی کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے اب منشی کے بجائے رامن کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ اپنے فیصلے پر ذرا بھی شرمسار نہیں تھے۔ ان کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ان میں سے کسی نے منشی سے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ الٹا وہ خود سہا ہوا تھا۔ منشی ڈین آدی تھا اور یقیناً کسی قدر حوصلہ مند بھی تھا لیکن حوصلہ بس اس وقت تک تھا جب تک حالات اس کے قابو میں تھے۔ جہاں حالات اس کے قابو سے نکلے اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ کچھ دیر پہلے تک اس کی حالت اس بھیڑ کی سی ہو رہی تھی جس نے قصائی کو دیکھ لیا ہے اور اس امید میں ہو کہ آج اس کی باری نہیں آئے گی۔

مگر اب وہ ہر سکون تھا حالانکہ معاملہ رامن کے ہاتھ میں چلا گیا تھا اور وہ اس کا حریف تھا۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مگر اب منشی اتنا خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسلحہ سمیٹ کر جانے والے چند منٹ بعد ہی رامن کے ساتھ لوٹ آئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوٹ نما آلتھ تھا۔ اس نے ہم کی طرف اس کا رخ کر کے چند بٹن دبائے اور اس کے سرکٹ پر جلتے بجھنے والی ایل ای ڈیز بند ہو گئیں۔ گویا ہم ڈی ایکنٹی ویت ہو گیا تھا۔ مگر یہ چند لمحے یہاں موجود افراد پر بہت بھاری گزرے تھے کیونکہ اگر غلطی سے کوئی اور بٹن دب جاتا تو ہم بچھڑانے سے پہلے دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ رامن کے ساتھ چھ افراد تھے اور مزید درجن افراد دوسری جگہوں پر تھے۔ اس نے آتے ہی خونی نظروں سے منشی دل جی کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”منشی بازی الٹ گئی ہے اب یہ میرے

ہاتھ میں ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ منشی لا پرواہی سے بولا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔“

میرے ساتھ رامن بھی چونکا تھا۔ رامن نے غرا کر کہا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“

”کیوں نہ میں تمہیں جلد زکھ بھیج دوں۔“ رامن نے جیکٹ سے پستول نکال کر اس کا رخ منشی کی طرف

کیا تو وہ اس بار بھی پُرسکون رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”ضرورتاً کہ تم بڑے کنور کی مدد سے بھی سیف نہیں کھلوا سکو گے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ رامن بولا۔

منشی نے حقارت سے اسے دیکھا۔ ”تم ایک دو نکلے کے سرکاری ملازم مگر تمہیں کنور پیلس کا انتظام مل گیا

تو تم نے خود کو کچھ سمجھنا شروع کر دیا۔ تم ساری عمر بھی یہاں رہو تو اس جگہ کے بارے میں وہ نہیں جان سکتے جو میں

جانتا ہوں۔“

”اوکے اگر میں تمہارے سر کے بجائے گھٹنے میں سوراخ کر دوں تو تم یہ کویتا (شاعری) چھوڑ کر سیدھی

بھاشا میں بات کرو گے۔“

”سیدھی بھاشا میں بات یہ ہے کہ سیف کھولنے کے لیے تین کمی نیشن درکار ہوتے ہیں۔ ایک بڑے کنور

کے پاس ہے دوسرا سادھنا کے علم میں تھا لیکن بڑے کنور نے اس سے حاصل کر لیا۔“

”تیسرا کمی نیشن راج کنور کے پاس ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن منشی نے اسے حاصل کر لیا ہے۔“

منشی دل جی میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”شبہا زجی تمہاری ذہانت پر مجھے کبھی شبہ نہیں رہا۔ یہی وجہ تھی کہ

میں تمہارے ساتھ خوف زدہ تھا کیونکہ تمہارے پاس مجھے زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ تم بلا وجہ کسی

کو نہیں مارتے ہو۔ اس سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ اس نے پھر حقارت سے رامن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ

مڑ گیا تھا۔ اس نے پھر پستول منشی کی طرف کیا۔

”اس کے باوجود میں تمہارے سر میں سوراخ کر سکتا ہوں۔“

”اور اس کے بعد ان حقوق کے کیا جواب دو گے جو صرف ہیروؤں کے لالچ میں تمہارے جیسے گدھے

کے ساتھ شامل ہوئے۔ رامن یہ میرا منصوبہ تھا اور مجھے اس کے ایک ایک حصے کا علم ہے۔“ منشی نے ان کی طرف

اشارہ کیا جو پٹری بدل کر رامن کے ساتھ مل گئے تھے۔

رامن کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آئے تھے۔ میں منشی جی کے دہلے پر حیران تھا۔ اس نے اصل پتا

اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور مجھے اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ میرے لیے یہ پتا بے کار تھا۔ اس نے رامن کے

لیے پتا کر رکھا تھا اور موقع آنے پر اس کے سامنے پھینک دیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ ان افراد کے

انداز میں بھی تبدیلی آئی تھی جو اصل میں منشی کے ساتھ تھے مگر اب رامن کے ساتھ تھے۔ وہ رامن کی طرف دیکھ

رہے تھے اور ان کا انداز اتنا چوکنا نہیں رہا تھا۔ ان میں وہ ہٹا کٹا سیاہ فام بھی شامل تھا جو منشی کا سیکنڈاں کمانڈ تھا اور

اس کے آدمیوں کو وہی کنٹرول کر رہا تھا۔ اب وہ بھی رامن کے ساتھ تھا اور اس کے آدمی بھی رامن کے ساتھ

تھے۔ رامن سوچ میں پڑ گیا تھا۔ نشی دل جی نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ اب بھی کھیل میں شامل تھا اس سے باہر نہیں ہوا تھا۔

یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا تھا کہ صورت حال میں اچانک تبدیلی سے رامن اپنے طے شدہ پلان پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب اسے نشی کو بھی شامل کرنا تھا۔ اب میں سمجھا تھا کہ نشی اور رامن کیوں مجھے اور سادی کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ بہ ظاہر ہم ان کے لیے بے کار تھے اور وہ بے کار چیزیں رکھنے کی بجائے انہیں پہلی فرصت میں ٹھکانے لگانے کے قائل ہیں۔ سادی کے پاس ایک کبی نیشن تھا اور اگر بڑا کنور آسانی سے نہیں مانتا تو سادی کی مدد سے اس پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف میرے ذریعے سادی کو دباؤ میں لایا جاسکتا تھا۔ پھر بیٹو کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ نشی اور رامن اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہماری زندگی کی زنجیر برقرار رکھی تھی۔ ایک بار سیف کی دولت ان کے ہاتھ میں آ جاتی تو وہ اس زنجیر کو ایک بار ہی کھڑے کر سکتے تھے۔

رامن سے بات کر کے نشی دل جی خاموش کھڑا تھا۔ اس نے پھر کچھ کہنے یا رامن سے سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب ضرورت مند رامن تھا وہ نہیں۔ مگر رامن کے ذہن میں اب بھی ابہام تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ امید تھی۔ اس نے نشی کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم سے وہ کبی نیشن نہیں نکلا سکتا؟“

”تم ایسا کر سکتے ہو، تم میرے جسم کو تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہو اور میں تشدد برداشت کرنے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن اگر تمہیں تشدد کے لیے میرا جسم ہی نہ ملے تو تم کیا کر لو گے؟“

رامن چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

نشی دل جی نے اپنا منہ کھول کر دکھایا۔ ”یہ دیکھو میرے منہ میں کیا ہے۔“

اس کی زبان پر ایک چھوٹا سا شیشے کا کپھول تھا۔ اس میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ اس نے دکھا کر منہ بند کر لیا اور اسے واپس جڑے اور گال کے درمیان کر کے بولا۔ ”اس میں سائٹائیڈ ہے۔ دنیا کا خطرناک ترین زہر، مجھے بس کپھول تو ڈرنا ہو گا اور میں ایک سیکنڈ میں مر جاؤں گا۔ پھر تم میری لاش پر تشدد کر کے پوچھتے رہنا۔“

”تم بلف کر رہے ہو۔“ رامن نے بے یقینی سے کہا۔ ”اس قدر خطرناک چیز تم منہ میں لیے پھر رہے ہو۔ اگر غلطی سے یہ تمہارے پیٹ میں چلا گیا تو.....؟“

”میں نے اسے ابھی منہ میں لیا ہے اس سے پہلے یہ میرے لباس میں تھا اور اگر یہ غلطی سے بھی پیٹ میں چلا گیا تب بھی بہت کم امکان ہے یہ اندر ٹوٹے گا۔ جب تک میں اسے چاؤں گا نہیں میں محفوظ ہوں لیکن اسے چبانے میں سیکنڈ کا دسواں حصہ لگے گا۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو، کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں تم پر قابو پا لوں گا؟“ رامن بدستور شک میں تھا۔

”نہیں یہ میں نے برے وقت کے لیے رکھا ہے۔ میں ناکام رہتا تو بڑے کنور کے ہاتھ آنے کی بجائے اسے چبانے کو ترجیح دیتا۔“ نشی دل جی نے کہا۔ ”عذاب سے اور سسک کر مرنے سے بہتر ہوتا میں اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا۔“

نشی نے ثابت کر دیا تھا کہ اس نے واقعی ہر پہلو مد نظر رکھا تھا۔ یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ رامن طفیلیہ کے طور پر

شامل ہوا تھا۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے یا تو وہ فشی کا تعاون حاصل کر لیتا یا پھر ہیرے بھول جاتا لیکن اس صورت میں وہ ان خون خوار لوگوں کو کیا جواب دیتا جو صرف دولت کے لالچ میں اس کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ اگر انہیں دولت نہ ملتی تو وہ رامن کی بوٹیاں نوچ لیتے۔ اس کے پاس واحد راستہ فشی کو ساتھ ملانے کا تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے سامنے ایک اور مکمل شروع ہو گیا تھا اور میں اسے دل چسپ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ اس میں میرے ساتھ سادی اور بیٹو کی زندگی بھی داؤ پر لگی تھی۔ ہاں یہ کھیل جتنا الجھتا ہماری زندگی کے امکانات اتنے ہی بڑھ جاتے۔ سادی نے بڑے کنور کو سنبھال کر اٹھالیا تھا۔ اس نے رامن سے کہا۔ ”ان کو دوا کی ضرورت ہے۔“

”فکرمات کرو اگر کچھ دیر دوا نہ ملی تو یہ مرے گا نہیں۔“ رامن نے نفرت سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے بڑے کنور سے کوئی خاص پُر خاش ہو حالانکہ بڑے کنور نے ایک بار اسے معاف کیا تھا اور اسے پیلس کا منتظم بھی بنایا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو رامن کو پیلس سے لات مار کر نکال چکا ہوتا۔ اس کے برعکس رامن کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی عناد دبائے بیٹھا ہے اور اب اسے موقع مل رہا تھا۔ گرنے کے بعد بڑے کنور کا ہڈ سر سے ہٹ گیا تھا اور اس کا چہرہ نمایاں تھا جس پر سانپ جیسی دھاریاں تھیں اور وہ خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ فشی اور رامن کے آدمی اسے دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی انسان نہیں بلکہ زہریلا سانپ ہو۔ انہوں نے ایسا انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رامن اور فشی اسے دیکھتے رہے تھے۔ میں نے رامن سے کہا۔

”تمہارے احساسات اپنی جگہ لیکن اگر یہ بے ہوش ہو گیا یا طبیعت زیادہ خراب ہونے سے پر لوک سدھا گیا تو کیا تم کبھی نیشن لینے اس کے پیچھے جاؤ گے۔ تم نے تو غالباً وہاں جانا بھی نہیں ہے۔“

”تم اپنی زبان بند رکھو۔“ رامن نے خون خوار لہجے میں کہا۔ ”ایسا نہ ہو میں پہلے تمہیں نرکھ بھیج دوں۔“

”تمہارا ارادہ تو یہی ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والے کی مرضی ہو۔“

”ٹھیک ہے اگر اوپر والے کی مرضی یہی ہے کہ یہ بتا دوا کے مر جائے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”شہباز جی ٹھیک کہہ رہے ہیں اسے دوا دے دو۔“ فشی جی نے کہا۔ ”دیر خطرناک ہو سکتی ہے۔“

”تم اپنا منہ بند رکھو۔“ رامن اس پر اٹ پڑا۔ ایسا لگ رہا تھا اس غیر متوقع صورت حال نے اس کی قوت فیصلہ متاثر کی تھی۔ وہ سب کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ فشی نے بٹے کئے سیاہ فام کی طرف دیکھا۔

”تم اس شخص کے ساتھ مل گئے ہو جس کے پاس فیصلہ کرنے کی قوت ہی نہیں ہے۔“

”رامن جی..... اسے دوا لینے دو۔“ سیاہ فام نے کہا۔ اس کا لہجہ بغیر کسی جذبے کے تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ وہ رامن کو باس نہیں سمجھ رہا ہو۔ بس اس کے ساتھ ہو۔ رامن نے اسے بھی خونخوار نظروں سے دیکھا۔

”بکواس مت کرو یہاں باس میں ہوں۔“

”واقعی۔“ سیاہ فام کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ”اگر ہم فشی کا ساتھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ آئے تو تم نے خود کو باس سمجھنا شروع کر دیا۔“

”میں باس ہوں۔“ رامن نے کہا اور اس کا ہاتھ جیکٹ کی جیب کی طرف گیا جس میں اس نے ریویوٹ

رکھا تھا۔ سیاہ فام نے رائفل کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

”نہیں راسن جی..... ہاتھ اوپر رکھو.....“

”تم غداری کر رہے ہو۔“ راسن غرایا لیکن اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

”میں تمہاری غلطی ٹھیک کر رہا ہوں۔ دیپ اس کی جیب سے ریویو نکال لو..... پستول بھی۔“

راسن کے پیچھے کھڑے آدمی نے سیاہ فام کے حکم کی تعمیل کی۔ وہ تلاشی لینے والوں میں شامل تھا۔ اس بار اس نے راسن کی تلاشی لی تھی۔ پھر سیاہ فام کے اشارے پر راسن ہمارے ساتھ آکھڑا ہوا میں نے آہستہ سے کہا۔

”اس موقع کے لیے ہمارے ہاں کہتے ہیں، ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز.....“

راسن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے نشی کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو نرا ایجنٹ ہے، تم پڑھ لکھے شخص ہو اس موقع کے لیے کوئی شعر ہو گا تمہارے ذہن میں.....؟“

”رنگ بدلتا ہے آسمان کیسے کیسے۔“ نشی دل جی نے مسکرا کر کہا۔

”بچھلے دس گیارہ گھنٹوں میں واقعی کچھ زیادہ ہی بدل گیا ہے، میری تو عقل خط ہو کر رہ گئی ہے۔ حالات کے اتنے گھماؤ پھراؤ میں نے شاید اس پورے عرصے میں نہیں دیکھے جتنے ان چند گھنٹوں میں دیکھ لیے ہیں۔“

”آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔“ نشی دل جی نے پھر اپنے پڑھ لکھے ہونے کا ثبوت دیا۔ نشی دل جی میرے پاس تھا میں نے ذرا جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔

”نشی جولوگ بیک اپ ٹیم کی دیکھ بھال کے لیے گئے ہیں ان کی واپسی کب تک ہوگی۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”ان کی واپسی نہیں ہوگی وہ اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔“

”اس کے برعکس میرا خیال ہے وہ یہیں آئیں گے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ نشی یوں خاموش اور

انجان ہو گیا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

سیاہ فام نے اپنے ایک آدمی کو بھیج کر بڑے کنور کے کمرے سے اس کی دو انہیں منگوا دی تھیں اور سادی اب اسے دوادے رہی تھی۔ بد ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ کمانڈر اب سیاہ فام کے پاس ہے۔ کم سے کم یہاں موجود باقی افراد اس کے ساتھ ہی تھے۔ میں نے نشی سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”اس کا نام جگنو ہے۔“ نشی جی نے کہا۔ ”بہمی کا مشہور بد معاش ہے۔ باقی سارے آدمی اس کے

ہیں۔“

”یعنی دوسرے آدمیوں پر بھی اسی کا ہولڈ ہوگا۔“

”بالکل..... سوائے راسن کے چار پانچ آدمیوں کے۔“

”ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں دیکھ چکا ہوں یہاں کے گارڈز نکلے اور نا اہل ہیں۔“

”مجھ سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔“ نشی جی نے کن انھیں سے رام پال کی طرف دیکھا۔ ”یہاں موجود

سارے گارڈز ایک ہی قبیلے کے اور تقریباً سب آپس میں رشتے دار ہیں۔ ایک نے دوسرے کو رکھوایا اور دوسرے نے تیسرے کو۔“

”یہ تو اس خطے کی خاص بات ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میرٹ کے بجائے اقربا پروری نے

ہیں ہر شعبے میں نان پروفیشنل کر دیا ہے۔“

”بس یہ بھی ایسے ہی گارڈز ہیں جنہیں مگن اٹھا کر فائرنگ کرنا آتی ہے لیکن جب ان کا واسطہ صحیح معنوں میں پروفیشنل سے پڑا تو یہ سب ڈھیر ہو گئے۔“

”آدی تو تمہارے بھی کم پروفیشنل نہیں ہیں انہوں نے کیسے کرٹل کے انتہائی تربیت یافتہ آدمیوں کو اڑا کر رکھ دیا۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”یہ اس طرح کے پروفیشنل ہیں کہ جان لینا اور دینا دونوں جانتے ہیں۔“ منشی جی نے سر ہلایا۔ ”اسی لیے کامیاب بھی رہے۔“

”لیکن کرٹل کے آدمیوں کو تمہارے آدمیوں کی طرف سے حملے کا خدشہ بھی تو نہیں تھا۔“

”اسی وجہ سے تو آسانی سے مارے گئے۔“ منشی بولا۔ ”انہوں نے خاموشی سے کارروائی کی اور تمام اسٹاپرز اور میزائل چلانے والوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ ان کی جگہ سنبھال کر انہوں نے کارروائی شروع کر دی۔ وہ مہارت میں کرٹل کے آدمیوں سے کم نہیں ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”ان کی مہارت میں نے دیکھی تھی جب انہوں نے دونوں اے پی سی گاڑیاں اڑا دیں۔ میں خود کئی بار ان کے نشانے سے بال بال بچا۔“

تمہاری یہاں موجود گی حیرت انگیز تھی۔ تمہارے بارے میں یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ تم کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہو یہ خیال کسی کو نہیں تھا کہ تم پکڑ کر کنور پیلس میں پہنچائے جا چکے ہو۔“

”بس قسمت کی بات ہے، دو معمولی ملازموں نے مجھے قابو کر لیا تھا لیکن کیا رامن نے تمہیں میرے بارے میں بتایا نہیں؟“

”اس سے میرا رابطہ نہیں تھا۔ میں اسے حملے سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔“ منشی نے رامن کی طرف دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے تمہیں شروع سے اس سے خدشہ تھا۔“

”اس جیسے شخص پر اعتبار کس طرح کیا جاسکتا ہے؟“ منشی دل جی کے لہجے میں پھر حقارت آگئی۔

”یہی خیال اس کا بھی ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اب ایسا لگ رہا ہے کہ جتنوں نے خود سب سنبھال لیا ہے؟“

”یہ بھی اس قابل نہیں ہے۔“ منشی نے سرگوشی کی۔

”تب کیا ہوگا؟“

جتنو باہر چلا گیا تھا اور جاتے ہوئے اپنے آدمیوں کو ہوشیار کر گیا تھا۔ اس کے آدی اس کے حکم کے تابع تھے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جتنو کس کے ساتھ ہے اس کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ جتنو کے بدلتے ہی انہوں نے لمبے بھر میں اس کا ساتھ دیا اور ذرا بھی نہیں ہچکچائے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ رامن کے آدمیوں کو ٹھکانے لگانے گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مرکزی پیلس کا سامنے والا حصہ تباہ ہو گیا تھا تب یہاں آمدورفت کیسے ہو رہی تھی۔ میں نے منشی دل جی سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”یہاں ایک راستہ ہے اس سے باہر جاسکتے ہیں۔“

میں نے رامن کی طرف دیکھا۔ ”پیلس میں بے شمار عام ملازمین بھی ہیں وہ کہاں ہیں؟“

”ان میں سے کئی مارے گئے ہیں اور باقی بچنے والے جمنازیم کی عمارت میں بند کر دیئے گئے ہیں۔“

اس نے پاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم ان کی نہیں اپنی فکر کرو۔“
 ”مجھے تو تمہاری فکر بھی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اس دوران میں بیٹو سرک کر میزے پاس آ گیا تھا اور
 کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔
 ”شوہنی یہ کیسا قلم ہے ہر دو منٹ بعد ولن بدل جاتا ہے۔“
 ”یہ زندگی کا قلم ہے۔“
 ”اب ہم کیا کرے۔“

”دیکھئے اور انتظار کرے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے ابھی اور بھی بہت کچھ ہوگا۔“
 میں نے جان بوجھ کر ذرا بلند آواز میں کہا تھا اور رامن کے ساتھ منشی جی نے بھی چونک کر میری طرف
 دیکھا تھا۔ منشی نے کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“
 ”کچھ نہیں۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
 جگنو کے آدمی بھی اسی کے علاقے کے تھے لیکن وہ صورت شکل سے بمبئی کے بجائے ساؤتھ کے لگ رہے
 تھے۔ ”ان کا تعلق ساؤتھ سے ہے؟“
 منشی نے سر ہلایا۔ ”ہاں یہ اصل میں مدراس کے ہیں۔ ان کی زبان بھی مدراسی ہے۔ مگر بمبئی میں ان کا
 گروہ بہت مضبوط ہے۔“

بمبئی انڈیا کا وہ شہر ہے جس میں ہر صوبے کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جیسے پاکستان میں کراچی ہے جس
 میں ہر صوبے بلکہ آس پاس کے تمام ملکوں کے لوگ بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جگنو کے ساتھی
 خاموش اور چوکس تھے۔ دوائی لینے کے بعد بڑے کنور کی حالت بہتر تھی اور اب وہ بغیر سہارے کے خود سے کھڑا
 تھا۔ جگنو جاتے ہوئے ریوٹ کنٹرول بم بھی باہر لے گیا تھا اگرچہ اس کا سرکٹ آف کر دیا گیا تھا لیکن پھر بھی وہ
 بم تھا ایک گولی اسے اڑا سکتی تھی اور آس پاس موجود کوئی فرد زندہ نہیں بچتا اس لیے اس کا یہاں سے ہٹا دینا ہی
 مناسب تھا۔ سچی بات ہے بم کی موجودگی میں میرے اعصاب بھی کشیدہ تھے اور اس کے ہٹائے جانے کے بعد
 میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ پتا نہیں جگنو اسے کہاں لے گیا تھا۔ کیونکہ جگنو کے ساتھی معمولی حرکت پر کوئی
 اعتراض نہیں کر رہے تھے اس لیے سادی میرے پاس آگئی اس نے سب لہجے میں کہا۔
 ”شوہنی اب کیا ہوگا؟“

”وہی جو اللہ چاہے گا اور جو اللہ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے اب تک اسی نے بچایا ہے اور آگے بھی وہی
 بچائے گا۔“
 سادی نے جھرجھری لی۔ ”شوہنی پہلا دھماکہ بہت خوفناک تھا مجھے لگا جیسے پورا ایلیس مگر جائے گا۔ عمارت
 ایسے لرزی تھی۔“

”ہم نے میزائل مار کر اس عمارت کا سامنے والا حصہ تباہ کر دیا تھا دھماکہ اسی کا تھا مجھے معلوم تھا کہ تمہارا
 کمر اندر کی طرف ہے اور تم محفوظ رہو گی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟“
 ”میرے ساتھ جو خدائیں تھیں وہ فوراً مجھے نکال کر بڑے بمیہ کے پاس لے گئیں۔ تب سے میں ان

کے ساتھ تھی۔ پھر اوپر سے فائرنگ کی آواز آئی۔ گارڈز اوپر گئے تو پھر دھماکہ ہوا جب بڑے بھیا نے سیف ہاؤس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”سادی تم بڑے کنور پرنس حد تک اعتماد کر سکتی ہو؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔
”بالکل بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

”اس کے کمرے میں موجود سیف کا ایک کبھی نیشن تمہارے پاس ہے کیا تم کو یاد ہے؟“
”ہاں یاد ہے کیونکہ میں نے خود لگایا تھا اور بڑے کنور کی ہدایت کے مطابق اسے بار بار دھرا کر یاد کیا تھا۔“

”پھر تم نے بڑے کنور کو بتا دیا؟“

”نہیں میں نے تو نہیں بتایا۔“

”لیکن ششی جی کا کہنا ہے کہ اسے معلوم ہے۔“

ششی نے سر ہلایا۔ ”بے بی تمہارے لباس میں ایک ٹن نما مائیک لگا تھا جب تم یاد کر رہی تھیں تو یہ مائیک تمہاری آواز بڑے کنور تک پہنچا رہا تھا۔“

سادی نے سر آدھ بھری۔ ”گو یا میں شروع سے ان لوگوں کے نزدیک بس ایسے ہی تھی۔“

”لیکن تم ہمارے لیے ایسی ہی نہیں ہو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے پتا چلا ہے کہ میں کچھ ہوں۔“

”تم کچھ نہیں ہمارے لیے سب کچھ ہو۔ میری چھوٹی بہن ہو، بیو کی دیدی ہو، وسیم کی زندگی ہو اور سفیر کی

سالی اور کچھ عرصے بعد ایک سنے یا منی کا ماما بھی ہوگی۔“

”شوبی.....“ وہ جھینپ گئی۔

”دیدی ہم ماموں بنے گا۔“ بیو خوش ہو کر بولا۔

”اگر سفیر یہاں ہوتا تو کہتا کہ تم پہلے ہی ماموں بنے ہوئے ہو۔“ میں ہنسا۔ ہم آپس میں بات کرتے

ہوئے کچھ دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ صورت حال کیا ہے۔ بات کرتے ہوئے میری نظر بڑے کنور کی طرف گئی

تو وہ بھول رہا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کرتا وہ اچانک لڑکھڑایا اور نیچے گر کر ساکت ہو گیا۔ سادی اس کی طرف

لپکی۔



”کیا ہوا..... بڑے بھیا۔“

میں سادی کے پیچھے تھا۔ میں نے بڑے کنور کو سیدھا کیا تو وہ بے ہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور

سانس بے ترتیب تھی۔ میں نے نبض اور دل کی دھڑکن چیک کی تو اسے بھی غیر متوازن ہی پایا۔ جگنو کے آدمی

ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور جب میں نے پلٹ کر نشی کی طرف دیکھا تو اس کے برابر سے رامن کو غائب

پایا۔ اسی لمحے جگنو کے آدمیوں نے بھی محسوس کر لیا۔ ایک چلایا۔ ”وہ بھاگ گیا.....“

”دادا مار ڈالے گا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”تم تینوں یہاں رکو میں اسے دیکھتا ہوں۔“

وہ باہر نکل گیا اور میں نے نشی سے کہا۔ ”پیس کا ڈاکٹر کہاں ہے اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے؟“
 ”اگر وہ بچ گیا ہے تو جہنازیم والی عمارت میں ہوگا۔“ نشی نے کہا۔
 ”ان لوگوں کو بتاؤ..... یہ اپنے استاد سے کہیں ڈاکٹر کو جلدی بلاؤ..... ورنہ تم لوگوں کی اتنی جدوجہد اور
 اتنے لوگوں کا خون رائیگاں جائے گا۔“

نشی نے جگنو کے ایک آدمی سے کہا۔ ”بڑے کنور کی حالت خراب ہے اس کے لیے فوری ڈاکٹر کی
 ضرورت ہے۔ یہ مر گیا تو ہیرے کسی کو نہیں ملیں گے اور جگنو کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“
 نشی کی بات سن کر اس کے ماتھے پر شکنیں آگئی تھیں لیکن اس نے جگنو کو اطلاع کرنے میں دیر نہیں کی۔
 اس نے ویسا ہی ایک چھوٹا واکا کی ٹاکی نکالا جیسا میں نے نشی کے پاس دیکھا تھا اور جگنو کو کال کی۔ پہلے اس نے
 بڑے کنور کی طبیعت خرابی کا بتایا پھر اس نے اطلاع دی کہ رامن افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا تھا۔ یہ سن کر
 جگنو نے اسے یقیناً بے نقط سنائی تھیں کیونکہ موسم گرم نہ ہونے کے باوجود اس کے سیاہ چہرے پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔
 وہ ہکلا ہکلا کر اسے بتانے لگا کہ یہ اس کی بھول نہیں تھی۔ پھر اس نے رابطہ کاٹ کر کسی اور کو کال کی کیونکہ کال جا
 رہی تھی اور آگے والا بندہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ وہ یہاں سے جانے والے کو
 کال کر رہا تھا اور وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ خیریت سے نہیں تھا۔ یہ بات اس نے بھی
 محسوس کی اور فوری اس کی اطلاع جگنو کو دی تھی۔ میں نے آہستہ سے بیٹو سے کہا۔ ”گزبوشروع ہوگئی ہے شاید
 ہمیں موقع ملے ہو شیار رہنا۔“

بیٹو نے سر ہلایا۔ بہ ظاہر ہم بڑے کنور کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ سادی ہلکی آواز میں رو رہی تھی
 لیکن موقع کی مناسبت سے اس نے اپنی آواز کسی قدر اونچی کر لی تھی۔ میں نے بیٹو سے کہا۔ ”کسی بھی ایسی
 صورت حال میں تم اپنے پاس والے کو دیکھو گے۔ ہتھیار چھیننے سے زیادہ اسے ناکارہ کرنے کی کوشش کرنا اور یہ
 بھی کہ وہ گن استعمال نہ کرنے پائے۔“
 ”ہم سمجھ گیا۔“

”سادی ایسی کسی صورت حال میں تم اس ستون کے پیچھے ہو جاؤ گی۔“ میں نے ہال کے وسط میں لگے
 آرائشی ستون کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں۔“ سادی نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پلیز شوبی کچھ کریں ورنہ اگر
 ان کا داؤ چل گیا تو یہ ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہم کوشش کریں گے۔“ میں نے کہا اور بیٹو کی طرف دیکھا۔ ”لیکن میرے اشارے کے بغیر کچھ مت
 کرنا چاہے موقع کتنا ہی آسان کیوں نہ لگ رہا ہو۔“

باقی تین پریشان تھے کیونکہ ان کا چوتھا ساتھی نہ تو واپس آیا تھا اور نہ ہی اس نے واکا کی ٹاکی پر جواب دیا
 تھا۔ رامن ایک بار پھر عیاری سے بچ نکلا تھا اور وہ اس کام کا ماہر بھی تھا۔ پھر قسمت بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ مجھے
 خطرہ تھا کہ رامن نے چوتھے پر قابو پالیا تھا اور اب وہ مسلح تھا۔ یہ بات ان تینوں نے بھی محسوس کر لی تھی اور اب
 ان کی توجہ ہم سے زیادہ گیلری کی طرف تھی۔ مگر ان تینوں میں سے کوئی اس طرف جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ

یقیناً خود کو ایک ساتھ زیادہ محفوظ تصور کر رہے تھے۔ کال کرنے والے نے ایک بار پھر واکی ٹاکی پر جگنو سے رابطہ کیا۔ ”دادا کچھ اور لوگ ادھر بھیججو..... لگ رہا ہے اس نے کالی کو قابو کر لیا ہے۔“

جواب میں وہ جگنو سے مزید ناگفتنی سن کر بے مزہ نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف سے گائیڈ لائن ملتے ہی اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک طرف کیا اور ہمیں راکفل کی ٹال پر آگے کیا۔ وہ ہمیں گیلری کے سامنے لے آئے تھے اور خود ہمارے پیچھے تھے۔ فشی نے بے چینی سے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”سوال نہیں۔“ واکی ٹاکی والا غرایا۔ ”چل ادھر.....“

”فشی کیسے آدمی ہار کیے ہیں تم نے جو عزت بھی نہیں کرتے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ فشی نے کچھ کہا نہیں۔ اتنا تو میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہمیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ اگر رامن اس طرف سے حملہ کرتا تو پہلے ہم نشانہ بنتے البتہ انہوں نے بڑے کنور کو اسی جگہ پڑے رہنے دیا تھا جہاں وہ موجود تھا۔ مگر رامن نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور مجھے اس سے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ بے شک وہ سیاست میں مار کھاتا تھا اور چال نہیں چل سکا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ میدانِ عمل کا زیرک کھلاڑی تھا۔ یہاں ایک کے مقابلے میں تین تھے اور گیلری میں چھپنے کی گنجائش کم تھی۔ یہاں وہ آسانی سے مار لیا جاتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کامیاب ہو کیونکہ مجھے سب سے زیادہ خطرہ اسی سے تھا۔ دس منٹ بعد جگنو اپنے دو آدمیوں اور ایک شخص کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس کے پاس میڈیکل بیک اعلان کر رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ جگنو نے اس سے کہا۔ ”بڑے کنور کو دیکھ..... اسے کچھ ہوا تو بھی ساتھ ہی پر لوک جائے گا۔“

پھر اس نے فشی کی طرف دیکھا اور اپنے نائب کو گھورا۔ ”اسے یہاں کیوں رکھا ہے؟“

”دادا تم نے کہا تھا.....“

”باقی سب کے لیے کہا تھا اسے ابھی بچانا ہے۔ ابھی وہ آکر اسے گولی مار جاتا تو سیف تیرا باپ کھولتا؟“

اب واکی ٹاکی والے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کے اشارے پر ایک آدمی فشی کو ہمارے پاس سے لے گیا۔ میں نے جگنو سے کہا۔ ”یہ تمہارا خیال ہے کہ وہ ادھر حملہ کرے گا۔“

”سب ادھر ہے تو وہ پھر کدھر حملہ کرے گا۔“ جگنو نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”وہاں حملہ کرے گا جہاں تم نے سوچا نہیں ہوگا اور وہ اپنا کام کر جائے گا۔“ میں نے اس کا طنز نظر انداز کیا۔ ”تم جو بم لے گئے تھے وہ کہاں ہے؟“

”میرے ساتھیوں کے پاس ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”رامن کے ساتھیوں کے ساتھ تم نے کیا کیا؟“

اس نے ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گہری سانس لی۔ ”اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھی اس دنیا سے نہ جائیں تو ان سے کہو بم سے فوراً دور ہٹ جائیں۔“

اس نے ابھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”ٹو کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”ضروری نہیں رامن کے پاس اس بم کا ایک ہی ریموٹ ہو تمہارے آدمی نے اس کی تلاش تو نہیں کی۔“

”فشی۔“

جگنو اچھل پڑا تھا اس نے جلدی سے واکی ٹاکی نکال کر ایک نمبر دیا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی اور جگنو نے کہا۔ ”ہم سے دور چلے جاؤ..... سوال کیوں کرتا ہے کتے.....“

اسی لمحے دور سے دبا ہوا دھماکہ سنائی دیا اور جگنو واکی ٹاکی پر چلاتا رہ گیا۔ اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا کیونکہ جواب دینے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ جگنو نے واکی ٹاکی شیخ دیا اور میری طرف آیا۔ اس نے میری جیکٹ کا لڑکچڑا۔ ”تجھے کیسے پتا چلا؟“

”کیونکہ میں اسے جانتا ہوں۔“ میں نے آرام سے اپنا کالر چھڑایا۔ ”میرا خیال ہے کوئی نہیں بچا ہوگا اور اگر بچ بھی گیا ہوگا تو اس میں سے نہیں چھوڑے گا۔ تم سمجھ لو کہ تمہارے پاس بس یہی پانچ بندے ہیں۔“

جگنو کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے میرا کالر چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر بڑے کنور کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹیک سے ایک انجکشن نکالا اور سرخ مین بھر کر اسے بڑے کنور کی نس میں انجکٹ کر دیا۔ پھر وہ نبض تھام کر گھڑی دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد اس نے جگنو سے کہا۔ ”اب حالت بہتر ہے لیکن انہیں آرام کی ضرورت ہے یہ یہاں پڑے رہے تو ان کی حالت پھر خراب ہو جائے گی۔“

”اسے کمرے میں پہنچا دو۔“ جگنو نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا اور وہ بڑے کنور کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر سمیت وہیں رکا تھا۔ بڑے کنور کو کمرے میں پہنچا کر جگنو میرے پاس آیا۔

”اب تیرا کیا خیال ہے..... وہ کیا کرے گا؟“

”میں جیوشی نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم کے حوالے سے مجھے خیال آیا تھا کہ اس نے اضافی ریویو بھی رکھا ہوگا۔ اس نے اپنا کام کر لیا ہے۔ ممکن ہے جننازیم میں کچھ آدمی ہوں اس کے۔“

جگنو فکر مند ہو گیا۔ اس نے یقیناً دولت کے چکر میں ٹیک اور کیا تھا لیکن یہ ٹیک اور الٹا اس کے گلے پڑ گیا تھا۔ اس کے ستر فیصد ساتھی موت کی نیند سو چکے تھے اور اب وہ پانچ آدمیوں کے ہمراہ کس طرح یہ دولت حاصل کر سکتا تھا۔ جب کہ ابھی بڑا کنور بے ہوش تھا اور نشی کی زبان کھلوانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ کیونکہ وہ زہریلا کپسول منہ میں رکھ کر بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ زبردستی کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان تمام مراحل سے گزر کر ہی سیف میں موجود دولت تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد یہاں سے نکلنے کا مرحلہ تھا اور یہ بھی آسان نہیں تھا۔ جگنو کے ساتھی ذرا ڈھیلے تھے مگر وہ خود ہماری طرف سے بہت چوکنا تھا۔ اس نے آتے ہی سب کو ٹائٹ کر دیا تھا۔ اب وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں واپس ہال کے وسط میں آنے کی اجازت مل گئی تھی اور دو افراد اب گیلری پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

نشی اب بالکل خاموش تھا۔ ایک بار میں نے اسے دیکھا تو وہ غیر محسوس انداز میں کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا اور تب میں نے وقت دیکھا۔ بارہ بجتے میں دو منٹ تھے۔ مجھے یاد آیا کہ بارہ بجے اگر بڑے کنور کی طرف سے سگنل نہ گیا تو اس کا بیک آپ دستہ کنور پیلز کی طرف روانہ ہو جائے گا اور اسے روکنے کے لیے نشی کے آدمی راستے میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس دستے سے نمٹ کر وہ واپس پیلز کی طرف آتے۔ اگرچہ نشی نے انکار کیا تھا مگر میں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا مجھے یقین تھا وہ یہیں آئیں گے اور نشی کو ان کا ہی انتظار تھا۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کتنی دیر میں آتے لیکن اب اس میں بہت زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ رامن اور اب جگنو اس بات

سے بے خبر تھا۔ سادی ہال میں تھی۔ میں نے جگنو سے کہا۔ ”اسے بڑے کنور کے پاس جانے دو یہ اس کی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔“

”یہ ادھر ہی رہے گی دیکھ بھال کے لیے ڈاکٹر موجود ہے۔“ جگنو نے صاف انکار کر دیا۔ اسے رامن کی فحاشی۔ مجھے جواب دے کر وہ کمرے میں چلا گیا اور میں اسے ڈاکٹر سے کہتے سنا۔ ”یہ کب تک ہوش میں آئے گا۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتے..... بڑے کنور کنور اور بوڑھے ہیں۔ پھر بیمار بھی ہیں اس لیے کچھ کہنا.....“ اس کے بعد ڈاکٹر کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو جگنو نے اس کے منہ میں پستول کی ٹال ڈالی ہوئی تھی اور اس کی گھٹی بندھی تھی۔ جگنو نے غرا کر کہا۔

”مجھے کو اس نہیں یہ بڑھا ہوش میں چاہیے۔ ابھی دس منٹ کے اندر اسے ہوش نہیں آیا تو ٹو ہیشہ کی نیند سو جائے گا..... کیا سمجھا؟“

جگنو نے ڈاکٹر کے منہ سے پستول نکالا تو اس کی جان میں جان آئی مگر فوراً ہی جان پر بن گئی تھی کیونکہ جگنو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اگر یہ دس منٹ میں ہوش میں نہ آئے تو اس سالے کو پکا دینا۔“

جگنو میری طرف آیا۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے سادی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تیری کیا لگتی ہے؟“

”بہن ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”سنا ہے تو اسے بچانے اور لے جانے آیا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھو۔“ میں نے کہا۔

”جب اسے زندہ دیکھنا چاہتا ہے تو جا کر اس حرامی کو مار دے۔“

”رامن کو؟“

”اور کون ہے یہاں..... تیرے پاس آدھا گھنٹا ہے۔“ جگنو بولا۔

میں پریشان ہو گیا۔ ”میں کیسے مار سکتا ہوں اور مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے؟“

”نہیں پتا تو جا کر تلاش کر، اسے بھی تیرے بارے میں نہیں پتا ہوگا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر اس

نے اپنے ایک ساتھی سے رائل لے کر اس کا میگزین الگ کیا اور دونوں چیزیں میری طرف بڑھائیں۔ ”یہ لے

اور جا کر اسے تلاش کر..... آدھا گھنٹا گزر گیا تو یہ لڑکی زندہ نہیں رہے گی۔“

میں بچھڑایا کہ مجھے رامن کے بارے میں بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ یقیناً اسی وجہ سے جگنو کے خردماغ

میں یہ خیال آیا تھا۔ ”میں اتنے بڑے کنور پیل میں اسے کیسے تلاش کر سکتا ہوں؟“

”یہ تیرا کام ہے ویسے بھی تو اس کے بارے میں بہت جانتا ہے۔“ جگنو کا لہجہ طنز یہ ہو گیا۔

”اس کے بارے میں جانتا ہوں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ ابھی کہاں ہے؟“

”باہر نکلے گا تو جان لے..... اب جاو اور اس کا سر لے آ..... اگر اس کا سر پچانا چاہتا ہے۔“ اس نے سادی

کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

”ہم بھی ساتھ جائے گا۔“ بیو نے مداخلت کی۔ ”یہ ہمارا بھی دیدی ہے۔“

”نہیں تم یہیں رہو۔“ میں نے جلت میں کہا اور آنکھ سے بیو کو اشارہ بھی کیا۔ وہ سمجھ کر چپ ہو گیا۔ میں نے جگنو سے رائل اور اس کا میگزین لے لیا۔ ”وہ میرا بھی دشمن ہے اور میں اسے مارنے کی پوری کوشش کروں گا لیکن تم یہ آدھے کھنسنے والی شرط مت رکھو..... اور مجھے ایک واکی ٹاکی بھی دو میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔ واکی ٹاکی سے تمہیں اطمینان رہے گا کہ میں یہیں ہوں کہیں بھاگا نہیں ہوں۔“

جگنو نے سوچا اور سر ہلاتے ہوئے ایک واکی ٹاکی میری طرف بڑھا دیا۔ ”ٹھیک ہے پر بھاگنے کی سوچنا بھی مت۔“

”مجھے ایک چاقو بھی چاہیے۔“

بادل نا خواستہ جگنو نے میرا یہ مطالبہ بھی پورا کیا۔ اس نے ایک آدمی سے چاقو لے کر میرے حوالے کیا۔ میں نے چاقو موزے میں اڑس لیا اور جگنو سے کہا۔ ”ہوشیار رہنا تم بے شک دادا ہو گے مگر وہ بھی بہت خطرناک آدمی ہے، راکا ایجنٹ رہ چکا ہے۔“

”اگر وہ یہاں آیا تو بیچ کر نہیں جائے گا۔“

”اگر وہ یہاں آیا تو منہ اٹھا نہیں آئے گا۔ وہ ایسے آئے گا جس کے بارے میں تم نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے میگزین رائل میں لگانا چاہا تو اس نے روک دیا۔

”یہاں نہیں..... اس گیلری سے نکلنے کے بعد لگانا۔“

”اگر وہ گیلری کے باہر موجود ہوا تو میں میگزین لگا تارہ جاؤں گا اور وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔“

”تب گیلری کے کنارے پہنچ کر لگا لینا پر یہاں نہیں..... کہیں تیرے ذہن میں آتم ہتھیا کا خیال نہ آجائے۔“

”مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا اس لیے زندہ ہوں۔“ میں نے رائل شانے سے ٹانگ لی اور سادی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”حوصلہ رکھنا میں آؤں گا۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ میرا حوصلہ ہیں۔“

”بیو تمہارے ساتھ ہے۔ تم سادی کا خیال رکھو گے۔“

”آپ بے فکر ہو۔“ بیو نے کہا۔

میں جگنو کے سامنے رکا۔ ”دادا تم اگر میرے بارے میں جانتے ہو تو امید ہے تم مجھے اپنا دشمن بنانے سے گریز کرو گے۔“

”اپن کو بھی دشمن پالنے کا شوق نہیں ہے ٹو جا.....“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ میں گیلری میں آگے بڑھا اور اس کے سرے تک آتے ہوئے رائل سے میگزین لگا لیا تھا۔ گیلری سے باہر آتے ہی میں نے رائل سامنے کر لی تھی۔ یہ خاصا سنسنی خیز مرحلہ تھا کیونکہ رامن کی یہاں موجودگی کا بہت زیادہ امکان تھا۔ وہ یہاں سے جا ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہاں وہ دولت تھی جس کے پیچھے یہ سب دیوانے ہو رہے تھے۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے میں نے کھلے دروازے سے دیکھا یہ

ایک چھوٹی نشست گاہ تھی اور اس کی وسطی میز پر تازہ پھل اور پانی موجود تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے رات سے کچھ نہیں کھایا اور پانی بھی کم نصیب ہوا تھا میں نے اندر آ کر دو عدد سیب لیے اور پانی کا ایک گلاس پی کر آگے روانہ ہو گیا۔ فی الحال میں سیب نہیں کھا سکتا تھا کیونکہ میری ساری توجہ آس پاس تھی۔ دس منٹ میں، میں نے مرکزی پیلس کا یہ سارا حصہ دیکھ لیا۔ رامن یا کوئی دوسرا فرد یہاں نہیں تھا۔ اب مجھے باہر جانا تھا۔ میں نے واک ٹاکی پر جگنو سے رابطہ کیا۔

”وہ یہاں پیلس میں نہیں ہے میں باہر جا رہا ہوں، نشی سے پوچھ کر مجھے باہر جانے والا راستہ بتاؤ۔“ جگنو نے نشی جی سے پوچھا اور اس نے بتایا تو مجھے خود بھی یاد آ گیا یہ وہ راستہ تھا جس سے مجھے عقب میں واقع کلینک اور جنازیم کی عمارت میں لے جایا جاتا تھا۔ میں مختلف راستوں سے ہوتا ہوا اس دروازے تک آیا۔ اسے ہم سے اڑا دیا گیا تھا اور اس کی چوکھٹ تک غائب تھی۔ غالباً یہ لاک تھا اور کھولنے کی بجائے حملہ کرنے والوں نے اڑانا مناسب سمجھا۔ میں باہر آیا۔ عمارت کے ساتھ ساتھ پتھروں سے بنی روش گھوم رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا کوئے تک آیا۔ یہاں سے مجھے نیچے واقع گیٹ پیلس کا اوپری حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ کنور پیلس ایک بڑی پہاڑی ڈھلان پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس کی مختلف عمارتیں مختلف سطحوں پر ہیں۔ کنور پیلس اور اس کے ساتھ کلینک اور جنازیم والی عمارت سب سے اوپر اور بلند ہیں۔ نیچے جاتی ڈھلان کو مختلف حصوں میں بانٹ کر ہموار کیا گیا تھا یوں ایسے قطعے وجود میں آ گئے جو ایک دوسرے سے دس سے بارہ فٹ بلند تھے۔

اس سے نہ صرف سکیورٹی کی گئی تھی بلکہ اس پورے پیلس میں دل کشی اور خوب صورتی پیدا کی گئی تھی۔ میرے سامنے جنازیم والی عمارت درختوں کے پار تھی اگر کوئی اس کی اوپری منزل پر ہوتا تو مجھے دیکھ سکتا تھا۔ یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں روش سے اتر کر اس کی طرف بڑھا اور درختوں کی آڑ میں پاس پہنچ گیا۔ بہ ظاہر عمارت میں کوئی ہلچل نہیں تھی لیکن کنور پیلس کے بچ جانے والے افراد اور ملازمین کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ واحد عمارت تھی جو میراٹکوں سے بچی ہوئی تھی کیونکہ یہ عام استعمال میں نہیں تھی۔ اس کا داخلی دروازہ صحیح سلامت تھا۔

میں درختوں کی آڑ میں عمارت کے عقبی حصے میں آیا۔ مگر اس طرف سے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کھڑکیاں تھیں جن پر گرل تھی۔ مجھے آگے سے ہی اندر جانا تھا۔ اس میں رسک تھا کہ رامن نے کوئی ٹریپ لگایا ہو مگر مجھے دیکھنا تو تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ گھوم کر اگلے حصے میں آیا۔ اس طرف کھڑکیوں کے پٹ ٹوٹ کر باہر گرے ہوئے تھے جیسے اندر کوئی دھماکہ ہوا ہو۔ دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور دروازہ کھلتے ہی تباہی کا بھیا تک منظر سامنے آیا تھا۔ وہاں کم سے کم آٹھ دس افراد کی ادھڑی ہوئی اور سخم شدہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے جسموں سے گوشت اور لوتھڑے الگ ہو کر دیواروں اور چھتوں پر چپکے ہوئے تھے۔ داخلی ہال کی حالت بری تھی۔ فرش میں سوراخ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جنازیم عمارت کے نیچے تھا۔

میں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہاں پھیلی خون اور گوشت کی بو سے میرا دل متلانے لگا تھا۔ اندر آنے پر اندازہ ہوا کہ لاشوں کی تعداد زیادہ تھی شاید جگنو کے باہر موجود سارے آدمی یہیں تھے اور وہ سب دھماکے میں مارے گئے تھے۔ میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ یہ ایک پستول تھا جو ایک عدد ہاتھ کے ساتھ تھا۔ ہاتھ کھائی سے

الگ ہو گیا تھا۔ میں نے رائفل کی نال سے ہاتھ الگ کیا اور پستول اٹھا لیا اس پر کسی قدر خون لگا ہوا تھا اسے ایک طرف ڈھیر پر دے سے صاف کیا اور جیکٹ میں رکھ کر آگے بڑھا۔ میرا اندازہ تھا کہ عام لوگوں کو جمنازیم میں قید کیا گیا ہوگا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں کسی کو قید کیا جاسکتا تھا۔ بیڑھیوں سے نیچے آیا تو جمنازیم کا فولادی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر موت کا سانسناٹا تھا۔ میرا دل رک سا گیا۔ جہاں زندہ افراد ہوں اور بے شک خاموش ہوں وہاں ایسا سناٹا نہیں ہوتا ہے۔ زندگی اپنا ارتعاش خود رکھتی ہے مگر اس وقت مجھے لگا وہاں کوئی زندہ فرد نہیں ہے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے جمنازیم میں قدم رکھا اور پھر مبر۔ے دانٹ پہنچ گئے تھے۔

ایک طرف ڈھیر کی صورت میں کنور بیس کے عام ملازموں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں مرد عورت دونوں تھے۔ ان سب کو سروں میں ایک ایک گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اور یہ کام یقیناً فٹشی اور راسن کا تھا۔ یہ پچاس سے اوپر لوگ تھے۔ انہیں با آسانی یہاں قید کیا جاسکتا تھا مگر سفاک قاتلوں نے انہیں بھی نہیں بخشا تھا۔ کنور بیس کی حدود میں رہنے والے اکثر ملازمین بیوی بچوں والے تھے اور انہیں رہائش ملی ہوئی تھی۔ پتا نہیں ان پر کیا گزری تھی؟ شاید انہیں بھی مار دیا گیا تھا۔ درندے بھی ایسا قتل عام نہیں کرتے ہیں۔ مجھے لگا جیسے میری رگوں میں خون کی جگہ کوئی گرم سیال دوڑ رہا ہے۔ اگر فٹشی، راسن اور جگنو اس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں بے دروغی انہیں قتل کر دیتا۔ میں اوپر آیا۔ کلینک والے حصے میں دائر ڈپنسر سے پانی پی کر اور سر پر ڈال کر میں نے خود کو ٹھنڈا کیا۔

میں نے خود کو یاد دلایا کہ میری ذمے داری سادی اور بیٹو کو بحفاظت یہاں سے نکال لے جانا تھا۔ اس لیے مجھے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ مجھے دیکھنا تھا کہ بیس کی حدود میں کیا ہوا تھا اور ابھی کیا ہو رہا تھا۔ میں باہر آیا اور وسطی لان میں لگے سب سے اونچے درخت کی طرف بڑھا۔ یہ کوئی سرد جیسا درخت تھا۔ چھ فٹ کے بعد اس کی دائیں بائیں بے شمار شاخیں نکلی تھیں اور اس کی بلندی کوئی پچاس فٹ تھی۔ میں آرام سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ درخت کے آخری حصے پر آنے کے بعد آس پاس کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ مگر جہاں تک نظر جاتی تھی تباہی و بربادی کے آثار تھے۔ تباہ شدہ گاڑیاں، اسلحہ اور لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ میزائلوں اور بموں نے عمارتوں کا حلیہ لگا ڈیا تھا۔ کئی جگہوں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا مگر کوئی زندہ یا حرکت کرتی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ میں تقریباً دس منٹ درخت پر رہا اور میں نے واکی ٹاک کی پر جگنو کو اطلاع دی۔

”راسن نظر نہیں آ رہا ہے میرا خیال ہے وہ جان بچا کر یہاں سے نکل گیا ہے۔ وہ اکیلا ہے اور اتنے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”پہلے میرا بھی یہی خیال تھا۔“ اس نے عیاری سے کہا۔ ”پر تو نے خیال بدل دیا۔۔۔۔۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ وہ ادھر ہی ہوگا۔“

میں نے ایک بار پھر خود کو ملامت کی۔ ضرورت سے زیادہ بولنا بعض اوقات یونہی گلے پڑ جاتا ہے لیکن اس کی وجہ سے مجھے ایک موقع بھی ملا تھا۔ کنور بیس کی تمام کیونیکیشن لائنیں ہم پہلے ہی تباہ کر چکے تھے اور ریڈیائی رابطوں کو جامر نے روکا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ جامر سامنے والے حصے میں قید خانے کی عمارت کے پاس کہیں نصب تھا۔ یہیں بیس کا پاور اسٹیشن تھا اور جامر کو خاصی پاور درکار ہوتی ہے۔ اس کا بیڑی یا اس جیسی کسی چیز سے

گزارا نہیں ہوتا ہے۔ میں نیچے اتر اور اس طرف روانہ ہو گیا۔ میں مرکزی پیلس کے ساتھ سے گزرا اور گھاس کی دو الگ سطحوں والے تختے عبور کیے۔ بلاشبہ سیوری کے لحاظ سے یہاں ہر ممکن خیال رکھا گیا تھا مگر ضرورت پڑنے پر ان میں سے کوئی چیز کام نہیں آئی تھی۔ نہ آدمی نہ اسلحہ اور نہ ہی الیکٹرانک سیوری۔ گزشتہ ساڑھے دس گھنٹے کے دوران میں یہاں دو سو کے قریب افراد مارے جا چکے تھے۔ بڑا کنورڈیشنوں کے زلغے میں تھا اور اس کی وجہ سے سادی اور ہم بھی پھنس چکے تھے۔ نہ وہ سادی کو اغوا کرنا اور نہ ہمیں یہاں آنا پڑتا۔

قید خانے کی تباہ شدہ عمارت کے عقب میں ایک چھوٹی سی عمارت نے میری توجہ حاصل کر لی۔ اس تک بجلی کی موٹی تاریں جاری تھیں۔ اس کے اوپر ایک موبائل ٹاور نما کھمبا لگا ہوا تھا اور یقیناً یہی جامر تھا۔ اس کے سامنے کم سے کم چار گارڈز کی لاشیں موجود تھیں۔ وہ جامر کے مگران تھے اور پہلے ان کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ میں نے پہلے سن گن لی۔ کنکریٹ کا ایک کلڑا دیوار پر پھینک کر مارا۔ جب اس کی آواز پر کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تو میں عمارت کی طرف بڑھا۔ ابھی میں نے اندر قدم رکھا تھا کہ واکی ٹاکی سے ہپ ابھری میں نے جلدی سے نکال کر کال ریسیو کی اور برہمی سے بولا۔ ”تم کیوں کال کر رہے ہو اگر رامن آس پاس کہیں ہوا تو وہ ہپ سن کر ہوشیار ہو جائے گا۔“

”آدھا گھنٹا ہو گیا ہے۔“

”آدھا گھنٹا تو یہاں ایک سے دوسری جگہ جانے میں لگ جاتا ہے اور تم نے کہا تھا کہ آدھے گھنٹے والی شرط ختم ہے۔“

”اس وقت کہا تھا پر اب ہے۔ تمہارے پاس آدھا گھنٹہ اور ہے۔ اگر ایک بیج کر دس منٹ تک رامن یا اس کی لاش کے ساتھ نہ آئے تو یہ لڑکی اور لڑکا دونوں مارے جائیں گے۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میرے اندر گھنٹی بجنے لگی۔ میری غیر موجودگی میں کوئی تبدیلی آئی تھی جس کے نتیجے میں جگنو کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ کیا انہوں نے سیف تک رسائی حاصل کر لی تھی اور یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا جب فشی سے اس کی کوئی ڈیل ہو جاتی۔ عمارت میں ایک سنسناتی آواز گونج رہی تھی۔ میں سوچتے ہوئے جلدی سے اندر آیا اور جامر کے کنٹرول روم میں داخل ہوا۔ یہ خاصا جدید اور طاقتور جامر تھا جس نے آس پاس کی موبائل کیونٹیشن بلاک کر دی ہوں گی۔ اس کا کنٹرول پینل کمپیوٹرائز تھا اور میری سمجھ سے بالاتر تھا اس لیے میں نے آسان کام کیا وہ سرخ بٹن پیش کیا جس پر پاور لکھا ہوا تھا۔ اس کے دباتے ہی سنسناتی آواز رک گئی۔

اب وہاں سنا تھا۔ ایک اسکرین پر نظر آنے والی کلرفل لائنیں نیچے آئیں اور پھر ختم ہو گئیں۔ یقیناً جامر نے کام روک دیا تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا اور ایک جگہ مجھے پاور سرکٹ بریکر بورڈ دکھائی دیا۔ میں نے اس کا ہینڈل نیچے کیا تو عمارت کی ساری روشنیاں بجھ گئیں۔ میں نے ایک ایک کر کے تمام سرکٹ بریکر نکال لیے اور انہیں جیب میں ڈال کر عمارت سے باہر آیا تھا کہ مجھے دوبارہ اندر جانا پڑا کیونکہ نزدیک ہی کچھ افراد کے بولنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اس عمارت کے عقب میں تھے۔ میں نے غور کیا اور تو ایسا لگا وہ آگے جا رہے تھے۔ میں نے احتیاط سے عمارت کے کونے سے جھانکا تو کم سے کم چار افراد مجھے ایک گھاس کے تختے سے نیچے اترتے دکھائی دیے۔ ان کی پشت میری طرف تھی اور میں صرف اتنا دیکھ سکا کہ وہ میری جیسی جیکٹ اور بلٹ پروف میں تھے۔

کیا وہ ہمارے ساتھی تھے؟ مگر ہمارا کوئی ساتھی آزاد اور زندہ نہیں تھا۔ ان کے غائب ہوتے ہی میں حرکت میں آیا اور گھاس پر تیز قدموں سے دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں وہ غائب ہوئے تھے۔ یہاں ایک راہداری نیچے کی طرف جاری تھی۔ اس کا فرش اور دیواریں پختہ تھیں لیکن چھت نہیں تھی یہ راہداری ایک دروازے تک گئی تھی۔ جس کی دوسری طرف کی سطح اس سطح سے نیچی تھی۔ اس کا دروازہ بھی غائب تھا۔ کسی گریڈ نے اسے اڑا دیا تھا۔ پختہ روش پر بھاری جوتوں کی آواز گونجتی اس لیے مجھے محتاط ہونا پڑا تھا جب میں دروازے تک آیا تو میں نے ان لوگوں کو گھاس میں غائب ہوتے دیکھا۔ منظر واضح نہیں تھا۔ جب میں نے دیکھا تو آخری آدمی نیچے ہو رہا تھا اور اس بار بھی اس کی پشت میری طرف تھی اس لیے میں چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ آوازوں سے بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کون تھے؟

آخری آدمی کے غائب ہوتے ہی میں اس جگہ آیا جہاں گھاس کا ایک بڑا سا کلاوا لگ ہو کر پڑا تھا یہ ایک چوکور تختہ تھا جس پر مٹی جما کر گھاس لگائی گئی تھی اور اسے اس چوکور ظاہر اس طرح جمایا ہوا تھا کہ وہ باقی گھاس سے الگ نظر نہیں آتا تھا۔ میری معلومات میں خفیہ سرنگوں کی طرح ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نیچے تاریک خلا تھا اور بہ ظاہر یہ ایک چھوٹی سرنگ لگ رہی تھی۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد میں نے اندر اترنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خانے کے کناروں پر اترتا پھر ان پر ہاتھ جما کر دونوں پاؤں سمیٹ کر اندر گیا۔ میں نے ہاتھوں پر زور دیا کہ پاؤں زور سے نیچے نہ لگیں اور آواز نہ ہو۔ خلاف توقع فرش پانچ فٹ سے زیادہ نیچے نہیں تھا۔ میں نے جھک کر آگے دیکھا تو سوائے تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آیا لیکن جیسے ہی ٹائٹ ویڈن کا ٹن دبایا سب نظر آنے لگا۔

یہ ایک کچی سرنگ تھی اس کا فرش اور دیواریں مٹی کی تھیں البتہ چھت پر مٹی روکنے کے لیے لکڑی کے تختے لگائے گئے تھے۔ سرنگ کا آغاز اسی جگہ سے ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سرنگ جلّت میں اور محدود مقصد کے تحت بنائی گئی تھی۔ مجھے آگے جانا تھا۔ میں نے رائل سنبھالی اور آگے بڑھا۔ ذرا آگے آیا تو مجھے بہت ہلکی سی گونجتی آواز سنائی دینے لگی جیسے آگے جانے والے بات کر رہے ہوں۔ مگر الفاظ اور لہجہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً ٹائٹ ویڈن کا استعمال کیا تھا کیونکہ یہاں ہلکی سی بھی روشنی نہیں جھلک رہی تھی۔ اگر انہوں نے روشنی کی ہوتی تو مجھے بہت واضح دکھائی دیتی۔ کچی زمین پر آواز پیدا ہونے کا امکان کم تھا۔ بس یہ خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی اگر پیچھے دیکھے اور رک جائے تو میں اس کی نظروں میں آس سکتا تھا۔ سرنگ سیدھی نہیں تھی بلکہ جگہ جگہ سے مڑ رہی تھی بعض جگہوں پر مجھے کنکریٹ بھی نظر آیا جو کسی عمارت کا زیر زمین حصہ تھی اور شاید اسی وجہ سے سرنگ جگہ جگہ سے مڑ رہی تھی۔

ایک جگہ میں مڑنے لگا تو مشکل سے دس فٹ کے فاصلے پر ایک پختہ دیوار میں خلا نظر آیا تھا اور وہ چاروں اس میں جا چکے تھے۔ دوسری طرف بھی اندھیرا تھا لیکن جب میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو یہ پختہ سرنگ ثابت ہوئی تھی۔ دیوار کا خفیہ راستہ ایک عمارت کی بیڑیوں تلے رابطہ سرنگ میں کھل رہا تھا اور وہ لوگ مرکزی سرنگ میں جا چکے تھے۔ میں باہر آیا۔ سرنگ کا یہ دروازہ خود کار طریقے سے کھلنے اور بند ہونے والا نہیں تھا بلکہ ایک دو بائی تین فٹ کی سلیب دیوار میں اس طرح نصب تھی کہ یہ ظاہر وہ دیوار کا حصہ لگتی تھی اندر سے اسے تاروں کی مدد سے باندھا ہوا تھا کٹر کی مدد سے ان تاروں کو با آسانی کاٹ دیا گیا اور دھکا دینے پر سلیب نکل گئی۔ اسے

واپس لگانے کی زحمت نہیں کی گئی تھی جیسے انہوں نے گھاس کا تختہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ گویا انہیں اب اس راستے کو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سرنگ میں ان کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔

میں مرکزی سرنگ تک آیا۔ وہ لوگ مرکزی پیلس کی طرف جا رہے تھے۔ جب وہ ایک موڑ سے مڑ گئے تو میں اس جگہ سے نکلا اور ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ اب تک مجھے ان کی صورتیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ منشی کے آدمی تھے اور شاید وہی ٹیم تھی جسے بیک آپ ٹیم کو روکنا اور دنیا سے رخصت کرنا تھا تا کہ وہ یہاں کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑائیں۔ وہ اپنا کام کر کے آگئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ انہیں کہاں سے اندر جانا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میں مضطرب ہو گیا۔ اگر یہ اسی طرف جا رہے تھے تو ان کا جگنو اور اس کے آدمیوں سے تصادم لازمی تھا اور اس تصادم میں نہ جانے کون بچتا ہے اور کون مارا جاتا ہے۔ وہاں بیڑا اور سادی بھی تھے۔ ان کا خیال آتے ہی میرے قدم تیز ہو گئے تھے۔ اس دوران میں وہ مجھ سے کوئی سوگڑ آگے نکل چکے تھے۔ میں نے موڑ سے جھکا کر دیکھا وہ سیف ہاؤس والے ہال سے ذرا پہلے دیوار میں موجود ایک خلا میں داخل ہو رہے تھے اور آخری آدمی بھی اندر جا چکا تھا۔

یہ خلا بھی میرے لیے نیا تھا۔ جب بڑے کنور کو اوپر جانا تھا تب اس نے اس راستے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور بہت مشکل سے تباہ شدہ راستے سے اوپر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس سرنگ میں کچھ راستے ایسے بھی تھے جن کے بارے میں بڑا کنور بھی لاعلم تھا۔ میں دبے قدموں اس راستے تک آیا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ اسے عجلت میں کچے انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس میں صرف بیرونی فنشنگ کا خیال رکھا گیا تھا وہ بھی اسے چھپانے کے لیے۔ اندر تقریباً کچے پلاسٹر سے بنی کھردری سیڑھیاں تھیں۔ اس بار بھی سلیب کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔ جہاں یہ سیڑھیاں ختم ہوئی تھیں وہاں بھی اندھیرا تھا اور مجھے لکڑی کے تختے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اوپر آیا تو پتا چلا کہ تختے ایک بیڈ کے نیچے لگے تھے۔ فرش میں قالین تلے ایک سلیب اس طرح نصب کی گئی تھی کہ اسے با آسانی اٹھایا گیا تھا اور وہ ایک طرف رکھی تھی۔ یہاں آنے والے جا چکے تھے۔

میں بیڈ تلے نکل آیا۔ بیڈ کے نیچے آکر میں نے سن گن لی اور سنا تا پا کر باہر نکل آیا۔ کمر اتار رکھا تھا۔ یہاں کی لائٹ اڑی ہوئی تھی۔ میں نے ذہن میں مرکزی کاپیلس کا نقشہ تازہ کیا۔ یہ راستہ اصل راستے سے ذرا پہلے نکلا تھا گویا یہ اس کمرے کی پشت والا کمرہ ہونا چاہیے تھا۔ دیکھنے میں یہ خاص آراستہ نہیں تھا یعنی ایسا کمرہ نہیں تھا جس میں پیلس کا کوئی فرد یا ان کا مہمان ٹھہرے ایسا لگ رہا تھا یہ دوسری درجے کے افراد کے لیے مخصوص بیڈروم تھا۔ جانے والے دروازہ بند کر گئے تھے میں نے کھول کر باہر جھانکا۔ یہ پیلس کے سامنے والے حصے کی ایک راہداری ثابت ہوئی۔ رامن کی تلاش میں ہمیں یہاں تک آیا تھا اسی راہداری کے ایک کمرے سے میں سیب اٹھائے تھے جواب تک میری جیب میں تھے۔ باہر کے مناظر دیکھ کر میری رہی سہی بھوک بھی مر گئی تھی۔ راہداری خالی تھی اب میں نے تیز قدمی دکھائی اور بڑے کنور کے حصے والی گیلری تک پہنچ گیا۔ وہاں سے تیز آواز میں گفتگو سنائی دے رہی تھی۔ جگنو چلا رہا تھا۔

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں کر سکتا۔“ ایک آواز آئی اور پھر شخص کی آواز سنائی دی جگنو کی کراہ بلکہ ڈکرانے کی آواز اس

سے زیادہ نمایاں تھیں لیکن مجھے ان دونوں آوازوں سے کوئی مطلب نہیں تھا میں تو دوسرے آدمی کی آواز سن کر دنگ رہ گیا تھا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس کا لہجہ اور بولنے کا انداز ایسا تھا کہ لاکھوں میں پہچانا جاسکتا تھا اور میں تو کان بند کر کے بھی اس کی آواز شناخت کر سکتا تھا۔ یعنی آنے والے چار آدمیوں میں ایک فتح خان بھی تھا۔ تو کیا میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا وہ منشی کی دوسری ٹیم نہیں تھی؟ مگر فوراً ہی منشی کی آواز آئی۔

”خان تم بروقت آئے۔“

”ہم ہمیشہ بروقت آتا ہے..... پراہر شہباز خان نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”اس احمق نے اسے ہتھیار دے کر رامن کے پیچھے بھیجا تھا۔“ منشی نے جگنو کے بارے میں کہا مجھے یقین تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔

”برا کیا..... اسے چھوڑنا زندہ شیر چھوڑنے کے برابر ہے۔“

”یہ اس سے واکی ٹاکی پر رابطہ کر رکھے ہوئے تھا وہ پیس کی حدود میں ہے۔“

”کدھر ہے اس کا واکی ٹاکی۔“ فتح خان نے کہا اور میں نے نہایت پھرتی سے اپنا واکی ٹاکی نکال کر آف کر دیا۔ کچھ دیر بعد فتح خان نے کہا۔ ”اس کا واکی ٹاکی بند جا رہا ہے۔“

”اسے چھوڑ دو..... بڑا کنور ہوش میں ہے اس سے سیف کھلاؤ اور یہاں سے چلو۔“

”اتنا جلدی کس بات کا ہے اب ادھر کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ باہر بھی کسی کو نہیں پتا کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔“

”پیس کی بیک اپ ٹیم کا کیا ہوا؟“

”وہ بے فکری سے آ رہا تھا اور ایک دھماکے نے ان کو بے فکری سے ادھر بھیج دیا وہ تم لوگ کیا کہتا ہے جہنم

”؟“

”نرکھ۔“ بیٹو نے زبان کھولی۔ ”جہنم تم بھی جائے گا۔“

”چھوٹا لڑکا تم اپنا زبان بند رکھو۔“ فتح خان نے کہا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”ادھر کا خیال رکھو..... وہ

تمہارا باپ شہباز خان آگیا تو سب سے پہلے تمہاری..... میں سوراخ کرے گا۔“ فتح خان نے ناقابلِ تذکرہ جگہ کا ذکر کیا۔ ”ان کا مافق آنکھ بند کر کے پہرہ دیا تو ان کی طرح ہمیشہ کے لیے سو جائے گا۔“

فتح خان یقیناً جگنو اور اس کے ساتھیوں کا ذکر کر رہا تھا۔ اب کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ سب مارے جا چکے تھے۔ فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے خاموش ہتھیار استعمال کیے تھے اس لیے فائرنگ کا شور بھی سنائی نہیں دیا تھا۔ اس سے پہلے وہ لوگ گیلری کے سامنے نمودار ہوتے میں آڑ میں ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے بیٹو کے چلانے کی آواز آئی۔ ”دید کی کو چھوڑ دو۔“

سادی مزاحمت کر رہی تھی۔ فتح خان نے کہا۔ ”خاموش۔“

ٹھک کی آواز آئی سادی چلائی۔ ”یہ تم نے کیا کیا ہے؟“

میرادل رک گیا کیا فتح خان نے بیٹو کو شوٹ کر دیا تھا اور میں آڑ سے نکلنے والا تھا کہ اس کی آواز آئی۔

”فکرمت کرو کچھ دیر کو سویا ہے بہت بولتا ہے ہم کو بولنے والا بندہ اچھا نہیں لگتا ہے۔ تم ادھر چلو تمہارا برادر سے بات کرے گا۔“

مجھے تسلی ہوئی اور میں رک گیا تھا۔ فتح خان یا اس کے کسی ساتھی نے بیٹو کا سر بجایا تھا ٹھک کی آواز اسی کی تھی۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ فتح خان اسے مارنے کی غلطی صرف ایک صورت میں کر سکتا تھا جب اسے یقین ہو کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔ فتح خان کی آواز محدود ہو گئی تھی وہ سادی کو بڑے کنور کے پاس لے گیا تھا۔ میں نے گھڑی اتار کر اس کا ڈائل باہر نکالا اور ہال کا منظر دیکھنے کی کوشش کی۔ فتح خان کے دو آدمی مستعدی سے ٹہل رہے تھے اور ان کی نظر اسی طرف تھی۔ میں نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ گھڑی کا ڈائل چھوٹا تھا مگر سیاہ رنگ کا تھا اس لیے نظر آ سکتا تھا۔ فتح خان کے ساتھ تین آدمی تھے اور چوتھا وہ خود تھا۔ بیک وقت چار آدمیوں سے نمٹنا جب کہ وہ مستعد بھی ہوں آسان کام نہیں تھا۔ فتح خان کے آنے سے مجھے سادی اور بیٹو کی طرف سے اطمینان ہوا تھا۔ اگر اس کی جگہ جگنو، راسن یا منشی کا غلبہ ہوتا تو میں فکر مند ہی رہتا۔ وہ ان تینوں کی طرح میرا اور میرے ساتھیوں کی جان کا دشمن نہیں تھا۔

میں فی الحال کچھ کرنے سے قاصر تھا اس لیے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ فتح خان اور منشی نے یہاں ہمیشہ تو نہیں رہنا تھا اور وہ ہیرے لے کر یہاں سے نکلے۔ اگر فتح خان میرے ساتھیوں کو قبضے میں رکھنے کا فیصلہ کرتا تب بھی میں انہیں چھڑانے کی پوزیشن میں تھا۔ اس لیے بلاوجہ محاذ چھیڑنا مناسب نہیں تھا جب کہ ابھی ہیرے ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے اور ان کے سروں پر ویسے ہی خون سوار تھا۔ اس کا اندازہ مجھے کنور پیلس میں ہونے والی قتل و غارت گردی سے ہو گیا تھا۔ فتح خان اس میں براہ راست شامل نہیں تھا اور اس کے چند ساتھی مارے بھی گئے تھے۔ ممکنہ طور پر اس کے دو ساتھی وہی تھے جو سرنگ سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے۔ لیکن فتح خان اور اس کے ساتھی ابھی کنور پیلس کی بیک اپ سکیورٹی ٹیم کو مار کر آرہے تھے۔ اس لیے صاف ان کے ہاتھ بھی نہیں تھے۔ ایک بار وہ دولت حاصل کر لیتے تو ان کا جنون ٹھنڈا پڑ جاتا اور پھر ان سے نمٹنا آسان ہوتا اس وقت وہ بس بھاگنے کی فکر میں ہوتے۔

میں گیلری کے ساتھ عقب میں بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے راسن کا خوف تھا کہ کہیں وہ پیچھے سے نہ آجائے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ کہیں گھاٹ لگا کر میری طرح اندروالوں کا منظر ہوگا۔ پھر بھی خطرہ تو تھا اور اس کے باوجود میں یہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ اگر میں کسی کمرے میں چلا جاتا تو ہال اور بڑے کنور کے کمرے میں ہونے والی کارروائی سے بے خبر ہو جاتا۔ مجھے زیادہ فکر بیٹو اور سادی کی تھی۔ وہ دونوں ہال میں تھے اور وہاں فتح خان کے ساتھی تھے۔ میں سادی کے معاملے میں ان لوگوں پر کوئی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ بارہا میں نے دیکھا تھا فتح خان کے ساتھی چھپے ہوئے بد معاش اور اوباش ہوتے تھے۔ وہ خود بھی کم نہیں تھا۔ مگر میرے معاملے میں ہمیشہ محتاط رہتا تھا۔ حد یہ کہ جب اس نے سویرا کو حویلی سے نکالا تب بھی اس کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھا تھا۔ مگر یہ خیال اس کے ساتھیوں کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں یہاں سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وقفے وقفے سے گھڑی کے ڈائل سے ہال کی نگرانی کر رہا تھا۔ کبھی فتح خان کے دو آدمی نظر آتے اور کبھی تیسرا بھی دکھائی دیتا تھا۔

مگر فتح خان بڑے کنور کے کمرے میں کیا کر رہا تھا اس کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ یقیناً وہ اس سے مذاکرات کر رہا تھا کہ وہ اسے سیف کا کبھی نیشن بتا دے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس میں کتنی دیر لگ سکتی تھی اور اگر بڑا کنوراڑ

جاتا تو سادی کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ میری ساری توجہ گیلری اور ہال کی طرف تھی۔ اسی نگرانی کے چکر میں، ہمیں اپنے عقب سے غافل ہوا تھا اور اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو دیر ہو گئی تھی میں نے گھومنا چاہا لیکن کسی ہتھیار کی نال آ کر میرے سر سے لگ گئی اور پھر فتح خان کی آواز آئی۔ ”ناشباز خان! ہلنا مت۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ”تم یہاں کیسے آئے؟“

”جیسے باہر سے ادھر آیا۔ اپنا راکفل اتار کر نیچے ڈال دو، بالکل آرام سے۔“

میرے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مختصری مدت میں کبھی اتنی بار میں ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں ہوا تھا۔ ”میرا خیال ہے اس طرف سے آنے کا واحد راستہ یہی ہے۔“

”تمہارے دوسرے کئی خیالوں کی طرح یہ بھی غلط ہے۔“

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ ”فتح خان تم نے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آقا کو بھی دھوکا دیا ہے۔“

”بے شک.....“ اس نے بلا جھجک تسلیم کر لیا۔ ”ہیروں کے لیے ہم اپنے باپ کو بھی دھوکا دے سکتا

ہے۔“

”تم ہم دونوں میں سے کسے اپنا باپ سمجھتے ہو۔“ میں نے اسے اشتعال دلانا چاہا لیکن وہ لومڑی کی طرح

مکار اور سرد مزاج شخص تھا۔ اس نے سکون سے جواب دیا۔

”دونوں کو..... اب تم چاقو بھی پھینک دو۔“

اسے معلوم تھا کہ جگنو نے مجھے کون کون سے ہتھیار دیئے تھے۔ میں نے جھک کر چاقو بھی نکال کر پھینک

دیا۔ ”اور کچھ.....“

”بس اب آگے چلو۔“

میں آگے بڑھا۔ ”تم شروع سے منشی کے ساتھ اس منصوبے میں شامل تھے؟“

”بالکل..... منشی کو یہ آدمی بھی میں نے دیا..... اسے کیا پتا ان چیزوں کا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا مجھے یاد رہا تھا کہ ان میں سے کچھ آدمی وہ تھے جو تم نے

میری پہلی انڈیا یا ترا میں میری تلاش پر لگائے تھے۔“

”تم ٹھیک پہچانا..... وہ جگنو کا گروپ تھا۔ پر اس بار اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا میں نے ٹھیک کر دیا۔“

میں ہال میں پہنچا تو میں نے دیکھ لیا کہ اس نے کیسے جگنو اور اس کے ساتھیوں کا دماغ درست کیا تھا۔ اس

نے ان کے سروں میں سوراخ کر دیا تھا۔ وہاں مزید چھ لاشوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر

کہا۔ ”دولت چیز ہی ایسی ہے آدمی کا دماغ خراب کرتی ہے۔“

”میں سب کا دماغ درست کر سکتا ہے۔“

”تم نے جس طرح دوسروں کا دماغ درست کیا ہے اس طرح کوئی تمہارا دماغ بھی درست کر سکتا ہے۔“

”ہمارا قسمت۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔ بیٹو فرش پر یوں دراز تھا کہ اس کا سر سادی کی گود میں تھا۔

ضرب کی شدت سے سر پھٹ گیا تھا اور خون نکل آیا تھا۔ سادی نے اپنا دو پٹا پھاڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھ دی

فتح خان اسے بڑے کنور کے سامنے لے جا رہا تھا مگر پھر کسی وجہ سے اسے یہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے فتح خان کے ساتھ دیکھ کر سادی مایوس ہوئی تھی۔ میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ”تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔“
”ابھی میں اور بھی اچھا نہیں کرے گا۔“ اس نے کہا اور سادی کی طرف دیکھا۔ ”اس کا بھائی شرافت سے نہیں مان رہا ہے لیکن میرے کو پہلے تمہارا فکر تھا۔“

”یہاں سے باہر جانے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔“
فتح خان نے دانت نکالے۔ ”یہ کنوروں کا محل ہے جتنا سامنے نظر آنے والا راستہ ہے اس سے زیادہ نہ دکھائی دینے والا راستہ ہے۔“

”سادی کا اب کنور خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”تعلق تو ہے۔“ فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تبھی تو اس نے اسے یہاں بلوایا ہے۔ شہباز اسے لے کر اندر چلو۔“ فتح خان نے سادی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے جھک کر بیٹو کو دیکھا۔ اس کی سانس اور نبض ٹھیک تھی۔ مجھے لگا کہ وہ ہوش میں تھا لیکن بے ہوش بنا ہوا تھا۔

”فتح خان اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے اگر اسے کچھ ہوا تو.....“
”تو تم ہم کو نہیں چھوڑے گا۔ بے شک نہ چھوڑو۔“ فتح خان نے فراخ دلی سے کہا۔ ”اب چلو اسے لے کر ورنہ میں اپنا آدمی کو بولتا ہے۔ وہ لے جائے گا۔“

میں نے سہارا دے کر سادی کو اٹھایا۔ ”فتح خان میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں سادی کو اس معاملے میں ملوث نہ کرو ورنہ اس کے بعد شاید ہمارے درمیان کبھی نارمل تعلق نہیں ہوگا۔“
فتح خان کے چہرے پر چند لمحوں کو ہچکچاہٹ آئی تھی اور پھر اس کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ ”شہباز خان! میں یہ رسک لے گا۔ ادھر وادی کے ہیرے سے کہیں زیادہ ہیرا ہے۔“

ہم بڑے کنور والے کمرے میں آئے۔ جہاں وہ بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کے چہرے پر نفاحت تھی لیکن وہ ہوش میں تھا۔ ایک طرف ڈاکٹر موجود تھا اور اس کے ساتھ ہی منشی بھی موجود تھا۔ ان سب کی مگرانی کے لیے فتح خان کا ایک آدمی موجود تھا۔ فتح خان کے اشارے پر اس کا آدمی ڈاکٹر کو لے کر کمرے سے چلا گیا اور دروازہ بند کر دیا تھا۔ اب فتح خان نے منشی کی طرف دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر خوب صورت آتش دان کا ایک ابھرا ہوا قطرہ ہار دیا تو یک دم آتش دان دو حصوں میں تقسیم ہونے لگا۔ یہاں بھی وہی سنسناتی آواز آ رہی تھی جو ہانڈروک سسٹم کی نشانی ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک بڑے فریج کے سائز اور شکل کا سیف تھا۔ اس کے اوپری حصے میں شیشے کی اسکرین تھی۔ منشی نے اس کے نیچے لگا مین دیا تو شیشے پر کی بورڈ ابھر آیا۔ یہ تقریباً پورا کی بورڈ تھا اس میں تمام انگریزی کے حروف تہجی اور علامات تھیں۔ ایک طرف چھوٹا نمبر کی پیڈز تھا۔ فتح خان نے بڑے طور سے کہا۔

”اپنا کبھی نیشن بتاؤ۔“

مگر بڑا کنور خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ میں نے مشورہ دیا۔ ”بہتر ہے اب تم بتا دو کیونکہ فتح خان بہر حال ان لوگوں سے بہتر ہے۔ مگر اسے سفاکی میں کم مت سمجھو۔“

بڑے کنور نے ٹھہرے انداز میں کہا۔ ”شہباز میں ان میں سے کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا۔“
 ”بات تمہارے اعتماد کی نہیں ہماری مجبوری کی ہے۔ دوسری صورت میں یہ سادی کو نشانہ بنائیں گے کیا تم برداشت کرو گے۔“

پہلی بار بڑے کنور کے چہرے پر اضطراب آیا۔ ”مجھے اب اس دولت کی پروا نہیں ہے لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ہمیں چھوڑ دیں گے؟“

”کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ فتح خان نے صفائی سے کہا۔ ”پر یہ شہباز خان مجھ کو جانتا ہے۔“
 ”میں تمہیں عام معاملات کی حد تک جانتا ہوں لیکن اگر تم نامعلوم مالیت کے ہیروں پر قابض ہو گئے تو تمہارا رد عمل کیا ہوگا میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“

”مجھے تم لوگوں کو مار کر کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مجھے صرف دو گھنٹے چاہیے ہوں گے اور اس کے بعد سارے بھارت کی پولیس اور ایجنسیاں بھی مل کر مجھے تلاش نہیں کر سکیں گی۔“
 ”تم نے نشی کا ذکر نہیں کیا؟“ میں نے طنز کیا۔

”ہم یہاں سے اپنی اپنی راہ لیں گے۔“ فتح خان نے شانے اچکائے۔ ”مجھے نہیں معلوم یہ کہاں جائے گا اور اسے نہیں معلوم میں کہاں ہوں گا۔“

سادی میرے پاس تھی اور سبھی ہوئی میرے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ اچانک فتح خان نے پستول کا رخ سادی کی طرف کر دیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ”بڑا کنور فیصلہ کرو۔۔۔۔۔ آریا پار۔۔۔۔۔ ایک جواب دو۔۔۔۔۔ ہم تین تک گئے گا۔“

میں نے سادی کو اپنی اوٹ میں لے لیا۔ ”فتح خان پہلے تمہیں مجھے شوٹ کرنا ہوگا۔“
 فتح خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ہم کو معلوم ہے پہلے تم کو مارے گا تب ہی گولی اس کو لگے گا۔“
 سادی تڑپ گئی۔ ”نہیں شوٹی۔۔۔۔۔“

”ایک۔۔۔۔۔“ فتح خان نے کہا۔

”بھیا۔“ سادی چلائی۔ ”اسے بتا دو۔“

”دو۔۔۔۔۔“ فتح خان نے کہا تو سادی زور لگا کر سامنے آنے لگی مگر میں نے اسے اپنی اوٹ میں رکھا۔

”تین۔۔۔۔۔“ فتح خان نے کہا تو سادی زور سے چلائی اور مجھے بڑے کنور کی آواز آئی۔

”یس۔۔۔۔۔ میں تیار ہوں۔“

میں جو گولی کھانے کے لیے تیار ہو گیا تھا میرا سخت ہوتا جسم نرم پڑ گیا۔ بڑا کنور بستر سے اٹھ رہا تھا کہ اچانک جھٹکا کھا کر گرا۔ میں نے اس کے سینے پر چوٹے کو سرخ ہوتے دیکھا۔ اسی لمحے آتش دان کے پاس کھڑے نشی دل جی کے سر میں سوراخ ہو گیا۔ اس کا خون اچھل کر سیف پر گیا تھا اور وہ لٹو کی طرح گھوم کر گرا تھا۔ چونکہ فتح خان اپنی جگہ سے اچھلا اور بیڈ پر گر گیا تھا۔ اس پر چلائی جانے والی گولی اس جگہ سے گزری جہاں وہ ایک لمحے پہلے تھا۔ اگلے لمحے وہ بیڈ کے دوسری طرف گرا اور اس نے دروازے پر کھڑے رامن پر فائر جھونک مارا۔ وہ خاموشی سے اندر آیا تھا اور خاموش پستول سے سب کو نشانہ بنارہا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ تینوں کو نشانہ بنالے گا مگر

فتح خان نے اس کا اعتماد غلط کر دیا تھا۔ وہ بڑے کنور کو گولی لگتے ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بچا تھا اور اس نے گرتے ہی خود کو سنبھال کر جوابی فائر کیا اور اس بار میں نے راسن کو اپنی گردن تھامتے ڈگمگاتے دیکھا۔ گولی اس کے زخروں سے گزر گئی تھی۔ یہ سب پانچ سیکنڈ سے بھی پہلے ہو گیا تھا۔

سادی میرے پیچھے تھی اور جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ بدحواس ہو کر پیچھے ہٹی تھی۔ اسی لمحے راج کنور ڈگمگاتے راسن کو دھکیلتا ہوا اندر آیا تو سادی اس کے سامنے تھی اس نے اسے پکڑ کر اپنی ڈھال بنالیا۔ میں جو راسن کے گر جانے والے پستول کی طرف جا رہا تھا رک گیا۔ راسن اور راج کنور ساتھ ساتھ آئے تھے یعنی ان میں گٹھ جوڑ تھا لیکن راج کنور نے ایک غلط نظر بھی زمین پر ایڑیاں رگڑتے راسن کی طرف نہیں ڈالی۔ اس کے چہرے پر دھشت تھی۔ وہ سادی کو آڑ بنائے سیف کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی حرکت کے ساتھ ساتھ فتح خان بھی حرکت کر رہا تھا۔ راج کنور کو اسی سے خطرہ تھا کیونکہ وہ مسلح تھا۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“

”ہم کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ فتح خان نے کہا۔ ”اگر تم نے پستول کا رخ میرا طرف کیا تو میں ضرور

گولی چلاؤں گا۔“

”ایک منٹ راج۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو تمہارے سارے دشمن مارے جا چکے ہیں۔ تم نے اپنے بھائی کو بھی مار دیا۔ لیکن تم جانتے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں صرف سادی کو یہاں سے لے جانے آیا ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔“ اس نے دانت چیس کر کہا۔ ”میرے سب سے بڑے دشمن اور میری مشکلوں کے

ذمے دار تم ہو۔“

”یہ غلط ہے میں نے کبھی تم سے دشمنی نہیں کی۔ دشمنی تم لوگوں نے کی اور میں نے ہمیشہ اپنا دفاع کیا۔ سادی کو بھی میں جان کر نہیں لے گیا تھا۔ اسے تم لوگوں کے دشمن قبائلی لے گئے تھے اور میں نے وہاں اس کی جان بچائی تھی۔ اگر قبائلیوں کو پتا چل جاتا کہ یہ تمہاری بہن ہے تو تمہاری ساری کامیابی ناکامی میں بدل جاتی۔“

”یہاں ہونے والی قتل و غارت گری کا ذمے دار کون ہے تم ہوتا۔“ راج غرایا۔

”یہ بھی غلط ہے، میں نے صرف سادی کو واپس لے جانے کا پلان بنایا تھا، اسے خوریز تم سب نے مل کر

کیا۔ تمہاری یہاں اچانک آمد بتاتی ہے کہ تم بھی اس میں شامل تھے۔“

”میں نے یہ سب نہیں چاہا تھا۔“

”تجسبی راسن نے سب سے پہلے بڑے کنور کو شوٹ کیا۔“ میں نے تلخی سے کہا اور ایک نظر سادی کو دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔ اس کی نظریں بڑے کنور پر مرکوز تھیں۔ اس نے کہا۔

”میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ دولت کے لیے اتنے گر جائیں گے۔ اپنے ہی بھائی کو مار دیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔ یہ میری مجبوری تھی۔“ راج کنور نے بے رحمی سے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ”تو

نے ہماری ناک کنوادی۔ پہلے اس کمار سے شادی کی جو اچھوت تھا اور پھر ایک مسلے سے شادی کر لی۔ تجھے مار کر

مجھے خوشی ہوگی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے تم فوج جاؤ گے۔“ میں نے کہا میرا تھرا تھرا رفتہ رفتہ حرکت کر رہا تھا۔
 ”ہاں پہلے میں تجھے ماروں گا۔ یہ تجھے مرتا دیکھے گی اس کے بعد اس کی باری آئے گی۔“ راج کنور کے
 چہرے اور لہجے کی وحشت ہر گزرتے لمحے بڑھ رہی تھی۔

”اگر تم نے شہباز کو مارا تو میں تجھے نہیں چھوڑے گا۔“ فتح خان نے اسے لٹکا رہا۔
 ”فتح خان تم کوئی نہیں چلاؤ گے اس نے سادی کو ڈھال بنایا ہوا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”میں کسی سادی کو نہیں جانتا۔ میں تم کو جانتا ہے۔ شہباز خان میں نے قسم کھایا تھا کہ تم کو اپنے ہاتھ سے
 مارے گا۔ پر نہیں مار سکا۔ ہو سکتا ہے کبھی ماروے۔ اس لیے اگر کسی نے تم کو مارا تو میرا قسم ادھورا رہ جائے گا میں
 اسے نہیں چھوڑے گا۔“

جوشن ایسی تھی کہ آدمی ہنس بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسرے فتح خان نے یہ بات نہایت سنجیدگی سے کی تھی۔
 میں نے راج کنور پر نظر جمائے ہوئے کہا۔ ”تمہارا شکریہ..... راج کنور تم نے بڑے کنور کو مار دیا ہے سیف کا
 اولین کبی نیشن اس کے پاس ہے۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”کبی نیشن پہلے ہی میرے پاس ہے۔“
 ”اگر اس نے کبی نیشن بدل دیا ہو؟“ میں بات کو طول دے رہا تھا کہ راج کنور کے سر سے خون اترے۔
 ویسے میں نے محسوس کیا تھا کہ فتح خان کی دھمکی کے بعد وہ ذرا دھیمہ ہوا تھا اور اس کے چہرے کی وحشت میں کمی
 آئی تھی۔ کمرے میں تین افراد کی لاشیں تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو کتنے عرصے سے مجھ سے دشمنی کرتے چلے آئے
 تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں یا وہ میرے ہاتھوں موت کے دہانے تک آئے لیکن قدرت نے وقت
 نہیں رکھا تھا اس لیے فوج گئے۔ خاص طور سے رامن اتنی بار فوج کر نکلا تھا۔ کم سے کم تین مواقعوں پر وہ موت سے
 بچا تھا مگر جب قضا آئی تو اچانک ہی مر گیا۔ اسے مرنے میں ایک منٹ کا وقت بھی نہیں لگا تھا اور ششی دل جی تو
 سینکڑوں میں مر گیا تھا۔ رامن نے عقب سے اس کے سر میں گولی اتار دی تھی۔ بڑے کنور کا کنور جسم اپنے خون میں
 نہایا ہوا بستر پر بکھرا ہوا تھا۔ راج کنور نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولا۔

”ایک بار لگ جانے کے بعد صرف کمپنی کا آدمی آکر کبی نیشن کو روری سیٹ کر سکتا ہے اور اس کے لیے
 ضروری ہے کہ تینوں کبی نیشن لگا کر سیف ایک بار کھولا جائے۔“
 ”دوسرے لفظوں میں یہ سیف بہت کم کھلا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”آخری بار چار مہینے پہلے کھلا تھا۔ جو ہیرے سودے سے فوج جاتے تھے وہ اسی میں رکھ
 پئے جاتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہم دوسرے درجے کے ہیرے فروخت کرتے تھے اور اول درجے کے اس
 میں رکھتے تھے۔ یہ محفوظ دولت تھی جس کا کہیں ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی ٹیکس دینا پڑتا ہے۔“
 میں نے گہری سانس لی۔ ”اس کا مطلب ہے بڑے کنور کا کبی نیشن تمہارے پاس ہے۔“

”اس کا بھی۔“ راج کنور نے سادی کے جکڑے بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ کراہی تھی۔ اس کے لیے راج کنور
 کے انداز میں بے پناہ نفرت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک لمحہ سوچے اور ہچکچائے بغیر اسے مار سکتا تھا۔ ”سیف
 مولنے کے لیے اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”راج تم سب سے بیک وقت نہیں لڑ سکتے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”تم شہباز اور اسے مار سکتے ہو لیکن میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔“

راج کنور کے چہرے پر اب ہچکچاہٹ کے آثار تھے۔ فتح خان کی دھمکی نے صورتِ حال بدل دی تھی یہ سچ تھا کہ اگر وہ مجھے مارتا تو فتح خان اسے مارتا اور اسے سادی کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ میرا ہاتھ بدستور حرکت میں تھا اور یہ اتنی خفیف حرکت تھی کہ راج کنور مجھے دیکھنے کے باوجود بھانپ نہیں سکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا اس لیے جو بات میں نے پہلے سوچ لی تھی وہ ذرا دیر سے اس کے ذہن میں آئی۔ وہ مجھے شوٹ کرتا اور سادی کو ڈھال بنا کر فتح خان کے پاس جا کر اسے بھی مارتا۔ فتح خان کی چلائی گولیاں سادی کو لگتیں اور راج کنور کا یہ مقصد بھی پورا ہو جاتا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس کا ذہن اس طرف نہ جائے۔ مگر جب اس کے تاثرات بدلے تو میں نے جان لیا یہ حل اس کے ذہن میں آ گیا ہے۔

اس نے سادی کو اس طرح آڑ میں لیا کہ فتح خان کی طرف سے کی جانے والے فائرنگ سے محفوظ رہے اور پستول کا رخ میری طرف کیا تھا۔ میں جست لگانے کو تیار تھا کہ کھلے دروازے سے بیٹو بگولے کی طرح اندر آیا اس نے مجھے دھکا دیا تھا۔ راج کنور نے فائر کیا اور بیٹو گھوم کر گر اٹھا۔ میری دھاڑ اور سادی کی چیخ ایک ساتھ نکل گئی تھی۔ سادی اتنی زور سے تڑپی کہ راج کی گرفت سے نکل گئی اور بیٹو کی طرف لپکی۔ راج جھٹکے سے سنبھل کر پستول کا رخ سادی کی طرف کر رہا تھا۔ میں نے ناقابل یقین تیزی سے جیکٹ میں موجود پستول نکالا۔ یہ وہی پستول تھا جو میں نے جگنو کے آدمی کے ہاتھ سے نکالا تھا۔ فتح خان یہاں چوک گیا تھا اور اس نے میری تلاش نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے راج ٹریگر دبا تا میں نے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گیا اور پھر ہر گولی کا جھٹکا اسے پیچھے دھکیلتا رہا۔ آخری گولی کے ساتھ وہ سیف سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ سرکنا ہوا نیچے گر اٹھا۔ میں بیٹو کی طرف لپکا۔ سادی اسے سنبھال رہی تھی۔ گولی نے بائیں طرف عین بلٹ پروف جیکٹ سے ذرا اوپر اس کی گردن کے نیچے سوراخ کر دیا تھا اور اس سے خون بے پناہ تیزی سے ابل رہا تھا۔ گولی نے یقیناً بڑی شریان کاٹ دی تھی۔ ”نہیں..... نہیں۔“

میں نے کہتے ہوئے بیٹو کا زخم ہاتھ سے دبا یا۔ لمعے میں میرا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ بیٹو کے چہرے پر زردی چھا رہی تھی اور یہ موت کی زردی تھی۔ اسی لمعے کھڑکی ٹوٹنے کا چھٹکا سنائی دیا تھا۔



اس سے پہلے بارہا میں نے موت کو پاس سے دیکھا۔ بے شمار لوگ میرے ہاتھوں اور میرے سامنے مرے۔ گزشتہ بارہ گھنٹے میں اتنی قتل و غارت دیکھ لی تھی۔ میں اس معاملے میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ زخم کی کنڈیشن اور زخمی کی صورت دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ بچے گا یا نہیں اور بیٹو کا زخم دیکھ کر میرے اندر سے کسی نے کہا وہ نہیں بچے گا۔ مگر میں اپنے اندر کے آدمی کو جھٹلا رہا تھا۔ میں بیٹو کو سنبھال رہا تھا۔ سادی نے اپنی شال اتار کر اس کی گدی بنا کر بیٹو کے زخم پر رکھا۔ جب کھڑکی ٹوٹنے کا چھٹکا سنائی دیا تب بھی میں نے بیٹو سے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے معلوم تھا فتح خان فرار ہو گیا ہے۔ اگر وہ فرار ہونے کے بجائے مجھے شوٹ کر دیتا تب بھی مجھے پروا نہیں ہوتی۔ اس وقت مجھے بیٹو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ گولی بلٹ پروف سے صرف نصف انچ اوپر لگی تھی اگر یہ ذرا نیچے لگتی تو کچھ نہ

ہوتا۔ آدھے انچ کا فرق زندگی اور موت کا فرق بن جاتا ہے۔ میں نے غم لہجے میں کہا۔ ”بیٹو یہ کیا کیا؟“
بیٹو کو زخم کا پتا نہیں تھا لیکن اس نے میرے تاثرات سے جان لیا اور سرگوشی میں بولا۔ ”شوبی ہم بچے کا
نہیں.....“

”نہیں..... نہیں۔“ میں نے پھر کہا۔ ”بیٹو کچھ نہیں ہوگا..... ابھی تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں تم
بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شوبی ڈاکٹر بہت دور ہے۔ ہم نہیں جاسکتا۔ پر آپ ادھر ہے دیدی ادھر ہے۔
ہمارے لیے یہ کافی ہے۔“

سادی خود پر قابو رکھ رہی تھی۔ مگر اس کے آنسو اس کے قابو میں نہیں تھے۔ شاید میرے بھی نہیں تھے۔
کیونکہ بیٹو مجھے دھندلا نظر آ رہا تھا۔ سادی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”بیٹو ایسی بات نہ کر۔“
میں نے بیٹو کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے روک دیا۔ ”نہیں شوبی..... وقت کم ہے..... آپ ہم سے
بات کرو.....“

اب تک میں خود کو جھٹلا رہا تھا کہ بیٹو بچ جائے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی وہ کئی بار زخمی ہوا تھا۔ ہم
میں سب سے زیادہ زخم خوردہ وہی تھا۔ اس کا پورا خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے مارا گیا تھا۔ اس کے قبیلے
کے بیشتر افراد مارے گئے تھے اور باقی پتا نہیں کہاں تھے۔ دنیا میں اس کا اب کوئی نہیں تھا سوائے ہمارے۔
میں نے سوچا تھا کہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ وہ میرے خاندان کا ایک حصہ ہوگا۔ ہم اس کی شادی
کریں گے پھر اس کا بھی ایک خاندان ہوگا۔ مگر جو سوچا تھا وہ سوچ میں رہ گیا اور حقیقت بیٹو کی رگوں سے قطرہ
قطرہ کر کے رس رہی تھی۔ جب بیٹو نے مجھ سے بات کرنے کو کہا تو مجھے لگا کہ ہاں اب وقت نہیں ہے۔ بیٹو جانے
والا ہے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا زخم دبا یا۔ خون جھننی دیر سے ٹکٹا بیٹو اتنی ہی دیر زندہ
رہتا۔

”بیٹو میں بات کر رہا ہوں میرے بیٹے.....“

اس کا چہرہ ایک لمحے کو چمکا تھا۔ ”ہم آپ کا بیٹا ہے؟“

”تم میرے بیٹے ہو، بھائی ہو، دوست ہو۔“

”ہم جانتا ہے شوبی.....“ اس نے کسی قدر وقت سے کہا۔ ”آپ سمجھتا ہم کامی سے محبت کیا..... نہیں شوبی

ہم بس آپ لوگ سے محبت کیا..... کامی اچھا لگا تھا اور بس.....“

”میں جانتا ہوں اگر تمہیں کامی سے محبت ہوتی تو تم اس کے ساتھ جاتے..... آدمی اس کے ساتھ جاتا

ہے جس سے محبت کرتا ہے۔ اگر تم اس سے محبت کرتے تو میں اسے کہیں سے بھی تمہارے لیے لے آتا۔“

”ہم کو معلوم ہے، پر ہم نے کبھی نہیں چاہا۔“

سادی بڑے کُور کے بیڈ کے ساتھ موجود دو واؤں کی میز سے بینڈج کا سامان لے آئی تھی۔ اس نے
ایک بڑی پٹی نکالی۔ میں نے شال ہٹا کر یہ پٹی اور اس کے ساتھ روٹی کا بنڈل رکھا۔ خون اسی روانی سے بہہ رہا
تھا اور اسے یوں بہتے دیکھ کر میری رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ بیٹو کا چہرہ ہرگز رتے لمحے زرد ہو رہا تھا اور اس پر

تکلیف نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ ”شوبی..... ہم کو سفیر..... بھائی یاد آ رہا ہے..... ہم اس سے بہت لڑا..... بدتمیزی بھی کیا.....“

”بیٹو میری جان یہ محبت تھی۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”ہم جانتا ہے..... وہ ہم سے بولا کہ جب سب ٹھیک ہو جائے گا تو وہ ہم کو اپنے پاس رکھے گا کیونکہ وہ جیسے مونا دیدی کے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح ہمارے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔“ بیٹو کا لہجہ پھر صاف ہو گیا۔ اس کی کلفت ختم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے اندر قوت آئی ہو۔ جیسے چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے۔ اس نے سادی کی طرف دیکھا۔ ”دیدی ہم کو معاف کر دینا۔ ہم آپ کو دیدی بولا اور آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔“

”تم نے میرے لیے سب کیا جو ایک بھائی اپنی بہن کے لیے کر سکتا ہے اس سے زیادہ کیا..... یہ میرے بھائی ہیں۔“ سادی نے راج اور بڑے کنور کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اللہ کی قسم مجھے ان کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے لیکن بیٹو تمہارا زخم مجھے اپنے دل پر لگ رہا ہے۔“

”دیدی آپ ہم سے محبت کرتا ہے۔“

”ہاں میرے بھائی.....“ سادی رونے لگی تھی۔

”شوبی آپ بھی کرتا ہے؟“

”ہاں۔“ میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا جس پر پسینہ آ گیا تھا اور یہ موت کا پسینہ تھا۔ اس کا جسم اینٹھ رہا تھا لیکن چہرہ ہنسٹھن تھا۔ ”شوبی میرا آخری خواہش پوری کرے گا۔“

اس وقت مجھے خود پر قابو پانے میں بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ ”بیٹو میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔“

”شوبی ہمارا اترتی کو آپ آگ دکھانا..... پر ایسا ضروری نہیں ہے اگر خطرہ ہو تو آپ ہم کو ادھر ہی چھوڑ جاتا.....“

”میں تمہاری یہ خواہش پوری کروں گا۔“ میں نے کہا تو مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔ سادی دوپٹے سے منہ دھار رہی تھی کہ اس کی آواز نہ لکھے۔

”نہیں آپ یہاں سے جاؤ..... یہاں خطرہ ہے۔“ بیٹو نے کہا۔ ”ہم پاگل ہے جو آپ کو ایسا بولا.....“

آپ دیدی کو دیکھو..... یہاں سے.....“

”تم جیسا کہو گے میں ویسا کروں گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ اس وقت وہ میری جان بھی مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔ اس کی آنکھیں بجھ رہی تھیں۔ اس نے رک رک کر کہا۔

”شوبی..... ہمارا ماں ایک بار..... ہم سے بولا..... آدمی مرتا ہے تو..... اس وقت..... وہ بھگوان

سے..... جو مانگتا..... بھگوان اسے..... ضرور دیتا ہے..... شوبی ہم مانگتا..... بھگوان آپ کو کامیاب کرے.....

آپ کا دشمن ناکام ہو۔“

”بیٹو میری خواہش ہے تم میرے ساتھ رہو۔“

”شوبی اب ایسا نہیں ہو سکتا۔“ بیٹو نے کہا اور بولتے ہوئے اچانک اسے جھٹکا لگا اور اس کا چہرہ سفید ہو

گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کی چمک بجھنے لگی تھی۔ میں بیٹو کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آواز دے رہا تھا مگر وہ میری آواز کی حد سے دور جا چکا تھا۔ آوازیں دیتے ہوئے میں نے اسے جھنجھوڑا تو بیٹو کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ سادی دھائیں مار کر رونے لگی وہ سمجھ گئی تھی۔ مگر میں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”بے وقوف رو کیوں رہی ہو، بیٹو بے ہوش ہوا ہے ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔“

سادی نے میرے شانے پر سر مارا۔ ”شوہی، بیٹو مر گیا ہے۔“

تب میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض چیک کی۔ وہ ساکت تھی۔ بیٹو کی سانس اور دل دونوں ٹھہر گئے تھے۔ وہ مر گیا تھا۔ شاید میں بھی رونے لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا دایاں بازو میرے جسم سے کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میں نے بے ساختہ اپنا بازو ٹٹولا مگر وہ اپنی جگہ تھا۔ ہاں شل ہو گیا تھا۔ میں سن سی کیفیت میں تھا۔ بیٹو کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ مگر اس موقع پر سادی نے حواس بحال رکھے۔ حالانکہ اس کے دو بھائی اس کے سامنے مارے گئے اور بیٹو تو بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔ اس نے میرا بازو ہلایا۔

”شوہی..... ہمیں یہاں سے جانا ہے۔“

میں چونکا۔ ”بیٹو کو چھوڑ کر؟“

”اگر نہ لے جا سکے تو چھوڑ کر جانا ہوگا۔“ سادی کھڑی ہو گئی۔ ”شوہی وقت کم ہے کوئی بھی آ سکتا ہے۔“

ابھی یہاں کچھ لوگ اور ہوں گے۔“

”کون لوگ۔“ میں نے رامن، منشی، راج اور بڑے کنور کی لاشوں کی طرف دیکھا۔ ”اب بچا ہی کنور

ہے۔“

”ان کے آدمی ہوں گے۔ ممکن ہے منشی کے کچھ آدمی باہر بھی ہوں۔ یا جگنو کے آدمی بچے ہوں۔“

سادی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ لیکن میں بیٹو کو یوں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں ہر صورت اس کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بیٹو کا سر احتیاط سے نیچے رکھا جیسے وہ سو رہا ہے اور اس کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ میں نے رامن کا ہسٹول اٹھایا کیونکہ اپنا ہسٹول تو میں نے راج کنور پر خالی کر دیا تھا۔ بیٹو اس کی گولی کا نشانہ بنا تھا لیکن اس کا اصل قصور سادی پر تھا۔ اٹھانا تھا۔ میں نے اس کا ہسٹول بھی اٹھالیا جو اس کے پاس پڑا تھا۔ پھر میں باہر آیا جہاں فتح خان کے آدمیوں کی لاشیں، جگنو اور اس کے آدمیوں کی لاشوں کے ساتھ پڑی تھیں۔ کنور پیلس میں اندر باہر لاشیں ہی لاشیں بکھری تھیں۔ ان میں وہ بھی تھے جو دوسروں کو مارنے آئے تھے اور وہ بھی تھے جن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی انہیں مارنے آ رہا ہے۔ وہ بھی مارے گئے تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کنور پیلس میں کام کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے تو یہاں غلام کی حیثیت سے تھے۔ انہیں صرف زندہ رہنے کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ انتہادر بچے کے تابعدار تھے مگر ان کی تابعداری بھی ان کو موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔

ان میں میرے بہت سے دشمن تھے اور بہت سے ایسے تھے جن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور بیٹو جو میرا ساتھی تھا میرے وجود کا ایک حصہ اب وہ یہاں لاشوں کا ایک حصہ تھا۔ رامن اور راج کنور نے ہال میں موجود فتح خان کے آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئے اور راج کنور یہاں تک کیسے پہنچا۔ جیسا

کہ فتح خان کا دعویٰ تھا کہ یہاں جتنے راستے سامنے تھے اس سے کہیں زیادہ خفیہ راستے تھے۔ وہ دونوں بھی کسی ایسے ہی راستے سے آئے ہوں گے۔ راج کنور کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اب ڈیوڈ شا کے قبضے میں نہیں ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اچانک یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ تو واضح تھا کہ رامن اب تک اس کے ساتھ تھا اور وہ اسی کے ہمراہ آیا تھا۔ منشی سمجھ رہا تھا کہ اس نے رامن کو بے وقوف بنایا ہے لیکن حالات بتا رہے تھے کہ رامن نے راج کنور کے ہمراہ مل کر اسے بے وقوف بنایا تھا۔ ان سب نے میرے اور ڈیوڈ شا کے کندھوں پر رکھ کر بندوق چلائی مگر آخر میں خودشانہ بن گئے۔

میں گیلری کی طرف آیا تھا کہ مجھے کسی کی جھلک دکھائی دی اور میں تیزی سے واپس آ گیا۔ آنے والے نے میری جھلک بھی دیکھ لی تھی اور مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”شہباز یہ میں ہوں۔“ میں چونکا تھا۔ وہ کرنل جیمز تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔ میں نے سر نکال کر جھانکا۔ وہ سر سے پاؤں تک گرد اور مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ مگر وہ کرنل جیمز ہی تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ کرنل کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کے بائیں بازو اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ”کرنل تم زندہ ہو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال تھا تم بھی مر چکے ہو؟“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”اتفاق سے میزائل اے پی سی کے سامنے لگا تھا اور میں عقبی حصے میں تھا۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے اور میں اڑ کر باہر جا گرا تھا کم سے کم دس گز دور اس کے باوجود بچ گیا شاید اس لیے کہ نرم گھاس پر گرنا تھا۔“

”تمہارا احمقانہ منصوبہ پوری طرح ناکام رہا۔“

”نہیں پوری طرح ناکام نہیں ہوا میں زندہ ہوں تم زندہ ہو۔“

میں نے اسے دھکیل کر دیوار سے لگایا اور اس کی گردن پر کبھی رکھ کر چلایا۔ ”ہاں لیکن میرا ساتھی زندہ نہیں ہے۔ وہ مارا گیا ہے تمہارے اس منصوبے کی بجائے چڑھ گیا ہے۔“

”کون؟“ وہ چونکا۔ ”وہ لڑکا.....؟“

”ہاں وہی۔“ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ کرنل نے مزاحمت نہیں کی تھی اس لیے میری گرفت خود نرم ہو گئی۔ ”تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ میرے لیے کیا تھا؟“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ کرنل نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن اس کی موت اسی طرح اور اسی جگہ لکھی تھی۔ یہ میرا اور تمہارا ایمان ہے۔“

اس کے الفاظ نے مجھ پر اثر کیا تھا میرا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹ گیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... لیکن میں کیا کروں۔“

”وہ لڑکی کہاں ہے؟ جسے ہم لینے آئے ہیں۔“

”اندر ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں تھے۔ اے پی سیز کو اڑے بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔“ میں نے اچھتی نظر گھڑی پر ڈالی جس میں تین بج رہے تھے۔

”میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے کاش کہ میں پہلے ہی تمہاری بات مان جاتا۔ یہ سارا کیا دھرا

نشی کا تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے تھے صرف ہیلی کا پٹر سے اترنے والی ٹیم محفوظ تھی لیکن باہر اسٹائیرز کی موجودگی میں وہ بھی محفوظ نہیں تھے اس لیے میں نے ان کے خاتمے کا فیصلہ کیا۔ میں رات کی تاریکی میں باہر نہیں نکل سکتا تھا اس لیے دن طلوع ہونے تک ایک جگہ چھپا رہا کتنے ہی پیس گاڑڈ میرے سامنے مارے گئے۔ جیسے ہی دن طلوع ہوا میں پیس سے نکل گیا۔ مجھے عقبی سے اترنا پڑا تھا اس کے بعد میں ایک ایک جگہ جا کر نشی کے آدمیوں کا خاتمہ کرتا رہا۔ یہ کام منٹا کر میں اندر آیا۔ یہاں کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔ میں اس امید میں یہاں آیا تھا کہ شاید یہ لڑکی زندہ ہو اور میں اسے ساتھ لے کر نکل سکوں۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتاؤ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟“

”ہاں ہیلی کا پٹر ہے۔“ کرنل نے کہا۔ ”میری پائلٹ سے ریڈیو پر بات ہوئی ہے وہ دس منٹ میں یہاں آ سکتا ہے۔“

ہم کمرے میں آئے تو سادی جو بیٹو کے پاس بیٹھی تھی کرنل کو دیکھ کر چوکی اور سہم گئی۔ ”شوٹی یہ کون ہے؟“

”کرنل جیمز۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ہم اسی نے ترتیب دی تھی۔“

”مہم یا قتل عام۔“ سادی نے غمی سے کہا۔ ”اسے معلوم ہے یہاں کتنے لوگ مارے گئے ہیں۔“

”بے بی ایسے کاموں میں یہ سب ہوتا ہے۔“ کرنل نے نرمی سے کہا۔ ”فی الحال ہمیں کسی بحث میں پڑے بغیر یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”میں ہیلی کا پٹر کے لیے کال کر رہا ہوں۔“

اب تک میں سوچ رہا تھا کہ بیٹو کو کیسے لے کر جاؤں۔ مجھے گاڑی کا خیال آیا تھا مگر ہیلی کا پٹر کہیں بہتر تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے کال کرو۔“

اس کے پاس کسی قدر بڑے سائز کا ریڈیو تھا۔ یہ اس کی پشت پر بندھے بیگ میں موجود تھا۔ اس نے ریڈیو نکالا اور ہیلی کا پٹر پائلٹ کو کال کرنے لگا۔ ”ریڈیو برڈ..... ریڈیو برڈ ڈیورڈی؟“

اس نے کئی بار پکارا لیکن ریڈیو سے کوئی جواب برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”شاید مجھے چھت پر جانا پڑے..... یہاں ریڈیو کام نہیں کر رہا ہے۔“

چھت پر جانے کا سیدھا راستہ تباہ ہو گیا ہے۔ لیکن ایک راستہ اور ہے۔“

”کہاں ہے اس پر بتاؤ۔“ کرنل نے ڈیجیٹل کمپاس نکالا۔ میں نے اسے ایمر جنسی میٹر ہیوں والا خفیہ راستہ سمجھایا۔ وہ نقشے میں نہیں تھا مگر کرنل سمجھ گیا۔

”لیکن یہ اوپر سے بند ہوگا اور اسے کھولنا پڑے گا۔“

”فکر مت کرو میں اسے کھول لوں گا۔“ کرنل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی سادی

بی۔

”شوٹی کیا ہم اس کے ساتھ جائیں گے۔“

”مجبوری ہے، یہاں میں خود سے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ڈیوڈ شاکی مدد سے ہم با آسانی

واپس جا سکتے ہیں۔“

”آپ اس شخص پر بھروسہ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ بیٹو مارا گیا۔“ سادی جذباتی لہجے میں بولی۔ ”کیا ضمانت ہے کہ یہ آپ کے کام آئے گا۔ میں جانتی ہوں وہ آپ کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ اگر میں اور آپ اس کے پاس چلے گئے تو کیا وہ میری مدد سے آپ کو مجبور نہیں کرے گا۔“

بیٹو کی اچانک موت نے مجھ سے جیسے سوچنے بجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی اور میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا کہ اس وقت میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ میں جو سب بیان کر رہا ہوں اگر وہ کیفیت ہوتی تو میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ پاتا۔ سادی نے توجہ دلائی تو مجھے خیال آیا۔ یہ سامنے کی بات تھی۔ اگر میں سادی سمیت ڈیوڈ شا کے پاس پہنچ جاتا تو اس جیسے عیار کے لیے ذرا بھی دشوار نہیں تھا کہ وہ سادی کی مدد سے مجھے بلیک میل کرے۔ یہ نیکوئیں سے نکل کر کھائی میں گرنے والی بات ہوتی۔ مجھے لگا جیسے بیٹو کی موت کے بعد مجھے پہلی بار ہوش آیا ہے۔ میں نے بیٹو کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سرد ماتھے پر پیار کیا۔ میرے آنسو اس کے چہرے پر گرے تھے۔ بیٹو چلا گیا تھا لیکن سادی تھی اور وہ میری ذمہ داری تھی۔ مجھے اپنی پوری توجہ اس ذمہ داری پر دینی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”سادی تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے اپنا سامان اور اگر رقم ہے تو وہ بھی لے لو۔ اگر ہم نے اپنا راستہ الگ کیا تو اس کی ضرورت پڑے گی۔“

سادی نے سر ہلایا اور بولی۔ ”میرے ساتھ چلیں مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔“ میرا بیٹو کچھوڑ کر جانے کو دل نہیں مان رہا تھا اس لیے خود پر جبر کر کے گیا۔ سادی کا کمر صاف ستھرا اور چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی بیلنس کا ایک حصہ ہے جس کا حشر ہو چکا ہے۔ اس نے الماری کھولی اور اس سے اپنے کچھ کپڑے نکال کر ایک چھوٹے ہینڈ کیڑی میں ڈالے۔ پھر اس نے اندر سے رقم کی گندیاں نکالیں۔ یہ بھارتی روپیے تھے۔ ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی چار گندیاں تھیں۔ یہ تین لاکھ کی رقم تھی جو عام حالات میں ہمارے لیے کافی ہوتی۔ سادی نے شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی میں نے پوچھا۔ ”ٹراڈ زر شرٹ ہے تو وہ پہن لو اور پیروں میں جو کر زہوں۔ ہو سکتا ہے بھاگ دوڑ کرنی پڑے۔ اپنی دوائیاں بھی ساتھ رکھنا۔“

”میں نے سب رکھ لی ہیں۔“ اس نے کہا اور بیک کی زپ بند کی۔ میں نے وہ اٹھا لیا۔ سادی نے الماری سے ایک چٹلون اور شرٹ نکالی تو میں باہر نکل آیا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے ایک رائفل اٹھالی تھی۔ مگر کسی نے راستہ نہیں روکا۔ سادی چند منٹ میں باہر آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”شوبی آپ نے کیا سوچا؟“ ”دیکھتی رہو۔“ میں نے کہا اور ہم واپس بڑے کنور والے حصے میں پہنچے۔ کٹرل وہاں آچکا تھا اس نے ہ چینی سے کہا۔

”کہاں چلے گئے تھے ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

”کچھ سامان لینا تھا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیسا سامان؟“

”اس کی دوائیاں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے ہیلی کاپٹر کے لیے کال کر لی؟“

”ہاں اوپر با آسانی بات ہو گئی۔“ اس نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ”ہیلی کاپٹر پانچ منٹ میں آنے

والا ہو گا۔“

”تب چلو اوپر۔“ میں نے کہا اور بیک سادی کو تھما کر بیٹو کو اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ میرا دل ایک بار پھر لرزا۔ آدھے گھنٹے پہلے بیٹو جیتا جاگتا انسان تھا اور اب میں اس کی لاش لے جا رہا تھا۔ کرنل چونکا۔

”اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”یہ میرا ساتھی ہے میں اس کی لاش یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔“ میں نے جتنی لہجہ میں کہا۔ کرنل کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔

”اوکے ہری آپ وقت کم ہے۔ ممکن ہے مقامی پولیس یہاں آنے والی ہو۔“

ہم سیز جیوں سے اوپر آئے۔ سب سے آگے کرنل تھا، اس کے پیچھے سادی اور سب سے پیچھے میں بیٹو کو لیے ہوئے تھا۔ ممکن ہے زندگی میں بیٹو وزنی ہو لیکن اس وقت مجھے کسی بچے کی طرح ہلکا پھلکا سا لگ رہا تھا۔ ہم چھت پر آئے۔ میں نے بیٹو کو ایک طرف نکا دیا۔ کرنل جیمو آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمیں اوپر آنے میں چند منٹ لگے تھے اور اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ کسی نقطے کی طرح نمودار ہوا جو بتدریج بڑا ہوتا گیا۔ کرنل نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ہیلی کاپٹر چھت پر بنے ہیلی پیڈ پر اتر گیا۔ اس کے نیچے گردش کر رہے تھے۔ انجن کی آواز دھیمی ہوئی تھی لیکن وہ بند نہیں ہوا تھا۔ کرنل نے ہمیں اشارہ کیا اور چلا کر بولا۔ ”جلدی کرو۔“

میں نے سادی کو سہارا دیا اور ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے اندر بٹھایا۔ پھر میں نے سڑک کرنل کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹو کو اٹھا کر لائے۔ اسے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام اسے کہوں گا۔ اس لیے وہ جھجکا اور پھر بادل تا خواستہ بیٹو کی طرف بڑھا اس نے بیٹو کو اٹھا کر شانے پر ڈالا اور ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ جیسے ہی اس نے بیٹو کو اندر لٹایا میں نے عقب سے اس کی گدی پر پستول کا دستہ مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور دوسری ضرب پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس دوران میں سادی اپنا پستول دونوں پائلٹ پر تان چکی تھی۔ جو میری کارروائی سے چونکے تھے۔ میں نے کرنل کے بیک سے رستی نکال کر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے۔ ہاتھ کس کر باندھے تھے اور پاؤں اس طرح باندھے کہ وہ چھوٹے قدموں سے چل سکتا تھا۔ یہ کام نمٹا کر میں نے اسے ہیلی کاپٹر میں ڈالا۔ پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ دروازہ بند کیا تو شور کسی قدر کم ہوا تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ”اسی نیلے پر چلو جہاں سے آئے ہو۔“

”ہمیں واپس شملہ جانا ہے۔“ پائلٹ بولا۔ وہ مقامی لیکن خوش شکل جوان آدمی تھا اس کا کو پائلٹ سیاہ رو اور بد صورت تھا۔

”لگتا ہے تمہیں جہنم جانا ہے۔“ میں نے اس کے سر سے پستول لگایا تو وہ جلدی سے بولا۔

”اوکے اوکے..... جہاں تم کہو۔“

”ریڈیو بند ہوں اور ہیلی کاپٹر کا کوئی ریڈیائی سسٹم کام نہ کرے۔“

”ریڈیو کام کر رہا ہے باقی سسٹم بند ہیں۔“

”ریڈیو بھی بند کر دو۔“

”اس صورت میں ہم کسی ممکنہ وارننگ سے بے خبر رہیں گے یہ علاقہ حساس ہے چائنا کی سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”ریڈیو بند کر دو۔“ میں نے پھر حکم دیا تو اس نے تعمیل کی تھی۔ اس نے قہر ڈل کھینچا تو انجن کی آواز بدلی اور ہیلی کاپٹر ایک ہلکے سے دھچکے سے بلند ہوا تھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے اور سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ مگر ابھی غروب ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ ہیلی کاپٹر دس منٹ سے بھی پہلے اس نیلے تک پہنچ گیا تھا۔ وہاں ہیلی پیڈ کے لیے بنائے گئے نشانات اور دوسرا سامان جس سے یہ جگہ صاف کی گئی تھی۔ اپنی جگہ موجود تھے۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر نیچے اتارا اور پھر انجن بند کر دیا۔ میں راستے میں کرنل کو چیک کر چکا تھا اس کی نبض سُست لیکن باقاعدہ تھی۔ وہ بے ہوش تھا لیکن اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انجن بند ہونے پر سکون ہو گیا۔ اس کے گردش کرتے پنکھوں کی رفتار سُست ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں پائلٹس سے کہا۔ ”نیچے اترو؟“

”کیوں؟“ چیف پائلٹ نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔

”یہ ہم کو مارنا چاہتا ہے۔“ سیاہ رُڈ کو پائلٹ نے اسے مطلع کیا۔

”احتمالاً نہ باتیں مت کرو..... میں بلاؤ کہ کسی کو نہیں مارتا ہاں اگر تم مرنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ اب

نیچے اترو..... مجھے ایک بات دوبار کہنے کی عادت نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں بٹھالو۔“

وہ دونوں نیچے اتارے تو میں نے کرنل کو کھینچ کر نیچے اتارا اور اس کا بیگ الگ کر دیا پھر اس کی مکمل تلاشی لی تو اس کے پاس سے کئی ہتھیار نکلے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی مسلح تھا۔ اسے مکمل طور پر نہتا کر کے میں نے سادی سے کہا۔ ”اس کی نگرانی کرنا..... میں ذرا ان سے کام لے رہا ہوں۔“

”شوہی ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

”بیو..... کی آخری خواہش پوری کرنے۔“ میں نے کہا اور ایک طرف رکھے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں کلباڑیاں اور آریاں بھی تھیں۔ ایسی قینچیاں جن سے شاخیں کاٹی جاسکتی تھیں۔ کام کی چیز کلباڑیاں تھیں۔ میں نے دو کلباڑیاں اٹھائیں اور پائلٹوں کے پاس آیا۔ کلباڑیاں ان کے سامنے پھینکیں اور ایک طرف گرے بہت پرانے خشک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سے لکڑی کاٹو۔“

”ہم لکڑی کاٹیں؟“ سیاہ رُڈ نے بے یقینی سے کہا۔

”بالکل کاٹو گے اگر مرنا نہیں چاہتے ہو۔“ میں نے رائفل کا رخ ان کی طرف کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے اگر اس دوران میں تم اتنی لکڑی نہیں کاٹ سکتے جتنی ایک چتا کے لیے درکار ہوتی ہے تو میں تم دونوں کو چھلنی کر دوں گا۔“

”ہمیں مار دیا تو اسے تم اڑاؤ گے؟“ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں اسے اڑاؤں گا۔ تم دونوں ابھی تک شروع نہیں ہوئے۔ وقت آدھا منٹ کم ہو گیا ہے۔“

وہ حرکت میں آئے۔ یہ بڑا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ کھوکھلا ہو گیا تھا اور یہ بالکل خشک ہو چکا تھا اس لیے آسانی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے خاصی لکڑی نکال لی تھی۔ اس دوران میں، میں نے سامان سے پانی نکال کر پیا تھا۔ پیاس سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں نے لکڑی کا جائزہ لیا اور انہیں روک کر کئی لکڑی چتا کے انداز میں رکھنے کو کہا۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔ ایک گھنٹے میں وہ ساری لکڑی کاٹ چکے تھے اور ان کا حشر ہو گیا تھا۔ وہ اس مشقت کے عادی نہیں تھے اور پھر یہاں دھوپ بھی تیز تھی۔ وہ ہانپ

رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ یہ لکڑی کافی تھی۔ اس لیے میں نے ان سے کلبازیاں لے لیں۔ میں ہوشیار رہا تھا کیونکہ یہ خطرناک ہتھیار بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ ایک کین میں ہیلی کا پٹر کے ٹینک سے اس کا ایندھن نکالا۔ یہ بہت تیز حرارت پیدا کرتا ہے جو ایک ٹربو جیٹ انجن چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ تقریباً ایک میلن تیل لکڑیوں پر اچھی طرح ڈالا۔

وہ مرحلہ آگیا جس کے بارے میں، میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا۔ مگر مجھے اس سے گزرنا ہی تھا۔ میں ہیلی کا پٹر کی طرف آیا تو سادی نے رونا شروع کر دیا۔ یہاں سنائے میں اس کی آواز عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ سب چھوڑ کر بیٹو کو یہاں سے لے جاؤں اسے آگ کی نذر نہ کروں۔ پھر دل پر جبر کر کے میں ہیلی کا پٹر میں آیا۔ بیٹو کے جسم سے بلٹ پروف اور دوسری چیزیں الگ کیں۔ اس کے جوئے اتارے۔ اب اس کے جسم پر صرف شرٹ اور پتلون تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی چتا تک لایا۔ اس پر لٹا کر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ اس کی شرٹ سامنے سے خون سے بھیگ گئی تھی۔ یہ وہ خون تھا جو جسم میں تھا تو زندگی تھا اور جسم سے نکل گیا تو موت بن گیا۔ اس کے ماتھے پر آخری بوسہ دے کر میں پیچھے ہٹا تو سادی آگے آئی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ جیچیں مار رہی تھی اور میں نے بڑی مشکل سے اسے بیٹو سے الگ کیا۔

”شوبلی..... بیٹو..... بیٹو۔“ وہ کہتے ہوئے اچانک ڈھیلی ہو کر نیچے گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال لیا اور اٹھا کر ہیلی کا پٹر میں لا کر لٹا دیا۔ پھر اپنی آنکھیں صاف کیں اور پائلٹ سے کہا۔

”تمہارے پاس ماچس یا لائٹر ہے۔“

اس نے خاموشی سے لائٹر نکال کر میرے حوالے کیا اور میں چتا تک آیا۔ لائٹر جلا یا تو میرا ہاتھ لرز گیا تھا۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے آگ دکھانا کتنا مشکل کام ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے مردے زمین کے سپرد کرتے ہیں جو سب سے احسن طریقہ ہے۔ کئی بار میرا ہاتھ بڑھتے بڑھتے رکا۔ پھر میں نے ہمت کر کے لکڑیوں کو آگ دکھا دی۔ ہائی ٹیمپنگ آئل کی وجہ سے لکڑیوں نے بہت تیزی سے آگ پکڑ لی تھی۔ جب تک میں ذرا پیچھے ہوا آگ نے لکڑیوں اور بیٹو کے بے جان وجود کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔ میں نے چتا کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا لیکن جب آگ نے بیٹو کے جسم کو چاٹنا شروع کیا تو اس کی بو خود مجھ تک آگئی تھی۔ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا اس لیے میں کرنل کے پاس آیا وہ کلباز رہا تھا۔ میں نے کچھ پانی اس کے منہ پر اور کچھ منہ میں ڈالا تو اسے ہوش آگیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

”شہباز یہ کیا..... تم نے.....“

”میں واپس ڈیوڈ شا کے پاس نہیں جاؤں گا اور یہ حفظ ماتقدم کے طور پر کیا ہے۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مجبوراً یہ حربہ استعمال کیا۔ ورنہ تم آسانی سے قابو میں نہ آتے۔“

وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ بیٹھا اس نے چتا کی طرف دیکھا۔ ”اوہ ہم وہیں ہیں..... پر یہ.....“

”میرے ساتھی کی چتا ہے اس کی خواہش تھی کہ اس کی چتا کو میں آگ لگاؤں۔“

کرنل کچھ دیر سوچتا رہا۔ ”تو تم واپس نہیں جانا چاہتے۔ یقیناً تم نے سوچ لیا ہو گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“

اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں اگر کچھ کرنا ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔ ہیلی کاپٹر مجھے اور سادی کو کہیں اتار کر تمہیں واپس لے جائے گا۔“

”تمہاری مرضی۔“ اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”ویسے میں تمہیں بتا دوں تم یہاں محفوظ نہیں ہو..... ڈیوڈ شاتہارے لیے بہت آسانیاں مہیا کر سکتا ہے۔ ویسے تم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔“

”میں اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ جیسے ہی سادی واپس پاکستان پہنچے گی۔ میں ڈیوڈ شا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میں اس کی مہم میں شامل ہوں گا لیکن اپنے طریقے سے۔ میں مکمل طور پر اس پر انحصار نہیں کر سکتا۔“

”تم جانتے ہو..... جو کام وہ بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔ تمہارے لیے وہ بہت مشکل ہوگا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”اس کے باوجود میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر اس نے سادی کو اپنے قبضے میں کر لیا تو میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”وہ تم پر بالکل جبر نہیں کرے گا۔“ کرل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھکتے ہوئے بیڑ کی چتا کے دوسری طرف چلا گیا تھا اور اس کی سرخی شعلوں کی سرخی میں گھل مل کر عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ یہ دل و دماغ کو بو جھل کر دینے والا منظر تھا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ ہیلی کاپٹر اسی راہتھستانی راجا کا تھا جس کے ولا میں ڈیوڈ شاتہم تھا اور جہاں پولیس اور ایجنسی نے مل کر چھاپہ مارا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر کو استعمال کیا جائے تو ہم مشرقی پنجاب تک کا طویل سفر بہت کم وقت میں طے کر سکتے تھے۔ وہاں مین عبد اللہ اور وسیم سے رابطہ کر سکتا تھا۔ کرل مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اس نے کہا۔

”یہ بہت خطرناک ہوگا..... یہ ہیلی کاپٹر ہر جگہ پہچانا جائے گا۔“

”کیا خطرناک ہوگا۔“

”یہی کہ تم اسے کہیں دور لے جانے کے لیے استعمال کرو۔“

میں نے ہیلی کاپٹر پر بنے نشانات کا معائنہ کیا یہ پینٹ ہوئے تھے اور اسے آسانی سے خراب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے خنجر کا استعمال کیا مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ پائلٹ نے کہا۔ ”یہ خراب نہیں ہوگا۔“

”تمہارے پاس کہاں تک پرواز کا اجازت نامہ ہے؟“

”پورے انڈیا میں پرواز کر سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”اگر مجھے ہوشیار پور جانا ہو تو؟“

”تقریباً سو کلومیٹرز کا فاصلہ ہے اس میں پون گھنٹہ لگے گا لیکن ہیلی کاپٹر میں اتنی لمبی پرواز کا فیول نہیں ہے۔“

میں نے فیول گج چیک کیا۔ نینک تقریباً ساٹھ فیصد بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کتنی پرواز کے لیے کافی ہوگا؟“

”تقریباً ساٹھ سے ستر کلومیٹرز۔“

مجھے خیال آیا۔ ہمیں اوپر کے بجائے نیچے کی طرف جانا چاہیے۔ جتنا نیچے جائیں گے پاکستان کی سرحد اتنا ہی پاس پڑے گی اور اسے عبور کرنا اتنا ہی کم مشکل ہوگا۔ لاہور اور اس سے اوپر سرحد حساس تھی اور اسے عبور کرنا جان جو حکم کا کام تھا۔ ”اگر ہم لدھیانہ کی طرف جائیں تو.....؟“

”تب بھی اتنا ہی فاصلہ پڑے گا۔“

کرنل نور سے سن رہا تھا مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں اسے بے خبر بھی رکھتا تو جب ہیلی کاپٹر چھوڑتا تو پائلٹ خود کرنل یا اپنے مالک سے رابطہ کر کے اسے بتا دیتا کہ ہم کہاں اترے تھے؟ میں نے فوری فیصلہ کیا۔ ”ٹھیک ہے، ہم لدھیانہ کی طرف جائیں گے۔“

میرا حلیہ نہایت خراب تھا۔ خون مٹی، چہرے پر کئی زخم تھے جو دیکھنے والے کو فوراً متوجہ کرتے۔ میری جیکٹ بھی کئی جگہ سے خون آلود تھی لیکن اس کے اندر موجود شرٹ محفوظ تھی میں نے جیکٹ اتار دی۔ پھر وہاں موجود پانی لے کر چہرہ اور جسم کے دوسرے حصے صاف کیے۔ اس سے میں کسی حد تک صاف ستھرا نظر آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر میں میڈیکل ایڈکس موجود تھا اس کی مدد سے بھی میرا تاثر بہتر ہوا۔ میں نے گیس ماسک پہلے ہی اتار دیا تھا اور اب میرے پاس اپنا اور بیٹو کا ٹائٹ ویشن تھا وہ میں نے سادی کے بیگ میں رکھ دیا۔ میری پتلون کمانڈ و ڈیزائن کی تھی لیکن آج کل ہر دوسرا شخص اسی قسم کی پینٹ پہن کر گھوم رہا ہے۔ میں نے خود کو صاف کرنے اور حلیہ بہتر بنانے میں خود کو مگن کر لیا کیونکہ میں ان شعلوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا جو بیٹو کے جوان جسم کو چاٹ چکے تھے۔ اس بو کو محسوس نہیں کرنا چاہتا تھا جو دھوئیں کے ساتھ فضا میں پھیل رہی تھی۔ لیکن جب میں ساکت ہوا تو مجھے لگا میں خود کو مصروفیت کا دھوکا دے رہا تھا۔ میرا رواں رواں ان شعلوں کی طرف متوجہ تھا۔

اس سے پہلے میں جان نہیں پایا تھا کہ بیٹو میرے لیے کیا ہے۔ مجھے اس کسن لڑکے سے کتنی محبت ہے جس کی ہمت اور بہادری کا میں خود گواہ تھا۔ جو موت سے یوں کھیلتا تھا جیسے وہ اس کا پسندیدہ کھلونا ہو۔ جو مرنے سے کبھی نہیں ڈرا۔ شاید اسی لیے وہ آسانی سے موت کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرا ہم وطن اور ہم مذہب بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے منسلک ہو گیا۔ مجھ پر جان نثار کرنے لگا اور آخر میں اپنی زندگی مجھ پر وار گیا۔ جو گولی راج کنور نے میری جان لینے کے لیے چلائی تھی وہ اس نے اپنے وجود پر روک لی۔ اب اس کا وجود راکھ میں بدل رہا تھا۔ چتا سے ہڈیاں چنچنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرا ضبط ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے بیروں کے بل بیٹھ کر زمین پر ہاتھ رکھ لیا اور خاموش آواز میں رونے لگا۔ اس وقت میں آس پاس سے بھی غافل ہو گیا تھا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ کرنل قید ہے مگر دونوں پائلٹس تو آزاد ہیں۔ وہ مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔

مگر انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید ان میں اتنی انسانیت تھی کہ مجھے اس سوگ میں نہ چھیڑیں۔

ب میرا دل ذرا ہلکا ہوا تو میں اٹھ کر ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ سادی بے ہوش تھی لیکن اس کی نبض تارل تھی۔ یہ بے ہوشی نہیں جسم کا سیلف ڈیفنس تھا جو قدرت نے خاص طور سے خواتین کو عطا کیا ہے۔ ان کا دکھ ہسٹریا کی صورت میں آنکھوں سے بہہ جاتا ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ کرنل مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ”شہباز تم غلطی کر رہے ہو، ایک بار پھر سوچ لو..... تم اکیلے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”میں سوچنے کی مہلت ہی تو چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم کہاں جاؤ گے انڈیا کی سرزمین پر تم کہیں محفوظ نہیں ہو۔“

”میں بہت عرصے یہاں رہا ہوں اور اب تک محفوظ ہی رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور پائلٹس کو اشارہ کیا۔

وہ اپنی سیٹوں پر چلے گئے۔ ”میں تمہیں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں مجھے امید ہے تم خود کو آزاد کرالو گے اور چند گھنٹوں

بعد یوڈشا کے پاس واپس پہنچ جاؤ گے۔ مجھے کوئی نمبر دوس پر میں تم سے یاڈ یوڈشا سے رابطہ کر سکوں۔“

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ایک نمبر ہے لیکن اسے ذہن نشین کرو کہیں لکھنا مت۔“

”بتاؤ میں بھی لکھنے کا قائل نہیں ہوں۔“

اس نے نمبر بتایا جو میں نے تین چار بار دہرایا اور مجھے یاد ہو گیا۔ کرنل نے سمجھ لیا تھا کہ میں اپنی ہی کروں

گا اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔ البتہ جب ہیلی کاپٹر کا انجن اشارت ہوا تو اتنا کہا۔ ”اگر تمہیں مدد کی ضرورت

ہو تو بلا جھجک کال کر لیتا۔“

”یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے سر ہلایا اور پچھلے حصے میں آ گیا۔ میں نے ایک چاقو کرنل کی طرف

پھینکا اور سلائیڈنگ ڈور کھینچ کر بند کر دیا اور سادی کے گرد سیٹ پیلٹ لپیٹ دی۔ ہیلی کاپٹر کا انجن پوری رفتار سے

چلنے لگا اور پھر وہ دھچکے سے اوپر اٹھا۔ میں نے آخری بار بیٹو کی چتا دیکھی جس میں شعلے اب مدہم پڑ گئے تھے۔

انہوں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ بیٹو کی راکھ یہیں رہ گئی تھی۔ وقت کی ہوا اسے منتشر کر دیتی اور اس کا نام و نشان مٹ

جاتا۔ لیکن جب تک میں زندہ رہتا وہ میرے دل میں زندہ رہتا۔ ہیلی کاپٹر نے جنوب مشرق کا رخ کیا تو میں

چونکا تھا۔ اس کے ریڈیو آف تھے اور وہ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے ہیڈ فون مانگا تو

کو پائلٹ نے مجھے ایک ہیڈ فون تمہا دیا۔ میں نے اسے پہن کر پائلٹ سے کہا۔ ”خیال رکھنا ہم زیادہ بلندی پر نہ

جائیں۔“

”ہم اس وقت پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یہ نارمل بلندی ہے میدانی علاقے

میں ہم تین ہزار فٹ کی بلندی پر آ جائیں گے۔“

”جب ایندھن ختم ہونے لگے تو کسی ہائی وے کے پاس رہنا ہم اتریں تو آگے بھی سفر کے لیے کچھ مل

جائے اور تم دونوں کو بھی مشکل نہ ہو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا۔“

میں ساوی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی چھڑکا اور کچھ اس کے منہ میں ٹپکایا۔ وہ ہوش

میں آنے لگی۔ میں نے مزید کوشش نہیں کی وہ خود سے جاگتی تو زیادہ اچھا تھا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں

کھول دیں اور دس منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اب ہوش میں تھی لیکن خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز

رہے تھے جو وقفے وقفے سے رخساروں پر ڈھلک آتے تھے۔ میں نے اس کی طرف پانی کی بوتل بڑھائی۔ اس

نے چند گھونٹ پانی لیا اور بولی۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ کی طرف۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں سے ہم پاکستانی سرحد کی طرف جانے

کی کوشش کریں گے۔“

”یہ آپ نے اچھا کیا۔“ سادی نے سر ہلایا۔ ”ڈیوڈ شانا قابلِ اعتبار شخص ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ہے۔“

”وسیم کی اس طرف سرحد پار آنے جانے والوں سے واقفیت ہے۔ وہ ان لوگوں کی مدد سے ہمیں سرحد پار کر سکتا ہے۔“ پائلٹس کے خیال سے میں نے ہیڈ فون اتار دیا تھا اور ممکن حد تک دھیمی آواز میں بات کر رہے تھے۔

”بیٹو.....؟“ سادی نے کچھ دیر بعد کہا تو میں نے سر آہ بھری۔
”راکھ ہو گیا۔“

سادی پھر روئے لگی تھی مگر اب اس کے رونے میں شدت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا۔ ”سادی مجھے راج اور بڑے کنور کا بھی.....“

”کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا افسوس کرنے کی۔“ اس نے تڑپ کر میری بات کاٹی۔ ”میرا ان خود غرض اور سفاک لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کاش میں جج بیٹو کی بہن ہوتی۔ پلیز آئندہ ان کی بات مت کرے گا۔ میرا ماضی بیٹو ہے اور میرا حال اور مستقبل آپ لوگ ہیں اس کے علاوہ میرا کوئی ماضی نہیں ہے۔“
میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ بس اب تم ہماری ہو۔“
”شوبی ان لوگوں کو کیسے بتائیں گے؟“ سادی کا اشارہ پاکستان والوں کی طرف تھا۔
”پتا نہیں..... لیکن بتانا تو ہو گا۔“

میں نے سارا اسلحہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ نمایاں ہوتا تھا۔ میں نے صرف ایک چھوٹی شات گن اور اس کے کچھ کارتوس سادی کے بیگ میں ڈال لیے تھے اور ایک پستول اور اس کے کچھ اضافی میگزین میری پتلون کی بیلٹ میں لگے ہوئے تھے۔ سادی کی طبیعت ٹھیک لگ رہی تھی ورنہ مجھے خدشہ تھا کہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد یہ فضائی سفر اس کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ میں گزشتہ بیس گھنٹے سے مصروف عمل تھا۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے اور سورج مغربی افق پر جا پہنچا تھا مگر مجھے امید تھی جب تک ہم زمین پر اتریں گے روشنی برقرار رہے گی۔ سادی بھی سولہ سترہ گھنٹے سے بے آرام تھی اور اس دوران میں اسے بہت زیادہ حرکت بھی کرنا پڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سرحد پار کرنے کا مرحلہ بھی آسان نہیں ہو گا۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں کم سے کم ایک رات مکمل آرام کی ضرورت تھی۔

پائلٹ نے پلٹ کر اشارہ کیا تو میں نے ہیڈ فون لگایا۔ اس نے کہا۔ ”ہم لدھیانہ سے تیس کلومیٹر ز دور ہیں اور اب مشکل سے دس منٹ کی پرواز کا ایندھن رہ گیا ہے۔“
”اوکے تم پانچ منٹ میں کوئی ہائی دے تلاش کرو اور اس کے ساتھ ساتھ تین منٹ پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر نیچے اتار لو۔“

”یہ شرط مت لگاؤ اگر اترنے کے لیے مناسب جگہ نہ ملی۔“

”ہائی دے سے مناسب جگہ کون سی ہوگی۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”ناؤ کو۔“

پائلٹ نے سر ہلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ پانچ منٹ بعد ہم ایک بڑی ہائی

وے پر تھے اور اس چھیلین کی ہائی وے پر بے پناہ ٹریفک تھا۔ ان میں بڑے ٹرکس اور بسیں بہت زیادہ تھیں۔ اس ٹریفک میں ہائی وے پر ہیلی کاپٹر اتارنا خود کشی کے مترادف ہوتا اور اس سے بہت زیادہ افراتفری پھیلتی۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ”آس پاس کوئی جگہ دیکھو اور فوری ہیلی کاپٹر اتار لو۔“

اسی لمحے ایک سرخ روشنی جلتے بجھنے لگی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ ایندھن بہت کم رہ گیا ہے۔ میں اور پائلٹ دونوں بے تابی سے اترنے کے قابل کوئی جگہ دیکھ رہے تھے اور جگہ بیک وقت ہم دونوں کو نظر آئی۔ یہ ایک کبڑی کا میدان تھا جس میں دو نیمیں نبرد آزما تھیں۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر میدان کے اوپر لانے لگا۔ کھیلنے والے اپنا کھیل بھول کر ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ ہوئے اور جب وہ نیچے آنے لگا تو سب بھاگے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میدان صاف ہو گیا تھا اور ہیلی کاپٹر آرام سے اس نرم مٹی والے میدان میں اتر گیا۔ پچھلے بے پناہ مٹی اڑا رہے تھے اس لیے میں نے اس وقت تک دروازہ کھولنے سے گریز کیا جب تک پچھلے تقریباً کار نہیں گئے اور مٹی اڑنا ختم نہیں گئی۔ میں نے سادی سے کہا۔ ”تم اس اسٹیٹ کی راجکماری ہو جس کا یہ ہیلی کاپٹر ہے میں تمہارا محافظ اور سیکرٹری ہوں۔“

وہ پچھلے انداز میں مسکرائی۔ ”جو چاہے بنادیں۔“

یہ کوئی گاؤں تھا جس کے ساتھ ہی میدان میں کبڑی ہو رہی تھی اور تقریباً ساٹھ ستر تماشائی بھی تھے۔ اتنے لوگوں سے الجھنا اور بلاوجہ اسلحے کی نمائش یا زور زبردستی مناسب نہیں تھی اس کے مقابلے میں حکمت عملی سے کام لیا جاتا تو یہی لوگ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے۔ میں نے سادی کو اندر رکھنے کو کہا اور خود نیچے اتر آیا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا تاکہ لوگ خود را بجکاری کو دیکھ سکیں۔ ویسے سادی سچ بچ را بجکاری ہی تھی۔ کنور خاندان راجا خاندان تھا اور وہ اب اس کی اکلوتی وارث تھی یا شاید اس کی ایک بہن اور بھی تھی۔ جاگیر دولت اب اسے ملتی یا پھر راج کنور کے بچے وارث ہوتے۔ مگر اس وقت سادی ریاست چتر پور کی راجکماری تھی۔ ہیلی کاپٹر پر ریاست کا نام بھی تھا۔ اترنے سے پہلے میں نے پائلٹس کو خبردار کر دیا کہ وہ کوئی غلط حرکت یا بات کرنے سے گریز کریں جس کا انجام ان کی وفات کی صورت میں نکلے۔ میرے اترتے ہی دو تندو مند سکھ سامنے آئے۔ وہ کبڑی کے کھلاڑی تھے۔

”تو کون اے۔“ ایک نے ہیلی کاپٹر میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ریاست چتر پور کے مہاراجا جگجیت سنگھ کا بیلی کاپٹر ہے۔ فنی خرابی کی وجہ سے ہیلی کاپٹر یہاں اتارنا پڑا۔ تم لوگوں کا کھیل خراب ہوا لیکن معاملہ جان کا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں ریاست کی راجکماری سفر کر رہی ہیں۔“

”تو کون اے؟“ دوسرے سکھ نے بھی وہی سوال کیا۔

”میں پرنسز کا سیکرٹری اور باڈی گارڈ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہمیں یہاں سے آگے جانے کے لیے

کوئی گاڑی مل سکتی ہے؟“

”آگے کہاں؟“

”ہمیں ہوشیار پور جانا ہے۔ وہاں راجا رنبیر سنگھ کے پوتے کی سگائی ہے پرنسز اسی میں شرکت کے لیے

جاری تھیں۔“

راجاؤں کے ذکر سے زیادہ انہیں ہیلی کا پٹر اور اس میں موجود سادی کی جھلک نے متاثر کیا تھا۔ ایک سکھ بولا۔ ”کیوں نہیں سرکار گندیاں بہت..... تسی حکم کرو۔“

”میری خیر ہے پر پرنسز ہر گاڑی میں سفر نہیں کر سکتی ہیں۔“ میں نے تنبیہ کی۔ اس پر وہاں موجود گاؤں کے سرکردہ لوگوں میں مختصر مینگ ہوئی اور طے ہوا کہ فٹیلے کی گڈی پرنسز کے لیے موزوں رہے گی۔ وہ مضبوط بھی تھی اور طویل سفر کر سکتی تھی۔ فیتا سنگھ عرف فہلا وہیں موجود تھا۔ وہ درمیانے قد اور درمیانے جسم کا صورت سے شریف نظر آنے والا شخص تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ فٹاٹ جا کر گاڑی لے آئے کیونکہ راجبھاری کو بہر صورت آج کے دن وہاں پہنچنا ہے اور کل سے شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جائے گا۔ جب تک گاڑی آتی میں نے گاؤں کے معززین کو پابند کر دیا کہ وہ پائلٹس اور ہیلی کا پٹر کی دیکھ بھال کریں گے جب تک مدد نہ آجائے۔ ان سے منٹ کر میں واپس ہیلی کا پٹر میں آیا۔ میں نے پائلٹس سے کہا۔ ”ہم یہاں سے چلے جائیں گے اور ان کو بتایا ہے کہ ہیلی کا پٹر میں فی خرابی ہوئی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد تم ریڈیو پر کسی سے مدد طلب کر سکتے ہو لیکن بہتر ہوگا ہمارے بارے میں کسی کو مت بتاؤ۔ ورنہ ممکن ہے تم پر اپنے آقا کی طرف سے عتاب نازل ہو میری بات سمجھ رہے ہوں؟“

”سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری مہربانی کہ ہمیں مار کر نہیں جا رہے۔“

”میں بلاوجہ کسی کو نہیں مارتا اور ہاں کرٹل کے بارے میں بھی بتا دینا وہ اب تک وہیں پھنسا ہوگا۔“

اس نے صرف سر ہلایا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں گے۔ فہلا دس منٹ میں اپنی گڈی لے آیا۔ میری توقع کے عین مطابق یہ خستہ حال بھارتی ساختہ ٹیکسی تھی لیکن گاؤں والوں کے لیے یہ کسی لکڑی کار سے کم نہیں تھی۔ مگر میں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا کیونکہ اصل مرحلہ یہاں سے جلد از جلد نکل جانے کا تھا۔ میں نے سادی کا بیگ اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا اور وہ بہت نزاکت اور خڑے کے ساتھ آکر ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ راجبھاری کی مکمل اداکاری کر رہی تھی۔ ویسے گاؤں والے حیران تھے کہ راجبھاری اتنے سادہ حلیے میں اور اتنے معمولی سے سامان کے ساتھ تھی۔ میں نے ان کے شکوک رفع کرنے کے لیے بیان جاری کیا کہ راجبھاری فضائی سفر میں ایسا ہی لباس پہنتی ہیں اور ان کا سامان سڑک کے راستے پہلے ہی ہوشیار پور پہنچ چکا ہے۔ ہیلی کا پٹر میں اتنا سامان لے جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس میں تو راجبھاری کے زیورات کے بکس بھی نہیں آتے۔“

ہیلی کا پٹر اترنے کے دس منٹ بعد سورج غروب ہو گیا تھا اور اب مکمل اندھیرا تھا۔ مگر وہاں موجود افراد جانے کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے جب ٹیکسی حرکت میں آئی تو میں نے در سادی نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ کہیں سوال جواب نہ شروع ہو جائیں یا کوئی چتر پر کا واقف کار نہ نکل آئے یا کوئی ہوشیار پور کے مفروضہ راجا کی ہسٹری سے واقف ہو جس کی الف بے سے بھی تم تا واقف تھے تو معاملہ خراب ہو جاتا اور پھر بات وہیں طاقت کے استعمال تک آ جاتی جس سے آگے مزید زبائیاں پیدا ہوتیں۔ میں فٹیلے کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جس کی زبان ٹیکسی کے انجن کے ساتھ ہی حرکت میں آگئی تھی۔ وہ پہلے تو ہمیں اپنی خاندانی تاریخ سناتا رہا، اگر ہم بیٹو کے صدے میں نہ ہوتے تو بہت ہنستے مگر ہمارے دل پر مسکراہٹ تک نہیں آئی۔ ہائی وے تک آنے پر میں نے اسے خبردار کیا کہ پرنسز خاموشی پسند ہیں اور اپنے

آس پاس بلا ضرورت شور پسند نہیں کرتی ہیں۔ اس پر وہ خاموش ہوا تھا۔

ہم ہائی وے پر الٹی سمت گئے تھے۔ بہ ظاہر ہمارا رخ واپس شملہ کی طرف تھا لیکن کچھ دیر بعد ٹیکسی ایک ذیلی ہائی وے پر مڑی جو ہوشیار پور کی طرف جارہی تھی۔ میں نے فیتلے سے معلومات حاصل کیں اور ان کے مطابق پچھلی ہائی وے لدھیانہ کی طرف جارہی تھی۔ دیگر معلومات میں نے یہ حاصل کی کہ راستے میں کوئی پولیس چوکی اور چیک پوسٹ آتی ہے یا نہیں۔ اس نے انکشاف کے انداز میں گالی دے کر کہا۔ ”کوئی جگہ ان..... سے خالی ہے۔ ہر جگہ کھانچے کے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔“

میں نے اچانک کہا۔ ”واپس چلو.....“

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”واپس..... کیا گاؤں چلوں؟“

”نہیں..... اب ہم لدھیانہ جائیں گے وہاں راجا صاحب کی ایک کوٹھی ہے۔“

”تو پہلے بتانا تھا جی وہیں چلتے۔“ اس نے کہا۔

”پرنسز نے ابھی ارادہ کیا ہے پہلے تم کو کہاں سے بتاتا۔“

”انہوں نے کب کہا ہے جی؟“ وہ پھر حیران ہوا۔

”ابھی..... ہم تابعدار خادم ہیں آنکھ کا اشارہ سمجھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد آنے والے اولین

کٹ سے اس نے ٹیکسی واپس موڑ لی۔ بیس منٹ بعد ہم اس کے گاؤں کے پاس سے گزرے تھے یہلی کا پڑا اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایک دو گھنٹے میں ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ یہاں سے پرواز کر جائیں گے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چیک پوسٹ کے پاس سے گزرے تھے لیکن وہاں موجود پولیس نے ہمیں روکا نہیں۔ وہ صرف بسوں اور ٹرکوں کو روک رہے تھے۔ کیونکہ اسی سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ گاڑیوں کو روکنے سے بعض اوقات لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ انڈیا میں دولت مند اور اونچے طبقے کے لوگ بھی ٹیکسیوں یا عام سی گاڑیوں میں سفر کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔ فیتلے نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ ہائی وے پچانوے تھی۔ ہم چند ہی گڑھ کی طرف جاتے ہوئے ہوشیار پور کی طرف مڑے تھے۔ وہ ہائی وے آگئیں تھی۔

میں اس کی گفتگو ذہن نشین کر رہا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ ہائی وے پچانوے ہی موگا سے آگے فیروز پور کی طرف جاتی تھی اور یہی ہائی وے آگے جا کر پاکستان میں داخل ہونے کے بعد فیروز پور روڈ بن جاتی تھی جو قصور سے ہوتی لاہور تک چلی جاتی تھی۔ فیروز پور مشرقی پنجاب میں اہم ترین شہر تھا کیونکہ اس کے پاس ہی ستلج کا ہیڈ روک تھا اور ریڈ کلف نامی بددیانت شخص نے اسے فراخ دلی سے انڈیا کو بخش دیا تھا حالانکہ یہ آبادی اور اہمیت کے لحاظ سے پاکستان کا فطری حصہ تھا۔ اسے انڈیا کو دینے کا مقصد پاکستان کو ستلج کے پانی سے محروم کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا کنٹرول سنبھالنے ہی انڈیا نے پانی بند کر دیا۔ ایک نام نہاد معاہدے کے ذریعے انڈیا کو تین مشرقی دریا بخش دیئے گئے حالانکہ وہ سارے کے سارے کشمیر سے آتے ہیں اور کشمیر ہمارا حصہ ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی اس فراخ دلی کا انڈیا کے ہوشیار حکمرانوں نے یہ جواب دیا کہ اب وہ باقی تین دریاؤں پر بھی دھڑا دھڑا ایم بنا رہے ہیں اور مستقبل میں وہ ہمارا پانی مکمل طور پر بند کرنے کی پوری تیاری کر رہے ہیں۔

فیروز پور کا نام سن کر یہ ساری باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں۔ ٹیکسی والے نے پتا پوچھا تو میں چونکا اور

اس سے کہا۔ ”فی الحال ہمیں کسی اچھے شاپنگ سینٹر پر اتار دو..... پرنسز نے کچھ لینا ہے ہم وہاں سے پیس جائیں گے۔“

فتیلے کے چہرے پر ہلکے آہستہ مردہ جرات نہیں کر سکا کہ ہیلی کاپٹر سے اترنے والوں پر کسی قسم کا شک کر سکے۔ اگر ہم وہ نہیں تھے جو ظاہر کر رہے تھے تب بھی اس کی اوقات سے بہت اوپر کی چیز تھے اس لیے اس نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ اس نے ہمیں لدھیانہ شہر کی سول لائن کے پاس بازار میں اتارا اس میں کئی جدید شاپنگ سینٹر تھے۔ یہ بڑا شہر نہیں ہے مشکل سے چند کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس شہر نے تقسیم سے پہلے بے شمار شاعر اور عالم پیدا کیے۔ نیچے اترنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میری جیب تو خالی تھی۔ میں نے بیگ کھولا اور اس میں سے ایک پانچ سو دالی گڈی سے ایک نوٹ نکال کر فتیلے کے حوالے کیا۔ اس کے چہرے پر جو خوشی دکھائی دی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”اب جاؤ۔“ وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔



میں سادی کے ہمراہ پہلے ایک ریسٹوران کی طرف بڑھا۔ ہم دونوں کا تھکن اور بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ ریسٹوران میں کھانے کا آرڈر کر کے ہم نے باری باری خود کو اس کے واش روم میں فریش کیا۔ میڈلنی علاقے میں گرمی بے پناہ تھی اور اے سی میں آکر سکون ملا تھا۔ سادی کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوج رہی تھیں۔ منہ دھو کر اس کا چہرہ بہتر ہوا تھا۔ کھانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے میں نے اس کے لیے چائے اور اپنے لیے کافی کے ساتھ اسٹیکس کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے ڈنر کے وقت ان چیزوں کے آرڈر پر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ کہانیاں اور خاموشی سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سادی نے پوچھا۔ ”اب ہم کیا کریں گے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ رات یہاں رک کر ہم صبح کہیں اور جائیں گے اور پھر دوسم اور دوسروں سے رابطہ کریں گے۔“

دوسم کے نام پر اس کا چہرے پر رنگ آیا تھا اس نے لجاجت سے کہا۔ ”شوٹی کیا آج رابطہ نہیں کر سکتے؟“

”آج۔“ میں نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”کوشش کر سکتے ہیں۔“

لیپ ٹاپ اور اس کے ساتھ دوسرا سامان نہ جانے کہاں گیا تھا مگر مجھے موبائل کے مقابلے میں انٹرنیٹ سے رابطہ محفوظ لگا تھا۔ چائے اور کافی کے ساتھ ہلکی پھلکی چیزوں نے ہمیں کسی قدر تازہ دم کر دیا تھا۔ ریسٹوران سے نکل کر ایک شاپنگ سینٹر میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنے لیے پینٹ اور ڈریس شرٹ کے جوڑے لیے۔ بنیان اور موزے لیے۔ جوتے مجھے اسی اسٹور میں مل گئے تھے۔ سادی کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے ایسی چیزوں کی خریداری کی جن سے ہمارا حلیہ مختلف نظر آتا۔ میرے لیے اس نے سن گلاس اور سادہ شیٹوں والے فریم لیے۔ ایک پی کیپ تھی۔ اپنے لیے اس نے فیشن بھیل قم کے دو ہیٹ لیے تھے۔ ٹرائی روم میں، ہمیں نے لباس تبدیل کیا۔ اتارا جانے والا لباس میں نے باہر نکل ایک ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ میرا اضافی جوڑا اور دوسرا سامان سادی کے بیگ میں آگیا تھا اس کے لیے ہمیں الگ سے کوئی بیگ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

وہیں سے میں نے معلوم کیا تو اسی بازار میں ایک شاپ کا ہٹا چلا جہاں مجھے کمپیوٹر اور اسی قسم کا دوسرا سامان مل سکتا تھا۔

انڈیا کے ایک چھوٹے سے شہر میں بھی کمپیوٹر اور دوسرے سامان کی ایسی جدید شاپ موجود تھی جہاں سب کچھ دستیاب تھا۔ میں اندر داخل ہوا تھا کہ میری نظر ایک ڈسپلے میں سجے ہوئی اسکرین والے ٹیب کمپیوٹرز پر پڑ گئی۔ یہ اس وقت نئے آئے تھے اور تیزی سے مقبول ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ کمپیوٹر کے بجائے ٹیب کیوں نہ لے لوں۔ میں نے شاپ کےپر کو بتایا کہ مجھے ایسا ٹیب چاہیے جس میں انٹرنیٹ کے لیے الگ سے کچھ لگانا نہ پڑے۔ اس نے فوراً ایک ٹیب نکال کر میرے سامنے رکھا۔ ”سریہ انٹرنیٹ ریڈی ہے اس میں بلٹن ہے۔ صرف کنکشن آن کرانا پڑے گا۔“

”کنکشن کیسے آن ہوگا؟“

”سر آپ انٹرنیٹ پرووائڈر سے.....“

”سوری میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کیا یہ کام آپ نہیں کر سکتے۔ میں ادائیگی کروں گا۔“

”کیوں نہیں سر۔“ اس نوجوان سکھ نے خوشدلی سے کہا۔ ”انٹرنیٹ سمیت یہ آپ کو پینتیس ہزار میں پڑے گا۔ اس میں تین مہینے کا انٹرنیٹ بھی شامل ہوگا۔“

”ٹھیک ہے تم اسے الیکٹروکارڈ اور اس دوران میں ذرا اس کا استعمال سمجھا دو۔“

”مجھے آتا ہے۔“ سادی نے مداخلت کی۔ ”مافی کے پاس ہے اس نے سکھایا تھا۔“

”بس تو تم انٹرنیٹ آن کرادو۔“

”آپ بیٹھیں میں یہ کام کراتا ہوں۔“ اس نے سامنے لگی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ پندرہ منٹ میں اس نے انٹرنیٹ آن کر کے ہمیں چیک کرایا اور بولا۔ ”اسے کراس دی انڈیا کہیں بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے سگنل ہر جگہ ملیں گے۔ اس میں ڈبل کیمرہ ہے فرنٹ کیمرے سے اسکا پپر ویڈیو کال کی جاسکتی ہے۔“

”بیٹری ٹائمنگ کتنی ہے؟“

”نارمل یوز پر چار سے چھ گھنٹے اور آڈیو ویڈیو پر تین سے چار گھنٹے۔ یہ ہر طرح کی ویڈیو پلے بیک کر سکتا ہے۔“

اس نے کر کے دکھایا۔ اس کے ساتھ چارجر، ہینڈ فری اور کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ سادی کی قدر پُر جوش ہو گئی تھی۔ باہر آ کر اس نے کہا۔ ”اب ہم وہاں بات کر سکتے ہیں۔“

”ہاں لیکن اس کے لیے ہمیں کسی جگہ کی ضرورت ہوگی جہاں ہم کسی کی نظر اور کان میں آئے بغیر پاکستان رابطہ کر سکیں۔“ میں نے کہا اور ایک ٹیکسی والے کو روکا۔ اندر بیٹھ کر میں نے اس سے کسی ایسے ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا جہاں کھانے کے ساتھ ساتھ رکنے کا انتظام بھی ہو۔ ٹیکسی والے نے جس معنی خیز سے نظروں سے سادی کو دیکھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ٹیکسی والے نے کیا سوچا ہے مگر ہماری بلا سے وہ جو چاہے سوچتا رہے۔ اس نے ایک ذرا اچھے درجے کے ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روکی اور جب میں اسے کرایہ دے رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سرجی اگر کوئی کرا چاہیے تو وہاں ساگر سے بات کرنا..... وہ ویڈیو ہے۔“

سادی ڈرا دور تھی وہ نہیں سن سکی ورنہ مزید برا مانتی۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی۔ ہوٹل والے اس کے بغیر کرا نہیں دیتے۔ ایسے میں ٹیکسی والے کی خراب ذہنیت کام آئی اس نے ہمیں عیاش جوڑا سمجھا اور اپنے جانے والا کا نام دے دیا۔ ساگر ہماری مدد کر سکتا تھا۔ ڈانٹنگ ہال بڑا اور اس وقت بھرا ہوا تھا۔ رات کے دس بجے وہاں مشکل سے کوئی میز خالی نظر آ رہی تھی مگر ایک ہیڈ ویئر نے ہمارے لیے جگہ نکال لی۔ میں نے سی فوڈ کا آرڈر دیا تھا تاکہ حلال حرام کا مسئلہ نہ ہو۔ بھوک ہم دونوں کو نہیں تھی۔ ہم تو یہاں کسی اور مقصد کے تحت آئے تھے۔ جو ویئر آرڈر لینے آیا میں نے اسے آرڈر کے ساتھ ہی ایک پانچ سو کا نوٹ تھا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر آیا تھا کہ اگر میں اسے حکم دیتا کہ اپنے باپ کو قتل کر دو تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتا۔ آرڈر ری پلٹس کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ ”سر کوئی خدمت؟“

”ساگر نامی ایک ویئر ہے یہاں؟“

وہ چونکا۔ ”ہے لیکن سر جو کام ساگر کر سکتا ہے وہ میں بھی کر سکتا ہوں۔“

میں نے سوچا اور آہستہ سے کہا۔ ”ہمیں ایک رات کے لیے کرا چاہیے۔ بغیر کسی لکھا پڑھی کے..... تم سمجھ رہے ہو نا؟“

ٹیکسی ڈرائیور کی نسبت یہ ویئر نہایت گھاگ اور تجربے کا تھا اس نے نظر اٹھا کر بھی سادی کو نہیں دیکھا اور نہایت نارمل لہجے میں بولا۔ ”کیوں نہیں سر..... بالکل مل سکتا ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہ ہو..... نہ ابھی..... نہ رات میں اور نہ صبح۔“ میں نے کسی قدر بد لے لہجے میں کہا۔ ”میں مسئلے پسند نہیں کرتا ہوں ان کا فوری حل نکال لیتا ہوں۔ اس میں مجھے صرف مالی نقصان ہوتا ہے لیکن دوسروں کا نقصان اس سے آگے کا ہوتا ہے۔“

اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ ”سر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا..... میں گارنٹی دیتا ہوں۔“

”اس صورت میں تمہاری توقع سے زیادہ ملے گا۔“

”آپ آرام سے ڈنر کریں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کوشش کریں کم سے کم دو گھنٹے یہاں رکیں تاکہ آپ کو باہر کہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔“

اس کے جانے کے بعد ہم نے ڈنر شروع کیا۔ سادی کم کھا رہی تھی مگر میں نے اصرار کیا۔ ”سادی کھاؤ..... ہمیں آنے والے وقت کے لیے توانائی کی ضرورت ہے۔ یہ سوچ کر کھاؤ..... ویسے بھی ہمیں یہاں دو گھنٹے گزارنے ہیں۔“

ہم نے بہت سکون سے ڈنر کیا۔ سب کھایا اس کے بعد میں نے اپنے لیے کافی اور سادی کے لیے اورنج جوس منگوایا۔ اسے دوایاں لینی تھیں۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجے تھے اور آرام دے نشست پر بھی سادی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ویئر کے لیے اشارہ کیا تو وہی ویئر نمودار ہوا۔ اس نے لاجبت سے کہا۔ ”سر پلزز..... صرف پندرہ منٹ اور..... ٹائٹ شفٹ چیلنج ہو رہی ہے۔ اس میں اپنا آدی آئے گا اور وہ کوئی مسئلہ نہیں ہونے دے گا۔“

مجبوراً ہمیں مزید بیٹھنا پڑا اور اس کے لیے مجھے ایک کافی اور پینا پڑی تھی۔ خدا خدا کر کے ویئر گیارہ

پچاس پرواپس آیا۔ اس نے بل میرے سامنے رکھا اور میں نے اسے دیکھ کر رقم بل کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ آئیے سر۔“

وہ پھرتی سے چند قدم آگے چلا گیا اور ہم اٹھ کر یوں لابی کی طرف آئے جیسے ہوٹل سے جا رہے ہوں۔ ویٹر لابی میں ایک کونے میں دکھائی دیا اور اس نے ہمیں اشارہ کیا۔ میں سادی کا ہاتھ تمام کر اس طرف بڑھ گیا۔ یہ عام گزرگاہ نہیں تھی۔ سیڑھیوں کی ساخت بتا رہی تھی کہ یہ ہنگامی حالات کے لیے مخصوص تھیں۔ ویٹر ہمیں تیسری منزل پر لایا۔ اتنی سیڑھیاں چڑھ کر سادی کی سانس پھول گئی تھی اور اس کے قدم لڑکھڑاہے تھے۔ مجھے اسے سہارا دینا پڑا تھا۔ تیسری منزل پر ایک سنسان راہداری میں ویٹر نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ ہم اندر آئے اس نے ماسٹر سوئچ دبا یا تو پورا کمر روشن ہو گیا تھا۔ ایک طرف بڑے سائز کا ڈبل بیڈ تھا جس پر قیمتی ویلٹ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک طرف کھڑکی پر بھاری پردے تھے۔ وسط میں فانوس لگا ہوا تھا۔ ایک کونے میں دو عدد ٹو سٹر صوفے تھے۔ دیواروں پر پینٹنگ آویزاں تھیں۔ اس نے انچ ہاتھ کا دروازہ کھول کر دکھایا اور پھر اے سی چلایا۔

”اپوری تھمگ ازاد کے اینڈ فائن۔“

”فائن۔“ میں نے کہا۔ ”ایک رات کا رینٹ کیا ہوگا؟“

”صرف دس ہزار سر۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”ویسے اس کا رینٹ سات ہزار ہے لیکن اس کے لیے

رجسٹر میں نام اور پتا دینا لازمی ہوتا ہے۔ اب آپ سے کوئی نام پتا نہیں پوچھے گا۔“

میں نے پانچ ہزار نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھے۔ ”یہ نصف پیشگی ہے۔“

”سوری سر رینٹ مکمل ایڈوانس ہوتا ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے سوچا اور باقی پانچ ہزار

بھی اسے دے دیئے ساتھ ہی میں نے شرٹ اٹھا کر اسے ہسٹول کی جھلک دکھائی۔

”کوئی گڑبڑ نہ ہو ورنہ۔۔۔۔۔“

اس کا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔“

”گڈ، میں دے کر پیسا واپس لینے کا قائل نہیں ہوں۔“

”سر کسی اور چیز کی ضرورت۔“ اس نے اشارہ کیا۔ ”یہاں سب دستیاب ہے مگر بھی اور غیر ملکی بھی۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے شکریہ۔“ میں کھردرے لہجے میں کہا تو وہ سلام کر کے جانے لگا۔ پھر دروازے

پر رکا۔ ”سر آپ باہر نہیں جائیں گے نہ روم سروں کو کال کریں۔“ لے اور نہ ہی آنے والی کوئی کال ریسپونڈ کریں گے۔

یہاں سے کوئی آواز بھی باہر نہ جائے جس سے آس پاس والے ڈسٹرب ہوں اور سر کمر صبح نو بجے خالی کرنا ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں پہلی بار کسی ایسی جگہ نہیں آیا ہوں۔“ میں نے کہا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ سادی

ایک طرف محبوب سی بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”سوری گڑیا۔۔۔۔۔“

یہ مجبوری ہے۔“

”میں جانتی ہوں شو بی۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”پھر بھی مجھے شرم آرہی ہے۔“

”اے سے بھول جاؤ۔“ میں نے ٹیب نکالتے ہوئے کہا۔ ”تم فریش ہو کر آ جاؤ میں رابطہ کر رہا ہوں۔“

”میں آتی ہوں۔“ وہ بولی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے اسکاپ آں کیا اور سفیر کے نمبر پر کال کی۔ جب تیل جاری تھی تو میرا دل بیٹھے لگا۔ میں کیسے ان لوگوں کو یہ خبر سناؤں گا۔ جب کہ میں نے خود ابھی تک اسے ذہنی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ سفیر نے کال وصول کی اور میری آواز سن کر حسبِ معمول چلایا۔

”ابے ٹو کہاں مر گیا ہے کوئی رابطہ ہی نہیں۔“

”بس یار ابھی فرصت ملی ہے..... مرانہیں کہ مرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔“ میں نے خالی ذہن کے ساتھ کہا۔ جذبات اور احساسات کی ہلکی سی لہر بھی نہیں تھی۔

”بیٹو کہاں ہے تم لوگ سادی کو لے آئے؟“

”بیٹو مر گیا ہے..... ہاں سادی کو لے آیا ہوں۔“ میں نے اسی کیفیت میں کہا۔ میرے الفاظ نے سفیر کو شاک دیا تھا۔ وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

”بکواس نہ کرا ایسی ڈھیٹ چیزیں اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتی ہیں۔“

”نہیں یار وہ بہت آسانی سے مر گیا۔“ میرا لہجہ گلوگیر ہونے لگا۔ ”یار سفیر بیٹو مر گیا جیج مر گیا۔“

”نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا۔“ سفیر نے کہا پھر وہ بھی رونے لگا۔ ”یہ تم دونوں کی سازش ہے تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔ میں اسے بہت تنگ کرتا ہوں نا..... شہباز میرے ساتھ حرامی پن مت کر..... میری بیٹو سے بات کر..... وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔“

”سفیر وہ چلا گیا ہے سب کو چھوڑ کر۔“

اسی لمحے سفیر سے موبائل وسیم نے چھین لیا۔ ”شہباز صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں..... بیٹو.....“ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی تھی۔

”ہاں یار۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بچاتے ہوئے اس نے اپنی جان واردی۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی۔“

وسیم بھی رو رہا تھا۔ عبداللہ آگیا اس نے موبائل لیا تو اسے بھی بتانا پڑا تھا۔ پہلے وہ شاک میں رہ گیا تھا۔ پھر اس نے سادی کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ میرے ساتھ ہے..... واش روم گئی ہے۔ ایک منٹ میں اسے بلاتا ہوں۔“

میں نے دروازے پر دستک دی۔ سادی باہر آئی تو اس کا چہرہ پانی سے نہیں آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تم بات کرو میں آتا ہوں۔“

جب تک میں اپنے دل کا بوجھ کم کر کے آیا سادی رو دھو کر خاموش ہو گئی تھی اور اس کی وسیم سے بات بھی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سفیر اور عبداللہ نے بھی وسیم کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ سادی نے ڈیڑھ گھنٹہ ملائی تھی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ بیٹو کا دکھ اپنی جگہ لیکن سادی کو دیکھ کر وسیم کے چہرے پر جو اطمینان آیا تھا وہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ جب تک سادی واپس نہیں آئی وسیم کے دل پر جو بیت ربی تھی وہ وہی جانتا تھا یا پھر سادی جانتی تھی۔ یہ اطمینان ہی ان کی دلی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا سادی نے مجھ سے کہا۔ ”وسیم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

وسیم نے کہا۔ ”سادی نے مجھے مختصر حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔“

”یعنی اب تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟“

”آپ فکر نہ کریں میں خود روانہ ہو رہا ہوں اور اپنے آدمی بھی ساتھ لاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کل صبح مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔ اس وقت تک چھوٹن واضح ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے لمبی بات کرنا مناسب نہیں ہے اور ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ سادی کو آرام کی ضرورت ہے۔ کل صبح بات کریں گے۔“ میں نے کہا اور ٹیب آف کر دیا۔ سادی بستر پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اے سی چلنے کے بعد کمر خشک ہو گیا تھا۔ یہاں دو ہلکے کبل موجود تھے۔ میں نے ایک کبل اور تکیہ اٹھایا۔ ”تم سو جاؤ..... میں نیچے لیٹ رہا ہوں۔“

وہ بے چین ہو گئی۔ ”شوبی نیچے صرف قالین ہے آپ بے آرام ہوں گے۔“

”میں تو کھردری زمین پر سوتا آیا ہوں۔ تم فکر مت کرو قالین دبیز ہے۔ میں کبل بھی بچھا لوں گا۔ تم سو جاؤ۔“ میں نے کہا اور قالین پر تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی سردی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ کبل لیتا۔ سادی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

”شوبی کیا ہم بیٹو کے لیے دعا نہیں کر سکتے؟“

”پتا نہیں۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”ہم ان نبی ﷺ کے اُمتی ہیں جنہوں نے منافقوں کی بخشش کے لیے بھی دعا کی تھی۔ بیٹو منافق تو نہیں تھا۔ ہم اللہ سے مدد مانگ سکتے ہیں آگے وہ مرضی کا مالک ہے کہ بخشے یا نہ بخشے۔“

سادی خاموش ہو گئی پھر اس نے نہیں کہا تھا۔ میں نے دل میں بیٹو کے لیے دعا کی اور سونے کی کوشش کرتے لگا۔ جسم خشہ حال ہو رہا تھا اور دل کی کیفیت اس سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ اس کے باوجود بہت مشکل سے نیند آئی۔ میں شاید دو بجے سویا تھا اور صبح سات بجے آنکھ کھل گئی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور سر میں درد تھا۔ سادی بے خبر سو رہی تھی میں نے اسے سونے دیا اور خود اٹھ کر واش روم میں آیا۔ یہ لگژری قسم کا باتھ روم تھا جس میں باتھ ٹب بھی تھا۔ میں نے اسے گرم پانی سے بھرا۔ اس میں کلون اور جراثیم کش ملا یا اور کپڑے اتار کر اس میں بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں زخم تھے اور کسی قدر ہرے تھے وہاں مرچیں لگی تھیں۔ کچھ دیر میں تکلیف کم ہو گئی اور گرم پانی جسم سے درد کھینچنے لگا تھا۔ میں گردن تک اس میں ڈوب کر لیٹ گیا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نو بجے ہمیں یہاں سے نکلنا تھا اس کے بعد ہم کہیں ناشتہ کرتے اور پھر گھومتے پھرتے رہتے۔ اگر وہیم صبح تک یہاں پہنچ کر ان لوگوں سے رابطہ کر لیتا جو سرد پارکراتے تھے تو ممکن ہے آنے والی رات ہم پاکستان میں ہوتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیں پھر رات گزارنے کے لیے یہ ٹھکانہ تو ملا ہوا تھا۔ نو گھنٹے کا آرام کافی ہوتا۔

میں شاید غنودگی میں چلا گیا تھا اچانک برابر والے کمرے سے ایسی دھمک ہوئی جیسے کوئی دیوار سے ٹکرا رہا ہو۔ ساتھ ہی ہلکی سی نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔ میں چونک گیا۔ شاید برابر والے کمرے میں کوئی جوڑا تھا اور مرد نے معاملات سلجھانے کے لیے بازو کا سہارا لیا تھا۔ دھمک خاصی بلند تھی اور اتنی قوت سے کوئی دیوار سے ٹکرائے تو اس کی وفات کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ مگر جب آواز دوبارہ نہیں سنائی دی تو میں واپس لیٹ گیا۔ پھر مجھے وقت کا خیال آیا۔ برابر سے اپنی رسٹ واج اٹھا کر دیکھی۔ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ میں سوا گھنٹے سے یہاں تھا۔ گرم پانی

نے میل کچیل کے ساتھ درد بھی کھینچ لیا تھا اور میرا جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ باہر نکل کر میں نے کوئیک شاور لیا اور تولیہ سے جسم صاف کر کے کپڑے پہن کر باہر آیا۔ سادی جاگ گئی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر اٹھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”جلدی سے واش روم سے ہواؤ..... ہمیں نوبتجے یہاں سے جانا ہے۔“

”میں ہاتھ بھی لوں گی۔“

”اسی لیے جلدی کا کہہ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ کر بال بنائے۔ مجھے حکیم قاسم کی ددائیاں کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا لیکن ان کی یہ تاثیر اب تک برقرار تھی کہ میرے زخم بہت تیزی سے بھر جاتے ہیں۔ اب بھی معمولی زخم بھر چکے تھے اور بس کھرٹا باقی رہ گیا تھا اور جو گہرے تھے وہ بھی بھرنے کی پوزیشن میں آچکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹیب اور انٹرنیٹ کی سہولت اپنی جگہ لیکن مجھے ایک موبائل کی ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے بہت جلد رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ ایک ریک تھا جس پر مختلف شوپیں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کارٹرل کا بنا ہوا نیڈی بیئر تھا۔ یہ ذرا مختلف چیز تھی میں نے پہلی بار کارٹرل کا بنا ہوا نیڈی بیئر دیکھا تھا۔ اس کا شیشہ کسی قدر گہرے سبز رنگ کا تھا۔ میں نے ایسے ہی اسے اٹھایا تو اس کے نیچے چھپا ہوا تار نظر آیا۔ تار نیڈی بیئر کے اندر جا رہا تھا اور پیچھے یہ دیوار میں غائب ہو رہا تھا۔

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی نائٹ شوپیں تھا اس کے اندر روشنی ہوتی تھی اور یہ رات کی تاریکی میں نظر آتا۔ تاریکی کا ہو سکتا تھا۔ مگر میں جن حالات سے گزر رہا تھا اور جس طرح ہمیں یہ کمر ملا تھا۔ میں مشکوک ہو گیا۔ میں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ یہ وزنی تھا شاید ایک سو اکلودون ہوگا۔ پھر میں نے تار کھینچ کر توڑ دیا اور نیڈی بیئر نیچے گر دیا۔ وہ ٹوٹ گیا اور اس نے اندر چھپی چیز سامنے آگئی۔ یہ چھوٹا سا لیکن جدید ترین کیمرا تھا اور اس کا لینس بتا رہا تھا کہ یہ بہت واضح تصویر یا ویڈیو لے سکتا ہے۔ بات واضح تھی۔ ویٹر اور اس کے ساتھ دوسرے افراد کا پورا گینگ تھا۔ وہ عیاش طبع لوگوں کو یہاں کمرامپیا کرتے تھے اور ان کی شرمناک سرگرمیوں کی تصاویر اور ویڈیو بنا کر پھر انہیں بلیک میل کرتے تھے۔ ظاہر ہے جو ایک رات کے لیے دس ہزار دے سکتے ہوں گے وہ دولت مند ہی ہوں گے۔ اگرچہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ ہم یہاں رات گزارنے آئے تھے اور کچھ دیر میں یہاں سے چلے جاتے۔ اس کے باوجود مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

سادی شاور لے رہی تھی اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا تھا وہ باہر آئی تو نیڈی بیئر دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے کیمرا دکھایا تو اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے اشارے سے منع کیا اور بولا۔ ”تیار ہونا وہ آنے والا ہوگا وہی ہمیں یہاں سے باہر نکالے گا۔“

”میں تیار ہوں۔“ سادی نے جواب دیا اور جو سامان بیگ سے باہر تھا اسے اندر رکھ لیا۔ میں نے کیمرا پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور نیڈی بیئر کے کٹڑے یونہی پڑے رہنے دیے۔ ٹھیک نوبتجے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا۔ ویٹر اندر آیا تھا اور اس نے آتے ہی نیڈی بیئر کے کٹڑے دیکھ لیے۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”یہ..... یہ کیا؟“

”غلطی سے ٹوٹ گیا..... میں اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔“ میں نے سکون سے کہا۔
”مگر اس میں.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”شاید تم اس کی بات کر رہے ہو۔“ اب میں نے اسے کسرا نکال کر دکھایا تو اس کا رہا سہا رنگ بھی اڑ گیا۔ مگر وحشتانی باقی تھی۔
”مجھے کیا معلوم سر۔“

”تمہیں شاید اپنے باپ کا علم نہ ہو لیکن اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور سر کی بھرپور ٹکراس کی ناک پر رسید کی۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے ایک دردناک کراہ نکلی اور اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے پستول نکال کر ناں اس کے منہ میں رکھ دی۔ اس کی آواز حلق میں گھٹ گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”تم لوگ یہاں رات کو رکنے والوں کی ویڈیو بناتے ہو..... یہ کام کہاں ہوتا ہے؟“

اس کی ناک سے خون پھوٹ کر نکلا تھا اور اس کی سفید شرٹ پر گر رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس بار میں نے سر کے بجائے گھونٹے سے کام لیا اور اس کی ناک کا رہا سہا بھی ملے ہو گیا۔ وہ بلبلا رہا تھا مگر اس نے اونچی آواز نکالنے سے گریز کیا۔ یہ اس کا مسئلہ بھی تھا۔ ”اپنی خوب صورت ناک کو تم نے خود چینی بنوایا ہے مگر تم چینی ناک کے ساتھ بہ خوبی زندہ رہ سکتے البتہ میں نے تمہاری گردن تو زدی تو تم سو فیصد مر جاؤ گے۔ اس لیے میرے سوال کا درست جواب دو۔“

وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا اس لیے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اپنے دودانت نکلا کر مان گیا۔ میں نے اسے موقع دیا کہ وہ دواش روم میں جا کر اپنی ناک دھو لے جو سوچ کر اپنے اصل سائز سے دو گنی ہو گئی تھی۔ اس نے منہ نہ کر کہا۔ ”اب اس حلیے کے ساتھ باہر جاؤں گا؟“
”بعد میں وضاحت کر سکتے ہو کہ بیڑھیوں سے گر گئے تھے یا بے خیالی میں دیوار سے ٹکرا گئے تھے۔ اب وقت ضائع مت کرو ورنہ خود ضائع ہو جاؤ گے۔“

بادل نا خواستہ وہ مجھے اور سادی کو لے کر باہر آیا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے کر دوبارہ پتلون کی جیب میں کر لیا تھا اور اسے خبردار کیا کہ میں یہاں سے بھی درست ترین نشانہ لے سکتا ہوں اس لیے وہ خود سے مرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیں اسی فلور کے ایک کمرے میں لایا۔ دستک کے جواب میں ایک شخص نے پوچھ کر دروازہ کھولا اور مجھے ویٹر کے عقب میں دیکھ کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے ویٹر کو اس پر دھکیل کر یہ کوشش ناکام بنادی۔ دونوں نیچے گرے اور ان کے اٹھنے سے پہلے ہم اندر آ گئے تھے۔ وہاں ایک شخص میز پر لگے بڑے ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جس پر مختلف کیمروں کے مناظر آرہے تھے۔ ایک سکھ ایک طرف کھڑا تھا۔ ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھے شخص نے اٹھنے کی کوشش کی اور پستول دیکھ کر واپس بیٹھ گیا۔ ”سب اس طرف دیوار کے ساتھ منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔“

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے ان کی تلاشی لی صرف مانیٹر کے سامنے بیٹھے شخص کے پاس سے ایک گمراری دالا چاقو نکلا تھا۔ باقی سب نہتے تھے۔ سکھ کے پاس کچھ نہیں تھا اور مجھے لگا کہ وہ ان کا ساتھی بھی نہیں تھا۔

جلد اس کی تصدیق ہو گئی جب اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”اوائے مینوں جان دیو..... رب دی سوں جے کدی اتھے آواں۔“

”سردار جی آرام سے۔“ میں نے تلاشی سے فارغ ہو کر کہا اور پھر مانیٹر پر بیٹھے شخص سے پوچھا۔ ”ان کیمروں کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟“

اس نے لرزتے ہاتھوں سے ایک طرف رکھے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ ”سب اس میں ریکارڈ ہوتا ہے۔“

”اور کل رات کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟“

اس نے مجھے جگہ دکھائی جہاں سب ریکارڈ ہو رہا تھا۔ یہ جدید ترین کمپیوٹر تھا جس میں بڑی گنجائش والی ہارڈ ڈسک لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی رائیٹر بھی تھا گویا ان لوگوں نے مکمل بند بست کیا ہوا تھا۔ یہ صرف ان تین افراد کا سیٹ آپ نہیں تھا اس میں یقیناً اس ہوٹل کے اور لوگ بھی ملوث تھے۔ میں نے صرف اپنے کمرے کی ریکارڈنگ چیک کی۔ سادی کی موجودگی میں باقی کمروں کی ریکارڈنگ چیک نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہارڈ ڈسک سے مکمل فولڈر اڑا دیا اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ اسے دوبارہ دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دے کر میں نے کمرے کی تلاشی لی تو ایک دروازے کئی ڈبے سی ڈیز کے لٹکے۔ ان میں ریکارڈ شدہ سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بھری ہوئی تھیں۔ یہ سب میز پر رکھ کر میں نے سکھ سے پوچھا۔

”تم کون ہو اور یہاں کس خوشی میں ہو؟“

”میں ہوشیار سنگھ ہوں جی..... ادھر فیروز پور سے آگے میری زمین ہے۔“

”تم زمیندار ہو..... یہاں کس لیے آئے تھے؟“

”جس کے لیے تم آئے تھے۔“ دروازہ کھولنے والے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ وہ جوان عمر شخص تھا یہ تینوں ہی جوان عمر تھے۔ جواب میں، میں نے عقب سے اس کی گدی پر گھونسا مارا اور آگے سے اس کا منہ دیوار سے لگا۔ اس دوہری ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ نیچے گرا تو مانیٹر والے نے جلدی سے کہا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“

”ابھی تم دیکھ لو گے۔“ میں نے کہا اور سکھ سے پوچھا۔ ”یہاں تمہاری موجودگی کا مقصد پوچھا ہے؟“

”وہ ایک لڑکی مجھے یہاں لائی تھی۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان بھیر کر کہا۔ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

”ٹھیک ہے وہ لڑکی تمہیں یہاں لائی تھی۔“

”وہ ان کی ساتھی تھی۔“ ہوشیار سنگھ نے اس بار رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم نہیں تھا۔“

”یہ کیوں نہیں بتاتا تو نے اسے مار دیا ہے۔“ مانیٹر والا بولا۔ ”تو ہتھیار ہے۔“

مجھے صبح واش روم میں دیوار کے ساتھ دھم کی آواز اور نسوانی چیخ کا خیال آیا۔ ”یہ میرے برابر والے کمرے میں تھا؟“

ویٹرنے سر ہلایا۔ ”اس نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔ اب لاش کا کیا کریں؟“

لاش کا سنتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے جلد از جلد روانگی اختیار کی جائے۔ اس سے پہلے کہ پولیس منظر نامے میں داخل ہو۔ ان میں سے ایک بے ہوش تھا۔ ویٹر کے سر پر میں نے پستول کا دست مارا اور وہ گرا تو بائزر والا چونکا مگر اس سے پہلے وہ صورت حال سمجھتا میں نے اسے بھی بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے گھگیا کر درخواست کی کہ اسے بے ہوش نہ کیا جائے۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔“ میں نے کہا اور ان تینوں کی تلاشی لی۔ ان کے پاس موبائل اور دوسری چیزیں تھیں لیکن میں نے صرف موبائل لیے تھے۔ یہاں موجود بلیک میلنگ اسٹف اور سردار جی کے ہاتھوں ماری جانے والی لڑکی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہاں سردار جی سے دلچسپی ضرور ہو گئی تھی اسی لیے میں نے اس کی تلاشی بھی لی اور اس کا پرس اور موبائل فون نکال لیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈی وی ڈیز کے ساتھ کمپیوٹر کھول کر اس کی ہارڈ ڈسک بھی نکال لی۔ وقت نہیں تھا ورنہ میں انہیں ضائع کر دیتا۔ اب یہ کام یہاں سے نکل کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ ”اگر تم نے فرار کی کوشش کی تو میں یہ دونوں چیزیں پولیس کے حوالے کر دوں گا اور وہ خود تمہیں تلاش کر لے گی۔“

”نن..... نہیں۔“ وہ ہکھلایا۔ ”میں نہیں بھاگوں گا۔“

”اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ میں نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری سنسان تھی۔ درحقیقت یہ پورا فلور ہی سنسان تھا اور شاید اسی قسم کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص تھا۔ ہم تینوں ان ہی سیڑھیوں سے نیچے آئے اور لابی سے ہوتے ہوئے ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوئے۔ اس وقت لابی میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اندر جاتے ہی ہم نے وہابی کی راہ لی اور لابی میں آئے۔ کسی نے نہیں روکا اور ہم آرام سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے ہوشیار سنگھ سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کوئی گاڑی ہے؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ادھر پاس ہی کھڑی ہے۔“

مہندر ا جیب چند سال پرانی تھی اور اس کا ظاہری حلیہ خراب تھا لیکن جب ہوشیار سنگھ نے اس کا انجن اشارت کیا تو وہ ایک سیکنڈ میں اشارت ہو گیا۔ یہ اندر سے بھی آرام دے تھی۔ بھارت میں تیار ہونے والی یہ جیب چلنے میں دیر پا ہوتی ہے اس لیے میں مطمئن تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”پہلے کسی اچھے ریسٹوران چلو جہاں ہم ناشتہ کر سکیں۔“

”میں..... میں بھی چلوں گا؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل..... اب ہم ساتھ ساتھ رہیں گے۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ مجھے تم اچھے لگے ہو اور جو مجھے اچھا لگتا ہے میں اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتا۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔ ”دیکھو تمہاری خاطر میں یہ سارا کچر اٹھا لایا ہوں ورنہ کیا ہوتا پولیس اس میں تمہاری ویڈیو دیکھتی اور سیدھی تمہارے گھر آتی۔“

”تم لے آ۔“ یہ ہو لیکن اب اپنے پاس رکھو گے مجھے بلیک میل کر دو گے۔“ ہوشیار سنگھ نے مردہ لہجے میں کہا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اردو میں بات کر رہا ہوں تو وہ بھی اردو بولنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے کم سے کم کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کی تھی۔

”بالکل بھی نہیں ابھی ناشتے کے بعد ہم کسی مناسب جگہ پہنچ کر انہیں ضائع کریں گے میں یہ کام تمہارے سامنے کروں گا۔“

”واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”بالکل جلد تم دیکھ لو گے، اب چلو۔“

ہوشیار سنگھ نے جیب ایک اعلیٰ درجے کے ریسٹوران کے سامنے روکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ سادی نے سادہ شلوار سوٹ پہن لیا تھا جو پنجاب میں عام پہناوا ہے۔ پینٹ شرٹ اور جوگر میں وہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک سینڈل بھی ساتھ رکھا تھا اور اس سوٹ کے ساتھ وہی پہنے ہوئے تھی۔ سامان ہم نے جیب میں چھوڑ دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کا خیال تھا کہ ناشتہ ہم اس کے خرچ پر کریں گے لیکن بل میں نے دیا۔ ناشتہ کر کے ہم باہر آئے اور جیب میں بیٹھے تو ہوشیار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”اب ہم تمہارے گھر چلیں گے۔“

وہ بدکا۔ ”وہ کیوں جی؟“

”میں نے بتایا تھا کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“ میں نے کہا اور پستول والی جیب پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”اب چلو۔“ اس نے جلدی سے جیب اشارت کر دی۔ پارکنگ سے نکلنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تم نے بولا تھا کہ ان چیزوں کو تباہ کر دو گے۔“

”کیوں نہیں..... جیب کسی ایسی جگہ روکنا جہاں لوگ نہ ہوں۔“

کچھ دیر بعد اس نے جیب ایک میدان کے ساتھ روکی جس میں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ہوشیار سنگھ نے میری ہدایت کے مطابق سوکھی گھاس اور شاخیں جمع کیں اور ان سی ڈیز کے ڈبے اور ہارڈ ڈسک رکھ کر اوپر سے کچھ پیٹرول چھڑکا۔ کیونکہ ماچس یا لائٹ نہیں تھا اس لیے ڈیش بورڈ کا لائٹ نکال کر لگایا تو پیٹرول نے فوراً آگ پکڑ لی تھی۔ سادی جیب میں بیٹھی تھی اور ہم اس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ نے ان چیزوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے لیا۔ اب ہوشیار سنگھ کچھ مطمئن تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مطمئن لگ رہا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پا جی تسی اپنا راستہ لو.....“

”راستے کے بچے۔“ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر آگ کی طرف دھکا دیا اور پستول نکال لیا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو میں اس کچرے کا محتاج ہوں۔ میں تمہیں یہیں گولی مار کر پھینک جاؤں گا اور تمہارے گھر بھی پہنچ جاؤں۔“

وہ آگ کے پاس گرا اور جلدی سے اس سے دور ہو گیا۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ”اوئے ایسا نہ کرنا رے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”بچے ہیں تو ان کی ماں بھی ہوگی۔“

”ہے جی کیوں نہیں ہے ورنہ بچے کہاں سے آتے؟“

”اگر اپنے بچوں کو قیمتمند اور بیوی کو دودھواں نہیں کرنا چاہتے تو شرافت سے چلو۔“

اس بار وہ شرافت سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ لدھیانہ پاکستان کی سرحد سے کوئی اسی کلومیٹر دور ہے۔ اس لحاظ سے ہوشیارنگھ کا گھر بھی اتنا ہی دور ہونا چاہیے تھا کیونکہ فیروز پور سرحد کے بالکل پاس ہے۔ یہ میں نے ٹیب میں گوگل میپ پر دیکھا۔ یہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا لیکن بہترین سڑک اور جیپ کی وجہ سے ایک گھنٹے میں طے ہو گیا۔ یہ کوئی گاؤں نہیں تھا بلکہ فارم ہاؤس تھے۔ ہر فارم ہاؤس میں زمین کے مالک کا گھر بنا ہوا تھا۔ اس لیے سارے گھر الگ الگ تھے۔ یہ چھوٹا سا بنگلہ نما مکان تھا جس کی چھت آرسی لیکن کچھریل اسٹائل کی تھی۔ یہ ایک منزلہ تھا اور کوئی سات مرلے پر پھیلا ہوا تھا۔ سامنے پتھروں سے بنا ہوا خوب صورت پورچ تھا۔ ہارن کی آواز پر اندر سے ایک نو عمر لڑکی نکلی اور اس نے گیٹ کھولا۔ مکان کے چاروں طرف احاطہ تھا اور اس میں گھاس کے لان کے ساتھ پھولدار پودوں کے تختے بھی تھے۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سادی عقبی نشست پر آرام کرتی رہی تھی اور میں سوچتا رہا۔

ہم کوئی بارہ بجے وہاں پہنچے تھے۔ ہوشیارنگھ نے جیپ پورچ میں روکی اور اترنے لگا تو میں نے کہا۔ ”خیال رکھنا کوئی چالاکی دکھا کر اپنے لیے مشکل مت کھڑی کرنا..... ابھی تمہاری بیوی نہیں جانتی ہے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں ایک عورت کی لاش چھوڑ آئے ہو۔ کوئی ہنگامہ ہوا تو وہ جان جائے گی۔“

”میں کچھ نہیں کروں گا میرے باپ۔“ وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔ ”تم کیوں میرے ساتھ چلے آئے ہو؟“

”بس ایسے ہی، ویسے تم فکر مت کرو میں بلیک میل نہیں ہوں ورنہ وہ اسٹف ضائع نہ کرتا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی زندگیاں ان سی ڈیز میں تھیں۔“ میں نے کہا۔ ”ایک دودن تمہارے ساتھ رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ بلکہ تم چاہو تو ہم یہاں رکنے کا معاوضہ بھی دے سکتے ہیں۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے بس تم میری جان چھوڑ دو۔“

”اس کی صرف ایک صورت ہے کہ میرے کہے پر حرف بہ حرف عمل کرو۔“

اس نے سر ہلایا اور نیچے اتر گیا۔ میں اور سادی بھی نیچے آئے تھے۔ اس وقت دھوپ کی شدت ناقابل برداشت تھی۔ جیپ اے سی تھی اس لیے اصل موسم کا باہر آنے پر اندازہ ہوا تھا۔ یہ جولائی آغاز تھا اور اب تک آسمان صاف تھا یعنی بارش نہیں ہوئی تھی۔ ہوشیارنگھ ہمیں اندر لایا۔ آغاز میں ہی پریشانداز میں سجا ہوا ڈرائنگ روم تھا اور یہی بتانے کے لیے کافی تھا کہ ہوشیارنگھ خاصا دولت مند شخص تھا۔ یہ دولت کا بخار ہی تو تھا جسے نکالنے وہ اس ہوٹل تک گیا تھا۔ وہ مونا سنگھ تھا یعنی معمولی سی شیوہی صرف سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جسے اس نے ایک خاص ٹوپی میں پھینا ہوا تھا یہ پگڑی نہیں تھی۔ اس نے نو عمر خادمہ سے کہا۔ ”شیلہ جا کر ٹھنڈا لے آ۔“

شیلہ کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ ”واہ گورو کے واسطے میری بیوی کے سامنے کچھ مت کہنا، وہ مجھے شریف آدمی سمجھتی ہے اسے پتا چل گیا تو مجھے معاف نہیں کرے گی۔“

”ویسے تم اسی قابل ہو لیکن بے فکر ہو ہماری زبان سے کچھ نہیں نکلے گا۔“

”اچھا اب میرا پرس اور موبائل دے دو۔“

میں نے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور جیسے ہی ہوشیارنگھ نے ایک موبائل

نکالا۔ اس پر سفیر کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی تیل پر کال ریسیو کر لی۔ میں نے بلا تمہید کہا۔ ”ہم سرحد کے پاس ہیں..... وسیم کہاں ہے؟“

”وہ اور عبداللہ دو گاڑیوں میں نکلے تھے۔ وہ اس وقت قصور سے آگے گنڈا سنگھ والا روڈ پر فٹو ہی والا تائی علاقے میں زمیندار کمال کھوکھر کے پاس ہیں۔“

”ٹھیک اسے یہ موبائل نمبر دے دو۔ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ پھر میں نے ٹیب نکال کر اس پر مذکورہ پاکستانی علاقہ دیکھا۔ یہ سرحد سے مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھا۔ کچھ دیر میں لوکی ہمارے لیے نمکین لٹی لے آئی جو اس موسم میں بہترین ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ علاقہ کیا کہلاتا ہے؟“

”دھوب محلہ۔“ اس نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔ میں نے ٹیب پر دیکھا تو حیرت انگیز طور پر دونوں جگہوں کو بالکل پاس آیا۔ جیسے فٹو ہی والا سرحد سے ایک کلومیٹر دور تھا اسی طرح دھوب محلہ سرحد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اس سے ذرا آگے فیروز پور کی آبادی تھی۔ یہ سارا علاقہ آباد اور سرسبز و شاداب ہے۔ سادی کو بتایا تو وہ یہ سن کر ہی بڑے جوش ہو گئی تھی کہ وسیم اور عبداللہ ہم سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھے۔ لیکن یہ دنیا کے مشکل ترین دو کلومیٹر تھے۔ کیونکہ درمیان میں وہ لکیر تھی جو آگ و خون سے کھینچی گئی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف فوج اور دوسرے پیرا میٹری دستوں کی موجودگی لازمی تھی۔ وسیم جس کمال کھوکھر کے پاس تھا کیا وہ وہی شخص تھا جس کا وسیم نے ذکر کیا تھا یا پھر وسیم اس کے پاس رکا ہوا تھا۔ میں نے لٹی کا گلاس ختم کیا تھا کہ موبائل نے تیل دی۔ نمبر پاکستان کا تھا اور اجنبی تھا یعنی کوئی جانا پہچانا نمبر نہیں تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”میں بات کر رہا ہوں۔“ وسیم کی آواز آئی۔ ”آپ کہاں ہیں۔“

”گنڈا سنگھ والا روڈ انڈیا میں حسنی والا روڈ بن جاتی ہے۔ تقریباً ایک کلومیٹر دور دھوب محلہ میں ہیں۔“

”یہ تو اچھی خبر ہے کہ آپ بالکل پاس ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”لیکن کراسنگ آسان نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”میں جس کے پاس ٹھہرا ہوں اس کا کہنا ہے آج کل بہت سختی ہو رہی ہے اور چوبیس گھنٹے سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”سادی کے ہوتے ہوئے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”اس کے بجائے میں کوئی اور راستہ تلاش کرنے کو ترجیح دوں گا۔“

”آپ محفوظ ہیں؟“

”فی الحال۔“ میں نے کہا۔ ”ایک زمیندار کے گھر ہیں اور زبردستی کے مہمان ہیں۔“

”وہ خطرناک ہو سکتا ہے؟“

”نہیں وہ قابو میں ہے۔“

”تب ٹھیک ہے آپ یہیں رکیں جب تک میں کوئی محفوظ راستہ نکالتا ہوں۔“ وسیم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ہم جتنی کم بات کرتے اتنا ہی اچھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہوشیار یا اس کے گھر کے کسی فرد کے سامنے بات

نہیں ہوئی۔ ہوشیار تقریباً چالیس برس کا شخص تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے بچے چھوٹے ہوں گے۔ گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اور گھر میں بھی کسی اور مرد کے آثار فی الحال نظر نہیں آئے تھے۔ اگر ہوشیار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا تو اسے قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اگر اس سے زیادہ افراد تھے تو پھر سوچا جاسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہوشیار ایک جوان عورت کے ساتھ اندر آیا اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ بہت حسین عورت تھی۔ اس نے شلوار قمیص کے ساتھ دوپٹہ لیا ہوا تھا اور خود کو مناسب انداز میں ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوشیار نگہ نے تعارف کرایا۔ اس کی بیوی کا نام سومیت تھا۔ اس نے ہمارا نام اجیت اور کوشل بتائے تھے۔ وہ گرم جوشی سے سادی سے ملی۔ اسے گلے لگایا اور سادگی سے بولی۔ ”ہوشیار کہہ رہا ہے آپ بہت اچھے ہیں کچھ دن ادھر مہمان رہیں گے۔“

”ہاں سردار جی سے اتفاقا ملاقات ہو گئی۔“

”اتفاقاً؟“ وہ چونکی۔ ”یہ تو کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کالج کے زمانے سے جانتے ہیں۔“

”وہی کہہ رہا ہوں یہاں اتفاقا ملاقات ہو گئی۔ شاید دس سال بعد، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ میں نے ہوشیار کی طرف دیکھا۔

”ہاں یار.....“ اس نے نارمل انداز میں کہا۔ ”اتنا عرصہ تو ہو گیا ہے۔“

سومیت نے سادی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”آپ کی بیوی بہت پیاری ہے اجیت بھیا۔“

سادی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہوشیار نگہ نے جلدی سے کہا۔ ”ٹو ایسا کر بھر جائی کواندر لے جا۔ آرام سے بٹھا۔“

سومیت سادی کو وہاں سے لے گئی۔ ان کے جاتے ہی ہوشیار نے کہا۔ ”معاف کرنا مجھے تمہارے ناموں کا خیال ہی نہیں رہا تھا اس لیے جو منہ میں آیا بول دیا۔“

”کوئی بات نہیں بلکہ اچھا ہے تم ہمارے بارے میں نہ جانو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟“

”میں، سومیت اور ہمارے تین بچے ہیں، بڑا بیٹا ہے دس سال کا اور اس سے چھوٹی سات اور پانچ سال کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ شیللا ادھر کام کرتی ہے ادھر ہی رہتی ہے۔“

”کوئی مرد ملازم؟“

”کوئی نہیں ہے..... پیچھے زمین پر کام کرنے والے چار آدمیوں کے گھر بنے ہیں۔“

”یہ اچھی بات ہے ہمارے بارے میں کم سے کم لوگوں کو پتا چلے۔ اسی میں تمہارا بھی بھلا ہوگا۔“

وہ ہچکچایا۔ ”مجھے تم لوگ کچھ پُر اسرار سے لگ رہے ہو۔“

”ہم واقعی پُر اسرار ہیں اور ہمارے بارے میں نہ جانتا ہی بہتر ہوگا۔“ میں نے اس کا خدشہ جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہمارے بارے میں جتنا زیادہ منکھوک رہتا کسی بے وقوفی سے اتنا ہی گریز کرتا۔ ”دیے تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں لیکن ایک بار پھر سمجھا دوں۔ اگر تمہارے دماغ میں کوئی الٹا سیدھا خیال ہے یا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے اور تم نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی تو عین ممکن ہے یہاں گرنے والی لاشیں دو سے کہیں زیادہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمیں مہمان بنا کر رکھو اور ہمارے جانے کے بعد ہمیں

بھول جاؤ۔ اگر تم چاہو تو میں اس میز بانی کا معاوضہ بھی دے سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی پیشکش کر چکا ہوں۔“
 ”ایسی بات نہیں ہے۔“ اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ ”بس تم جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔“
 ”میری بھی یہی خواہش ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم زمیندار ہو تم سے ملنے لوگ آتے ہوں گے؟“
 ”بہت کم۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی چاول کی فصل درمیان میں ہے۔ بیوپاری بھی نہیں آرہے۔“
 ”رشتے دار؟“

”وہ امرتسر میں ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تب تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”اصل میں یہ میری بیوی کی زمین ہے۔“ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”وہ میرے سر کی ایک ہی اولاد ہے۔ ساری زمین اسے ملی۔“

”یعنی تمہیں ملی..... تمہاری بیوی خوب صورت عورت ہے اس کے باوجود تم ادھر ادھر منہ مارتے پھر رہے ہو۔“

”وہ کھسیا گیا تھا۔“ میری توجہ جواب میں کہیں جاؤں۔“

”وہاں کیا ہوا تھا؟“

جواب میں وہ چپ رہا تو میں نے کہا۔ ”تم نہ بھی بتاؤ تب بھی کل سب اخباریائی وی میں آجائے گا۔“
 اس نے چور نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”وہ مجھے بلیک میل کر رہی تھی۔ میرا جھگڑا ہوا تو میں نے اسے دھکا دیا تھا اس کا سردیوار سے لگا اور وہ مر گئی۔ میں داہ گورو کی سوں، میں نے صرف اسے دھکا دیا تھا کیونکہ وہ میرا منہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر اس کے ناخنوں کے نشانات آتے تو میں سومیت کو کیا منہ دکھاتا۔ جلدی میں دھکا زور سے لگا اور وہ دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر گئی تھی۔“

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس پر دباؤ ڈالا۔ ”اس کے باوجود یہ قتل ہی کہلائے گا۔“

”میں نے اسے ایک دھکے کے سوا ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔“ ہوشیار کے چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی تھی۔
 ”اگر معاملہ پولیس تک پہنچا تو وہ یہاں بھی آسکتی ہے۔“

”کیسے؟..... کیا تم نے ان کو اپنا پتا بتایا تھا؟“

”نہیں لیکن تمہیں جب اپنا نام اور فیروز پور کا بتا رہا تھا تو وہ بھی سن رہے تھے۔ یہ جگہ کوئی بہت بڑی نہیں ہے اور یہاں دو درجن ہوشیار بھی نہیں ہوں گے۔“

میں مسکرایا تھا۔ ”اگر وہ سب تمہارے جیسے ہیں تو درحقیقت یہاں کوئی ہوشیار نہیں ہے۔“

”میں ہی سب سے ہوشیار ہوں۔“ اس نے تصدیق کی۔ ”اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو باقی سب کے بارے میں۔“

اس کی یہ بات قابل غور تھی اگر لاش والی بات پولیس تک پہنچی اور وہ تینوں پکڑے گئے تو پولیس کو یہاں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہاں ٹی وی کیبل ہے۔“

”بالکل ہے میرے پاس ٹائٹا اسکا ٹی ہے۔“ اس نے کہا اور ایک کونے میں رکھا بڑے سائز کا ایل سی ڈی

ٹی وی ریموٹ سے آن کیا۔ پھر اس نے پنجابی کا ایک مقامی نیوز چینل لگایا۔ ”اگر معاملہ پولیس تک گیا ہے تو لازمی اس پر خبر آئے گی۔“



لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا معاملہ بادیایا گیا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بات پولیس تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ ایک بڑے ہوٹل کی ساکھ کا معاملہ تھا۔ اس لیے خاموش کارروائی کا بھی امکان تھا۔ اس صورت میں پولیس بہر حال تفتیش کرتی اور یہاں آنے کا بھی بہت زیادہ امکان تھا۔ ایک بج رہا تھا کچھ دیر بعد شیلانے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ وہ تقریباً چودہ پندرہ برس کی صحت مند اور مناسب شکل و صورت والی لڑکی تھی۔ میں ہوشیار کے ساتھ ڈرائنگ روم کے ساتھ موجود لانچ میں آیا۔ ڈائنگ ایریا بھی یہی تھا اور اس کے ساتھ بڑا سا کچن تھا۔ سویت نے کھانا خود بنایا تھا اور کیونکہ وہ بھی بھری خور تھے اس لیے یہ خدشہ نہیں تھا کہ کسی ڈش میں کوئی غلط چیز شامل ہوگی۔ کھانے میں مٹر پلاؤ اور روٹی کے ساتھ بھجائی تھی۔ کئی طرح کے اچار اور چٹنیاں بھی تھیں۔ شیلانے کھانا لگا رہی تھی۔ مجھے بچے نظر نہیں آئے میں نے ان کے بارے میں پوچھا تو سویت بولی۔

”بھجائی وہ اپنے دادے کے ہاں گئے ہیں۔ اسکو لی کی چٹنیاں ہیں۔“

یہ بھی اچھا تھا کہ یہاں بچے نہیں تھے ورنہ بچے اندر کی خبریں سب سے زیادہ باہر پہنچاتے ہیں۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر سویت نے کہا۔ ”بھجائی اور بھرجائی آپ آرام کریں آج گرمی بہت ہے شام کو زمین پر چلیں گے۔“

کھانے کے بعد لٹی کے گلاس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔ سادی کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں میں نے اس سے کہا۔ ”تم آرام کرو میں ذرا ہوشیار سے کپ شپ کروں گا۔“

ہوشیار کا خیال تھا کہ میں اس کی جان چھوڑ دوں گا اس لیے میری بات پر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ سادی کھڑی ہو گئی۔ سویت نے ہمارے لیے ایک کرا بھی سیٹ کر دیا تھا۔ میں اور ہوشیار واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ہوشیار نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تم مجھے اپنے سامنے رکھنا چاہتے ہو؟“

”اس کے بجائے تم کہہ سکتے ہو کہ میں پوری طرح ہوشیار رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں پولیس آسکتی ہے اور اس صورت میں مجھے اپنا بچاؤ کرنا ہوگا۔“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تمہیں پولیس سے خطرہ ہے؟“

”میں مطلوب تو نہیں ہوں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر پولیس کے ہاتھ آتا بھی پسند نہیں کروں گا۔ اگر وہ یہاں آئی تو لازمی بات ہے تمہارے ساتھ مجھے بھی لے جائے گی۔“

”اس صورت میں یہاں رکنا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔“ اس نے گویا مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن میں خطرہ مول لینے والا آدمی ہوں۔“

ہوشیار نگہ ہوشیار آدمی تھا۔ وہ عام شخص تھا اس لیے ہنگامی صورت میں بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک عورت ماری گئی تھی اور پھر وہ بلیک میانگ کے چکر میں بھی آ رہا تھا۔ میں اسے دونوں چکروں سے نکال لایا تھا۔ مگر یہ کام میں نے فی سبیل اللہ نہیں کیا تھا، اس میں میرا مفاد تھا۔ مجھے اس سرزمین پر ایک ٹھکانے کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے یہ سرحد کے بالکل پاس تھا اور اب وسم بھی دوسری طرف آ گیا تھا اس لیے ہمارا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ہوشیار یہ بات نہیں جانتا تھا مگر وہ اتنا ضرور سمجھ رہا تھا کہ ہم کسی مقصد سے اس کے پاس ٹھہرے ہیں۔ فی الحال اسے بے خبر رکھنا ضروری تھا۔ اگر وہ جان جاتا کہ میں پاکستانی ہوں تو ممکن ہے اس کی خُب الوطنی کی رگ پھڑک جاتی اور وہ تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر میری بغ کئی پر تل جاتا۔ اس لیے میں اسے دھمکانے کے ساتھ ساتھ نرمی سے بات کر رہا تھا اور اسے یقین دل رہا تھا کہ میں اس کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔ وہ مطمئن نہیں تھا اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ میری طرف سے ٹینشن میں رہے مگر یہ ٹینشن اتنی نہ بڑھے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے پر تل جائے۔

میں نے موبائل کو ڈائریکٹ پر کر لیا تھا۔ باقی دو موبائل آف کر دیئے تھے۔ اگر وسم مجھے کال کرتا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوشیار کو اس کا علم ہو۔ میں نے کہا۔ ”تم اس چکر میں مت پڑو۔۔۔۔۔ اگر پولیس نے تمہیں گرفتار بھی کیا تو تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم سرے اس ہوٹل میں رکے ہی نہیں۔“

”وہاں کئی افراد نے مجھے دیکھا ہے۔“

”تم کھانے پینے کے لیے بھی وہاں جا سکتے ہو۔“

”میں دباؤ برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس نے پریشانی سے کہا۔ ”تم جاننے ہو پولیس کس طرح سے پوچھتی ہے۔“

”انسان پر مشکلیں آتی ہیں اسے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ہاتھ پاؤں جھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں پر میں بزدل آدمی ہوں۔“

”اگر تم بزدل ہوتے تو یہ سب نہیں کرتے آدمی سب سے زیادہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔“

”سو میت سے میری جان جاتی ہے اگر اسے پتا چل گیا تو وہ لات مار کر مجھے یہاں سے نکال دے گی۔“

”یہ سب اس کا ہے؟“

”ہاں اس کا اور اس کے بعد بچوں کا۔“ ہوشیار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں مرتے دم تک ان لوگوں کے لیے بس کام کرتا رہوں گا۔“

”ہر آدمی اپنی بیوی بچوں کے لیے کام کرتا ہے۔ تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ اپنا کام کر رہے ہو، کسی کی نوکری نہیں کر رہے۔ مجھے تو لگتا ہے سو میت نے سب تمہارے ہاتھ میں دیا ہوا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ کہا۔ ”سو میت نے آج تک پلٹ کر حساب نہیں مانگا کہ کتنا کمایا ہے اور کہاں خرچ کیا ہے۔“

”اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اب ان چکروں سے گریز کرو یہ یقیناً تمہاری بیوی بچوں کی دعائیں تھیں جو میں وہاں پہنچ گیا ورنہ اس وقت تم حالات میں ہوتے یا پھر ان سفاک بلیک میلروں کے چنگل میں جو بالآخر تمہارے خون کا آخری قطرہ تک چوس جاتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں وعدہ کرتا ہوں.....“

”عدہ مت کرو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اگر کوئی وعدہ کرتا ہے تو خود سے کرو۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا آرام کر لوں رات سے جاگا ہوا ہوں اور اب سر بھاری ہو رہا ہے۔“

”بالکل آرام کرو مگر کوئی احتیاط نہ حرکت مت کرنا جو تمہارا آرام ہمیشہ کے لیے غارت کر دے۔“

ہوشیار وہاں سے چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو شیلہ کو آواز دے لوں۔ میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ رات چند گھنٹے کی بے خواب نیند نے مجھے کسی حد تک تازہ دم کر دیا تھا۔ زخم بھرنے سے جسمانی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ مجھے ابتدائی مرہم پٹی کے بعد کسی دوا کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے پشت سے سر نکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنے والے کشن مرحلے سے پہلے ہمارے لیے آرام کا یہ وقفہ غنیمت تھا۔ ہم دونوں ہی جسمانی اور ذہنی تھکن کا شکار تھے۔ آدھے گھنٹے بعد موبائل واہیر بیٹ ہوا۔ میں نے سوچا کہ وسم کی کال ہوگی مگر کال مقامی نمبر سے تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے منمناتی آواز آئی۔ ”تم کون ہو یہ موبائل تمہارے پاس کہاں سے آیا۔“

یہ وہی تھا جس کی ناک کو میں نے افسوسناک بنا دیا تھا۔ ”میں وہی ہوں اور یہ موبائل اب میرے پاس رہے گا۔“

اس نے بھڑک کر گالی دی۔ ”تجھے دیکھ لیں گے..... ہسپتال سے بھی تلاش کر لیں گے۔“

”ضرور۔“ میں جیسی آواز میں ہنسا۔ ”مگر تمہیں اس کی زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ جلد میں تم لوگوں سے خود رابطہ کروں گا۔ اب میں تمہارا باپ ہوں۔ وہ تمام اسٹف میرے پاس ہے۔“

وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر اس نے دعویٰ کیا۔ ”ٹو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ ہمارے پاس اس کی کاپیاں ہیں۔“

”ہاں لیکن ایک چیز کی کاپی نہیں ہوگی۔ تمہیں معلوم ہے جب تم تینوں بے ہوش ہوئے تو میں نے کیا کیا تھا؟“ میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”کیا..... کیا تو نے؟“

”وہاں ایک عدد لاش تھی اور میں نے باری باری تم تینوں کے ساتھ اس کی تصویریں لی ہیں۔ تم لوگوں نے وہ لاش یقیناً ٹھکانے لگا دی ہوگی لیکن یہ تصویریں بھی کافی ہیں۔ پولیس خود معلوم کر لے گی کہ لاش کہاں گئی؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس کی آواز لرز نے لگی تھی۔

”سچائی کے ساتھ میں جلد رابطہ کروں گا۔ اس موبائل کو بھول جاؤ اور نمبر بند کرانے کی کوشش مت کرنا ورنہ وہ تصادیر پولیس تک پہنچ جائیں گی۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یہ خیال گفتگو کے دوران میرے ذہن میں آیا تھا۔ مجھے یقین ہے اس کی حالت غیر ہوگئی ہوگی، اس جھوٹ پر کہ میں نے لاش کے ساتھ ان کی تصادیر بنا لی تھیں۔ وہ اس بات پر یقین نہ بھی کرتے تب بھی ان میں اتنی جرأت نہیں رہی ہوگی کہ اپنے موبائل نمبرز بند کراتے۔ یہ موبائل میرے لیے اشد ضروری ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے اسی نمبر پر کال کی دیر نے ہی کال ریسیو کی تھی۔

”اب کیا ہے؟“

”تمیز سے بات کرو۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”لاش کا کیا کیا؟“

”ٹھکانے لگا دی ہے۔“ اس نے کسی قدر حوصلہ کر کے کہا۔ ”اب اسے کوئی تلاش نہیں کر سکتا ہے۔“

”گڈ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ لاش غائب تھی اور پولیس کو اس کے قاتل کی تلاش نہیں تھی یعنی پولیس کا ہوشیار سگھ کے گھر آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے شیل کو آواز دی۔ وہ فوراً آگئی۔ ”جی سرکار۔“

”مجھے کرا دکھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے سادی والے کمرے تک لے آئی۔ دستک کے جواب میں اندر سے سادی نے کہا۔

”آ جاؤ۔“

میں اندر آیا سادی آرام کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے کہ یہ جگہ مل گئی در بدر نہیں بھٹکتا پڑا۔“

”ہاں واقعی اس کا احسان ہے وہ کبھی آزمائش کو ہماری اوقات سے زیادہ نہیں بڑھاتا ہے۔“

”وسیم کی کال آئی؟“

”نہیں۔“ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ سادی جلدی سے بیڈ سے اٹھ گئی۔

”آپ آرام کر لیں..... آپ رات میں بھی کم سوئے تھے۔“

”نہیں کسی کا جاگنا لازمی ہے۔“

”میں جاگوں گی۔“ اس نے کہا۔ ”دو گھنٹے سولی ہوں اتنا کافی ہے۔“

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر آرام کر لوں۔ ”مجھے دو گھنٹے بعد اٹھا دینا۔“ میں نے پستول سادی کے حوالے کیا۔ ”کوئی مسئلہ ہو تو اسے استعمال کرنا۔“

”میں کر لوں گی۔“ وہ اعتماد سے بولی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں سو گیا تھا۔ اس بار بھی نیند بہت گہری اور بے خواب تھی۔ میں اس وقت چونکا جب سادی نے مجھے اٹھایا۔ اس کا پُرسکون چہرہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔

”اٹھ جائیں دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ سو میت نے باہر لان میں چائے کا انتظام کیا ہے۔“
میں منہ پر پانی مار کر باہر آیا۔ پونے سات بجے دھوپ تقریباً ختم ہو گئی تھی اور لان کو پانی دینے سے ایک نم اور خوشگوار سے ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں جدید ترین لان چیزز ایک ماربل ٹاپ میز کے گرد رکھی تھیں۔ شیلہ چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے لوازمات سجا رہی تھی۔ اس میں سموے اور ککلس تھے۔ دونوں چیزیں آلو کی تھیں اس لیے ہم نے بے فکر ہو کر کھائیں۔ چائے بہت اچھی بنی تھی۔ سادی اور سو میت اس دوران میں خاصی بے تکلف ہو گئی تھیں اور انہوں نے ایک طرف اپنی محفل بچائی ہوئی تھی۔ ہوشیار نے چائے کے بعد مجھ سے کہا۔ ”آؤ میں تمہیں اپنا فارم دکھاتا ہوں۔“

فارم بنگلے کے ساتھ ہی تھا۔ ہم عقبی دروازے سے باہر آئے تو دور تک زمین پر چاول کی فصل لگی ہوئی تھی اور ابھی کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ پودے دھنڈے ہو چکے تھے۔ ہماری زمینوں پر بھی چاول لگتے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہاں پودے بہت پاس پاس لگے تھے۔ یعنی فی مربع فٹ زیادہ پودے لگے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انڈیا میں چاول کی فی ایکڑ پیداوار ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ حکومت کسانوں کو کھاد اور بجلی میں سب سڈی دیتی ہے۔ پانی مہیا کرنا حکومت کا کام ہے اور وہ پاکستان کے حصے کا پانی چرا کر تنہا ہی سے یہ فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”ابھی بارشیں شروع نہیں ہوئی ہیں پھر پانی کہاں سے لے رہے ہو؟“
”وہ دیکھ رہے ہو؟“ ہوشیار سنگھ نے مغرب میں دور ہوا میں بلند ہوتے سیاہ دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس وقت نوٹ نہیں کیا تھا۔

”ہاں یہ کیا ہے کوئی بھی کام کر رہی ہے؟“

”نہیں یہ ڈیزل سے چلنے والے میگا ٹیوب دیل ہیں۔“ ہوشیار سنگھ نے انکشاف کیا۔ ”یہاں ڈھلان ہماری طرف ہے۔ اس لیے جب ہم زمین سے پانی نکالتے ہیں تو پاکستان کا پانی ہماری طرف آتا ہے۔ یہ ٹیوب دیل ایک منٹ میں ایک ہزار گیلن پانی زمین سے کھینچتے ہیں اور یہ پانی بہت بڑے پائپوں کی مدد سے یہاں زمینوں پر دیا جاتا ہے۔ پائپوں کی مدد سے یہ پانی سو میل دور تک پہنچایا جاتا ہے۔“

میں دنگ رہ گیا۔ یہ انکشاف تھا۔ کم سے کم میرے لیے تو انکشاف ہی تھا۔ ممکن ہے میرے ملک کے ارباب اختیار واقف ہوں مگر جب انہیں دریاؤں کے پانی کی چوری کی پروا نہیں ہے تو ٹیوب ویلیوں سے پانی چرانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے حکمران ملک و قوم کے مفاد سے کس حد تک لاپرواہ ہو سکتے ہیں۔ یہ شاخ کاٹنے والا کیس نہیں تھا یہ تو جڑ کاٹنے والی بات تھی۔ انڈیا صرف دریاؤں کا پانی نہیں روک رہا تھا بلکہ وہ زیر زمین پانی بھی چرا رہا تھا اور یہ صرف چوری نہیں تھی بلکہ اس کے پس پشت پاکستان سے دشمنی کا جذبہ پوری شدت سے کارفرما تھا۔ جس خشک سالی اور قحط سے ہمارے چند ماہرین زراعت و معاشیات خبردار کر رہے تھے انڈیا اسے جلد از جلد لانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ بین الاقوامی تجارت کے معاہدوں کی مدد سے وہ بہت جلد ہمیں اپنے ساتھ تجارت پر مجبور کر کے ہماری رہی سہی زراعت و صنعت تباہ کر دیتا۔ اس کے بعد اسے کسی جنگ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ میں نے ہوشیار سے کہا۔ ”کیا یہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی نہیں ہے۔“

اس نے کسی قدر تعجب سے مجھے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

مجھے احساس ہوا کہ میں نے پاکستانی بن کر یہ سوال کر دیا تھا اور ہوشیار سنگھ کا تعجب درست تھا کہ میں خود کون سا قانون پسند تھا جو بین الاقوامی قانون کی بات کر رہا تھا۔ ”مطلب یہ کہ اس طرح کسی دوسرے ملک کا پانی حاصل کرنا کیا ٹھیک ہے؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”صحیح غلط تو حکومت جانے..... جب سے یہاں دریا کا بہاؤ کم ہوا ہے حکومت نے پانی دینے کے لیے یہ ٹیوب ویل لگائے ہیں تب سے پانی کی کمی نہیں ہے۔“

میں جتنی بار انڈیا آیا میں نے محسوس کیا کہ یہاں حکومت زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ایک تو اتنی بڑی آبادی کو خوراک بھی بہت زیادہ درکار ہوتی ہے دوسرے انڈیا کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اگر انہیں زراعت میں روزگار نہیں ملے گا تو وہ لازمی شہروں کا رخ کریں گے اور اس سے وہ مسائل جنم لیں گے جس سے آج ہمارا ملک دوچار ہے۔ اس لیے کم سے کم مشرقی پنجاب کی حد تک حکومت نے یہ پالیسی اپنائی ہے کہ کسان کو بجلی اور سڑک مہیا کی ہے۔ وہ اپنی زمین آباد رکھ سکتا ہے اور اپنی پیداوار کو خود منڈی تک پہنچا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشرقی پنجاب خوشحالی میں جنوب کی ان ریاستوں سے آگے ہے جہاں آئی ٹی کی انڈسٹری بین الاقوامی سطح پر کام کر رہی ہے۔ اس کی ایک مثال ہوشیار سنگھ تھا۔ اس کے پاس کل پندرہ ایکڑ زمین تھی اور وہ اس کا ایک ایک انچ استعمال کر رہا تھا۔ جدید زرعی آلات اور بجلی کی وجہ سے اسے صرف چار ملازموں کی مدد درکار تھی۔ اس نے فخر سے بتایا۔

”دس سال سے صرف تین بار میں نے ایک فصل کے لیے زمین چھوڑی ہے اس میں بھی گوار پھلی لگاتا ہوں اس سے زمین پھر زرخیز ہو جاتی ہے اور مجھے اس کا بھی اچھا خاصا مل جاتا ہے۔“

ہوشیار سنگھ بڑھا لکھا تھا اور اس نے حکم زراعت سے کورس بھی کر رکھے تھے اسی لیے وہ کاشت کے جدید طریقے اپنائے ہوئے تھا۔ اس کے پاس بہترین گھر تھا اور دو گاڑیاں تھیں۔ جب وہ اپنے لیے استعمال کرتا تھا جب کہ خاندان کے ساتھ آنے جانے کے لیے اس کے پاس نئے ماڈل کی چھوٹی کار تھی۔ یہ اس نے چند مہینے پہلے لی تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے اس کی زمین کی آخری حد تک چلے گئے۔ یہاں سے وہ میگا ٹیوب ویل دکھائی دے رہے تھے جو زمین سے پانی کھینچ کر آگے بھیج رہے تھے۔ ان کی تعداد کم سے کم بھی درجن تھی اور یہ سرحد سے کچھ فاصلے پر ہر سو گز کے بعد لگے ہوئے تھے۔ ہوشیار سنگھ نے کہا۔ ”یہ بارہ گھنٹے چلتے ہیں۔“

”ان کی تعداد بہت زیادہ ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے جہاں تک دیکھا ہے یہ ہر سو گز بعد اسی طرح لگے ہوئے ہیں۔ انہیں ٹرکوں

سے ڈیزل دیا جاتا ہے۔“

”تم لوگ پانی کا معاوضہ دیتے ہو؟“

”بالکل..... ورنہ یہ ٹیوب ویل کیسے چل سکتے ہیں۔ مگر یہ معاوضہ بہت زیادہ نہیں ہے یوں سمجھ لیں مجھے

مہینے میں تین چار ہزار روپے سے زیادہ نہیں دینا پڑتا ہے۔“

اچانک چٹون کی جیب میں موجود موبائل نے واہریشن دی تو میں نے ہوشیار سنگھ کی طرف دیکھ کر چھوٹی

انگلی فضا میں بلند کی اور نزدیک موجود چند درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ درختوں میں پہنچ کر ہٹا چلا کہ وہ ان ہی کاموں کے لیے مخصوص تھے جس کا بہانہ کر کے میں یہاں آیا تھا۔ اس لیے فضا مہک رہی تھی۔ میں نے موبائل نکالا اس بار دسیم کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کام چل رہا ہے۔“ دسیم نے آواز آئی۔ ”ممکن ہے آج ہو جائے۔“

”کام پکا ہونا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”خطرہ کم سے کم ہو۔“

”میں یہی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ دونوں ٹھیک ہیں؟“

”ہاں یہاں حالات بہتر ہیں۔“

”گڈ میں پھر رابطہ کروں گا۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں موبائل رکھ کر واپس آیا تو ہوشیار اسی جگہ کھڑا تھا۔ لیکن وہ اپنی فصل کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ اس کے ہاتھوں مادی جانے والی عورت کی لاش ان تینوں نے ٹھکانے لگا دی تھی اور یہ کام انہوں نے اپنی گردن بچانے کے لیے کیا تھا۔ میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا اس طرح اس پر سے دباؤ کم ہو جاتا جب تک وہ اس خوف میں رہتا کوئی ایسی حرکت کرنے سے گریز کرتا جس سے معاملہ پولیس کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ اب تک اس کا رد عمل مطمئن کرنے والا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کو اطلاع مل گئی ہوگی کہ میں سادی کو لے کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ انتقاماً مقامی حکام کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ اسے میرے بارے میں علم نہیں تھا کہ میں کہاں تھا؟ ڈیوڈ شا زیادہ سے زیادہ اس بازار تک پہنچ سکتا تھا جہاں قبیلے نے مجھے اور سادی کو اتارا تھا۔ بازار بہت بڑا تھا اور وہاں بے شمار شاہنچ سینٹرز اور دکانیں تھیں جس ہوٹل میں ہم رکے تھے وہ اس جگہ سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں بھی ہماری موجودگی کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ جب تک وہ تینوں پولیس یا ڈیوڈ شا کے ہاتھ نہیں آتے ہماری نشان دہی مشکل تھی۔ اس کے باوجود میں سو فیصد مطمئن نہیں تھا۔ دشمن کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے میں وحشی طور پر مستعد تھا۔ ہم واپس آئے تو سورج ڈوبنے کے بعد رہی سہی روشنی بھی تاریکی میں بدل چکی تھی۔ سومیت نے ہم سے معذرت کی تھی کہ وہ سبزی خور تھے اور کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے اس میں مچھلی بھی شامل تھی ہاں اٹھارے استعمال کرتے تھے اور ڈنر میں اٹھاروں سے بنی ایک ڈش موجود تھی۔ یہ اصل میں اٹھارہ بریانی تھی جو میں نے پہلی بار کھائی تھی۔ وہ لوگ جلدی کھانے کے عادی تھے اس لیے ساڑھے آٹھ بجے میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔

جلد کھانے کے ساتھ وہ جلد سونے کے عادی بھی تھے جیسا کہ گاؤں دیہات کا رواج ہے۔ ان کا گھر شہری سہولتوں سے آراستہ تھا مگر معمولات دیہاتی ہی تھے۔ کھانا کے بعد ہم نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ میری کوشش تھی کہ ہوشیار زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ رہے۔ دس بجے ہم اپنے کمروں میں آ گئے۔ وہ جلدی سو جانے کے عادی تھے میں نے سادی سے کہا۔ ”ہم کمرے میں ہوں گے لیکن کوئی ایک جاگتا رہے گا۔ ابھی تم سو جاؤ میں تمہیں صبح چار بجے جگا دوں گا۔“

سادی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے مختصر شاور لیا اور ایک طرف صوفے پر اپنی جگہ بنائی تھی۔ یہاں سے ہی نہیں تھا اس لیے کبیل کی ضرورت نہیں تھی۔ پٹکھا چل رہا تھا اور اس کی ہوا گرمی اور جس دور کرنے کی کوشش

کر رہی تھی۔ ڈنر کے بعد موسم اچانک جس آلود ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بارش آنے والی تھی۔ مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی آجائے گی۔ بارہ بجے گرج چمک شروع ہوئی اور دس منٹ بعد تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے تھے اندر کی گرمی نکلی اور باہر سے خشک و نم ہوا اندر آئی۔ شدید بارش کا سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے جاری رہا اس کے بعد اس کی شدت میں کمی آگئی۔ مگر گرج چمک کا سلسلہ جاری تھا۔ میں صوفے پر نیم دراز تھا۔ کمرے کی بڑی روشنیاں بند کر کے صرف ایک نیلگوں روشنی والا ٹائٹ لیمپ آن کیا ہوا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ باہر کوئی گاڑی رکی ہے۔ ویسے تو آواز نہیں آئی تھی لیکن انجن بند کرنے سے پہلے اسے ریس دی جاتی ہے تو اس کی آواز آتی تھی۔ میں چونکا ہو گیا اور دروازے تک آیا۔ میں نے باہر جھانکا لیکن لاؤنچ خالی تھا۔ ہوشیار سنگھ کے گھر میں چار بیڈروم تھے اور ان چاروں کے دروازے لاؤنچ میں کھلتے تھے۔ لاؤنچ گھر کے وسط میں تھا۔ مگر لاؤنچ میں کوئی نہیں تھا۔ ہمارا کمرہ پورچ اور گیٹ کی طرف تھا اس لیے میں نے آواز سن لی۔ خاصی دیر تک کوئی اور آہٹ نہیں ہوئی تو میں دروازہ بند کرنے والا تھا کہ اسی لمحے کال بیل بجی۔ بجانے والے نے نہایت بدتمیزی سے بیل بٹن پر انگلی رکھ دی تھی اور تقریباً آدھے منٹ تک مسلسل بجاتا رہا۔ اندر سے ہوشیار پاچا جے اور بنیان میں افراتفری کے ساتھ برآمد ہوا۔ یقیناً میری طرح اس کے ذہن میں بھی خیال آیا ہوگا کہ پولیس آگئی۔ پولیس کی کسی کے گھر آدمی رات کو اسی طرح نازل ہو سکتی تھی۔

میں پلٹا کہ بیگ سے شاٹ گن نکال سکوں تو سادی کو بیدار پایا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں بیگ کی طرف بڑھا تھا کہ باہر سے ہوشیار سنگھ کی حیرت زدہ آواز آئی۔ ”سنگھ بٹو.....؟“

”ہاں بھائی جی..... ایک سال بعد ہی تو دیکھا ہے..... کیا شکل بدل گئی ہے جو پہچان نہیں رہے تھے۔“

”ٹو یہاں کیوں آیا ہے؟“

”ہوشیار یار تو میرا بھائی ہے۔“ سنگھ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ ہوشیار سنگھ سے بالکل مختلف اور صورت سے ہی جرائم پیشہ نظر آنے والا شخص تھا۔ لہجے سے وہ بھی ہوشیار کی طرح پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ ”اپنے بھائی سے ملنے آیا ہوں۔“

”سنگھ تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا تو جانتا ہے سب نے تجھ سے تعلق ختم کر لیا ہے۔ سویت بھی پسند نہیں کرے گی۔“

”بھرجانی کو چھوڑ اپنی بات کر۔“ سنگھ نے کہا۔ ”وہ بے چاری تو اور بھی بہت کچھ پسند نہیں کرے گی جوڑ کر تباہ رہتا ہے۔“

”آہستہ بول۔“ ہوشیار نے برہمی سے کہا۔ ”کیا تو میرا گھر برباد کرنے آیا ہے۔“

”میں تیرا بھائی ہوں، دشمن نہیں..... یہاں سے گزر رہا تھا سو چا ایک رات تیرے پاس رک جاؤں صبح چلا جاؤں گا۔“

”ٹو جیل سے کب آیا؟“

”دو ہفتے پہلے رہا ہوا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اس علاقے میں تو کہاں جا رہا تھا جو یہاں سے گزرا۔“ ہوشیار کے لہجے میں شک تھا۔

”بس جا رہا تھا۔“ سکتیے نے ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں آیا ہے۔ کوئی گڑبڑ تو کر کے نہیں آیا ہے کہ پیچھے سے پولیس بھی آرہی ہو۔“

”ایسا کچھ نہیں بھائی جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے کہا تا بس ایک رات رکوں گا اور پھر ہم اپنی راہ لیں گے۔“

”ہم؟“ ہوشیار کی چوکتی آواز آئی۔ ”اور کون ہے؟“

”میرے دو دوست بھی ہیں۔“ اس نے کہا تو میرے اندر خطرے کی تھنٹی بجنے لگی۔ سکتیے تاج مچ کوئی غلط

کام کر کے یہاں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی اسے برداشت نہیں کرے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی لے آیا تھا۔ یہ بات ہوشیار نے بھی محسوس کر لی۔

”سکتیے میں تجھے نہیں ٹھہرا سکتا اپنے دوستوں کو لے کر اسی وقت نکل جا۔“ ہوشیار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”چل نکل یہاں سے۔“

”اب میں نہیں جاؤں گا۔“ سکتیے نے کہا اور آواز دی۔ ”آ جاؤ یا رو، اپنا ہی گھر ہے۔“

”سکتیے یہ کیا کر رہا ہے ان بد معاشوں کو اندر بلا رہا ہے۔“ ہوشیار نے برہمی سے کہا اور میں مگھری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں کہیں جاؤں اور وہاں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ یہاں بھی مسئلہ آگیا تھا۔ سکتیے کے دونوں آدمی اندر آ گئے اور ہوشیار کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ دونوں آدمی مسلح تھے اور انہوں نے ہمدردیگ اشارہ کئے تھے۔

”بھائی جی یہ بد معاش نہیں ہیں لیکن ضرورت پڑے تو بن جاتے ہیں۔“ سکتیے نے دانت نکال کر کہا۔

”بس ایک رات کی بات ہے صبح ہم چلے جائیں گے۔“

”تم لوگ کوئی واردات کر کے آئے ہو۔“ ہوشیار نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ ”پولیس سے بچنے کے لیے

یہاں آئے ہو۔“

”ہاں، ادھر پولیس سرگرم ہے۔“ ایک آدمی نے زبان کھولی۔ وہ طویل قامت اور دہلی جسامت کا مالک

تھا۔ ”اس وقت ناکے لگائے ہیں صبح تک کھول دیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔“

”کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“ سکتیے بتولا۔ ”مجھے معلوم ہے بچے مانتا پتا کے پاس ہیں۔ ادھر بس بھر جائی ہو

گی۔“

”کچھ مہمان بھی ہیں۔“ ہوشیار نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے کالج کے وقت کا دوست ہے، بیوی کے

ساتھ ادھر آیا ہوا ہے۔“

”اس کی خیر ہے تم بتا دینا کہ بھائی اور اس کے دوست ہیں۔ کوئی سامنے نہیں آئے گا ہم کرے تک رہیں

گے۔“

ان لوگوں کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر ہوشیار نے انکار کیا تو وہ زبردستی پر اتر آئیں گے۔ طویل قامت

کے شانے سے شاٹ گن لگ رہی تھی اور دوسرے نے اپنی توند کے ساتھ پتلون کی دھنسی بیلٹ میں پستول بھی اٹکایا ہوا تھا۔ سنگیتا خالی ہاتھ تھا لیکن لگ رہا تھا کہ اس کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار ہوگا۔ ہوشیار نے محسوس کیا کہ وہ اب انکار کر کے نقصان میں رہے گا۔ مجبوراً اس نے سر ہلایا۔ ”اپنی بات پر قائم رہنا کل صبح یہاں سے چلے جانا۔“

”بھائی جی اندر تو آنے دو۔ ابھی آئے نہیں اور نکالنے کی بات شروع کر دی۔“ سنگیتا آگے بڑھا تو ہوشیار نے روکا۔

”ادھر نہیں یہاں وہ رکے ہیں۔ تم لوگ اس کمرے میں جاؤ۔“

میں نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ کیونکہ اب وہ آگے آتے تو کھلا دروازہ دیکھ سکتے تھے۔ میری توجہ کا مرکز سنگیتے کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں موجود بیک تھے۔ انہوں نے جس طرح اٹھار کھے تھے اس سے ظاہر تھا کہ ان میں خاصا وزن تھا۔ وہ بیگوں میں کپڑے اور ضرورت کا سامان لے کر گھومنے والے لوگ نہیں تھے۔ ان بیگوں میں یقیناً لوٹ کا مال یا ایسی کوئی چیز تھی جس کے لیے پولیس ان کے پیچھے تھی اور علاقے کو باقاعدہ ناکوں سے بند کیا گیا تھا۔ وہ تینوں اس کمرے میں چلے گئے جو ہوشیار نے ان کے لیے کھولا تھا۔ میں پلٹا تو سادی کو پیچھے کھڑے پایا اس نے سر گوشی میں کہا۔ ”شوٹی لگ رہا ہے مصیبت آگئی ہے۔“

”لازمی بات ہے ہم کہیں قدم رنجہ فرمائیں اور وہاں کوئی مصیبت یا آفت نہ آئے یہ ممکن ہی نہیں ہے۔“

”تب کیا کریں پولیس آگئی تو ان کے ساتھ ہمیں بھی سمیٹ کر لے جائے گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ اگر پولیس نے ناکابندی کی ہے تو ان کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں وہ گھروں تک بھی آسکتی ہے۔ یقیناً یہ کوئی ایسا کام کر کے آئے ہیں جس کی وجہ سے پولیس بڑے پیمانے پر حرکت میں آئی ہے۔“

”شوٹی وسم نے رابطہ کیا پھر؟“

”نہیں بس شام کو اس کی کال آئی تھی، تمہیں بتایا تھا۔“ میں واپس صوفے پر دراز ہو گیا۔ ”وہ پوری کوشش کر رہا ہو گا لیکن میں نے اسے بتا دیا ہے کہ جب تک خطرہ صرف دس فیصد تک نہ ہو میں تمہیں لے کر بارڈر کر اس نہیں کر سکتا۔“

”وہ تو جب وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔“ سادی بستر پر بیٹھ گئی۔ ”لیکن شوٹی مجھے لگ رہا ہے یہ لوگ کچھ گڑبڑ کریں گے۔“

”وہ کیسے؟“

”جیسے ہم ان سے چوکننا ہیں اسی طرح وہ بھی ہم سے چوکننا ہوں گے۔ ہوشیار کی بات الگ ہے لیکن اس کا بھائی ہم پر اعتبار نہیں کرے گا۔“

سادی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ صرف ایک رات کے لیے یہاں نہیں آئے تھے۔ جب تک پولیس ان کی تلاش میں ہوتی وہ اسی جگہ رہتے اور یہاں انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہوشیار بہر حال اپنے بھائی کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ یہیں رہتے تو اس کا پورا امکان تھا کہ جلد یا

بدیر ہماری ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوتی۔ وہ تین تھے اور مسلح بھی تھے۔ پھر عادی جرائم پیشہ تھے ان کے لیے کسی پر ہاتھ اٹھانا یا کسی کو مار دینا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں انتظار کرنے کی بجائے پہلے میں ہی کیوں نہ کچھ کر گزروں۔ یہ گھوڑے کے پہلے پھونک مارنے والا کیس بھی ہو سکتا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے اور تب وہ اسلحے کے زور پر ہمیں پرغال بنا لیتے۔ اگر میں پہلے کارروائی کرتا تب بھی خطرہ تھا کہ وہ مزاحمت کریں گے اور یہاں کچھ گولیاں چلیں گی۔ اس صورت میں پولیس کے آنے کا امکان بڑھ جاتا۔ بے شک آس پاس کوئی گھر نہیں تھا لیکن یہ جگہ ویران بھی نہیں تھی۔ بڑی سڑک پاس تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اب کوئی زبردستی اندر نہیں آ سکتا تھا۔



مجھے خود پر اعتماد تھا کہ وہ تینوں میرے لیے مسئلہ نہیں ہوں گے۔ مگر انہیں قابو کر کے رکھنا آسان نہیں تھا اور قتل تو اس مسئلے کا بالکل بھی حل نہیں تھا۔ اس سے دیگر کئی مسائل کھڑے ہو جاتے۔ یہاں ہوشیار کے ملازمین بھی اہل خانہ کے ساتھ رہتے تھے۔ اتنے لوگوں کو خاموش کرانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے جو کرنا تھا خاموشی سے کرنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا سادی دوبارہ لیٹ گئی۔ اسے وقتی تشویش ہوئی تھی ورنہ اسے بھی یقین تھا کہ میں اس چکر سے نمٹ سکتا ہوں۔ وہ غنودگی میں گئی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور وہ جاگ گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ کون ہے؟“

”میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے تک آیا۔ دستک اتنی ہلکی تھی کہ اگر ہم ذہنی طور پر چوکنہ نہ ہوتے تو شاید سنائی بھی نہ دیتی۔ پھر باہر بارش اور بجلی کی گرج چمک کا شور تھا۔ امکان یہی تھا کہ باہر ہوشیار ہوگا اس لیے میں نے ممکن حد تک دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کون؟“

”میں ہوں ہوشیار۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ میں نے گہری سانس لی لیکن مطمئن نہیں ہوا تھا کیونکہ ہوشیار کو گن پوائنٹ پر یہاں لایا جاسکتا تھا۔ میں نے پستول نکال کر ہاتھ پشت پر کیا اور دروازہ کھول دیا۔ ہوشیار بڑی سے اندر آیا۔ سادی نے جلدی سے دو پٹا ٹھیک کیا اور میں نے پوچھا۔

”یہ کیا حرکت ہے تم اس طرح منہ اٹھائے کس خوشی میں اندر آ رہے ہو؟“

”آئی ایم سوری۔“ اس نے دھیمی آواز میں کہا اور پھر بولا۔ ”ہم بڑی مشکل میں پھنس گئے۔“

”ہم سے کیا مراد ہے؟“

”میرا مطلب ہے ہم دونوں۔“ اس نے گھبرا کر کہا کیونکہ میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ ”واہ رو کے لیے آواز دھیمی رکھو وہ نہ سن لیں۔“

”وہ کون؟“

”میرا بھائی اور اس کے ساتھی۔“

”میرا تمہارے بھائی یا اس کے ساتھیوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

ہوشیار نے سوچا اور پھر مجھے پوری بات بتانے کا فیصلہ کیا حالانکہ میں پہلے ہی سب جانتا تھا۔ اس نے کہا ”کیا۔“ ”میرا چھوٹا بھائی ہے نگیت سنگھ..... جوانی میں غلط چکروں میں پڑ گیا۔“

”جیسے تم شادی کے بعد غلط چکروں میں پڑ گئے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم ڈرائنگ روم میں چل کر بات کرتے ہیں۔“

ہوشیار نے سر ہلایا تو میں نے سادی کو اشارہ کیا کہ وہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔ وہ سر ہلاتی ہوئی کھڑی ہوئی تو میں اور ہوشیار باہر نکل آئے اور دبے قدموں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ہوشیار نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے لاک کر دیا اور مجھے ممکنہ حد تک دور والے حصے میں لا کر بولا۔ ”اس نے جرم شروع کر دیئے۔ ایک سال پہلے وہ پکڑا گیا۔ خوش قسمتی سے ایک گواہ مخبر ہو گیا اور اسے صرف چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ وہ چھوٹ آیا اور اب یہاں ہے۔“

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ میں نے انجان بن کر کہا۔

”مجھے شبہ ہے جی کہ وہ اور اس کے دوستاچی کہیں کوئی واردات کر کے آئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے اور علاقے کی ناکابندی کر رہی ہے۔“

”ہاں اب میرا مسئلہ بھی بن رہا ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تمہارا مسئلہ تو ہے ہی۔“

”وہ کہہ رہا ہے کہ صبح چلا جائے گا لیکن مجھے یقین ہے وہ یہاں جم کر بیٹھ جائے گا۔“

”سامنے کی بات ہے پولیس اتنی جلدی اپنی تلاش ختم نہیں کرے گی اور یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

”ابھی تو میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم میرے دوست ہو۔“

”سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہاں رکے اور پولیس انہیں تلاش کرتی آگئی تو وہ اتنی شرافت سے خود کو پولیس

کے حوالے نہیں کریں گے۔“ میں نے ہوشیار کو قائل کرنا شروع کر دیا۔ ”یہ گولیاں چلائیں گے اور مارا ماری ہو

گی۔ ممکن ہے پولیس سے بچنے کے لیے یہ تمہیں اور ہمیں پرغمال بنالیں۔“

درحقیقت وہ پہلے ہی قائل تھا اور جو باتیں میرے ذہن میں تھیں وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اسی لیے تو وہ

میرے پاس آیا تھا۔ وہ متفکر ہو گیا۔ ”یہ تو ہے۔“

”یہ مقابلہ کریں گے اور گولیاں چلائیں گے تو جواب میں پولیس پھول تو نہیں مارے گی اور گولیاں

سامنے آنے والے کو نہیں دیکھتی ہیں۔ ہم بھی مارے جا سکتے ہیں۔“

”یہ بھی ہے۔“ اس نے پھر اتفاق کیا۔

”اس صورت میں ہمیں وہ کام کرنا چاہیے جس سے مسئلہ خاموشی سے حل ہو جائے۔“

”خاموشی سے کیسے؟“

”یہ بتاؤ تمہارے پاس نیند کی دوا ہے؟“

”بالکل ہے کچھ مہینے پہلے مجھے نیند نہیں آتی تھی تو میں لایا تھا۔ اس کے بعد خود نیند آنے لگی تو اس کا ڈبا دیا

ہی پڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے انہیں چائے میں دو ملا کر دے دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”چائے اس وقت؟“

”ہاں..... تم کہہ سکتے ہو کہ فکر سے تمہاری نیند اڑ گئی ہے اور تم اپنے لیے چائے بنا رہے تھے تو سوچا کہ ان

تینوں کے لیے بھی بنا دو۔ تم ان کے ساتھ ہی چائے پینا تاکہ انہیں شک نہ ہو۔“

”دوا والی۔“ اس نے اعتراض کیا۔ ”اس سے تو میں بھی سو جاؤں گا۔“

”اپنے لیے تم بغیر دوا والی لینا۔“

”جب ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”جب تو عمل کرو۔۔۔۔۔ اگر وہ سچ سچ ہو گئے تو تم اٹھا کر تو چائے نہیں دو گے۔“

”میں ابھی جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”میرے پاس گولیاں ہیں پہلے انہیں پیس لیتا ہوں۔“

وہ سچ سچ ہوشیار تھا۔ شکر ہے اسے یہ حرکت ہمارے ساتھ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ ہم نے شرافت سے کام لیا تھا اور اس کی مدد ہی کی تھی۔ اسے قتل اور بلیک میلنگ کے چکر سے بچا لیا تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا کہ سامنے سنگیت اور اس کے دونوں ساتھی دکھائی دیے۔ ان کے چہروں پر شک ہی شک تھا۔ سنگیت نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ ”بھائی جی دروازہ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟“

میں خاموش کھڑا رہا ہوشیار نے مڑ کر دیکھا تو اس کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ حوصلہ کرے۔ اس نے اشارہ سمجھ لیا اور کسی قدر گرم لہجے میں بولا۔ ”تو کون ہوتا ہے مجھ سے میرے گھر میں یہ سوال کرنے والا۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو یا رایسے ہی پوچھ لیا۔“

میں آگے آیا۔ ”تم تینوں ساتھ ساتھ رہتے ہو کیا۔۔۔۔۔ ہر وقت؟“

طویل قامت نے غرا کر میری طرف دیکھا اور ہوشیار سے کہا۔ ”اپنے یار کو سمجھالے ہمارے منہ نہ لگے۔“

”منہ لگنے والی بات بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بات کرنے سے پہلے آئیے میں منہ دیکھ لیا کرو۔“

”لگتا ہے تو اس طرح نہیں مانے گا۔“ طویل قامت آگے آیا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”یہاں نہیں۔۔۔۔۔ یہ میرے دوست کا گھر ہے اس کا نقصان میرا نقصان ہے باہر چلتے ہیں۔“

توند والا خوش تھا اور سنگیت بھی دلچسپی لے رہا تھا ایسا لگ رہا تھا ان کا دل پسند تھا شاہو نے والا ہے۔ طویل

قامت بولا۔ ”تم خود مقابلے کا کہہ رہے ہو بعد میں رونا مت۔ میں ہاتھ چلاتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ آگے والے کے منہ ناک کا کیا ہوگا؟“

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ہوشیار گھبرا گیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”تم فکر مت کرو ہم ذرا تبادلہ خیال کریں گے۔“ میں نے کہتے ہوئے باہر کا

رخ کیا۔ وہ چاروں بھی پیچھے تھے۔ ہوشیار اپنے بھائی سے کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ اس کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اس کے بجائے وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں میری مرمت دیکھنا چاہتا تھا۔ اب وہ ہوشیار ہو گئے تھے اور شاید دوا والا

حربہ کام نہ کرتا اس لیے میں نے دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ ہم باہر آئے جہاں ہوشیار کی جیب کے ساتھ ایک کھٹارا سی

پرانی کار کھڑی تھی۔ وہ لوگ اسی میں آئے تھے اور انہوں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے گاڑی بھی اندر کھڑی کر

لی تھی۔ اس لیے اب پورچ میں جگہ نہیں تھی۔ ہم لان میں آگئے۔ ہوشیار اب خاموش تھا اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی کوئی نہیں سنے گا۔ سنگیت اور توند والا ذرا دور کھڑے ہو گئے اور طویل قامت آگے آیا۔ میں نے اناڑیوں کی

طرح دونوں ہاتھ آگے کیے۔ طویل قامت مسکرایا اور اس کا چہرہ لان لپٹ کی پہلی روشنی میں مزید کردہ نظر آنے لگا۔ مجھے کمزور محسوس کر کے وہ آگے آیا اور میں نے آدھے منٹ میں کھیل ختم کر دیا۔ اس کے دو وارنا کام بنا کر میں نے پہلے اس کے پیٹ میں مکا مارا اور جب وہ جھکا تو اس کے سر پر پستول کا دستہ رسید کیا وہ وہیں گر گیا۔ توند والے کا ہاتھ اپنی پلٹ کی طرف گیا تھا کہ میں نے پستول اس کی طرف کر دیا۔ ”ہاتھ اوپر اور حرکت مت کرنا ورنہ.....“ میں نے پستول کو جنبش دی تو اس کا ہاتھ رک گیا پھر اس نے ہاتھ اوپر کر لیے۔ سنگیت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب ہوائیاں ان کے چہروں پر اڑ رہی تھیں۔ وہ میرے پرزے اڑتے دیکھنے آئے تھے اور یہاں تماشا ہی لانا ہو گیا تھا۔

”ہاتھ گردن پر۔“ میں نے حکم دیا تو انہوں نے اس بار بھی تعمیل کی اور ہوشیار نے میرے کہنے پر ان کی تلاشی لے کر ہتھیار برآمد کر لیے۔ دونوں کے پاس پستول تھے۔ نہتے ہونے پر ان کا رہا سہا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ سنگیت نے کہا۔ ”بھائی جی ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”اتنی آسانی سے نہیں۔“ میں نے کہا اور ہوشیار سے پوچھا۔ ”کوئی جگہ ہے جہاں ان کو بند کیا جاسکے تو صرف ان کی آتماں وہاں سے نکل سکیں؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے کہا اور عقبی لان کے ساتھ بنی کوٹھری تک آیا۔ یہ اوزار اور فالتو سامان رکھنے کے لیے تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی اس کوٹھری کی چھت بھی کچی تھی اور دروازہ موٹی لوہے کی چادر کا بنا ہوا تھا۔ یہ انتظام شاید سامان کو چوروں سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا اور یہاں سے بچ بچ ان کی روٹیں ہی نکل سکتی تھیں۔ ایسی ساری چیزیں نکال لیں جن کی مدد سے یہ خود کو آزاد کر سکتے تھے اور پھر انہیں کوٹھری میں دھکیل دیا۔ میں نے کہا۔

”آرام سے بیٹھنا..... ہنگامہ کیا تو اپنا نقصان خود کرو گے۔“

”بھائی تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“ سنگیت نے بھائی کو دھمکایا۔

”ٹٹو نے بہت اچھا کیا جو ان بد معاشوں کو لے کر میرے گھر آ گیا۔“ ہوشیار نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”ہم صرف رکتے تیرا کوئی اور نقصان نہیں کرتے۔“

”بکواس مت کر..... یہ میرا دوست ہے اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے تیرے ساتھی اور ٹٹو..... ٹوکتا ہے میرا نقصان نہیں کر رہے تھے۔ ابھی پہلے معلوم کر لوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے پھر تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔“

ہوشیار اندر سے ایک بڑا اور مضبوط تالا لے آیا اسے باہر ڈال دیا۔ ہم اندر آئے پہلے میں نے سادی کو تسلی دی کہ حالات میرے قابو میں ہیں اور وہ سو جائے پھر میں ہوشیار کے ساتھ اس کمرے میں آیا جس میں یہ تینوں رکے تھے۔ وہاں ان کے اضافی اسلحے کے ساتھ وہی دونوں بڑے بیگ بھی تھے۔ ہوشیار نے ایک بیگ کھولا اور میری توقع کے عین مطابق اس میں کئی نوٹوں کا ڈھیر نکلا تھا۔ یہ سارے ہزار اور پانچ سو والے نئے کئی نوٹ تھے جن پر بینک کی پٹی لگی تھی۔ ہوشیار نے گھبرا کر کہا۔ ”واہ گرد کی سوں..... کسی بینک میں ڈاکا ڈالا ہے۔“

”لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔“ میں نے دوسرا بیگ بھی کھولا اور وہ بھی اسی طرح کئی نوٹ سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں بیگوں کا مشترکہ وزن کوئی پچاس کلو گرام تھا۔ ہوشیار نے گڈیاں گئیں اور مجھے آگاہ کیا۔

”دو سو گڈیاں لاکھ والی اور تین سو پچاس ہزار والی ہیں۔“

”ساڑھے تین کروڑ روپے۔“ میں حیران ہوا تھا۔ ”یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور پولیس لازمی چوکنا ہوگی۔“
 ”اتنی بڑی واردات ٹی وی پر لازمی آ رہی ہوگی۔“ ہوشیار نے کہا تو ہم نے نشست گاہ کا رخ کیا۔ اس
 نے ٹی وی آن کر کے مقامی نیوز چینل لگایا تو اس پر اس وقت یہی خبر چل رہی تھی۔ نامعلوم افراد نے امرتسر سے
 لدھیانہ آنے والے کیش آرمرڈ ٹرک کو لوٹ لیا تھا۔ ڈاکوؤں نے ٹرک کے چاروں محافظوں کا قتل کر دیا تھا اور اس
 میں موجود ساڑھے تین کروڑ کی رقم لوٹ کر لے گئے تھے۔ یہ خبر دیکھتے ہوئے رات دو بجے ہوشیار سنگھ کے بارہ بج
 گئے تھے۔ ”یہ تو قاتل بھی ہیں۔“

”پولیس بہت سرگرمی سے ان کی تلاش میں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اچھی خبر ہے کہ وہ ان کے بارے
 میں کچھ نہیں جانتی ہے۔ مگر بہت سی باتوں سے دوران تفتیش پتا چل جائے گا کہ ڈاکوؤں نے کہاں کا رخ کیا
 ہے۔“

”وہ سیدھی یہاں آئے گی۔“ ہوشیار نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ”اور تم کہہ رہے ہو کہ اچھی بات
 ہے۔“

”میرا مطلب ہے وہ ناموں سے واقف نہیں ہے ورنہ یہ پتا چلا نا کون سا مشکل ہوتا کہ سنگیت سنگھ کا بھائی
 ہوشیار سنگھ اسی علاقے میں رہتا ہے۔ لدھیانہ یہاں سے بہت دور ہے۔“
 ”اتنا دور بھی نہیں ہے۔“ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

”اب ان کو چمپا کر رکھنا اور ضروری ہو گیا ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ان کے لیے چائے بناؤ
 وہی دوا والی۔“

”شراب میں ندے دوں۔“ ہوشیار سنگھ نے بہتر تجویز دی۔ ”زیادہ اثر کرے گی۔“

”یہ بہتر رہے گا۔“ میں نے کہا تو اسی لمحے نشست گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

”یہ سو میت ہوگی وہ جاگ گئی ہوگی۔“ ہوشیار نے کہا اور باہر چلا گیا۔ وہ دس منٹ بعد آیا تو اس کے ہاتھ
 میں دیسی شراب کی بوتل تھی۔ اس نے مجھے دکھائی۔ ”دوا پیس کر اس میں شامل کر دی ہے۔“

ہم باہر آئے۔ کوٹھری کا تالا کھولا اور ہم اندر آئے۔ طویل قامت کو ہوش آ گیا تھا اور وہ سر تھاڑے مجھے خونی
 نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹو نے اچھا نہیں کیا ابھی مجھے جانتا نہیں ہے۔“

میں نے نرمی سے کہا۔ ”بس ایک دن کی بات ہے پھر تم کو آزاد کر دوں گا۔“

”تم لوگوں نے آرمرڈ ٹرک لوٹا اور اس کے گارڈز کو مار دیا۔“ ہوشیار تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے شراب کی
 بوتل سنگیت کی طرف اچھال دی۔ میں نے اندر آنے سے پہلے پستول نکال لیا تھا اس لیے وہ شرافت کے دائرے
 میں تھے۔ سنگیت نے مشکوک لہجے میں کہا۔

”ٹو شراب کیوں لایا ہے۔“

”بتایا تو ہے کہ تم لوگ ایک دن آرام سے رہو گے۔ شاباش اب پینا شروع کر دو۔“

”اس میں زہر ہے۔“ سنگیت کا شک زبان پر آ گیا۔

”میں تم تینوں کو خالی ہاتھ سے بھی مار سکتا ہوں تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تین تک گنوں گا اور

اس کے بعد.....“ میں نے پستول کو جنبش دی تو طویل قامت نے سنگیت سے بوتل لے کر منہ سے لگائی۔ اسے ضرورت بھی تھی اس نے ایک ہی بار میں چوتھائی بوتل صاف کر دی۔ پھر گینڈے نے بوتل کے ساتھ ہی سلوک کیا۔ سنگیت کو جب میں نے بجایا تو اس نے بوتل منہ سے لگائی تھی۔ اس دوران میں طویل قامت جھونے لگا تھا مگر پہلے گینڈا لڑھکا پھر طویل قامت گرا اور آخر میں سنگیت نے مزید ایک گھونٹ لیا تھا اٹنا غفیل ہونے سے پہلے۔ بوتل تقریباً خالی ہو گئی تھی۔

”یہ گئے کم سے کم دس بارہ گھنٹے کے لیے۔“ ہوشیار نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کوئی دوا انسان کو آٹھ گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہیں سلا سکتی ہے اس سے زیادہ دیر سونے کی صورت میں انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”ہاں یہ دس بارہ گھنٹے تک کسی قابل نہیں رہیں گے۔“

ہم باہر آئے اور ہوشیار نے تالا لگا دیا۔ ہم اندر آئے تو میں نے ہوشیار کا شانہ تھپکا۔ ”اب تم سو جاؤ۔“
”اور تم؟“

”میں جاگتا رہوں گا۔ پولیس کی طرف سے ہوشیار رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے یہ گاڑی کہیں اور نہ چھوڑ دیں۔“

”بیچھے کھڑی کر دیتے ہیں۔“ ہوشیار نے تجویز پیش کی۔ ”باہر جانا خطرے والی بات ہوگی۔ مین روڈ پاس ہے اور اس پر پولیس موجود ہو سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے تب بیچھے کھڑی کر دو بلکہ ابھی یہ کام کرو۔“ میں نے مشورہ دیا اور ہوشیار قہقہے کے لیے چلا گیا۔ اب اس کا رویہ میرے ساتھ تقریباً نارمل ہو گیا تھا اور وہ بھڑک نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی نظروں اور انداز میں غناصت تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اپنے ساتھ اس کی مدد بھی کر رہا تھا۔ رقم والے بیک ابھی تک ان کے کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ ہوشیار آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”انہیں چھپانا ہے۔ صبح شیلایا کوئی اور بندہ نہ جانے کے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔“

گھر میں ایک اسٹور روم تھا مگر وہ کھلا تھا اس لیے ہوشیار کے کمرے کے ساتھ روم کے اوپر والی دو چھتی سے کام لیا گیا۔ ہم نے اسلحہ بھی بیگوں میں ڈال دیا اور انہیں دو چھتی پر سامان کے پیچھے رکھ دیا۔ سومیت جان گئی تھی اور ہراساں تھی۔ مگر وہ ہوشیار کا مسئلہ تھی وہ اسے سنبھال لیتا۔ اس نے گاڑی پیچھے ملازموں کے مکانات کے ساتھ ٹریکٹر اور دوسری مشینری کے شیڈ میں کھڑی کر دی تھی۔ میں نے سومیت سے کہا۔ ”بھر جائی اگر مشکل نہ ہو تو میرے لیے ایک کپ چائے بنا دیں۔“

اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”کیسی بات کرتے ہیں اجیت بھیا آپ نے تو ہمیں ان ڈاکوؤں سے بچایا ہے آپ کی سیوا تو دھرم ہے۔“

سومیت چائے بہت اچھی بناتی تھی اور اس کے پاس پتی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ میں وہیں لاؤنج میں بیٹھ گیا تھا۔ ہوشیار کمرے میں تھا سومیت مجھے چائے دے کر بولی۔ ”بھائی جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لینا اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”شکریہ بہن۔“ میں نے کہا وہ اندر چلی گئی تھی۔ باہر گرج چمک رک گئی تھی مگر موسم بارش والا ہی ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی تیز ہوا کے خاک جھوٹکے آتے تھے۔ میں پانچ بجے تک وہاں رہا پھر کمرے میں آیا اور سادی کو چگا کر سو گیا۔ وہ کمرے سے ہی آس پاس نظر رکھ سکتی تھی۔ اس نے مجھے نو بجے جگایا۔ وہ خود منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر چکی تھی۔

”شوبی اٹھ جائیں ناشتہ کر لیں۔“

”کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟“

”نہیں ہوشیار بھی سو رہا ہے، میں اور سو میت باتیں کر رہے تھے۔“

میں نے موبائل چیک کیے ان پر کال نہیں آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب وسم اسی وقت کال کرتا جب وہ ہمارے لیے بندوبست کر لیتا یا پھر نہیں کر پاتا اور ہمیں کوئی متبادل راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ ویسے میری خواہش تھی کہ وہ انتظام کر لے اور ہم یہیں سے سرحد پار کر جائیں۔ میں اور سادی جتنی جلدی یہاں سے چلے جاتے ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ میں نے منہ ہاتھ دھونے کی بجائے غسل کیا اور اپنے زخموں کا جائزہ لیا جو تقریباً بھر چکے تھے۔ ماتھے کے زخم پر کمرٹڈ آگیا تھا جو شاید ایک دن میں اتر جاتا۔ باقی زخم صاف ہو چکے تھے اور معمولی نشان رہ گئے تھے۔ رات میں نے جاگتے رہنے کے خیال سے کم کھایا تھا اس لیے اب بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتہ میں دیسی انڈے اور پراٹھے تھے۔ ان کے ساتھ سوچی کا حلوا اور لسی تھی۔ میں نے ناشتے سے پورا انصاف کیا، سو میت تازہ پراٹھے بنارہی تھی۔ اسی دوران میں ہوشیار بھی آکر میرے ساتھ ناشتے میں شامل ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”میں کچھ دیر پہلے گیا تھا وہ بے سدھ پڑے ہیں۔“

”یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اگر ان میں سے کسی کو ہوش آگیا ہوتا تو تم مشکل میں پڑ جاتے۔“

”میں صرف نام کا ہوشیار نہیں ہوں۔“ اس نے فخر سے کہا۔ ”پستول لے کر گیا تھا۔“

”یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کو پولیس کے حوالے کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”خاص طور سے

جب ان میں تمہارا بھائی بھی شامل ہے۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”مشکل ہے اگر نگیت نہ ہوتا تو میں ایسا کر گزرتا۔“

”دوسری صورت میں کیا یہ تمہیں بخش دیں گے؟ کل رات ان کے ساتھ جو ہوا ہے۔“

اس بار ہوشیار نگہ کارنگ اڑ گیا تھا اور نوالہ اس کے حلق میں بھنس گیا جسے اس نے جلدی سے لسی سے نیچے اتارا۔ وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جو سوچتا ہے جلدی سوچ لو، میرے پاس وقت نہیں ہے شاید ہمیں بھی جلد جانا پڑے۔“

”میں سوچتا ہوں۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ غالباً یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ میں ناشتہ ختم کر رہا تھا کہ موبائل واچبرٹ ہوا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں واش روم سے آتا ہوں۔“

واش روم میں آکر میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف وسم تھا۔ اس نے بلا تمہید کہا۔ ”سیاہ لباس کا

بندوبست کر لیں، جوتے ایسے ہوں کہ کچی اور تانہوار زمین پر تیزی سے حرکت کر سکیں اور سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ کے سوا کچھ نہ ہو۔“

”میں بندوبست کرتا ہوں۔“

”یہ کام آج رات تک کر لیں اور ہاں نائٹ وین بھی ہوں۔“

”وہ ہیں اور بہت اچھی کوالٹی کے ہیں۔“

”بس تو کام بن گیا۔“ وسیم بولا۔ ”تیسرے آپ کو یہ موبائل بھی ساتھ رکھنا ہوگا، ہینڈ فری کے ساتھ

رہنمائی کے لیے۔ اسے پوری طرح چارج ہونا چاہیے۔“

”ہو جائے گا ورنہ میں کوئی لمبی چارجنگ والا سیٹ لے لوں گا۔“

”آج رات تیار رہنے گا میں شام کے وقت رابطہ کروں گا۔“

میں ہاتھ دھو کر آیا تو سادی سراپا انتظار بنی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھے کال آئی تھی۔ میں نے آنکھ سے

اشارہ کیا کہ وہ ذرا صبر کرے اور ہوشیار رہے کہا۔ ”ہمیں کچھ کپڑے چاہئیں یہاں سے مل سکتے ہیں۔“

”یہاں تو مشکل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ادھر فیروز پور جانا پڑے گا۔ وہاں کچھ دکانیں ہیں جہاں کپڑے

مل جاتے ہیں۔“

”بس تو ابھی چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ابھی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”ان کو چھوڑ کر؟“

”وہ آرام سے پڑے ہیں اور کوٹھری سے باہر نہیں آ سکتے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”ہم ایک کھنسنے سے

بھی کم وقت میں واپس آ جائیں گے۔“

میں نے اسے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں سادی کے ساتھ کمرے میں آیا اور اسے مختصر اوہم سے ہونے

والی گفتگو سنائی۔ اس کا چہرہ ہلکا ہوا تھا کہ ہم آج رات ہی واپس جا رہے تھے۔ ”میں سامان لینے جا رہا ہوں تم

ہوشیار رہنا اور کسی مشکل صورت میں حال میں پستول کے استعمال سے مت بچکھانا۔“

”آپ فکر نہ کریں میں سب دیکھ لوں گی۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔

ہم فیروز پور کی طرف روانہ ہوئے۔ درحقیقت دھوب محلہ فیروز پور شہر میں ہی ہے لیکن آبادی کم ہونے کی

وجہ سے الگ تھلگ لگتا ہے۔ ہائی وے یا حسین والا بارڈر روڈ کی طرف جانے کے بجائے ہوشیار نے اندرونی

سڑکوں کا انتخاب کیا اور ہم بغیر پولیس سے مدد بھڑکے فیروز پور کنٹونمنٹ ایریا پہنچ گئے وہاں ایک چھوٹا سا صاف

ستھر بازار تھا۔ میں نے ریڈی میڈ ہوزری گارمنٹ کی ایک دکان کا انتخاب کیا۔ اس کے پاس ہر سائز کے زنانہ

مردانہ ٹراؤزر اور پورے آستین کی ٹی شرٹ موجود تھیں میں نے سیاہ رنگ میں دکھانے کو کہا۔ دکاندار ذرا حیران

ہوا تھا کہ میں نے اس موسم میں پوری آستین کی ٹی شرٹ مانگی تھیں۔ مگر اسے دکانداری سے مطلب تھا اس نے

مجھے مطلوبہ سائز کے ٹراؤزر اور ٹی شرٹس دے دیں۔ ایک میں نے اپنے سائز کا لیا تھا اور ایک سادی کا لیا تھا۔

اس کے پاس کھل کر لمبی ہو جانے والی ٹوپیاں بھی تھیں۔ یہ سردی کا مال تھا جو فروخت سے بچ گیا تھا۔ میں نے وہ

بھی لے لیں اور سیاہ ہی رنگ کے باریک دستانے لیے۔ اس کے بعد ہم ایک شو اسٹور آئے یہاں سے کیونٹس

کے کریپ ربرسول والے جوتے لیے۔ ان کا رنگ گہرا تھا مگر انہیں سیاہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ ساری خریداری مشکل سے آدھے گھنٹے میں منٹ گئی۔ پھر میں نے وہیں ایک موبائل شاپ سے ایک سادہ اسکرین مکر لمبی بیٹری والا موبائل لیا۔ یہ نیا تھا اس لیے قابل بھروسہ تھا۔ ہم سچ سچ ایک گھنٹے میں واپس آ گئے تھے۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری اس خریداری نے ہوشیار کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اس نے راستے میں دو تین بار مجھ سے پوچھا کہ میں نے یہ کپڑے اور جوتے کیوں لیے ہیں لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ واپس آتے ہی میں نے کمرے میں آکر سب سے پہلے ٹاپ چیک کیے۔ خاص طور سے جوتوں کے۔ اپنا سائز تو دکان پر دیکھ لیا تھا مگر سادی کا اندازے سے لایا تھا اس نے پہلے جوتے چیک کیے۔ یہ اسے معمولی سے بڑے تھے۔ اس نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں میں موزے پہن لوں گی۔“

پھر اس نے واش روم میں جا کر چست ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہنی اور جھینپتی ہوئی باہر آئی۔ میں ہنسا تو وہ شرما گئی۔ ”واہیات لگ رہی ہوں اس میں۔“

”مجبوری ہے تمہارے میاں جی کا حکم ہے۔“ میں نے موبائل کو چارجر پر لگاتے ہوئے کہا۔ ”دوپہر میں ہم ڈیو کریں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ فل ڈریس ریہرسل ہوگی رات کے اصل ڈرامے کے لیے۔“ میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ ہوشیار سنگھ لاؤنچ میں تھا اور سومیت سے کچھ کہہ رہا تھا مجھے دیکھ کر یک دم چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

”ان کو چیک کیا؟“

”نہیں۔“

”آؤ دیکھ لیں۔“ میں نے کہا اور ہم کوٹھری تک آئے۔ ہوشیار نے تالا کھولا۔ وہ تینوں ہوش میں تھے مگر ان کی صورتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ سنگیت نے بھائی کو دیکھتے ہی وہی راگ الاپنا شروع کر دیا جس میں دھمکیاں بھی تھیں اور انتہائیں بھی۔ درحقیقت وہ تینوں ہی خوفزدہ تھے۔ وہ جو کر کے آئے تھے انہیں اندازہ تھا کہ اب تک ہم واقف ہو چکے ہوں گے۔ میں نے کہا۔ ”پولیس تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کر رہی ہے۔ چار قتل اور ساڑھے تین کروڑ کی ذمہ داری معمولی بات نہیں ہوتی ہے۔“

”تو خود کو میرا بھائی کہتا ہے اور یہاں چلا آیا۔“ ہوشیار نے نفرت سے سنگیت کو دیکھا۔ ”تیرے پیچھے پولیس آتی تو میں بھی مارا جاتا۔“

سنگیت کا سر جھک گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ویسے تم تینوں اس قابل ہو کہ پھانسی چڑھاؤ لیکن ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے ممکن ہے تمہیں چھوڑ دیں۔ اس لیے آرام سے بیٹھو اور کوئی ہنگامہ مت کرنا۔“

”ہم کوئی ہنگامہ نہیں کریں گے۔“ مونے نے یقین دلایا۔

لبے نے چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ ”پیشاب آ رہا ہے۔“

”ہمیں کرلو۔“ ہوشیار نے کہا۔ ”کچھ دیر میں تمہیں کھانے کو مل جائے گا۔“

”شراب نہیں مل سکتی۔“ مونے نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ابھی نہیں شام کو دوں گا۔“ ہوشیار نے انکار کیا۔ ہم انہیں بند کر کے اندر آئے۔ اس بار میں ہوشیار کو نشست گاہ میں لے آیا۔

”تم نے کیا سوچا ہے؟“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”میری ایک تجویز ہے۔“ میں نے کہا۔ ”انہیں ایک بار پھر شراب میں دوا دے دو اور ان کی گاڑی میں ڈال کر انہیں یہاں سے دور کہیں چھوڑ آؤ۔“

”دور جانا ممکن نہیں ہے۔ پولیس نے ناکے لگائے ہوں گے۔“

”تم پہلے خود جا کر دیکھ لو کہ پولیس کتنی سرگرم ہے اور انہیں چھوڑنے کا کام تاریکی کے بعد کرنا۔“

اس نے غور کیا۔ ”تم میری مدد کرو گے۔“

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ہاں میں تمہاری مدد کروں گا۔“

”ان کا اسلحہ اور وہ رقم؟“ ہوشیار کا لہجہ رقم کا ذکر کرتے ہوئے ذرا تبدیل ہوا تھا۔

”وہ بھی ساتھ ہوگی۔ اس رقم کے چکر میں مت پڑو۔ تم نے غور نہیں کیا وہ ساری غنی اور سیل گڈیاں ہیں ان کے نمبرز پولیس کے پاس ہوں گے اور تمہارے پاس سے ایک نوٹ بھی نکل آیا تو تم بھی ان کے ساتھ مارے جاؤ گے۔“

ہوشیار فوراً سیدھا ہو گیا۔ اس نے صفائی پیش کی۔ ”میری نیت خراب نہیں ہے میں صرف پوچھ رہا تھا۔“

”تم ابھی کھانے کے بعد نکلتا اور دیکھ کر آ جانا۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے۔“

سومیت نے وال چاول بنائے تھے جس کے ساتھ چشیاں اور اچار تھا۔ ایک ڈونگے میں سب ڈال کر ان تینوں کو پہنچا دیا گیا اور پھر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہوشیار اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں سادی کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ اگرچہ سومیت اس سے گپ شپ کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے کپڑے بدلے اور سیاہ ٹراڈز اور فلی آسٹین کی ٹی شرٹ میں آ گئے۔ جوتے ڈارک براؤن کھر کے تھے اور تاریکی میں یہ سیاہ ہی نظر آتے۔ میں جوتوں پہنا لایا تھا انہیں سر پر چڑھا کر دیکھا۔ یہ گردن تک آ رہی تھیں۔ پھر ان میں آنکھوں والی جگہ بلیڈ سے کاٹ کر سوراخ کیے اور آخر میں کمرے میں تاریکی کر کے ٹائٹ ویڈن لگا کر ایک دوسرے کا معائنہ کیا۔ چست سیاہ لباس اور سر تا پا سیاہ ہونے کی وجہ سے رات کی تاریکی میں نظر آنے کا امکان کم تھا اور آج رات بھی بادل ہوتے تو کام اور آسان ہو جاتا۔ سادی نے جوتوں میں موزے پہن کر دیکھے اور وہ مطمئن تھی اب جوتے اسے فٹ تھے۔

ریہرسل سے فارغ ہو کر وہ باہر چلی گئی اور میں لیٹ کر آرام کرنے لگا مجھے ہوشیار کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ چار بجے واپس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں باہر نکلا تو وہ نہادھو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس علاقے میں پولیس معمول کے مطابق ہے۔ ”ہم آرام سے انہیں دور تک چھوڑ کر آ سکتے ہیں۔“

”گڈ تب ہم تاریکی چھاتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”میں انہیں شراب دے آتا ہوں۔“

”صرف دے کر نہیں آئی ہے انہیں پہلے کی طرح پلائی ہے۔ درندہ پنپنے کا دھوکا بھی دے سکتے ہیں۔“
”تب تم بھی چلو۔“

ہم کوٹھری تک آئے۔ اس بار بھی ہوشیار دہی شراب کی بوتل لایا تھا اور انہیں اس بار بھی پینا پڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹن ہو گئے تھے۔ ہوشیار ان کی گاڑی لانے چلا گیا۔ میں اندر آیا۔ مجھے اب دہی کی کال کا انتظار تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ چھ بجے تک اس کی کال نہیں آئی تو میں اسے کال کر لوں گا۔ مگر پونے چھ بجے ہی اس کی کال آگئی۔ اس نے کہا۔ ”گوگل میپ پر یہ علاقہ نکالیں۔“

میں نے ٹیب آن کر کے اس پر گوگل میپ پر سرحدی علاقہ نکالا اور دہی کو آگاہ کیا۔ ”نکال لیا۔“
”اس میں فیروز پور روڈ پر دیکھیں۔ دریا کر اس کرنے کے لیے ایک پل ہے۔“
”بالکل ہے۔“

”یہاں دریا انڈیا کی حد میں ہے لیکن اس سے نیچے چند سو گز کے بعد یہ گھوم کر پاکستان کی حد میں چلا جاتا ہے۔“
”ٹھیک۔“

”آپ نے اسی جگہ آتا ہے۔ یہاں سے کراسنگ کرتے ہی آپ ٹیب میں آجائیں گے اور انڈیا کی طرف سے محفوظ ہو جائیں گے۔“
”رہنمائی کیسے ہوگی؟“

”آپ ٹائٹ ویڈیو استعمال کریں گے اور ہماری طرف سے ایک انفراریڈ ٹارچ آپ کو گائیڈ کرے گی لیکن خیال رہے یہاں انڈیا نے کسی زمانے میں بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں اور آپ ٹائٹ ویڈیو سے زمین دیکھ کر آئیں گے۔ جہاں بارودی سرنگ ہوگی وہاں اسپاٹ سا نظر آئے گا۔“
میں فکرمند ہو گیا۔ ”یہ خطرناک چیز ہے۔“

”اسی لیے میں نے ٹائٹ ویڈیو کا کہا ہے۔ سمجھ لیں صرف ایک فیصد خطرہ رہ جائے گا۔ آپ موبائل سے رابطے میں ہوں گے اور آپ کو گائیڈ کیا جائے گا۔“

”تم لوگ علاقے کی نگرانی کر رہے ہو گے؟“
”بالکل، کسی کی آمد سے ہم پہلے ہی خبردار ہو جائیں گے۔“
”وقت کیا ہوگا؟“

”رات بارہ کے بعد۔ آپ اشارہ ملنے پر روانہ ہوں گے لیکن بارہ تک بالکل تیار رہیے گا۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور دہی نے کال کاٹ دی۔

موبائل چارج ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ہینڈ فری آزما کر دیکھا وہ بہترین کام کر رہا تھا۔ میں نے سم اس میں منتقل کر دی۔ سویت نے آج بھی چائے پر اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم نے خواتین کو اندر بھیج دیا اور جیسے ہی تاریکی ہوئی باری باری ان تینوں کو لاکر کار کی پچھلی نشست پر ڈھیر کر کے ان پر چادر ڈال دی تھی۔ اگلے اور تم والے بیک ڈکی میں رکھے۔ میرے مشورے پر ہوشیار نے گاڑی کی ان تمام جگہوں کو صاف کر دیا تھا

جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ اس نے اس گاڑی کی ڈرائیونگ سنبھالی اور میں ہوشیار کی جیب میں اس کے پیچھے تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے میرے دل میں خدشہ تھا کہ کہیں کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں اور ہماری روانگی کھٹائی میں پڑ جائے۔ ان ہونیاں میرے آس پاس ہی رہتی تھیں۔

مگر سب آسانی سے ہو گیا۔ ان تینوں کو گاڑی سمیت لدھیانہ سے کوئی چالیس کلومیٹر پہلے سڑک کے ساتھ چھوڑا۔ ان پر سے چادر ہٹا دی تھی اور سنگیت کو اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ دہلی شراب کی خالی بوتل گاڑی میں ڈال دی اور اس کے دونوں پچھلے دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ امید تھی کہ پولیس جلد یا بدیر ان تک پہنچ جائے گی۔ ہم نو بجے تک واپس پہنچ گئے تھے۔ ہوشیار کسی قدر فکر مند مگر مطمئن بھی تھا میں نے اسے تسلی دی کہ پولیس ڈاکوؤں کی بکواس پر توجہ نہیں دے گی جب کہ اسے لوٹ کا مال بھی مل جائے گا۔ ان تینوں کی بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھانسی سے بچ گئے تب بھی ساری عمر جیل میں گزرے گی۔ لہذا اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کا کھانا دیر سے اور ہلکا کھایا تھا۔ پھر تھکن اور نیند کا بہانہ کر کے کمرے میں آ گئے۔ خود ہوشیار بھی تھکا ہوا تھا۔ وہ سوویت سمیت اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

رات دس بجے تک ایک بار پھر بادل آ گئے مگر آج گرج چمک نہیں ہو رہی تھی۔ یہ اچھی بات تھی ورنہ اس میں نائٹ ویژن کا استعمال بہت مشکل ہو جاتا۔ گیارہ بجے ہم تیار ہونے لگے اور بارہ بجے تک ہم بالکل تیار تھے۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر دس بج کی کال آئی۔

”نکل جائیں اور پوائنٹ پر پہنچ کر مجھے اشارہ دیجئے گا میں کال کروں گا۔“

”چلو۔“ میں نے سادی سے کہا اور ہم خاموشی سے مکان سے نکل آئے۔ عقبی حصے سے نکلنے کے بجائے ہم گھوم کر کھیتوں والی طرف آئے۔ نائٹ ویژن کی وجہ سے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں چار کلومیٹر تک پیدل چلنا تھا۔ مجھے سادی کی فکر تھی مگر اس نے کہا۔ ”میں چل لوں گی۔“ ویسے بھی چلنا ہے تا بھاگنا تو نہیں ہے۔“

”تمکن ہے بھاگنا پڑے۔“

”تو بھاگ بھی لوں گی۔“

ہم ساڑھے بارہ بجے سرحد کے پاس تھے۔ یہاں انڈین سائینڈ پر انہوں نے ایک چمکنے والی پہلی لائن بنا رکھی تھی تاکہ مقامی لوگ سرحد سے ہوشیار رہیں اور غلطی سے بھی پار نہ جائیں۔ ہم حسنی والا بارڈر روڈ پر اس کر کے یہاں تک آئے تھے۔ علاقہ صاف اور خالی تھا۔ یہاں نہ تو آبادی تھی اور نہ کھیت تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے ویم کو کس کال دی اور اس نے مجھے کال کر لی۔ ”ہم پہنچ گئے ہیں۔“

”رائٹ آپ دونوں نظر میں ہیں۔ کراس کر کے اس طرف آئیں اور دریا کے کنارے تک بہت احتیاط سے زمین چیک کر کے چلیں۔ سادی آپ کے پیچھے ہو۔ دریا پار دیکھیں روشنی نظر آرہی ہے۔“

دریا پار سرخ روشنی بار بار جل بجھ رہی تھی۔ ”ہاں نظر آرہی ہے۔“ میں نے کہا اور سادی کو ہدایت کی۔ ”تم ٹھیک میرے نقش قدم پر مجھ سے دس قدم پیچھے چلو گی۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے تشویش سے پوچھا۔

”یہاں بارودی سرنگیں ہیں۔ زمین کو غور سے دیکھتی رہنا کوئی ساٹ الگ سے دکھائی دے تو سمجھ لینا یہ بارودی سرنگ ہے۔“

سادی نے سر ہلایا۔ میں جھکے جھکے آگے بڑھا۔ وسیم نے کہا۔ ”سوگزن کا کلکڑا خطرناک ہے دریا میں اتر کر بائیں طرف مڑ جائے گا پانی ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔“

اس طرح جھکے جھکے چلنا آسان نہیں تھا میں نظر جما کر زمین بھی دیکھ رہا تھا۔ اپنے آس پاس کی مگرانی میں نے وسیم کے سپرد کردی تھی جو یقیناً سرحد پار سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے دریا کی ڈھلان پاس آرہی تھی میرے دل کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ سادی ٹھیک میرے پیچھے تھی اور اس کے لیے اس طرح جھک کر چلنا زیادہ مشکل کام تھا۔ بالآخر ہم دریا کی ڈھلان تک پہنچ گئے۔ وسیم نے تصدیق کی۔ ”آپ ڈھلان پر ہیں۔“

میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ ہم نے کسی دشواری کے بنا ایک طرف سے سرحد پار کر لی تھی۔ اسی لمحے میرا پاؤں کسی چیز پر گیا اور کلک کی آواز آئی تھی۔ میرا تیز رفتاری سے دھڑکتا دل تھم گیا۔



سادی نے بھی آواز سنی تھی۔ ”شوہی! آواز کیسی ہے؟“

میرے کان کلک کی آواز کے بعد دھماکے کے منتشر تھے۔ مگر دھماکہ نہیں ہوا تو میرا کارکا ہوا دل پھر چل پڑا تھا۔ وسیم نے سادی کی آواز سن لی تھی۔ اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”سادی تم آگے جاؤ میرے پیچھے آؤ اور بالکل سیدھ میں آگے جاؤ۔“

”شوہی.....“

”سادی۔“ میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”ناؤ گواٹ از آرڈر۔“

سادی حرکت میں آئی اور میرے نقش قدم پر چلتی میرے پاس آئی اور پھر سائیڈ سے ہو کر آگے بڑھ گئی تھی میں اس کے قدموں سے آگے زمین پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وسیم نے پھر پوچھا تو میں نے اسے شٹ اپ کال دی۔ میری ساری توجہ سادی پر مرکوز تھی۔ اس موسم میں بھی دریا میں برائے نام پانی تھا۔ ایک زمانے میں اپنے قیامت خیز سیلابوں کی وجہ سے مشہور یہ دریا اب خشک تھا اس کا سارا پانی انڈیا پی گیا تھا۔ اب سادی دریا کی ریتیلی زمین پر تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”میرا خیال ہے میرا پاؤں کسی بارودی سرنگ پر آ گیا ہے۔“

وہ مضطرب ہو گیا۔ ”میرے خدا۔“

”تم سادی کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔“

”میں آ رہا ہوں۔“ وسیم نے کہا اور موبائل عبداللہ کے سپرد کر دیا وہ اس کے ساتھ تھا۔ اسی لمحے انڈیا کی طرف سے کسی گاڑی کی روشنیاں لہرائیں اور میں تیزی سے ممکنہ حد تک نیچے جھک گیا۔ سادی وہیں ریت پر لیٹ گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آنے والی جیپ تھی۔ میں نے دایاں پاؤں جو بارودی سرنگ پر تھا اسے سیدھا رکھا اور بائیں پاؤں موڑتے ہوئے سر جھکا کر جیروں کے پاس لے آیا اور گول مول ہو گیا۔ آسمان پر بادل تھے اس لیے تاریکی تھی لیکن اگر روشنی پڑتی تو میں نظر آ جاتا اور میں چاہتا تھا کہ دیکھنے والے مجھے پتھر یا مٹی کا ڈھیر سمجھیں میں انہیں انسان نہ ٹکوں۔ یہ خاصا مشکل پوز تھا۔ اگر سادی یہ پوز بنانا چاہتی تو آرام سے بنا لیتی کیونکہ اس کا جسم

نازک اور چکدار تھا۔ میرا سخت اور غیر چکدار جسم آسانی سے مڑنے تڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اپنی بغل سے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ جیب آکر مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر رک گئی۔ اس سے دو آدمی اترے اور ایک بڑی نارنج کی روشنی آس پاس مارنے لگے۔ عبداللہ نے میرے کان میں کہا۔

”آپ فکر نہ کریں ہمارے پاس اسٹائپر مکن ہے اگر انہوں نے آپ کو دیکھ بھی لیا تو انہیں اڑادیں گے۔ میرا آدمی انہیں نشانے پر لیے ہوئے ہے۔“

”فائرنگ کی آواز سے دوسرے ہوشیار ہو جائیں گے۔“

”گنیں بے آواز ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”آس پاس دیکھو۔“ جیب سے اترنے والے اٹرن فوجی نے چلا کر کہا۔ ”وہ یہیں نظر آئے تھے۔“

”لگ رہا ہے یہ بھی انفراریڈ سے معائنہ کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ ہم تو روشنی کے بغیر آئے تھے۔“

”ہو سکتا ہے، اب ایسے آلات عام ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”وسیم روانہ ہو گیا ہے۔“

”جیب میں کتنے لوگ ہیں؟“

”تین ایک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے۔“

باقی دو آس پاس روشنی ڈال رہے تھے اور کئی بار روشنی میرے پاس سے گزری تھی لیکن مجھ پر نہیں آئی تھی۔

”اگر شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تو پہلے ڈرائیور کو نشانہ بنانا۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”اس کے پاس ریڈیو ہو گا وہ دوسروں کو خبردار کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

وہ پٹی کے دوسری طرف نہیں آرہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا وہ یہاں بارودی سرنگوں کی موجودگی سے باخبر تھے۔ اب پتا نہیں یہ سرنگیں دونوں طرف سے کس نے بچائی تھیں کیونکہ یہ علاقہ بہر حال پاکستانی تھا مگر اس کی نوعیت ایسی تھی کہ پاکستانی سکیورٹی والے اس طرف نہیں آ سکتے تھے، انہیں دریا کراس کرنا پڑتا اس لیے عملاً اس حصے کی نگرانی اٹرن سکیورٹی ہی کر سکتی تھی۔ وہ سرحد کراس نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہم پاکستانی حد میں تھے لیکن ان کی نظر میں آ جاتے تو وہ فائرنگ کر سکتے تھے۔ سادی نشیب میں ہونے کی وجہ سے ان کی نظروں اور نارنج کی روشنی سے محفوظ تھی۔ مگر وہ میری خاطر ساکت تھی۔ میں سرحدی پٹی کے تقریباً سو گز اندر تھا۔ سادی دو سو گز آگے اور نشیب میں تھی۔ دریا کے پاس پاکستانی کنارہ اونچا تھا اور وہیں کہیں عبداللہ اور دوسرے موجود تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وسیم کیسے اس طرف آئے گا۔

”یہاں کوئی نہیں ہے..... ان کو کھواب آتے ہیں۔“ ایک فوجی نے گندی گالی کے ساتھ کہا۔ ”اس وقت

ہمیں دوڑاتے ہیں۔“

”ٹھیک۔“ سے دیکھ لے ورنہ وہ تیری ماں.....“ دوسرے نے مزید گند اگلی۔ وہ نچلے درجے کے اہلکار لگ

رہے تھے۔ جن کی زبان اور لہجہ دونوں ہی گندہ تھا۔ وہ بس نارنج گھمار رہے تھے اور انہوں نے ایک بار بھی سکون سے نارنج کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اسی تیزی میں ایک بار روشنی مجھ پر سے گزری تھی۔ مگر وہ مجھے دیکھ نہیں سکے

تھے۔ انہیں آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے مگر مجھے لگ رہا تھا کہ میں نہ جانے کب سے اس پوز میں تھا اور میری کرد و کر کے لگی تھی۔ میری اس وقت خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد دفع ہو جائیں۔ بالآخر انہوں نے واپسی کا فیصلہ کیا۔

”چل واپس.....“ پہلے والے نے پھر گالیوں کا ڈھیر اگلا اور مڑا تھا کہ اچانک ہی تاریخ کی روشنی میری طرف آئی اور اس بار اس نے دیکھ لیا۔

”یہ..... کیا ہے؟“

”کہاں کدھر؟“ دوسرے نے کہا۔

”انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہے۔“ میں نے عبد اللہ کو مطلع کیا۔ وہ دونوں پاگلوں کی طرح تاریخ کی روشنی اس طرف ڈال رہے تھے مگر خوش قسمتی سے دوبارہ روشنی مجھ پر نہیں آئی تھی۔ اگر میرا پاؤں بارودی سرنگ پر نہ ہوتا تو میں اس وقت ان کی طرف سے فارنگ کی پروا کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوتا۔ مگر میں بل بھی نہیں سکتا تھا۔ میرا پاؤں ہٹا اور سینکڑ سے بھی پہلے میرا جسم ٹکڑوں میں بٹ جاتا۔ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلا والا چلایا۔ ”وہ دیکھ دریا کے ساتھ۔“

میں گول مول ہوا تھا ان کی بات نے چونکایا اور میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سادی کو دریا کی طرف بھاگتے دیکھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بچانے کے لیے یہ حماقت کی تھی۔ وہ خود کار رائل کی حد میں تھی۔ میں نے بولٹ کھڑکنے کی آواز سنی اور عبد اللہ کو حکم دیا۔ ”شوٹ ہم..... جلدی۔“

عبد اللہ کا شوٹر ساتھی پہلے ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ میں نے سائیں کی آواز سنی پھر گولی گلنے کی آواز آئی۔ جیسے کسی سخت لکڑی پر پتھر مارا ہو۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک گر گیا تھا اور دوسرا جیب کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ابھی وہ جیب سے کچھ دور تھا اور چلا کر ڈرائیور کو خبردار کر رہا تھا۔ دوسری سائیں کی آواز آئی اور اس بار ڈرائیور جو جیب اشارت کرنے کی کوشش کر رہا تھا سیت پر ڈھیر ہو گیا۔ بچ جانے والا جیب تک پہنچا تھا مگر اسے اس میں سوار ہونا نصیب نہیں ہوا اور تیسری گولی اس کی پشت میں اتر گئی۔ وہ اچھل کر جیب کے جنگلے سے ٹکرایا اور پھر نیچے گر گیا۔ تب میں نے دیکھا سانسے پانی سے دوہیو لے برآمد ہو رہے تھے۔ سادی ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ان میں سے ایک سادی کے پاس رکا اور اسے لائف جیکٹ پہنانے لگا اور دوسرا میری طرف آیا۔

میں نے قامت اور چال سے اندازہ لگا لیا کہ وہ وسیم تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آلہ تھا جس کی ہلکی سی روشنی یہاں سے دکھائی دے رہی تھی۔ بھارتی فوجی مارے گئے تھے یا شدید زخمی تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خطرہ ٹل گیا تھا۔ اگر سنٹرل کمانڈ سے جیب سے رابطہ نہیں ہوتا تو جلد کوئی نہ کوئی ان کی خبر گیری کے لیے آتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مشکل سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جائے۔ مگر میں پوز کی مشکل سے نکل آیا تھا اور احتیاط سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کمر کو بہت سکون ملا تھا۔ وسیم سیدھا نہیں آ رہا تھا بلکہ وہ اس آلے سے زمین کو چیک کرتا آ رہا تھا۔ یہاں یقیناً مزید بارودی سرنگیں تھیں اور وہ ان سے محتاط تھا۔ بالآخر وہ میرے پاس پہنچ گیا۔ اس نے خوشدلی سے کہا۔ ”کیسے ہیں شہباز صاحب آپ کو دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“

”اس حال میں؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے میں اسے ابھی فکس کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور جھک کر میرے پاؤں کے آس پاس سے مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے بھی نائٹ ویژن پہن رکھی تھی اور چاقو سے مٹی کرید رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے ساتھ آنے والا سادی کو لائف جیکٹ پہنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب وہ دوسری کنارے پر چڑھے تو میں نے سکون کا سامان لیا تھا۔ سادی محفوظ ہوگئی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔

”ٹھیک ہے کوشش کر دیں اگر یہاں مزید انڈین آئے تو تم فوراً واپس چلے جاؤ گے۔“

وسیم نے جواب نہیں دیا اور اپنا کام کرتا رہا۔ ایک منٹ میں اس نے بارودی سرنگ کے آس پاس سے مٹی ہٹا لی اور دیر کیا کنارے ہونے کی وجہ سے اس پر مٹی کی تہہ چھانچ سے زیادہ آگئی تھی اور شاید اسی وجہ سے یہ نائٹ ویژن میں نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا اوپری حصہ چھوٹا تھا لیکن نیچے سے یہ خاصی بڑی تھی اور اپنی ساخت سے یہ بکتر شکن بارودی سرنگ لگ رہی تھی۔ چاقو سے مٹی کریدتے ہوئے وسیم نے اس کا وہ حصہ نکال لیا جو میرے پاؤں تلے دبا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”وسیم احتیاط سے۔“

”آپ فکر نہ کریں میں نے ان کا کورس کیا ہوا ہے، مجھے معلوم ہے یہ کیسے ناکارہ ہوتی ہیں۔“ اس نے کہا اور اب وہ چاقو کی نوک سے اس کی چٹائی پلٹ کے اسکو دکھول رہا تھا۔ ”یہ روسی ساختہ بارودی سرنگ ہے اور شکر ہے کہ روسی ہے کیونکہ میں اس کی ساخت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یورپی اور امریکی بارودی سرنگیں پوری طرح تیل ہوتی ہیں اور ان کی پلٹ کھولی نہیں جاسکتی ہے۔“

”اسے کھول کر کیا کرو گے۔“

”اس کا ڈیٹونیت ایک گزاری سے منسلک ہوتا ہے۔ ایک بار دباؤ آنے سے گزاری گھوم کرتن جاتی ہے اور جیسے ہی اس پر سے دباؤ ختم ہوتا ہے گزاری واپس اپنی جگہ آکر ڈیٹونیت کو چلا دیتی ہے اور وہ بارودی مواد اڑا دیتا ہے۔“ بولنے کے ساتھ ساتھ وہ نہایت پھرتی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے دومنٹ میں سارے اسکو کھول دیے اور اس کی بات سے مجھے اطمینان ہوا تھا کہ وہ اسے ناکارہ بنا سکتا ہے یقیناً وہ یہ کام کر سکتا تھا تب ہی کر رہا تھا۔ اس نے بہت احتیاط سے چاقو کی نوک سے پلٹ کے کنارے کو کرید کر واضح کرنا شروع کیا جو مٹی جم جانے سے تقریباً غائب ہو گیا تھا۔ یہ گول پلٹ اس گول پائپ کے گرد تھی جس پر میرا پاؤں ٹکا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”یہ اوپر کیسے آئے گی میرا پاؤں ہٹائے بغیر؟“

”اسے پورا نہیں نکالنا ہے صرف سرکانا ہے گزاری اس کے نیچے ہوتی ہے۔“ وسیم نے اپنا کام کرتے ہوئے کہا۔ اب اس نے نائٹ ویژن آف کر کے ایک چھوٹی پنسل نارچ نکال کر ان کی اور اسے منہ میں دبا کر نیچے جھک گیا۔ روشنی ہم دونوں کے درمیان تھی اس لیے امید تھی کہ دور سے نظر نہیں آئے گی۔ وسیم نے مجھے سیدھے کھڑے ہونے کہا تاکہ اسے کام کے لیے زیادہ جگہ مل سکے تو میں سیدھا کھڑا ہو گیا اس دوران میں میرا پاؤں سختی سے بارودی سرنگ پر جما ہوا تھا۔ میں نے دریا کے پار دیکھا۔ جہاں عبداللہ اور اب سادی بھی تھے۔ عبداللہ رابطے پر لیکن خاموش تھا۔ میں نے پلٹ کر جیب اور زمین پر پڑے بھارتی فوجیوں کی طرف دیکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کل دونوں ملکوں میں گرما گرم بیانات اور دھمکیوں کا تبادلہ ہوگا۔ چند دن بعد بھارتیوں کی طرف سے ہماری کسی پوسٹ پر فائرنگ کی جائے گی۔ بدلہ لینا ضروری تھا۔

اب وسیم خاموش تھا کیونکہ اس کام کا اہم ترین مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ اسے گراری کو اپنا کام کرنے سے روکنا تھا اور اس معاملے میں ذرا سی غلطی سرنگ کو اور اس کے ساتھ ہمیں بھی اڑا دیتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ وسیم کی جان بھی خطرے میں تھی۔ میں نے کہا۔ ”وسیم ایک منٹ رک کر میری بات سنو۔“

وہ ساکت ہو گیا اور پھر اس نے نارج بند کر دی۔ ”جی کیسے؟“

”تمہیں یقین ہے تم یہ کام سو فیصد کر لو گے۔“

”سو فیصد نہیں نوے فیصد یقین ہے۔“

”میں سو فیصد یقین چاہتا ہوں۔“

”آپ مجھے کرنے دیں اور اللہ سے دعا کریں۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا اور دوبارہ نارج روشن کرتے ہوئے نیچے جھک گیا۔ اس وقت میں نے سچ سچ دل کی گہرائیوں سے اللہ سے دعا مانگی کہ اگر میرا وقت آ گیا ہے تو میرے دوست کو محفوظ رکھنا۔ میں تیری رضا میں راضی ہوں۔ میں نیچے نہیں دیکھ رہا تھا۔ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وسیم پوری طرح جھکا ہوا تھا۔ اچانک دور اسی طرف سے پھر روشنی نمودار ہوئی اور اس طرف آنے لگی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”وسیم کوئی اس طرف آ رہا ہے۔ گاڑی ہے۔“

”بس ایک منٹ اور۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا وہ پوری توجہ سے اپنا کام کر رہا تھا۔ گاڑی ابھی شاید ایک ڈیڑھ کلومیٹر دور تھی اور اسے یہاں آنے میں دو منٹ لگ سکتے تھے۔ یہ کچا علاقہ تھا اور یہاں کوئی گاڑی تیز رفتاری سے نہیں چل سکتی تھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد بارودی سرنگ سے کٹ کی آواز آئی اور وسیم نے نہ جانے کب سے رک سانس لیا۔ اس نے کہا۔ ”گراری کاٹ دی ہے، اب آپ اللہ کا نام لے کر پاؤں بٹائیں۔“

”وسیم تم دور چلے جاؤ کم سے کم دس قدم۔“

”آپ.....“

”بحث مت کرو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”گاڑی قریب آ گئی ہے۔“

وسیم نے اس بار قیام کی اور مجھ سے دس قدم دور چلا گیا۔ میں نے کلمہ شریف پڑھا اور پھر اللہ کا نام لے کر بارودی سرنگ سے پاؤں بٹا دیا۔ ایک دھماکا ہوا، لیکن یہ بارودی سرنگ کا دھماکا نہیں تھا بلکہ آنے والی گاڑی کی طرف سے فائر کیا گیا تھا اور گولی مجھ سے ذرا فاصلے سے گزری تھی۔ میں نیچے جھکا اور جھکے جھکے ہی تیزی سے دریا کی ریت کی طرف بڑھنے لگا۔ میری نظر زمین پر مرکوز تھی۔ میں ایک بارودی سرنگ سے بچ کر دوسری کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اب عقب سے خود کار رائل گرنج رہی تھی مگر اس کا نشانہ میں نہیں تھا۔ آنے والی گاڑی پہلی جیب کے ساتھ رکی اور اس کے ساتھ ہی عبداللہ کا ساتھی اسنا پھر حرکت میں آ گیا۔ نیچے اترنے والا جھکے سے واپس گاڑی میں گر ا تھا اور اس کی رائل جوشیلے اگل رہی تھی خاموش ہو گئی۔ وسیم دریا کے کنارے پہنچ گیا تھا اور میں ریت تک پہنچتے ہی تیز رفتاری سے جھکے جھکے بھاگا تھا۔

اب عقب سے دو تین ہتھیار رہ رہ کر گولیاں برسا رہے تھے۔ پھر ایک اور اسنا پھر کا نشانہ بنا تو ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ فائرنگ بھول کر تیزی سے واپسی کی راہ پکڑ چکے تھے۔ عبداللہ کی مضطرب آواز سنائی دی۔

”جلدی کریں یہاں بھی کچھ لوگ آرہے ہیں۔“

”ادھر کی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جان کا خطرہ تو نہیں ہوگا۔“

”جلدی آئیں۔“ وسیم نے کہا اور پانی میں اتر گیا۔ میں نے دیکھا کہ حسینی والا بارڈر روڈ کی طرف سے روشنیاں اس طرف آرہی تھیں اور میں پانی کو دیکھ گیا۔ پانی تقریباً سو گز کی پٹی میں بہہ رہا تھا اور رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ وسیم آگے جا رہا تھا اور میں اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ دو منٹ میں ہم دوسری طرف تھے اور اسی لمحے بھارتی سرحد کی طرف ایک گاڑی آکر رکی تھی اس پر لگی سرچ لائٹ گھوم رہی تھی۔ اس کی روشنی سے بچنے کے لیے ہم جھکے جھکے بھاگنے لگے اور پھر اسنا پیر نے کام دکھایا اس نے سرچ لائٹ ہی گل کر دی۔

”اتنا سچا نشانہ۔“ میں نے ہانپتے ہوئے اسے داد دی۔

”ابھی آپ نشانچی کو دیکھیے گا۔“ وسیم بولا۔ اس کا سانس ہموار تھا حالانکہ وہ تیر کر آیا بھی تھا۔ میری طرح وہ

بھی سر تا پا سیاہ لباس میں تھا۔ میں نے پانی سے نکلتے ہی تینوں موبائل پانی میں پھینک دیئے تھے۔ اگر میں یہاں سکیورٹی فورس کے ہتھے چڑھتا تو ایسی کوئی چیز میری مشکلات میں اضافہ کر سکتی تھی۔ عقب میں بھارتی فائرنگ کر رہے تھے مگر یہ اندھا دھند تھی کیونکہ انہیں کوئی نظر تو آ نہیں رہا تھا اس کے باوجود ہم خطرے کی حد میں تھے اس لیے تیز رفتاری سے دریا کے پٹے پر چڑھے اور یہاں زمین پر گر کر چاروں ہاتھوں پاؤں سے ریپکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کچھ آگے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ پشت جب نشیب کی طرف ہوا تو ہم کھڑے ہو گئے۔ اب خطرے کی حد سے باہر تھے۔ میں نے پلٹ کر بھارتی سرزمین کی طرف دیکھا جس سے بالآخر میں جان چھڑانے میں کامیاب رہا تھا اور جو پیر تسمہ پا کی طرح میری پشت سے چٹ گئی تھی۔ جب ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو وہاں عبداللہ اور اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ خطرے سے نکلتے ہی وسیم مجھ سے یوں لپٹ گیا جیسے میرے وجود کا ایک حصہ بن جانا چاہتا ہو۔ وہ رو رہا تھا۔ میں بھی رو رہا تھا۔ ہم بیٹو کو یاد کر رہے تھے۔ مگر عبداللہ نے اپنے حواس برقرار رکھے تھے اس نے کہا۔

”یہاں سے نکلیں، میرا خیال ہے ریجنرز کا کوئی پیدل دستہ اس طرف آرہا ہے وہ بے دریغ فائر کر دیتے

ہیں۔“

عبداللہ کے ساتھ وسیم کے ایک ساتھی نے ایک عجیب ساخت کی جدید گن اٹھا رکھی تھی اور پھر میں اسنا پیر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مانی تھا۔ اس نے شانے سے لیپ ٹاپ بیگ لٹکایا ہوا تھا۔ علیک سلیک کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس لیے ہم تیزی سے اس طرف موجود کھیتوں میں گھس گئے۔ سادی پہلے ہی جا چکی تھی۔ مانی کے ہاتھ میں ایک آلہ تھا اور وہ اس پر دیکھتے ہوئے ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ سب نے نائٹ ویژن چڑھائے ہوئے تھے سوائے مانی کے، کھیتوں میں مکئی کی فصل کاشت کی گئی تھی اور اس کے پودے تین فٹ تک اونچے ہو گئے تھے اور یہ اسی صورت میں ہمیں آڑ دے سکتے تھے کہ ہم جھک کر چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتے مگر اس کی ضرورت نہیں آئی۔ میں نے ذرا آگے ہو کر مانی کے ہاتھ کے آلے کو دیکھا یہ ٹیپ سائز کا تھا اور اس پر دو مختلف بجھوں پر چند سرخ نقطے حرکت کر رہے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے مانی سے پوچھا۔

”مین ڈیٹیکٹر۔“ اس نے کہا۔ ”ایک کلومیٹر کے علاقے میں موجود افراد کی نشان دہی کر سکتا۔ یہ ہم ہیں۔“ اس نے سرخ نقطوں کے ایک گروپ کی طرف اشارہ کیا اور پھر دوسرے گروپ کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ وہ ہیں جو اس طرف آرہے ہیں۔ یہ ہم سے کوئی نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔“

”سادی کہاں ہے؟“ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

”وہ کمال کھوکھر کی حویلی جا چکی ہے۔“

”یہ کمال کھوکھر کیسا آدمی ہے؟“

”اسٹیکر اور رساگیر ہے۔ ادھر کا مال ادھر کرنے کا ماہر ہے۔ وسم سے اس کے تعلقات اسی وجہ سے

ہیں۔“

”کیا اس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے؟“

”وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کیا ہوں اس لیے کسی شرارت سے پہلے ہزار بار سوچے گا۔“ وسم نے جواب دیا۔ ”ویسے آپ فکر نہ کریں، ہمارے ساتھ آٹھ بندے ہیں، میرے، عبداللہ اور مانی کے علاوہ۔ دو گاڑیاں ہیں اور اسلحہ تو آپ دیکھ چکے ہیں۔“

”اسی گن سے فائرنگ کی جارہی تھی؟“ میں نے وسم کے آدمی کی پشت پر گلی گن کی طرف دیکھا۔ وہ آگے جا رہا تھا۔

”بالکل یہ مکمل طور پر خود کار ہے اور اس کی ریج پندرہ سو میٹرز ہے۔ سات آٹھ سو میٹرز تو اس کے لیے فاصلہ ہی نہیں ہے۔“

”اسے کون چلا رہا تھا یہی؟“ میں نے گن اٹھانے والے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”مانی۔“ وسم نے غر سے کہا۔ ”یہ کمپیوٹر انڈز گن ہے اور بلوٹھ کی مدد سے کسی بھی لیپ ٹاپ سے کنٹرول کی جاسکتی تھی۔ ہم میں سے کمپیوٹر کا چھیتا مانی ہے اس لیے اسے ساتھ لایا اور اس نے کمال کر دیا، ایسے نشانے لیے کہ دوسری گولی چلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔“

یہاں ہمیں کم فاصلہ طے کرنا پڑا تھا اور دو کلومیٹرز بعد ہی فٹو ہی والا میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ فیروز پور روڈ کے ساتھ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کمال کھوکھر کی حویلی گاؤں میں تھی۔ شروع میں اکا دکا گھر آئے جو کھیتوں کے ساتھ بنے ہوئے تھے اور پھر گاؤں کی خاص آبادی آئی جو غریب غراب پر مشتمل تھی، ہم اس کے ساتھ ساتھ چلتے گاؤں اور انڈین سائیڈ کے درمیان واقع بڑے فارم ہاؤس جیسے قطعات کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک بڑے مکان تک آئے۔ چاروں طرف سے اونچی دیوار والے احاطے اور اندر گھنے درختوں کے درمیان ایک پرانے طرز کا سرخ اینٹوں اور پٹی چھت والا مکان تھا۔ اس پر پکی چھت تھی۔ گیٹ پر ہلکی سی دستک دی تو ایک چھوٹی کھڑکی سے کسی نے باہر جھانکا اور عبداللہ کو دیکھ کر چھوٹا دروازہ کھول دیا تھا۔ ہم اندر آئے تو وسیع صحن میں چار پائیاں پڑی تھیں اور ان پر درجن سے بھی آدمی لوگ لیٹے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ وسم کے آدمی تھے اور باقی کمال کھوکھر کے۔ سب نے اٹھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

پھر ہم اندر آئے جہاں ایک دیہاتی اسٹائل کی نشست گاہ میں ایک بھاری بھر کم فضا دھوتی اور پگڑ

باندہ۔ بیٹھا تھا۔ یہ کبھی نیشن میرے لیے نیا نہیں تھا خود اپنے گاؤں میں کئی بزرگوں کو اسی حلے میں دیکھ چکا تھا۔ تقریباً پچاس سال کا کھجڑی ہو جانے والے بالوں اور متورم آنکھوں والا شخص تھا۔ اس نے اٹھ کر مجھے اپنی توند سے لگایا۔ ”اودہ جی شہباز صاحب..... خوش قسمتی کہ آپ کا دیدار ہوا، خادم کو کمال کھوکھر کہتے ہیں۔ مجھے آپ اپنا فین سمجھیں۔“

وسیم نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ کھوکھر صاحب آپ کو جانتے ہیں یہ تو صرف نام سن کر دل و جان سے راضی ہو گئے۔ اس طرف جواتا سکون تھا تو یہ کھوکھر صاحب کا ہی کمال تھا۔“

”میں کیا جی اور کیا میرا کمال۔“ اس نے انکساری سے کہا۔ ”آئیں بیٹھیں جی۔ آپ کے دونوں طرف اتنے چہرے ہیں کہ بس.....“

”حالانکہ میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“

وہ اچھل پڑا۔ ”کیسی بات کرتے ہیں جی، آپ نے تو کشتوں کے پٹے لگا دیے، بھارتیوں کے، ہم سے زیادہ کون جان سکتا ہے آپ کو۔“

ہمارے بیٹھے ہی ایک شخص لسی کا بڑا جگ لے آیا اور اس کی خنکی اور مٹھاس نے گرمی اور تھکن دور کر دی تھی۔ یہاں تین بچے چل رہے تھے اور گرمی دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اندر میرے ساتھ صرف وسیم اور عبداللہ آئے تھے۔ مانی اور دوسرا آدی باہر رہ گئے تھے۔ کمال کھوکھر گپ شپ کے موڈ میں تھا لیکن وسیم نے سلیقے سے اسے بتایا کہ میں بہت مشکل مرحلے سے گزر رہا ہوں اور مجھے آرام کی اشد ضرورت ہے۔ اسی لیے اس نے جلدی سے کہا۔ ”کیوں نہیں جی آپ آرام کرو کل صبح بات ہوگی۔“

ہمارے لیے اندر دو کمرے مخصوص تھے۔ ایک میں سادی موجود تھی۔ اس بے چاری نے پورے لباس پر چادر بھی لی ہوئی تھی کیونکہ لباس بہت چست تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ہم آگئے ہیں کیونکہ مانی وہاں موجود تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح اکیلے ہی بھارتیوں کے کشتوں کے پٹے لگا دیے تھے۔ عملی زندگی میں وہ پستول پکڑ بھی نہیں سکتا تھا مگر کمپوزنگ کی مدد سے اس نے وہ جدید ترین مگن پوری مہارت سے استعمال کی تھی۔ سادی لپک کر میرے پاس آئی۔ ”اللہ کا شکر ہے آپ ٹھیک ہیں۔“

”تم جیسی بہن دعا کرے گی تو اللہ کیوں نہیں سنے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا احسان ہے کہ میں تمہیں لانے میں کامیاب رہا۔ تم ٹھیک ہوتا؟“

”ہاں ورنہ ایک بندہ ہوش و حواس کو خیر باد کہنے والا تھا۔“ عبداللہ نے لقمہ دیا تو وسیم اور سادی جھینپ گئے۔ میں نے کہا۔

”سادی تم آرام کرو۔“ وسیم ہمارے ساتھ آنے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ ”تم کہاں تم بھی آرام کرو۔“

میں، عبداللہ اور مانی دوسرے کمرے میں آئے۔ یہاں چار پائیاں تھیں اور ہر چار پائی کے سر ہانے بڑا پیدٹل فین لگا ہوا تھا۔ یہ بیک وقت مچھروں اور گرمی کے لیے تھا۔ یہاں بڑے خوفناک قسم کے اودکھی کے سائز کے مچھر تھے۔ جو نہ جانے کون سا راگ گاتے ہوئے ناک اور کان میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ٹوپی میں

پہلے ہی اتار چکا تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی دیسی اسٹائل کا غسل خانہ اور لیٹرین تھا مگر صاف ستھرا تھا اور یہاں پانی کے ساتھ صابن اور تولیہ بھی دستیاب تھا۔ میں نے خود کو صاف کیا۔ عقل مند عبد اللہ آتے ہوئے میرے کپڑے لیتا آیا تھا۔ میں نے موسم کی مناسبت سے پینٹ اور ٹی شرٹ لی۔ میرا خیال تھا کہ عبد اللہ روداد معلوم کرنا چاہے گا مگر اس نے کہا۔ ”آپ سو جائیں صبح سویرے ہمیں یہاں سے نکلنا ہے خطرہ ابھی ملا نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈیوڈ شانے رابطہ کیا تھا۔ اسے معلوم ہے آپ یہاں آرہے ہیں اس نے کہا کہ وہ آپ کی واپسی کی راہ میں روڑے نہیں اٹکائے گا لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ نے اس سے ایک معاہدہ کیا تھا۔“

”معاہدہ۔“ میرا الجھت ہو گیا۔ ”اس نے احقانہ انداز میں پلان بنایا اور فشی دل جی جیسے خبیث شخص پر بھروسہ کیا۔ اس نے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بیوہ اسی کی وجہ سے مارا گیا اور وہ مجھے معاہدہ یاد دلایا رہا ہے۔ حساب تو مجھے اس سے لینا ہے۔“

”اس نے اور باتیں بھی کی ہیں۔ مرشد کے حوالے سے بھی اور آپ کے دوسرے مسائل کے بارے میں بھی۔“

”کیا کمال کھوکھر کو علم ہے کہ ہم صبح سویرے جا رہے ہیں وہ تو مجھ سے کپ شپ کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

”اسے وسیم بتا دے گا۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”حساب کتاب بھی وہی کرے گا۔“

میں چونکا۔ ”حساب کتاب.....؟ وسیم نے اسے ادائیگی کی ہے؟“

عبد اللہ مسکرایا۔ ”شہباز صاحب، اس جیسے لوگ پیسے کے لیے اپنی ماں بیچ دیں اور باپ کا کام مفت میں نہ کریں۔ وسیم نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔“

میں چار پائی پر گر گیا جس پر روٹی کا گدا بچھا ہوا تھا۔ مانی خاموش تھا اس نے بیوہ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ حالانکہ بیوہ سے اس کی ہم عمری والی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ سب سمجھ رہے تھے کہ میں ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا اور ٹوٹا ہوا تھا۔ فی الحال مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ میرے لینے ہی عبد اللہ نے لائٹ بند کر دی تھی اور اب کھڑکی سے صحن کی جلنے والی روشنی اندر آرہی تھی۔ میرا ذہن انتشار یا اضطراب کی حالت میں نہیں تھا۔ بلکہ میں ایک سکون آمیز کیفیت میں تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ میں خطرے سے دور اپنی سرزمین پر آ گیا تھا۔ میں سادی کو واپس لانے میں کامیاب رہا تھا۔ میں جو دعویٰ کر کے گیا تھا اسے سچ کر دکھایا تھا۔ مگر میں نے اس کامیابی کی بہت بھاری قیمت ادا کی تھی۔ میں سادی کو لے آیا تھا اور بیوہ کو وہیں چھوڑ آیا تھا۔ بیوہ جو میرا کچھ نہیں تھا اور جو میرا سب کچھ تھا۔ اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے سویا تو خواب میں بھی بیوہ دکھائی دیا۔

وہ ایک چھوٹے سے کچے مکان میں اپنے جیسے چار پانچ لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور چپک کر بولا۔ ”شوہن اب ہم اپنے گھر میں ہے..... یہ ہمارا بہن بھائی ہے..... ہمارا ماما پتا بھی ادھر ہے۔“

”مبارک ہو بیوہ تم اپنے گھر میں آ گئے۔“ میں نے کہا۔

”پر ہم آپ کو بہت مس کرتا ہے، آپ سب کو..... ہمیشہ مس کرے گا۔“

”بیٹو ہم بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“ میں نے کہا۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا اور میرے ہاتھ پر رکھا اور اسی لمحے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس جگہ گیا جہاں خواب میں بیٹو نے ہاتھ رکھا تھا۔ صبح ہو چکی تھی اور کھڑکی کے باہر روشنی جھلکنے لگی تھی۔ عبداللہ اپنی چار پائی پر نہیں تھا اور مانی خراٹے لے رہا تھا۔ چند منٹ بعد عبداللہ غسل خانے سے برآمد ہوا بولا۔ ”صبح بہ خیر۔“

”صبح بہ خیر۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”وسیم جاگ گیا ہے؟“

”ہاں اور اسے جگانا ہے۔“ عبداللہ نے مانی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ مشکل کام ہوگا کیونکہ یہ بارہ ایک بجے سو کر اٹھنے والی مخلوق ہے۔“

جب میں غسل خانے جا رہا تھا تو عبداللہ مانی کی ناک میں بتی گھمانے لگا تھا۔ ایک چھینک کی آواز آئی تھی اور مانی نے احتجاج کیا۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں؟“

”ناک میں دم۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”تمہیں اٹھانے کا یہی ایک طریقہ سمجھ میں آیا اب اٹھ جاؤ ورنہ یہیں رہ جاؤ گے۔ خود سے آنا پڑے گا۔“

میں واپس آیا تو مانی اٹھ گیا تھا اور اپنی عینک کے پیچھے آنکھیں چھپکا رہا تھا۔ وسیم بھی آگیا تھا اور وہ تیار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ناشتہ آ رہا ہے، بس کرتے ہی نکلتے ہیں۔ ایک گاڑی تو چلی گئی ہے۔“

کمال کھوکھر کا ایک ملازم ناشتہ کا تھا لے آیا جس میں دیسی ساخت کا مقوی اور بھر پور ناشتہ تھا۔ میں نے مانی، عبداللہ اور وسیم کے ساتھ مل کر اس سے بھر پور انصاف کیا اور سادی نے اسے کھانے سے صاف انکار کر دیا تھا اس لیے اسے جبراً دودھ کا بڑا گلاس پلایا گیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرہ گلاب کی طرح کھل گیا تھا۔ مانی سادی کو اور عبداللہ وسیم کو چھیڑ رہا تھا۔ میں نے ناشتے کے دوران وسیم سے پوچھا۔ ”تم نے کھوکھر کو کتنی ادائیگی کی ہے؟“

”دس لاکھ دیئے ہیں، آپ کو واپس لانے کے لیے اگر ہمیں اپنے پاس موجود ایک ایک پائی خرچ کرنا پڑتی تو ہم اس کے لیے بھی تیار تھے۔“

”شہباز صاحب کو یا پھر.....“ عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”تم جو چاہے سمجھو۔“ وسیم نے جھینپ کر کہا۔

”تم نے اچھا کیا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے کھوکھر جیسے بندے کا احسان لینا گوارہ نہیں ہے۔“

”جو چیز آپ کو گوارہ نہیں اسے ہم کیسے گوارہ کر سکتے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس لیے میں نے اسے منہ مانگا معاوضہ دیا۔ اپنے پرانے تعلق کا حوالہ بھی نہیں دیا۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم باہر آئے تو سورج طلوع ہو چکا تھا اور دن ابھی سے گرم تھا۔ کھوکھر غائب تھا مگر ہم نے کون سا اس سے علیک سلیک کرنی تھی اس لیے ہم بلا تکلف وہاں سے نکل آئے۔ دوسری گاڑی بڑی نسان وین تھی۔ اس میں آگے پیچھے دو سیٹوں کے ساتھ عقب میں سامان رکھنے کا بڑا حصہ تھا جو ہموار تھا۔ اس میں وسیم کے دونوں آدمی مع سامان کے آگئے تھے۔ ڈرائیونگ عبداللہ نے سنبھالی تھی اور میں اس کے ساتھ تھا۔ عقب میں سادی، وسیم اور مانی تھے۔ چودہ سو سی سی کے طاقتور انجن والی یہ وین ہائی وے پر آتے ہی سوکھو میٹر زنی گھننے کی

رفار سے دوڑنے لگی تھی۔ اس رفتار پر اندر پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔ میں نے تعریف کی تو عبداللہ نے فخر سے بتایا کہ حال ہی میں اس نے لی تھی۔ اباز چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔ بانو کو حویلی بھیج دیا تھا اور وہاں بہت خوش تھی۔ حویلی کے نام پر مجھے یاد آیا کہ بہت سے لوگ میرے منتظر تھے۔ سادی نے رات میں ہی حویلی کا کال کر کے بات کر لی تھی۔ اب میں نے نمبر ملایا اور سب سے بات کی سوائے اس ایک ہستی کے جس سے میں سب کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جب کال ختم ہوئی تو سادی نے کہا۔ ”سوریا سے کیوں بات نہیں کی؟“

”سمجھا کرو۔“ وسیم نے کہا۔ ”شہباز صاحب پرانے زمانے کے وضع دار لڑکے ہیں سب کے سامنے بات نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک کہا یا تم سب خوش قسمت ہو جن کی کشتیاں پارلگ چکی ہیں۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”ساتھ بیٹھے ہو اور ہم بات بھی نہیں کر سکتے۔“

اس بار سادی اور وسیم جھپینے تھے۔ مانی ہنسا پھر اچانک چپ ہو گیا۔ اس کے اس طرح چپ ہونے سے سب ہی سمجھ گئے تھے کہ اسے بیوہ کی یاد آئی تھی۔ اسے دنیا سے گزرے آج تیسرا دن تھا۔ ہم جن حالات سے دوچار تھے وہاں کوئی بھی دن اور کوئی لمحہ آخری لمحہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود بہت سے مواقع پر ہم موت کے منہ سے نکل آئے تھے۔ مگر بیوہ کا وقت آ گیا تھا اور وہ چلا گیا۔ حالات نے ہمیں سخت جان بنایا تھا۔ ہم لاشوں کے سامنے بیٹھ کر بھی کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے رہے تھے اور یہ عادت بن گئی تھی اس لیے آج بھی ہم نے ڈٹ کر ناشتہ کیا تھا اور اس وقت لمبی مذاق کر رہے تھے مگر بیوہ کی یاد اور بات آتے ہی سب کے دل جو جھل اور اداس ہو گئے تھے۔ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ مانی اور وسیم کے چہرے اتر گئے تھے۔ سادی کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”بیوہ بہادروں کی طرح جیا اور بہادروں کی طرح مر گیا۔ ہمیں دکھی ہونا چاہیے مگر سوگ نہیں منانا چاہیے۔ یہ اس کی تو بین ہوگی۔“

پھر میں انہیں بتانے لگا کہ ہم پر کیا گزری تھی۔ آخری بار جب ان لوگوں سے بات ہوئی اور اس کے بعد رابطہ ہونے تک ہم کیا کرتے رہے۔ کیسے مراحل سے گزرے۔ ایک گھنٹے بعد جب میں نے اپنی روداد ختم کی تو لاہور آ گیا تھا اور ہم لاہور کے مضافات سے ہوتے ہوئے جی ٹی روڈ پر آ گئے تھے۔ بیوہ کے آخری لمحات کا ذکر کرتے ہوئے میں دکھی ہو رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو سادی بتانے لگی کہ اس پر کیا گزری تھی۔ میں باہر گزرتے مناظر دیکھ رہا تھا۔ ہزاروں لوگ سینکڑوں گاڑیاں ہمارے آس پاس تھیں۔ یہ سب عام لوگ تھے۔ میں ان سے الگ تھا۔ میں ان کی طرح عام زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ دشمنوں نے اور ان کی دشمنی نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں عام زندگی سے ہٹ جاؤں۔ ابھی کچھ دشمنوں سے یوں نجات ملی کہ وہ زندگی سے نجات پا گئے۔ ساتھ ہی مجھے بیوہ جیسے دوست سے محروم ہونا پڑا لیکن ابھی ڈیوڈ شا اور مرشد جیسے دشمن باقی تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان سے نمٹنے کے لیے مجھے اپنے کسی اور دوست کی قربانی نہ دینی پڑے۔

”شہباز صاحب۔“ اچانک عبداللہ نے زور سے کہا تو میں چونکا تھا۔

”سوری میں نے سنا نہیں۔“

”کہاں کھوئے ہیں، میں کہہ رہا ہوں کچھ دیر کرفریش نہ ہو جائیں؟“

نوج رہے تھے اور ہم جہلم کے پاس تھے۔ یہاں جی ٹی روڈ کے ساتھ کئی اچھے ریسٹوران تھے۔ میں نے سر ہلایا تو عبداللہ نے گاڑی ایک ریسٹوران کی طرف موڑ دی۔ یہ اعلیٰ درجے کا اے سی ریسٹوران تھا اس لیے ہم بس کچھ دیر کے لیے گرمی برداشت کر کے اندر اے سی کی خشکی میں آگئے تھے۔ وسم کے آدمی اصرار کر کے گاڑی میں رک گئے انہیں ہمارے ساتھ آنا مناسب نہیں لگا تھا۔ پھر گاڑی میں بہت ساقیتی اور ممنوعہ سامان تھا اس کے ساتھ رہنا بھی ضروری تھا۔ پیٹ سب کے بھرے ہوئے تھے اس لیے ریفریجمنٹ چائے اور کافی کا آرڈر دیا۔ ان دونوں کے لیے چائے بھجوانے کو کہہ دیا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں نے وسم سے پوچھا۔ ”یہاں کے حالات کیسے ہیں، تم لوگ مرشد کے خلاف کوئی کارروائی کرنے جا رہے تھے۔ بعد میں مجھے پوچھنے کا خیال نہیں رہا تھا۔“

ویم مسکرایا۔ ”ہم نے اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہے..... نادر کے مرنے کے بعد وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا اب اسے ذرا سکون ہے۔“
”وہ کیسے؟“

”میرے آدمیوں نے درگاہ مرشد کی جاسوسی کی اور ہمیں پتا چلا کہ وہاں نہ صرف منشیات آتی اور آگے بھیجی جاتی ہے بلکہ تخریب کاروں کو اسلحہ بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ سارا غیر ملکی ساخت کا اسلحہ ہوتا ہے۔ ہم نے ایک کیپ اڑادی جب وہ درگاہ کے خفیہ خانوں میں آف لوڈ ہو رہی تھی۔“
میں حیران ہوا۔ ”یہ تو بڑی کارروائی ہے اس کا چرچا نہیں ہوا؟“

”کیوں نہیں ہوا، یہ چار دن پہلے کی بات ہے اور اب تک میڈیا اور اخبارات میں اس کا چرچا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ خفیہ اداروں نے وہاں کارروائی کی ہے اور درگاہ سے متعلق کئی اہم افراد کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“
”یہ اچھی خبر ہے اور مرشد کا کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں..... وہ سیاست دان ہے اور حکومت میں شامل نہیں ہے مگر فی الحال اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ اس کے اور درگاہ کے خلاف سازش ہے۔“

”اسلام دشمنان، یہودی ایجنٹوں کی۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
”اس پر دباؤ آیا ہے۔“ عبداللہ بولا۔ ”اس کارروائی میں اس کے درجن بھر اہم ترین کارندے مارے گئے جو اسلحے اور منشیات کی پینڈنگ کرتے تھے۔“

”فاضلی کا کچھ پتا چلا؟“
”نہیں وہ غائب ہے۔“ وسم بولا۔ ”میرا خیال ہے مرشد نے اپنی اس ناجائز اولاد کو کہیں اور بھیج دیا ہے۔“

”وہ کہیں نہیں جائے گا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے دماغ میں مرشد کی دولت اور جاہلاد پر قبضے کا سودا سمایا ہوا ہے اور وہ مرشد سے بھی نفرت کرتا ہے جب سب اس کے ہاتھ میں آئے گا تو وہ اسے بھی ٹھکانے لگا دے گا۔“

”آخری اطلاعات کے مطابق وہ شدید زخمی تھا اور مرشد ہاؤس میں اس کا علاج جاری تھا لیکن اس کے

بعد وہ منظر عام پر نہیں آیا حالانکہ مرشد سے ہمارے کئی ٹاکرے ہو چکے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔
 ”ممکن ہے اس کا زخم ٹھیک سے نہ بھرا ہو یا وہ مر گیا ہو اور مرشد نے اسے خاموشی سے دفن دیا ہو۔ وہ اس کی جائز اولاد تو تھا نہیں جو وہ اسے دھوم دھام سے دفناتا۔“ عبداللہ کی بات پر سب مسکرانے لگے تھے۔ اسی دوران میں ویٹر چائے کافی اور کھانے پینے کا ہلکا پھلکا سامان لے آیا تھا۔ وسیم کے آدمیوں کے لیے گاڑی میں ہی بھجوا دیا تھا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہوا ہو۔“ سادی نے دل سے کہا۔ ”ہمارے سارے دشمن ایسے ہی مر جائیں، ہماری جان چھوٹ جائے۔“

”اگر دشمن کو سنوں سے مرنے والے ہوتے تو ہماری خواتین کافی ہیں۔“ وسیم ہنسا۔
 ”نہیں یار دعاؤں کا بہت اثر ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ جو اللہ کا کرم ہوتا ہے اس میں ہمارے پیاروں کی دعائیں ہی تو شامل ہوتی ہیں ورنہ ہمارے ذاتی اعمال کیا ہیں؟“ میں نے کہا تو عبداللہ نے سر ہلایا۔
 ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”اس کے لیے بھی دعا کرنے والی آگئی ہے۔“ وسیم نے شرارت سے کہا تو میں انجان بن گیا۔
 ”اچھا مبارک ہو کیا رشتہ طے ہو گیا ہے تمہارا؟“

”شہباز صاحب کس کی باتوں میں آرہے ہیں۔“ عبداللہ نے جھینپ کر کہا۔
 ”اب شہباز صاحب خود آگئے ہیں تو دیکھ لیں گے۔“ وسیم نے کہا۔ ”ویسے موصوف نے حویلی کا ایک ہی چکر لگایا تھا مگر جب سے بانو گئی ہے یہ دوبار تشریف لے جا چکے ہیں۔“
 ”کام کے سلسلے میں۔“ عبداللہ نے صفائی پیش کی۔ ”اور مشکل سے چند گھنٹے بعد واپس آگیا۔“
 ”تو بانو سے ملاقات نہیں ہوئی؟“ وسیم نے چیلنج کیا۔

”ہوئی..... سب سے ہوئی تو اس سے بھی ہوگئی۔“ عبداللہ نے جان چمڑانے کے لیے کہا۔ ”مجھ سے تو ماں جی اور سویرا جی بھی ملنے آئی تھیں۔“

”بانو کیسی ہے..... وہاں ایڈ جسٹ ہوگئی؟“

”ایسی ویسی۔“ وسیم نے کہا۔ ”سنا ہے نفل پڑھے ہیں جان چھوٹنے پر۔“

آپس میں نوک جھونک کے دوران چائے اور دوسری چیزوں سے انصاف کیا گیا اور ہم تازہ دم ہو گئے۔
 واش روم گئے اور دوبارہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ دس بجے روانہ ہوئے اور بارہ بجے کے قریب پنڈی پہنچ گئے تھے۔ ایک بار پھر میں ان جانی پہچانی فضاؤں میں تھا جن کی خوشبو میری سانسوں میں بسی ہوئی ہے۔ اتفاق کی بات ہے جب ہم یہاں پہنچے تو گرج چمک کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی اور ہم خاصی سست رفتاری سے موسم سے لطف اندوز ہوتے فیض آباد والی کھٹی تک پہنچے تھے۔ سیر کہیں گیا ہوا تھا۔ اس نے عبداللہ کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ ذرا دیر سے آئے گا۔ سادی تھکی ہوئی تھی اس لیے وہ فوراً اوپر چلی گئی۔ صوفی نے ہمارا استقبال کیا اور دوپہر کے کھانے کا پوچھا۔ اسے کھانے کا بتا کر ہم اوپر آئے۔ میرا کمر اوپا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ سامان بھی ویسا ہی رکھا تھا۔ وسیم نے کہا۔ ”آپ نہ لیں..... جب تک کھانا بن جائے گا۔“

”بالکل۔“ عبداللہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور ایک نیا موبائل فون میری طرف بڑھایا۔
 ”یہ آپ کا موبائل ہے اس میں سارے نمبر مع اس فون کے نمبر کے فیڈ ہیں۔“
 ”یہ تم نے اچھا کیا۔“ میں نے کہا اور ان کے جاتے ہی سویرا کا نمبر ملایا۔ اسے یقیناً میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ موبائل سے لگی بیٹھی تھی۔ اس نے پوری تیل جانے سے پہلے کال ریسو کی اور مرتعش لہجے میں بولی۔

”ہیلو۔“

”سویرا۔“ میں نے کہا تو وہ تڑپ گئی۔

”شہباز..... کہاں تھے آپ..... کیسے جی جی کر اور مرمر کر یہ وقت گزارا ہے۔“
 ”مجھے معلوم ہے کیونکہ خود میں نے بھی یہ وقت ایسے ہی گزارا ہے۔ جب موت کا یقین آ جاتا تو جی اٹھتا تھا اور جب جینے کی آس بندھتی تو موت سامنے آ جاتی تھی۔“
 ”بیٹو کا سن کر بہت افسوس ہوا۔“ اس کا لہجہ بھیگ گیا۔ ”کل سے ہم اس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔“

”اس کا وقت آ گیا تھا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”وہ مجھ پر قرض چھوڑ گیا۔ میری جان بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔“
 ”وہ ہم سے بھی یہی کہتا تھا کہ آپ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ آپ پر اپنی جان قربان کر دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔“

بیٹو سے ہوتی بات سادی تک پہنچی۔ سادی نے پہلے ہی ان سے بات کر لی تھی اور رونا دھونا بھی کر لیا تھا۔ ابھی اس کے واپس جانے یا نہ جانے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ سویرا نے بتایا کہ موتا بھی واپس آنا چاہ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ابھی ہم نے فیصلہ نہیں کیا ہے کہ خواتین کو یہاں بلانا ہے۔ ممکن ہے سادی کو بھی حویلی بھیج دیا جائے۔“

”ایک اطلاع اور ہے بلکہ خوشی کی خبر ہے۔ شاید اسی مہینے رفیق بھائی عتیق کا رشتہ شی کے لیے مانگنے آئیں۔“

”حالانکہ وہ تو ان کی امانت ہے۔“ میں ہنسا۔ ”فیصلہ اس کے دادا نے کرنا ہے۔“

”ہاں مگر آپ کو پتا ہے نہ دوسرے لوگ بھی شی کے امیدوار بن رہے ہیں۔ اس سے محبت میں نہیں صرف زمین کی خاطر، وہ عتیق سے محبت کرتی ہے اور رفیق بھائی اسے باپ کی طرح چاہتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے اچھا گھر ان کا ہی ہوگا۔ اس لیے اب طے ہوا کہ رشتہ آپا سے مانگا جائے گا اور وہ شی کی ماں کی حیثیت سے فیصلہ کریں گی تو کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوگا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ ایک بار میں نے شی پر اپنا حق کہا تو آپا نے ڈانٹ دیا تھا کہ اس کے اصل وارث اس کے دھھیال والے ہیں۔ وہی اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔“
 ”ہاں مگر اب گیند ہمارے کورٹ میں آ گئی ہے۔“ سویرا نے کہا۔ ”اس سال شی بی اے فائنل کے پیپرز

دے گی اور امکان ہے کہ آنے والے سرما کے فوراً بعد اسے رخصت کر دیا جائے گا۔“

”ایک رخصتی کا اور بھی تو امکان ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔

”کس کی رخصتی کا؟“ وہ انجان بن کر بولی۔

”بس ہے ایک رخصتی جس کا شدت سے انتظار ہے۔“

”کسے انتظار ہے؟“

”مجھے اور ایک ہستی اور ہے۔“ میں نے ذرا بے باکی سے کہا تو وہ شرما گئی۔

”پلیز شہباز ایسی باتیں نہ کریں۔“

”تم تو بات بھی نہیں کرنے دیتیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”میں نے آپ کی واپسی پر سونفل کی منت مانگ رکھی ہے کل سے پڑھنا شروع کر دیئے ہیں۔“

”سوریا تمہیں یقین تھا کہ میں واپس آؤں گا؟“

”یقین تھا اور اب بھی ہے لیکن دل خدشات سے خالی نہیں ہوتا ہے۔“

میری اور سوریا کی محبت اس پھول کی مانند تھی جو ابھی کھلا نہ ہو، جس کی خوب صورتی اور ناز کی بند پتھریوں میں ہو۔ جب ہم اکیلے میں بات کرتے تب بھی کھل کر نہیں کر پاتے تھے۔ وہ عورت تھی جو باحیا ہوتی ہے لیکن میں مرد ہوتے ہوئے بھی اس سے یوں بات نہیں کر پاتا جیسے کرنا چاہتا تھا۔ اس پر یوں حق نہیں جتا پاتا تھا جیسے جتنا چاہتا تھا۔ قصہ مختصر کہ ہمیں رومانی گفتگو نہیں آتی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم پھر دوسروں کی بات کر رہے تھے۔ سوریا نے شازیہ کے بارے میں بتایا کہ وہ ذہنی طور پر خاصی سنبھل گئی تھی اور اباجی نے ایک وکیل کے توسط سے اس کی جائیداد اور وراثت کا کس بھی فائل کر دیا تھا کیونکہ اس کے گھر پر کچھ رشتے دار قابض ہو گئے تھے۔ البتہ اسے بینک اکاؤنٹس اور اپنے باپ کے بزنس کا قبضہ مل گیا تھا۔ وہ آٹو ورکشاپ چلاتا تھا۔ ورکشاپ فی الحال ایاز کے سپرد کر دی گئی تھی اور اس کے معاملات وہی دیکھ رہا تھا۔ سوریا سے بات کر کے میں واش روم میں آیا۔ شاور کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

اب کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا تو سوچوں نے ذہن پر قبضہ کر لیا۔ مجھے سب سے پہلے ڈیوڈ شا کا خیال آیا۔ وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا شخص نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے میری مدد کا وعدہ کیا تھا وہ مکمل نہیں ہوا تھا اور یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں پھر بھی سادی کو لانے میں کامیاب رہا اور بد قسمتی مجھے بیٹو کی قربانی دینا پڑی۔ اگر ڈیوڈ شا کا منصوبہ درست ہوتا تو آج بیٹو زندہ ہوتا۔ اگرچہ میرا ہمیشہ سے یہ ایمان رہا ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور بیٹو کا وقت آ گیا تھا مگر یہ ایمان میرا تھا۔ ڈیوڈ شا جیسے لوگوں کا تقدیر پر ایمان ہوتا تو وہ انسانیت کے درجے سے کیوں گرتے۔ میں اس سے کھل کر کہہ سکتا تھا کہ بیٹو کا نقصان اس کی وجہ سے ہوا ہے، اب میں اس کی مدد کا پابند نہیں رہا تھا۔

دوسرا فرد جس کا خیال مجھے اب آیا تھا وہ فتح خان تھا۔ اس کے بارے میں یہ تاثر ہر بار مستحکم ہوتا جاتا تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ مکار اور عیار ہو گیا ہے لیکن اس بار اس نے جو کیا اس کا میرے ذہن میں دور دور تک شاہدہ لب نہیں تھا۔ اس نے مکاری کی انتہا کرتے ہوئے ششی دل جی سے ساز باز کر لی۔ وہ ہیروں کا دیوانہ تھا اور کنور

ہیلس میں اس سے کہیں زیادہ ہیرے تھے جن کے پیچھے وہ گزشتہ ایک عشرے سے زیادہ وقت خوار ہوا تھا اور وہ ہیرے آج تک اس کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ مگر یہ ہیرے بھی اس کی قسمت میں نہیں تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح ناکام و نامراد واپس بھاگا تھا۔ جن ہیروں کے پیچھے اس قدر قتل و غارت گری ہوئی۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے۔ کرنل جیمز ان سے بے خبر تھا اور میں نے بھی اسے باخبر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی ہیروں کے چکر میں پڑ کر وقت نہ گنوا دے۔ میں جلد از جلد سادی کو لے کر وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ فتح خان نکل بھاگا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ بچ گیا ہوگا۔ وہ اس معاملے میں جنگل کے جانوروں جیسی فطرت رکھتا ہے جو اپنی واپسی کے راستے کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ناکامی بھی ہو سکتی ہے اور اس نے پہلے ہی سوچ لیا ہوگا کہ ناکامی کی صورت میں اسے کیا کرنا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکا۔ ”آ رہا ہوں۔“

”آپ کا موبائل بیل دے رہا تھا۔“ باہر سے دسیم نے کہا۔ ”سفیر آ گیا ہے۔“

میں جلدی سے غسل مکمل کر کے اور کپڑے پہن کر باہر آیا۔ میرے بعد بیٹو سب سے زیادہ سفیر سے قریب تھا۔ دونوں میں نوک جھونک چلتی تھی مگر وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ سفیر میرے گلے لگ گیا اور ہم دونوں ہی خاموشی سے بیٹو کو یاد کرتے رہے۔ وہ رو رہا تھا اور میں شاید اپنے حصے کے آنسو بہا چکا تھا اس لیے اسے تھپکتا رہا۔ آخر سفیر کا دل ہلکا ہوا تو اس نے پوچھا۔ ”یہ سب کیسے ہوا یا؟“

میں اسے بتاتا رہا۔ یہ بھی بتایا کہ بیٹو نے آخری لحات میں اسے یاد کیا تھا۔ وہ اس سے معافی چاہ رہا تھا۔ سفیر نے سر دھام بھری۔ ”معافی تو مجھے مانگنی چاہیے تھی مگر وہ اتنی دور چلا گیا ہے کہ اب اس سے معافی بھی نہیں مانگ سکتا۔ میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی۔“

”ایسا نہیں یار، وہ سمجھتا تھا۔ تب ہی تو تمہیں یاد کر رہا تھا۔ تم نے اس سے کہا تھا کہ جیسے تم مونا کے بغیر نہیں رہ سکتے اس طرح اس کے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔“

”ہاں یار میں نے سوچا تھا کہ جب میں دہائی جاؤں گا تو اسے لے جاؤں گا۔ دسیم بھی ساتھ ہوگا۔ وہ سادی کو اپنی بہن سمجھتا تھا۔ ہم سب ساتھ رہیں گے۔ اگر ٹو شال ہوگا تو ٹو بھی ہمارے ساتھ ہوگا، پرانے دن زیادہ اچھے ہو کر لوٹ آتے مگر.....“

”پرانے دن آئیں گے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”کیا ہوا جو بیٹو ساتھ نہیں ہے، اس کی یادیں تو ساتھ رہیں گی نا۔“

”ہاں وہ ہمیشہ ساتھ رہیں گی۔“ سفیر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”چل نیچے کھانا لگ گیا ہے۔ بیٹو کی پسند کی ساری چیزیں بنی ہیں۔ آج ہم کھانا کھا کر اسے یاد کریں گے۔“

”جیسے گورے پی کر اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہی سمجھ لے۔“

”ٹو کہاں گیا تھا؟“

”کھانے کے بعد بتاتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ہم نیچے آئے جہاں ایک جوان العر عورت کھانا لگا رہی

تھی۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ بچن کی طرف چلی گئی تو میں نے صوفی سے پوچھا۔
”یہ کون ہے؟“

”میری بیوی ہے جی۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں حیران ہوا تھا۔“ تم نے شادی کر لی؟“

”نہیں جی کرنی پڑی۔ یہ میرے چچا زاد بھائی کی بیوی تھی۔ دو سال پہلے شادی ہوئی تھی۔ وہ مر گیا تو چچا کے گھر والوں نے اس پر منحوس کا لیبل لگا دیا۔ بچہ بھی کوئی نہیں ہے۔ پیچھے میکا بھی نہیں ہے۔ بے چاری کہاں جاتی۔ در بدر ہو جاتی، میں نے اسے شادی کا کہا تو مان گئی اور میں سادگی سے شادی کر کے یہاں لے آیا۔“

”زبردست صوفی تم نے بہترین کام کیا ہے، اب ولیمہ کب کھلا رہے ہو۔“ سفیر نے کہا۔ ”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ یہ شادی اس طرح ہوئی ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بالآخر تمہیں خیال آ گیا۔“

صوفی مسکرایا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں جی۔ پر بیوی بچوں کے بعد دل ہی مر گیا تھا۔ یہ تو زبیدہ نے آ کر مجھے تھوڑا تبدیل کیا ہے۔ عورت میں بہت طاقت ہوتی ہے جی مرد کو بد لے کی۔“

میں نے غور کیا تو واقعی صوفی بدلا ہوا تھا۔ سر کے بال باقاعدہ تراشے ہوئے اور داڑھی بھی حد میں تھی، البتہ اس نے کلر نہیں کیا تھا اور اس پر سیاہ و سفید داڑھی اور بال اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی عمر چالیس سے اوپر تھی اور زبیدہ میرے اندازے کے مطابق پچیس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ مگر ان دونوں کی جوڑی اچھی تھی۔ کھانا زبیدہ نے ہی بنایا تھا اور عبد اللہ نے اسے آفیشل کک مقرر کر کے اس کی باقاعدہ تنخواہ بھی لگا دی تھی۔ پہلے صوفی کے پاس کوٹھی کے اوپری حصے میں ایک کمر تھا۔ اسے دو کمرے دے دیئے گئے تھے۔ میں نے عبد اللہ سے پوچھا۔
”چھپی کوٹھی والے ملازمین کہاں ہیں؟“

”وہ اصل میں راجا صاحب کے ملازم تھے۔ میں نے راجا صاحب کی ملازمت چھوڑ دی ہے۔“

میں چونکا۔ ”چھوڑ دی ہے لیکن کیوں؟“

”اصل میں اب یہاں کوئی کام تو تھا نہیں۔ راجا صاحب نے یہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ لیا ہے، باقی ملازمین کو فارغ کر دیا لیکن میں بلاوجہ کی تنخواہ لے رہا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا اس لیے استعفا دے دیا۔“

”عبد اللہ نے اچھا کیا۔“ وسیم نے کہا لیکن میں خاموش رہا۔ مجھے عبد اللہ کا بغیر مشورے کے راجا صاحب کی ملازمت ترک کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اگر وہ عبد اللہ کو تنخواہ دے رہے تھے تو یہ ان کا مسئلہ تھا۔ عبد اللہ نے بھانپ لیا۔

”آپ کو اچھا نہیں لگا؟“

”اب تم استعفا دے چکے ہو۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اس لیے اچھا یا برا لگنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”میں معذرت خواہ ہوں شہباز صاحب۔“ عبد اللہ نے شرمندگی سے کہا۔ ”میں کیا اور میری اوقات کیا..... راجا صاحب نے مجھے اور مجھ جیسے کتنوں کو آپ کی خاطر رکھا ہوا ہے۔ مجھے آپ سے اجازت لینی چاہیے تھی۔“

”نہیں میں تم سے برتر نہیں ہوں لیکن راجا صاحب میرے اور ہم سب کے محسن ہیں، بہت سے مواقع پر وہ بے لوث ہمارے کام آئے۔ کیا تم نے ان سے اجازت لی تھی۔“

”نہیں۔“ عبداللہ نے دہی زبان میں کہا۔ ”میں نے بس استعفا بھیج دیا تھا، انہوں نے منظور کر لیا۔“

”یاراب اتنے بے لوث بھی نہیں ہیں۔“ سفیر بولا۔

”میں نے جو دنیا اور اس کی خود غرضی دیکھی ہے خاص طور سے بڑوں لوگوں کی تو اس لحاظ سے راجا صاحب بہت اچھے اور اعلیٰ طرف انسان ہیں۔ ٹھیک ہے ان کی مجھ سے غرض ہے مگر یہ غرض ڈیوڈ شا کو بھی ہے۔ اب تم دونوں کے رویے کا موازنہ کرو تو تمہیں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ دولت اور اختیار میں مرشد راجا صاحب کا پانسہ بھی نہیں ہے مگر ان کے رویے میں فرق دیکھو۔ اس سے تمہیں اندازہ ہوگا کہ راجا صاحب کیا ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وسیم نے تائید کی۔ ”جب انہوں نے مجھے آپ کے لیے ہار کیا تو ان کے الفاظ تھے کہ یوں سمجھو کہ ان کا بیٹا خطرے میں ہے اور میں نے اسے بچانا ہے۔“

عبداللہ زیادہ شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”بس یاراب جو ہوا سو ہوا۔ میں خود راجا صاحب سے سوری کر لوں گا۔ وہ بڑے آدمی ہیں ہمیں معاف کر دیں گے۔“

”اور ساتھ ہی تجھے ساتھ لے جانے کی کوشش بھی کریں گے۔“ سفیر بولا۔ ”ابھی آیا ہے، آرام سے بیٹھ کچھ دن..... ندیم بھی تیری جان کو رو رہا ہے۔“

”وہ منحوس ہمیشہ روتا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب کیا مسئلہ ہے اسے۔“

”کیسوں سے تیری جان چھوٹ گئی ہے مگر بعض معاملات میں اسے تیرے سائن چاہئیں۔ کچھ عدالتی چکر ہیں۔“

”جعلی سائن کر دیتا۔“

”تاکہ تجھ پر جلسازی کا جینوین کیس بن جاتا۔“

”اس سے بھی بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مزید سنایا یہاں کوئی اور ایکٹیوٹی ہوئی ہے۔ مہرہ اور اس کے نام نہاد شوہر کی کوئی اطلاع؟“

”دونوں محاورے کے مطابق سینگ کی طرح غائب ہیں۔“ وسیم نے کہا۔

ہم کھانا ختم کر چکے تھے اس کے بعد ہم نشست گاہ میں آئے۔ مانی کھانے کے لیے آیا تھا اور جلدی جلدی کھا کر رخصت ہو گیا۔ اسے کسی کام کی غلت تھی۔ سادی آرام کر رہی تھی۔ وہ نہیں آئی تھی۔ عبداللہ نے غور سے مجھے دیکھا۔

”آپ زخمی ہیں کیا جسم پر بھی زخم ہیں؟“

”تھے اب تقریباً بھر چکے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سفیر ٹو کہاں غائب تھا میری آمد کا سن کر۔“

”وسیم نے تجھے بتایا ہوگا کہ پچھلے دنوں مرشد کی درگاہ میں ایک دھماکہ ہوا اور وہاں اتارا جانے والا اسلحہ تباہ ہوا تھا؟“

”ہاں بتایا ہے۔“

”اس معاملے میں ہم کچھ بے وقوف بنے۔ ہمارے آدی اندر موجود تھے لیکن ان کو گائیڈ کیا گیا اور اس اسلحے کے بارے میں اس طرح معلومات دی گئیں کہ انہیں شبہ نہیں ہوا تھا۔“

میں چونکا۔ ”تیرا مطلب ہے جان بوجھ کر معلومات دی گئیں؟“

”بالکل اور ہمارے آدی سمجھے کہ وہ اتفاق سے یہ سب جان گئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا اور پھر ہم نے ان کی ہی مدد سے یہ اسلحہ تباہ کر دیا۔ درگاہ مرشدیہ کے عقب میں ایک عمارت کے درخانے میں یہ سب رکھا تھا۔ یہ اصل میں درگاہ کا سماع ہال تھا جو خستہ حالی کی وجہ سے متروک قرار دے دیا گیا تھا اور اس جگہ کے آگے ایک بڑا اور عالی شان سماع ہال بنایا گیا ہے لیکن یہ کام جان بوجھ کر کیا گیا تاکہ متروک سماع ہال کو اسلحے کے گودام کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ یہاں صرف اسلحہ اور اس سے متعلقہ لوگ ہوتے تھے اس لیے وہی مارے گئے۔“

”سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں پر اپنی حماقت کا انکشاف کب ہوا؟“

”اسی پر ہوا ہے۔“ دیم نے سفیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہم پر تو اب تک نہیں ہوا۔“

”بیٹا ہوگا بھی نہیں۔“ سفیر نے جواب دیا۔ ”کیونکہ تم لوگوں کے سر میں وہ عقل نہیں ہے جو اس سر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔“ اس نے سر بجایا۔ میں نے سر ہلایا۔

”ہاں آواز تو کچھ خالی ڈبے کی سی آئی ہے۔“

”شہباز میری پینہ میں چھرا مت گھونپ۔“ سفیر فرمایا۔ ”مت بھول کہ ٹو پہلے میرا دوست ہے۔“

”اچھا بھائی میں تیرا دوست ہوں اب جلدی سے باقی ماجرا بھی سنا دے۔“

”اسلحے کی تباہی کے بعد ہمارے دو آدمیوں میں سے ایک وہاں سے نکل آیا کیونکہ وہ مشکوک ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے جو اسنوری سنائی تو مجھے لگا یہ تو کوئی طے شدہ کام ہے۔ اس نے مجھے ایک شخص کا حوالہ دیا۔ لطیف شاہ نامی یہ شخص درگاہ کے سرکردہ لوگوں میں سے ہے۔ اگرچہ اس کا تعلق مرشد کے خاندان سے نہیں ہے مگر اس کا خاصانہ چڑھا ہوا ہے۔ یہ رہتا بھی درگاہ پر ہے۔ اصل میں اسی نے ہمارے آدمیوں کی رہنمائی آنے والے اسلحے تک کی تھی۔ میں نے اندر رہ جانے والے سے اس کی نگرانی کرائی اور اس سے پتا چلا کہ وہ ہر دوسرے دن دوپہر کے وقت کہیں جاتا ہے اور دوڑھائی گھنٹے بعد آتا ہے۔ میں نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔“

”خود؟“

”نہیں میرے ساتھ دور اینڈر اور بھی ہوتے ہیں، ہم یوں باری باری اس کا تعاقب کرتے رہے کہ اسے شک نہ ہو۔ اس نگرانی سے پتا چلا کہ فتح جنگ میں ایک فارم پر جاتا ہے اور پھر وہاں سے واپس درگاہ چلا جاتا ہے۔“

”تم نے فارم کی نگرانی شروع کرا دی؟“

”بالکل اور آج ہی انکشاف ہوا کہ ہم احمق بن رہے تھے فاضلی کے ہاتھوں۔“

میں اور باقی سب اچھل پڑے تھے۔ ”فاضلی.....؟ آج ہی تو اس شیطان کا ذکر ہو رہا تھا۔“

”کہتے ہیں جب شیطان کا ذکر ہو تو وہ آس پاس ہوتا ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ ”اس سے اندازہ کر لو

فاضلی کے بارے میں۔“

”فارم میں فاضلی ہے؟“

”صرف فاضلی نہیں ہے بلکہ وہاں دو ایسے افراد بھی ہیں جن کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ اسلحے میں ہونے والے دھماکے میں مارے گئے ہیں اور وہ اس گودام کے نگرانوں میں شامل تھے۔“

”ممکن ہے یہ مرشد کی چال ہو؟“

”چال ہے..... لیکن فاضلی کی ہے اور مرشد کے خلاف ہے۔“

اس بار میں زیادہ چونکا تھا۔ ”تمہارا مطلب ہے فاضلی نے جان بوجھ کر مرشد کو نقصان پہنچایا ہے؟“

”بالکل..... اس نے صرف اسلحہ ہی تباہ نہیں کرایا بلکہ مرشد کو بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے کیونکہ یہ

اسلحہ بعض ایسے تخریب کار گروپوں کے لیے بھیجا جا رہا تھا جو آئے دن بم دھماکے اور نارگٹ کلنگ کی وارداتیں

کرتے ہیں۔ وہ اس کی ادائیگی کر چکے تھے اور مرشد ٹڈل مین کا کام کر رہا تھا۔“

”یعنی ادائیگی اب اسے کرنا پڑے گی؟“

”بالکل کیونکہ یہ کروڑوں کا اسلحہ ہے۔ دوسری مشکل یہ کہ جن لوگوں کو اپنے مذموم عزائم کے لیے اسلحہ نہیں

ملے گا اور جو خود بیرونی دشمنوں کے پے رول پر ہیں وہ مرشد کے خلاف ہو جائیں گے۔“ سفیر نے کہا۔ ”سب

سے اہم بات یہ کہ خفیہ ایجنسیوں نے اس دھماکے کے بعد جو اسلحہ پکڑا ہے یعنی فوج جانے والا اور تباہ شدہ اسلحہ، وہ

ملک بھر میں تخریب کاریوں میں استعمال ہوا ہے۔ خاص طور سے بارود وغیرہ۔ اس کا جواب بھی مرشد کو دینا پڑے

گا۔“

”یہ مفروضہ ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ فاضلی مرشد کے خلاف ہو گیا ہے۔“

”یہ اسٹوری بھی آج ہی علم میں آئی ہے، مرشد نے اپنے خاص آدمیوں کو حکم دیا ہے کہ فاضلی کو تلاش کیا

جائے اور وہ جہاں ملے اسے دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔“

”یہ بھی چال ہو سکتی ہے مرشد اور فاضلی کی، دونوں باپ بیٹے ایک نمبر کے حرای اور ڈرامے باز ہیں۔“

”اس میں چال کہاں سے آگئی اور چال چال میں وہ اپنا اتنا بڑا نقصان کر لیں گے؟“ سفیر نے کہا۔

”فارم ہاؤس کس کا ہے؟“

”کسی کرم الدین نامی زمیندار کا ہے۔ وہ خود خان پور میں ہوتا ہے۔ یعنی اس کی اصل زمینیں خان پور میں

ہیں اور یہ فارم اس نے فاضلی کے حوالے کیا ہوا ہے۔ اس پر سنگترے اور مالٹے کے باغات ہیں اور ایک عالی

شان کٹھی بھی بنی ہوئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہاں موجود ہر بندہ مسلح نظر آتا ہے اور ان کی تعداد بھی خاصی

ہے، صورتوں سے وہ سب جھپٹے ہوئے بد معاش نظر آتے ہیں۔“

”تم نے جو نتیجہ نکالا ہے اس سے قطع نظر فاضلی کا نظر اتنا ہی بہت بڑی کامیابی ہے اور ہمیں جلد از جلد

اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ وسیم نے کہا اور میری طرف دیکھا۔ ”آپ کیا کہتے ہیں؟“

”اچھا خیال ہے۔ یہاں تمہارے کتنے آدمی ہیں؟“

”یہاں تو بس دو تین ہی ہیں، باقی سب حویلی میں ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”مگر وہ بیس منٹ کے نوٹس پر

یہاں آسکتے ہیں۔“

میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ”فارم کے اندر کی پوزیشن کیسے معلوم کی؟“
 ”اس سے دوسو گز دور ایک چھوٹی سے پہاڑی ہے۔ میں نے وہاں سے جائزہ لیا تھا۔ فارم تقریباً دو ہیکٹر
 رقبے پر ہے۔ کوٹھی سامنے ہے اور باغ عقب میں ہے۔ کوٹھی تقریباً ایک کنال رقبے پر ہے۔ سڑک سے ہٹ کر
 ہے مگر یہاں بجلی ہے۔“
 ”اندر کتنے آدمی ہیں؟“

”ایک درجن تو ہیں۔“ سفیر نے کہا اور اپنا جدید ترین اسمارٹ فون نکال کر اسے وہاں موجود ایلی سی ڈی
 ٹی وی سے منسلک کیا اور پھر تصویریں اس پر دکھانے لگا۔ پہلی تصویر فارم کی تھی۔ اس کی ساخت بڑی حد تک
 نمایاں تھی۔ اس کے گرد پیلے پتھروں سے بنی کم سے کم آٹھ فوٹ اونچی چار دیواری تھی اور اس پر خاردار تاریکی
 باز بھی لگی ہوئی تھی۔ فرنٹ پر بڑا فولادی گیٹ تھا۔ اس کے اندر کوٹھی کی چار دیواری الگ تھی اور اس کا چھوٹا
 گیٹ بھی الگ تھا۔ فارم کا گیٹ اتنا بڑا تھا کہ اس سے بڑے سا بڑا ٹرک نکل سکتا تھا۔ کوٹھی دو منزلہ تھی مگر اس کی
 اوپری منزل پر صرف دو تین کمرے تھے اور باقی کھلی چھت تھی اور نیچے مکمل عمارت تھی۔ اسمارٹ فون کا کیمرہ
 بہت ہائی میگا پیکسل تھا مگر اس میں زوم زیادہ نہیں تھا اس لیے کوٹھی اور اس میں نظر آنے والے افراد کو قریب سے
 نہیں دکھایا جاسکتا تھا۔ مختلف تصاویر میں مختلف لوگ نظر آ رہے تھے اور پھر ایک لمبے بالوں والے کو دیکھ کر میں
 چونک گیا۔

”یہ فاضلی ہے؟“

سفیر مسکرایا۔ ”غلط..... فاضلی اس کے برابر والا شخص ہے۔“

فاضلی نے بال اتنے چھوٹے کر لیے تھے کہ وہ تقریباً گنجا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی کلین شیو ہو گیا تھا اور اس کے
 چہرے پر جو ہلکی سی داڑھی رہا کرتی تھی وہ غائب تھی۔ ساتھ ہی اس نے مونے سیاہ فریم کی عینک لگا رکھی تھی جو بہ
 ظاہر نظر کی دکھائی دیتی تھی اور ان تین تہیلوں نے اس کا حلیہ یکسر بدل دیا تھا۔ اس کے ساتھ نظر آنے والے
 افراد میں سے دودھ تھے جن کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ وہ درگاہ میں ہونے والے دھماکے میں مارے گئے
 تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”ٹو نے کیسا پہچانا۔“

”میں نے اس کا پیچھا کیا اور چند مواقع پر اس کی آواز سنی تو تصدیق ہوئی کہ یہ فاضلی ہے۔“

”اگر بے قول تمہارے اس نے تمہیں کوئی گائیڈ کیا۔ یعنی فاضلی تمہارے آدمیوں سے واقف ہے تو وہ اپنے
 تعاقب اور نگرانی سے کیسے بے خبر رہا؟“

”جیسے ہم بے خبر رہے۔“ سفیر نے دانت نکالے۔

”وہ الٹا تمہارا تعاقب اور نگرانی بھی کر سکتا ہے۔“

”میں نے اس کا پورا خیال رکھا ہے۔ الیکٹرانک ڈیوائسز کا بھی۔“ سفیر نے جواب دیا تو میں مطمئن ہو

گیا۔

”سوال وہی ہے کہ فاضلی اور مرشد میں یہ اختلاف کیوں اور کیسے ہوا؟“

”میرا خیال ہے فاضلی کے زخمی ہونے کے بعد کچھ ہوا اور وہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ مہینے سے بھی زیادہ غائب رہنے کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔“

”تمہارے جاسوس پتا نہیں کر سکے کہ فاضلی کی موت کا حکم کیوں جاری کیا گیا ہے؟“

”امکان ہے کہ اس کے پیچھے مرشد کے سیکرٹری کا ہاتھ ہے۔ وہ فاضلی سے خار کھاتا ہے۔ شاید اسی نے کوئی چکر چلایا ہے جو باپ بیٹے کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے میں نے فاضلی کے جو خیالات سنے تھے اس کے دل میں پہلے ہی مرشد کے خلاف رجش ہے کیونکہ اس نے اس کی ماں کے ساتھ بہت برا کیا۔“

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ ”کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ مرشد اور فاضلی میں اختلاف کس وجہ سے ہے اور اگر فاضلی ہمارے آدمیوں کو جان گیا ہے تو اس نے ان کی نشان دہی کے بجائے انہیں استعمال کیا ہے؟ مگر یہ ہمارا نہیں اس کا مفاد ہے۔“

”بالکل..... ہمارے لیے جاننا اشد ضروری ہے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔“

”جب.....؟“

”اپنا جاسوسی کا یونٹ استعمال کرو۔“ میں نے کہا۔ ”فارم ہاؤس کو ہدف بناؤ..... وہاں فون لائنز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ موبائل فریکوئنسی پکڑنے والا آلہ استعمال کرو۔ روایتی جاسوسی سے کام نہیں چلے گا۔“

”ناقم نے روایتی جاسوسی سے کام نہیں چلے گا۔“ وسیم نے سفیر کی طرف دیکھا۔

”تو کرو اپنی جیمز بانڈ والی جاسوسی۔“ سفیر نے کہا۔

”یہ تم نے کی تو ہے۔“ میں نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور خدا کے واسطے آئندہ کوئی ڈھنگ کا زوم لینس والا کیمرا ساتھ رکھنا..... تم کیا پنک کی تصویریں لینے گئے تھے۔“

وسیم کھڑا ہو گیا۔ ”میں یہ کام کرتا ہوں۔ دین حویلی میں ہے اسے منگوانا ہوگا اور مانی کو ساتھ رکھنا ہوگا۔“

وسیم کے جانے کے بعد میں نے ایاز کا پوچھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ وہ شازیہ کے باپ کے آٹو رکشاپ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ سفیر نے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں اسے خرید لوں اور ایاز سے پارٹنر شپ کر لوں۔“

”یہ کام کر لینا چاہیے تھا۔ ہمیں ایک آسانی میسر آ جائے گی۔ اس آٹو رکشاپ کی مدد سے ہم گاڑیوں میں حسبِ مشاقتدیلیاں آسانی سے کر سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں ایاز سے کہتا ہوں۔“

”ضرور کہیے۔“ ایاز نے نشست گاہ میں آتے ہوئے کہا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ایاز میرا کم وقت کا ساتھی تھا۔ مگر اس کے انداز میں کبھی مجھے خلوص اور گرم جوشی دوسروں سے کم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مجھ سے مل کر وہ سامنے بیٹھ گیا۔

”بیٹو کی خبر نے اندر تک دکھ بھر دیا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”شاہین پورا دن روتی رہی اور ماں جی حیران تھیں کہ وہ کیوں کسی کو اتار رہی ہے۔“

”وہ تھا ہی ایسا، ہمارا کچھ نہیں لگتا تھا مگر سب کچھ تھا۔ سب کو زلا کر چلا گیا۔“ میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد

بات ہوتی رہی۔ میں نے ایاز کو مختصر احوال سنایا۔ کچھ دیر بعد صوفی چائے لے آیا تو ماحول بدل گیا اور گفتگو بھی بدل گئی۔ دسّم اپنے آدمیوں کو ہدایات دے کر آگیا تھا۔ میں نے ایاز سے درکشاپ کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ”بہت اچھی درکشاپ ہے لیکن وہاں کے انتظامات دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ وہاں چوری کی یا اسمگل شدہ گاڑیوں کو جعلی نمبر اور کاغذات کی مدد سے فروخت کیا جاتا تھا۔ دونوں ملازموں نے کھل کر اقرار نہیں کیا مگر وہ بھی شامل تھے۔ باقی سامان اور لوکیشن کے لحاظ سے بہت اچھی جگہ ہے۔ لگے بندھے گا ہک بھی خاصے ہیں۔“

”سفیر کا ارادہ ہے یہ درکشاپ تمہارے ساتھ پارٹنرشپ میں خرید لے مگر اس کے لیے تم اوکے کرو گے۔“

”ہمارا اوکے تو آپ کے ساتھ ہی جی۔“ ایاز نے اپنی لمبی زلفوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”اور پارٹنرشپ کیا جی ملازم رکھ لے گا، اپنی دال روٹی بھی چلتی رہے۔“

”زیادہ سادہ صومٹ بنو۔“ سفیر نے اسے گھورا۔ ”مجھے اچھی طرح پتا ہے تم دال بنزی کتنی کھاتے ہو۔“

ایاز مسکرایا۔ ”جتنی آپ کھاتے ہیں جی اتنی ہم بھی کھا لیتے ہیں۔“



چائے کے بعد میں نشست گاہ کے ایک کونے میں چلا گیا اور ندیم کے دفتر کا نمبر ملایا۔ کال اس کی سیکرٹری یا آپریٹر نے ریسیو کی اور نغمہ سرا آواز میں بولی۔ ”بھئی لاڑا بیوسی ایش۔“

”ٹھیک کہا ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”ویسے وہ ہے کہاں؟“

”سوری سر۔“ سیکرٹری گڑبڑا گئی تھی۔

”ندیم بھئی..... میں اس کا ایک بھوت کلائنٹ بات کر رہا ہوں اس کی وجہ سے بھانسی ہوئی تھی مجھے۔“

سیکرٹری نے بہتر سمجھا کہ لائن ندیم کو ٹرانسفر کر دے اور اس نے آغاز ہی گالی سے کیا۔ ”..... کے بھوت، مجھے پتا تھا تو ہی ہوگا، واپس آگیا پھر بچ کر، انڈین سالے تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔“

”جب تجھ جیسے سالے کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو دوسرے سالے کیا بگاڑیں گے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اور سنا کتنی ترقی کی ہے جھوٹ بول بول کر، بینک بیلنس اور بیوی بچے کہاں تک پہنچے۔“

اس پر ندیم نے مزید گالیاں دیں تھیں اور کچھ باتوں کو بھی بگھارا۔ ”سب نے زندگی حرام کی ہوئی ہے۔“

”شکر کر ٹو زندہ ہے ورنہ میرے دشمن کسی کو معاف کرنے کے قائل نہیں ہیں۔“

”کسر تو کوئی نہیں چھوڑی تھی اس حرامیوں کے مرشد نے۔“ ندیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تیری جان دالت سے چھڑوائی تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔“

”کیا مطلب؟“

”دھمکیوں اور حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پہلے میری گاڑی کو ایک ٹرک نے مری ہانی دے پر کمر ماری۔ تو اللہ نے زندگی رکھی اور کھائی میں گرتے گرتے بچا..... پھر میرے بیوی بچوں کے حوالے سے دھمکیاں ملنے لگیں۔“

”ٹو نے دسّم یا عبداللہ کو نہیں بتایا۔“

”ان کو بتایا اور انہوں نے اسے اس کا دماغ درست کیا اور کچھ میں نے بھی جیک لگائے۔ اعلیٰ حکام کو درمیان

میں ڈالو تو وہ انسان کا بچہ بنا۔“

”نذیم تجھ پر یہ آفتیں میری وجہ سے آئی ہیں۔“

”بکواس نہ کر اب ٹونیک پروین بن کر ساری آفتیں خود پر لینے کی بات کرے گا۔ تجھے بتانے کا مطلب جتنا نہیں ہے۔ ایسی کی تہیسی اس مرشد کی۔ میں نے اس کے کچھ معاملات کی فائلیں بنائی ہوئی ہیں اور وہ میں نے اسے بھجوائی تھیں۔ اگر یہ کیمرہ عدالت میں آگئے تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے اس کے بعد وہ انسان سے بندر کا بچہ بن گیا۔ میرے اشاروں پر ناچنے کو بھی تیار ہو گیا۔“

”یہ ٹونے اچھا کیا۔“ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”مجھے آتے ہی پتا چلا کہ ٹونے میرے فراق میں بے قرار ہے، دن رات تڑپتا ہے اور بیوی کے پہلو میں بھی چین نہیں آتا۔“

”ہاں ٹونے کا جانے ان معاملات کو..... بیوی عاق کرنے کی دھمکی دے چکی ہے۔“

خاصی دیر بکواس کے بعد وہ اصل بات پر آیا۔ عدالتوں سے کیس خارج ہو گئے تھے مگر کچھ کاغذات جمع کرانے تھے اور ان پر میرے سائن ضروری تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں کسی کو کچھ بھجوں گا کاغذات اس کے ہاتھ بھجوا دینا اور بتا دینا کہ کہاں کہاں سائن کرنے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں تیرے لیے ایک چیک پر بھی سائن کر دوں اگرچہ بینک اکاؤنٹ میں شاید ہی کچھ ہو۔“

اس پر نذیم نے کال کا اختتام پھر گالیوں پر کیا تھا۔ کال کے بعد میں نے موبائل جیب میں رکھا تھا کہ اس کی بیل بجی۔ میں نے نکال کر دیکھا۔ نام کے بجائے نمبر آ رہا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ تمام جاننے والوں کے نمبر اس میں ناموں سے فیڈ تھے پھر یہ کس کا نمبر ہو سکتا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”شہباز ملک۔“ دوسری طرف سے ایک سرد اور ٹھہری ہوئی آواز نے کہا اور مجھے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

”ڈیوڈ شا۔“

”تم واپس پہنچ گئے ہو اور جس مقصد کے لیے انڈیا میں رکے تھے وہ بھی پورا ہو گیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں کہ اسے یہ نمبر کہاں سے ملا تھا۔ میں نے اب تک گھر اور پھر نذیم سے بات کی تھی اور یقیناً ان میں سے کوئی نمبر انڈیا آرزو ریشن تھا۔ اسی سے ڈیوڈ شا کو پتا چلا تھا۔ ”تم نے کیوں کال کی ہے؟“

”تمہیں یاد دلانے کے لیے کہ میرا تم سے ایک معاہدہ ہوا تھا۔“

”وہ معاہدہ جسے تم پورا نہیں کر سکے۔“ میرا لہجہ بھی سرد ہو گیا تھا۔ ڈیوڈ شا کا نام سنتے ہی وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور میں نے ان کے درمیان میں آتے ہوئے موبائل کا اسپیکر فون آن کر لیا تھا۔ ”پلان تمہارے آدمی کرٹل جیمز نے بنایا اور وہی اس مشن کا سربراہ تھا مگر کیا ہوا؟“

”ٹھیک ہے سب مارے گئے اور ویسا نہیں ہوا جیسا سوچا تھا لیکن تم اس لڑکی کو نکال لائے۔“

”ڈیوڈ شا یہ میری ذاتی کاوش تھی۔ میری خوش قسمتی کہ میں پہلے پکڑ کر کنور پیلس پہنچا دیا گیا تھا ورنہ

تمہارے پلان پر عمل کرتا تو میں بھی مارا جا چکا ہوتا۔ کرنل بھی اپنی قسمت سے محفوظ رہا۔ تم نے منشی دل جی پر بھروسہ کیا اور اس نے تمہیں دھوکا دیا۔“
 ”وہ کیفر کردار کو پہنچ گیا ہے۔“

”اس میں تمہارا کوئی کردار نہیں ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ڈیوڈ شا مجھے تمہاری وجہ سے فائدہ نہیں نقصان ہوا ہے میرا ایک قیمتی ترین ساتھی مارا گیا۔“

”مجھے اس کا افسوس ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تو تم معاہدے سے انکار کر رہے ہو؟“
 ”میں انکار نہیں کر رہا کیونکہ تم اپنی کٹ منٹ پوری نہیں کر سکے۔ تمہارا پلان مکمل ناکام رہا اور میرے ساتھی سمیت سینکڑوں لوگ اس کی بیھٹ چڑھ گئے۔ اب تم کس منہ سے مجھ سے معاہدے کی بات کر رہے ہو؟“
 ”میرا تو خیال ہے میں نے کمیشنٹ پوری کی ہے، تم اس لڑکی کو لے جانے میں کامیاب رہے۔“

”ڈیوڈ شا۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہارے جیسے بین الاقوامی مذاکرات کار کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ کیا تم معاہدے کے لفظ سے اتنے ہی لاعلم ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔“

”وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز مجھے تمہارا تعاون ہر قیمت پر درکار ہے۔“
 میں ہنسا۔ ”اب بھی تم سوچے سمجھے بغیر بات کر رہے ہو، تم ہر قیمت کا مطلب سمجھتے ہو؟“
 ”ہاں۔“ وہ بد مزگی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے میرا ایک پلان ناکام رہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو۔“

”غالباً بے عزتی محسوس کر رہے ہو لیکن ڈیوڈ شا انسان اپنے کردار اور کاموں سے ہی عزت یا بے عزتی کماتا ہے۔ تم شاہی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے ہو جو بلا وجہ تمہاری عزت کی جائے۔ درحقیقت میرے ذہن میں تمہارا جو بیچ تھا پچھلے کچھ عرصے میں اسے بہت نقصان ہوا ہے۔ پہلے مرشد نے تمہاری ضمانت کو جوتے کی نوک پر رکھا اور اب منشی دل جی جیسا عام آدمی تمہیں استعمال کر گیا۔ کیا تم اب بھی خود کو اسی مقام پر محسوس کرتے ہو؟“
 ”شہباز..... ان سب باتوں کو بھول جاؤ ہم نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔“ اس نے غالباً خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں معاہدہ پورا کرنے میں ناکام رہا لیکن میں اب بھی تمہارے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم بولو میں بن رہا ہوں۔“

”میں مرشد سے تمہارا تصفیہ کر سکتا ہوں اس بار ضمانتی تمہارے اپنے ملک کا آدمی ہوگا۔“
 ”ٹھیک ہے تم پیشکش کرو لیکن میں اس کا جائزہ لے کر ہی فیصلہ کروں گا۔ یاد رہے کہ اب میں ہر صورت تمہاری مدد کا پابند نہیں ہوں گا۔“

”شہباز تمہارے کچھ دشمن کم ہوئے ہیں اور مجھے امید ہے تم دشمن بڑھانے والے کام نہیں کرو گے۔“
 ”بالکل نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں باقی ماندہ دشمنوں کو بھی کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس کے ساتھ ہی موبائل آف کر دیا۔ وہ سب تشویش زدہ تھے۔ گفتگو انہوں نے سن لی اور آخر میں ڈیوڈ شا کی دھمکی بھی سن لی تھی۔ سفیر نے کہا۔

”اسے تیرا نمبر کیسے ملا؟“

”جیسے پہلے ملتا رہا ہے۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہمارے ملک کی موبائل کمپنیاں ان کی غلام ہیں۔ یہاں اگر پولیس کو مدد درکار ہو تو انہیں نہ جانے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں، کسی نمبر کو ٹریس یا آبرو ویشن میں رکھنے کے لیے اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ ان سے براہ راست کام لیتے ہیں۔“

”یہ سب ان کا بنایا ہوا سیٹ آپ ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”مائی نے بتایا کہ ایک آئی ٹی کمپنی جس کے آپریٹنگ سسٹم ہم استعمال کرتے ہیں ان میں ایسی چیزیں چھپی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں معلوم نہیں ہوتا اور وہ ہماری معلومات انٹرنیٹ کے توسط سے آگے بھیجتی ہیں۔“

”شکر ہے میں نے اس سے صرف حویلی اور ندیم کو کال کی ہے۔“

”آپ بے فکر ہیں اب اپنے لیے ہم الگ سے سم استعمال کریں گے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”سب کے پاس ڈویل سم والے موبائل ہیں۔ خاص سم ہم صرف آپس میں رابطے کے لیے استعمال کریں گے۔“

”ایک بات اور ہے۔“ ایاز نے ہاتھ اٹھایا۔ ”اب موبائل سگنل سے لوکیشن بھی نکال لی جاتی ہے۔“ یہ قابل غور بات تھی کم سے کم ڈیوڈ شا کو پتا تھا کہ میں کہاں تھا اور میں اخلاقی طور پر اس سے معاہدے کا پابند نہیں رہا تھا اس لیے وہ مجھے قابو کرنے کے لیے دوسرے حربے استعمال کر سکتا تھا۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”تم نے مزید ٹھکانے بنائے ہیں؟“

”وہ فارم ہاؤس دوبارہ لے لیا ہے جسے ایک بار خدشے کی بنا پر چھوڑا تھا۔“ عبداللہ نے بتایا۔ ”اتفاق سے فتح جنگ سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بس تو ہم ابھی وہاں جا رہے ہیں۔“

”سب؟“ وسیم نے پوچھا۔

”بالکل..... اصل وجہ سادی ہے، اسے زیادہ سے زیادہ محفوظ ہونا چاہیے جب تک اسے حویلی نہیں بھیجا

جاتا۔“

”تم حویلی کی بات کر رہے ہو، جبکہ مونا یہاں آنے کے لیے پرتول رہی ہے۔“

”اس کے پرکاش دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”نا بابا۔“ سفیر نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”یہ مجھ غریب کے بس سے باہر ہے۔“

”یار شوہر بن زن مرید نہ بن۔“

سفیر نے دانت نکالے۔ ”زن مریدی میں زیادہ مزے ہیں۔“

وسیم نے تائید کی۔ ”جب بندے نے گدھا بن کر بوجھ ہی اٹھانا ہے تو تابعدار گدھا کیوں نہ بنے۔“

”ہاں گھاس ذرا زیادہ ملتی ہے۔“

ایاز زیر مونچھ مسکرا رہا تھا۔ اچانک ہی سادی اندر آئی۔ ”اچھا موضوع چل رہا ہے۔“ اس نے طنزیہ لہجے

میں کہا۔ ”مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم بوجھ ہیں۔“

”خوب صورت بوجھ۔“ وسیم نے تھجج کی۔

”جو ہم خوشی خوشی اٹھانے کے لیے مرے جاتے ہیں۔“ سفیر نے لقمہ دیا تو سادی مزید خفا ہو گئی۔

”آپ تو بات نہ کریں سفیر بھائی۔ آپ کو بالکل شرم نہیں آتی ہے۔“

”شرم تم لوگوں کو جو آتی ہے۔“ سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔

”آپ کیسے ہیں ایاز بھائی..... شاہین کیسی ہے؟“

”اس کا بھی تو پوچھو جو آنے والا ہے۔“ سفیر نے پھر ٹانگ اڑائی۔ سادی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”آپ سچ سچ بہت واہیات ہیں۔“

”بھئی میں ایاز کے بے بی کی بات کر رہا ہوں تمہارے.....“

”آپ تو چپ ہی رہیں۔“ سادی نے اٹھ کر وہاں سے جاتے ہوئے کہا۔ سفیر نے دانت نکالے۔

”دیکھا کیسے جان چھڑائی۔“

”یار تو بے لگم ہوتا جا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم دوستوں کی بات الگ ہے مگر عورتوں کے سامنے ذرا

زبان پر قابو رکھا کر۔“

”کوئی بات نہیں اس نے برا نہیں منایا صرف شرمناک رہی ہے۔“ سفیر بولا۔ ”اب مطلب کی بات کر.....

کب چلنا ہے؟“

”جلد از جلد۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن خیال رہے اس جگہ کو خفیہ رکھنا ہے موبائل کا استعمال کم سے کم ہوگا اور

آنا جانا بھی کم سے کم..... اب وہاں بیڑا اور چکن نکدہ پارسل نہیں ہوگا۔“

”تب میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ سفیر نے اعلان کیا۔ ”زبیدہ خانم کے ہاتھ میں کیا ڈانقہ ہے۔“

”بیٹے دشمنوں کے ہاتھ میں بھی کم ڈانقہ نہیں ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ٹھیک ہے یار دیوے ڈانقہ سادی کے ہاتھ میں بھی کم نہیں ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”وہ آرام کرے گی۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”اس کی کنڈیشن ایسی نہیں ہے۔“

”یار ایسی کنڈیشن میں ہماری مائیں اور تانیاں دادیاں سب کرتی تھیں۔“

”ان کی بات الگ تھی۔“ میں نے کہا۔ ”سادی شہزادی ہے، اس نے ساری عمر کچھ نہیں کیا ہے۔ یہ تو اس

کی نیک نفسی ہے جو ہمارے ساتھ عام عورتوں کی طرح رہتی ہے اور سب کرتی ہے۔“

”کیونکہ میں عام عورت ہوں۔“ سادی نے اندر آتے ہوئے کہا۔ وہ چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے

تھی۔ ”آپ فکر نہ کریں سفیر بھائی آپ جو کہیں گے میں بنا کر کھلاؤں گی۔“

”دیکھا ایسی ہوتی ہیں سعادت مند بچیاں، بزرگوں کی خدمت کرنے والی۔“

”ہاں کیونکہ اپنی بچی جو تے کی نوک پر رکھتی ہے۔“ دیم نے آہستہ سے کہا۔ ”دوسروں کی بچیوں پر نظر رہتی

ہے۔“

”برادرانہ نظر۔“ سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔

”کیا برادرانہ سفیر بھائی۔“ سادی نے ٹرے میں چائے کے ساتھ سیاہ کافی کے مگ تھے ساتھ میں کریم

اور شکر تھی۔

”جیو گڑیا۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ سفیر اور ایاز نے منہ بنائے تھے۔ وہ چائے کے عادی تھے۔ وسیم بھی کافی کا شوقین تھا۔ سادی خوش تھی اور یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس بھاگ دوڑ اور مار دھاڑ میں اس بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا جو ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ سادی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ طے ہوا کہ وسیم وہیں سے فارم ہاؤس آئے گا۔ کافی کے بعد وسیم سادی کو لے کر چلا گیا۔ میں نے عبداللہ سے مالی معاملات کا پوچھا۔ زیورات کا سونا فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم اس نے کیش میں تبدیل کر کے اسے ایک درجن مختلف بینک لاکروں میں رکھا تھا۔ یہ تقریباً پانچ کروڑ سے اوپر رقم تھی۔ باقی کیش کی صورت میں پاس تھی اور روزمرہ کے کاموں میں استعمال ہو رہی تھی۔ کیونٹینیشن وین سمیت ہمارے پاس سات گاڑیاں تھیں جن میں دو مزدادین تھیں۔ ان میں بارہ تیرہ افراد مع ساز و سامان کے آرام سے آسکتے تھے اور یہ اسی لیے مخصوص تھیں۔ کمال کھوکھر کے ڈیرے پر آنے والے وسیم کے آدمی ایک مزدادین میں آئے تھے۔ دو گاڑیاں یہاں تھیں اور باقی بھگوال والی حویلی میں تھیں۔

یہاں صرف صوفی اور زبیدہ تھے۔ وسیم کے آدمی گیٹ کی نگرانی کرتے تھے۔ یہ وہی بایک رائڈر تھے جو سفیر کے ساتھ جاسوسی کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ جاتے۔ صوفی نے اصرار کیا کہ اسے بھی ساتھ لیا جائے مگر عبداللہ نے منع کر دیا۔ ”تم یہاں کے نگران ہو اس لیے یہیں رہو گے اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑ سکتے۔“

”میں بھی چلتا ہوں۔“ ایاز نے سب سے ہاتھ ملایا۔ ”کل آؤں گا۔ باقی ضرورت پڑنے پر آپ کسی وقت بھی کال کر سکتے ہیں۔“

ایاز کے جانے کے بعد ہم سارے ساز و سامان کے ساتھ اسی نسان وین کار میں سوار ہوئے جس میں سرحد سے یہاں تک آئے تھے۔ دونوں رائیڈر اپنی بانیکس پر تھے۔ مانی خفا تھا کہ اسے محبت میں اپنا سب سامان سمینا پڑا اور جب سفیر نے اسے دشمنوں سے ڈرایا تو وہ فٹ پاتھ اپنا سامان سمیٹ کر سب سے پہلے وین میں آ بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے اس کی بھی تنخواہ مقرر کرنا چاہی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔

”میں گزارے لائق کما لیتا ہوں۔ اگر ضرورت ہوگی تو آپ سے کہہ دوں گا۔“

اس پر عبداللہ نے اسے دولاکھ دیئے تھے کہ اسے سامان کی ضرورت ہو تو وہ بلا تکلف خرید لے۔ وہ سن کر خوش ہوا تھا کہ ہم اسی فارم پر جا رہے تھے اور جب اسے پارسل نوڈ پر پابندی کا پتا چلا تو اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ ”تب ہم کیا کھائیں گے؟“

”جو وہاں بنے گا۔“ سفیر نے کہا۔ ”ہم ناشتے اور کھانے کے لیے ایک ساتھ ہی راشن لے جائیں گے۔“

جیسے دلیہ، دودھ، بیریل، انڈے اور اسٹور ہونے والی سبزیاں اور دالیں۔“

”تب میں نہیں جا سکتا۔“ مانی نے انکار کیا۔ سفیر نے اسے دوبارہ دشمنوں کا واسطہ دے کر راضی کیا اور ان کی نوک جھونک میں ہم ہنستے اور مسکراتے رہے۔ جب بیٹو تھا تب بھی یہی سین چلتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کسی کے جانے سے فرق نہیں پڑتا ہے۔ انسان پھر اپنی زندگی میں مگن ہو جاتا ہے لیکن یہ انسان کی خامی نہیں بلکہ وہ فطرت ہے جو اللہ نے بنائی ہے۔ ہم سب گاڑی میں لد گئے۔ فاضلی جیسے دشمن کا سن کر میں نے محتاط رہنے کا فیصلہ کیا تھا

اور سب مسلح تھے۔ پستول سب کے پاس تھے جب کہ بڑا اسلحہ بھی پہنچ میں تھا۔ سفیر بار بار اپنی بیلٹ میں لگا پستول مانی کو لگا رہا تھا اور وہ ڈر کر اسے دور کر رہا تھا میں نے کہا۔ ”یار تم نے اتنی صفائی سے بھارتیوں کو نشانہ بنایا اور اب ایک معمولی پستول سے ڈر رہے ہو۔“

”شوہی وہ تو میں ویڈیو ٹیم کھیل رہا تھا، اس کا ماہر ہوں نا۔“

”ماہر نہیں ہو بیٹے تم چیٹ کرتے ہو۔“ سفیر نے اب زبان کا استعمال کیا۔ ”تم گیم میں بھی اپنی مرضی کی چیزیں ڈال دیتے ہو۔“

”یہ بھی تو میری مہارت ہوئی نا۔“ مانی نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”شوہی کمال تو سارا اس مشین کا ہے وہ بالکل ٹھیک نشانہ لگا رہی تھی اور گولی چلنے کی معمولی سی آواز آ رہی تھی ورنہ تو میرا ویسے ہی ہارٹ فیل ہو جاتا دھماکے کی آواز سن کر۔“

ہم فیض آباد سے نکلے اور کچھ دیر بعد کشمیر روڈ پر آ گئے۔ وہاں سے جی ٹی روڈ پر آئے لیکن ترنول سے دوبارہ جی ٹی روڈ سے اتر گئے۔ اب ہنم فتح جنگ روڈ پر تھے۔ اگرچہ فتح جنگ یہاں سے کوئی پندرہ کلومیٹر دور تھا۔ ہم پی اے ایف ترنول سے پہلے جہاں اسلام آباد کا آخری جی پندرہ سیکٹر ختم ہو رہا تھا نو غازی کے ساتھ واقع فارم ہاؤس تک پہنچے۔ یہ سڑک سے کسی قدر ہٹ کر تھا اور اس کے عقب میں دور تک کھیت تھے۔ ایک موقع پر ہم ان ہی کھیتوں سے نکل کر فرار ہوئے تھے کیونکہ مانی کے لگائے کیمروں نے بروقت دشمنوں کو آتے دکھا دیا تھا۔ وہ اپنے کیمرے اور نگرانی کا دوسرا سامان بچا لیا تھا۔ چابی عبد اللہ کے پاس تھی اس نے اتر کر گیٹ کھولا اور اچانک ہی واپس آیا اس نے گاڑی میں منہ ڈال کر کہا۔

”اندر کوئی ہے..... ایک گاڑی کھڑی ہے۔“

میں نے فوری فیصلہ کیا اور مانی سے کہا۔ ”تم یہیں رکو۔“

”اور آپ سب؟“ مانی نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہم دیکھتے ہیں یہاں معاملہ کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم دیکھو اگر خطرہ ہو اور ہم میں سے کوئی مدد کے لیے آس پاس نہ ہو تو گاڑی لے کر دوڑ جانا۔“

مانی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور ہم نے اسلحہ والے بیک سے خود کار انقلابی نکالیں۔ عبد اللہ بتا رہا تھا کہ گیٹ کھلا ہوا تھا مطلب لاک نہیں تھا۔ فارم ہاؤس کے چاروں طرف سات فٹ اونچی چار دیواری تھی پہلے اس پر خاردار تار تھی مگر اب وہ ہٹا دی گئی تھی۔ میں نے وسیم کے دونوں آدمیوں خاور اور اشفاق کو پیچھے کی طرف بھیجا۔ دائیں طرف سفیر اور عبد اللہ بائیں طرف سے گیا تھا میں گیٹ سے اندر جاتا۔ ان لوگوں کے جانے کے چند منٹ بعد میں گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک چھوٹی لیکن نئی کار کھڑی تھی۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں پورچ سے ہوتے داخلی دروازے تک آیا اور وہ اندر سے بند تھا۔ اسی دوران میں سفیر بھی آ گیا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”باہر کوئی نہیں ہے اور یہ تو اندر سے بند ہے؟“

”کیا خیال ہے کال بیل بجائیں۔“ میں نے کہا۔

”تاکہ وہ اندر سے سیدھی گولی ماریں۔“ سفیر نے بھنا کر کہا۔ ”آپ نے کیا عقل بھی گاڑی میں بھیج دی ہے۔“

”تم مذاق بھی نہیں سمجھتے۔“ میں نے ایک کھڑکی سے اندر جھانکا۔ یہ لاؤنج تھا اور اس کے ساتھ نشست گاہ تھی۔ فارم ہاؤس کی بیرونی حالت سے لگ رہا تھا کہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال کی جاتی تھی اور پودوں کو پانی وغیرہ دیا جاتا تھا۔ اس لیے سبزہ ہر اتھا۔ کھڑکی کے ساتھ ستون پر بوگن ویلیا کی تیل چڑھی ہوئی تھی اس لیے یہاں سایہ تھا اور اندر کا منظر تاریک لگ رہا تھا۔ میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ہی شیشے کے دوسری طرف ایک نسوانی چہرہ نمودار ہوا۔ وہ بھی جھانک رہی تھی اور مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں پھر وہ چیخ مار کر بھاگی۔ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میں تیزی سے داخلی دروازے تک آیا اور دروازے کے لاک پر ہتھول رکھ کر فائر کر دیا۔ ہتھول پر سائلنسر تھا اس لیے آواز کا خدشہ نہیں تھا۔ دوسرے فائر پر لاک ٹوٹ گیا۔ سفیر میرے آس پاس تپتے ہوئے اس فائرنگ کی وجہ دریافت کر رہا تھا۔ مگر میں اس کی بک بک پر توجہ دیئے بغیر دروازہ کھلتے ہی اندر گھس گیا تھا۔ اندر آیا تو اسی وقت لڑکی ایک لڑکے کے ساتھ اندر سے نمودار ہوئی۔ لڑکا صرف پاجامے میں ملبوس تھا اور لڑکی نے بھی ہاتھ رو بہن رکھا تھا۔ مجھے مسلح دیکھ کر وہ واپس بھاگے تھے کہ میں نے لاک کر کہا۔

”بس.....“

وہ دونوں منجمد ہو گئے۔ دس منٹ میں پورا فارم ہاؤس چیک کر لیا گیا تھا وہاں بس یہی دونوں تھے۔ میں ان کے سر پر تھا اور وہ دونوں سہمے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی مشکل سے انیس بیس سال کی تھی اور بہت حسین تھی۔ جب کہ لڑکا بھی اچھے نقوش کا اور اساتھ تھا۔ جب عبد اللہ نے آل کلیئر کا اشارہ کیا تو میں نے اسے مانی کو اندر بلانے کے لیے کہا۔ دسم کے آدمی سفیر کے ہمراہ فارم کے آس پاس چیک کر رہے تھے مگر میں نے محسوس کر لیا تھا کہ خطرہ نہیں ہے۔ عبد اللہ نے مزید رپورٹ دی تھی کہ اندر ایک بیڈروم زیر استعمال تھا اور وہاں باقاعدہ ان کا سامان تک موجود تھا۔ وہ دونوں سہمے ہوئے تھے اگرچہ لڑکا کسی قدر بہادر نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اندر سے اس کی ہوا بھی خراب تھی۔ میں نے ان دونوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

”اب ذرا کچھ سوالوں کے جوابات دو۔“

”کیسے سوالات؟“ لڑکے نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔

”ایسے نہیں جناب..... الگ الگ پوچھتے ہیں۔“ عبد اللہ نے بروقت عقل مندی کی بات کی اور لڑکی سے

کہا۔ ”چلو اٹھو اندر جاؤ۔“

لڑکی ہچکچاتے ہوئے ابھی اس کا خیال تھا کہ ہم میں سے کوئی اس کے پیچھے آئے گا مگر ہم بیٹھے رہے اور وہ بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ یہاں باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک کچن کا دروازہ تھا وہ سامنے تھا اور میزبیاں بھی لاؤنج سے ہی اوپر جا رہی تھیں۔ میں نے لڑکے سے پوچھا۔

”تمہارا نام۔“

”راشد علی۔“ اس نے جواب دیا۔

”راشد علی..... تم یہاں کیا کر رہے ہو..... اس لڑکی کے ساتھ.....؟ اور اس کا نام کیا ہے؟“

”رومانہ۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کا نام رومانہ ہے۔“

”اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ”ہم یہاں چھپے ہوئے ہیں۔“

میں چونکا۔ ”چھپے ہو کس سے؟ اور تمہیں اس جگہ کا پتا کیسے چلا؟“

”ہم اپنے گھروالوں سے چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے اس کا جگہ کا معلوم تھا۔ میں ایک بار اپنے دوست کے

ساتھ یہاں آچکا ہوں۔“

”تمہیں معلوم تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہوگا اس لیے تم یہاں چلے آئے لیکن تمہیں کیسے معلوم کہ یہاں کوئی

نہیں ہوگا؟“

”اس فارم ہاؤس کا مالک باہر ہوتا ہے۔ یہ جگہ کرائے پر دی جاتی ہے لیکن ابھی خالی ہے۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ خالی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم نے اسے کرائے پر لے لیا

ہے۔“

”ہم سے غلطی ہوئی لیکن ہم نے یہاں سے کچھ لیا نہیں ہے صرف ایک تالا توڑا ہے۔“

”عمارت میں کیسے آئے؟“

”اتفاق سے اس کی چابی میرے پاس تھی اسی لیے تو یہاں کا رخ کیا۔“ اب وہ کسی قدر اعتماد سے بول رہا

تھا ویسے بھی اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ”اندروالا بیڈروم لاک تھا

اس کا تالا توڑنا پڑا۔“

”کیوں نہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“

”کر دیں۔“ اس نے بے خوفی سے کہا۔ ”پولیس مسئلہ نہیں ہے۔“

”تب تمہیں تمہارے گھروالوں کے حوالے کیوں نہ کر دیں۔“

اس بار اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے گھبرا کر کہا۔ ”پلیز ایسا مت کریں۔ میں بیچ جاؤں گا مگر رومانہ

ماری جائے گی اس کا باپ بہت ظالم ہے۔“

”جب تمہیں معلوم ہے کہ اس کا باپ بہت ظالم ہے تو یوں بھاگ کر چھپنے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے تم

دونوں نے شادی کر لی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”کل ہی ہمارا نکاح ہوا ہے۔ بھاگ کر شادی اس لیے کی کہ رومانہ کا باپ جو میرا رشتے

کا چچا ہے اس شادی کے لیے بالکل آمادہ نہیں تھا۔“

”اور تمہارے گھروالے؟“

”مان تو وہ بھی نہیں رہے تھے مگر اصل مسئلہ رومانہ کے باپ کا تھا۔ وہی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔“

”اسے تم نے بائی پاس کر دیا۔“ میں نے کہا۔ اسی اثنا میں مانی بھی اندر آ گیا۔ وہ خوش تھا کہ خطرہ نہیں تھا

اور مارا ماری نہیں ہوئی۔ اس نے مجھ سے سامان لانے اور سیٹ کرنے کی اجازت مانگی۔

”جلد از جلد کرلو خاص طور سے سکیورٹی سسٹم۔“

”میں چند گھنٹے میں کر لوں گا۔ لیکن مجھے ایک آدمی چاہیے۔“

عبداللہ نے خاد کو اس کے ساتھ کر دیا۔ میں نے راشد سے چند سوال اور کیے اور پھر رومانہ کو بلایا۔ راشد کے ساتھ عبداللہ گیا تھا۔ وہ بہر حال مرد تھا اور اس سے مزاحمت اور گزبڑ کی توقع کی جاسکتی تھی۔ رومانہ نے ان تمام سوالوں کے جوابات درست دیئے جو میں نے راشد سے کیے تھے۔ وہ شروع میں نزوس تھی مگر اب اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اسے کم سے کم لڑکی ہونے کی حیثیت سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ اعتماد سے جواب دے رہی تھی۔ آس پاس سب کلیئر تھا۔ سفیر کچن میں کھانے پینے کا سامان رکھ رہا تھا جو صوفی نے ساتھ کیا تھا۔ اس میں کئی تیار ڈشیں تھیں جو زبیدہ نے غلت میں تیار کر دی تھیں۔ میں سوچ کر آیا تھا کہ اب ہم فاضلی کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کریں گے اور یہ کام آج ہی سے شروع کر دیں گے مگر یہاں یہ مسئلہ موجود تھا۔ راشد اور رومانہ کا ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ وہ ہمارے لیے خطرہ تھے مگر انہیں چھوڑنے کا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ نہ جانے کیا گل کھلاتے اور ہم مشکل میں پڑ جاتے۔ میں نے راشد کو بلایا۔

”تم دونوں نے سچ کہا ہے لیکن ہم اس کی مزید تصدیق کریں گے اور اس کے بعد ہی تم دونوں کو یہاں سے جانے کی اجازت دی جائے گی تب تک تم یہیں رہو گے۔“

”ہم قید ہوں گے؟“ راشد نے بے یقینی سے کہا۔ ”مگر کیوں؟“

”ٹریلر پاس کے جرم میں۔ اگر تمہیں گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے تو چند مہینے کی سزا تو لازمی ہوگی۔ سمجھ لو ہم نے تمہیں چند دن قید کی سزا دی ہے۔ اس دوران میں تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں ہوگا اور نہ ہی تمہیں کسی بھی طرح مجبور کیا جائے گا۔ صرف باہر جانے پر پابندی ہوگی تم اپنے کمرے تک محدود رہو گے۔“

”کب تک؟“ رومانہ نے پوچھا۔

”کہہ نہیں سکتا چند دن بھی ہو سکتے ہیں اور چند ہفتے بھی۔“ میں نے کہا اور عبداللہ کو اشارہ کیا۔ وہ انہیں کمرے کی طرف لے گیا۔ اس کا دروازہ باہر سے بند نہیں ہوتا تھا اور لاک کرنا بھی بے کار تھا کیونکہ وہ آسانی سے اندر سے کھل سکتا تھا۔ ویسے بھی لاک انہوں نے توڑ دیا تھا۔ اس لیے یہاں کسی نہ کسی کو ان کی نگرانی کے لیے موجود رہنا ضروری تھا۔ وسیم اور سادی خاصی تاخیر سے آئے تھے اور وجہ صاف ظاہر تھی وہ مزگشت کر کے آرہے تھے۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سفیر نے کہا۔

”دیکھا آئے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں آوارہ گردی شروع۔“

”سفیر بھائی ہم میاں بیوی ہیں۔“ سادی نے احتجاج کیا۔

”تم شادی سے پہلے گھوم پھر لیے ہم شرفا ہیں شادی کے بعد سب کام کرتے ہیں۔“ وسیم نے کہا تو سادی جلدی سے بولی۔

”میں ذرا فریش ہو جاؤں۔“

”احتیاط سے، اس کمرے میں مت جانا۔“ سفیر نے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔

”کیوں اس میں کیا ہے؟“

”ایک نیا شادی شدہ جوڑا..... ہنی مون منارہا ہے۔“

سفیر کی بات پر سادی اور وسیم نے اسے شک سے دیکھا۔ ”نیا شادی شدہ جوڑا کہاں سے آگیا۔“
”وہ پہلے سے موجود تھا۔“ میں نے کہا۔ پھر وسیم کو بتایا تو وہ فکر مند ہو گیا۔

”یہ تو اچھا نہیں ہوا، ہم یہاں چھپنے آئے ہیں اور یہاں پہلے ہی کوئی موجود تھا۔“

”مجھے لگ رہا ہے وہ سچ کہہ رہے ہیں مگر ہم انہیں ایسے ہی نہیں چھوڑ سکتے۔“

وسیم نے تائید کی۔ ”ٹھیک ہے ابھی تو ان کو رکھتے ہیں بعد میں دیکھیں گے۔“

یہاں تین بیڈروم تھے۔ ایک وسیم اور سادی کے حصے میں آیا اور دوسرے میں، میں نے سفیر کے ساتھ ڈیرا جمایا۔ مانی حسب معمول اسٹڈی میں اپنا سیٹ اپ کر چکا تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتا۔ وہ کیمرے لگانے میں مصروف تھا پھر اس نے عمارت کے چاروں طرف لیزر جال لگایا۔ اگر کوئی اس جال میں مداخلت کرتا تو اندر الارم بج جاتا۔ کھانے کی میز پر ذہن غلبت میں آیا اور پھر چلا گیا۔ کھانے کے بعد عبد اللہ بھی اس کی مدد کرنے لگا تھا اور سفیر تفریح کرنے پہنچ گیا تھا۔ میں کچھ دیر بیٹھی وی دیکھتا رہا۔ پھر راشد اور رومانہ کو چیک کیا۔ وہ فکر مند تھے مگر زیادہ نہیں۔ انہیں کھانا کمرے میں ہی دے دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد انہیں چائے بھی مہیا کی تھی۔ یہاں ہر کمرے میں اے سی تھا اس لیے سکون تھا۔ ویسے موسم بارش کے بعد بہتر تھا اور باہر کچھ اچھا ہی تھا میں ٹیلنے باہر آیا تو خشکی کے ساتھ نباتات کی خوشبو نے استقبال کیا تھا۔ دس بجے گیٹ کے سامنے کیونٹیکشن وین رکی اور اشفاق جو ڈیوٹی پر تھا اس نے دروازہ کھولا۔ کیونٹیکشن وین اندر آئی۔ اس کا رنگ آسمانی کر دیا تھا اور اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس پر سرکاری نمبر پلیٹ لگی تھی۔ اس کے پیچھے مزید دو رائیڈز آئے تھے۔ اب یہاں چار رائیڈز ہو گئے تھے۔ یہ یہاں پہرہ بھی دیتے اور گیٹ کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ ان کے لیے اوپر موجود واحد کمرہ مختص کر دیا تھا جس کے ساتھ ہاتھ روم بھی تھا۔ ہمہ وقت دو افراد پہرے پر رہتے اور ان میں سے ایک وقفے وقفے سے فارم ہاؤس کا چکر بھی لگاتا۔ وہ واکی ٹاکی سے آپس میں اندر موجود وسیم سے رابطے میں رہتے۔ میں حفاظتی انتظامات سے مطمئن ہو گیا تھا۔ انہیں ان کی ذمے داریاں سمجھا کر وسیم میرے پاس آگیا۔ میں نے پوچھا۔

”فاضلی کے لیے کیا پلان ہے؟“

”اے اٹھانے کا سوچا ہے لیکن جیسا آپ کہیں۔“

”نہیں اٹھانے کا مسئلہ ہوگا۔ تم جانتے ہو وہ خطرناک آدمی ہے۔“

”تب اس کا پتا صاف کر دیتے ہیں۔“

”ہاں اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے لیکن پہلے دیکھا جائے کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ ممکن ہے کوئی موقع ہاتھ

لگے اور ہم اسے اٹھا بھی سکیں۔“

”میں سمجھ گیا..... ہم اوپن مائنڈ کے ساتھ جائیں گے۔“

”بالکل پہلی شرط مکمل مگرانی کی ہے۔“

”کیا خیال ہے ہم آج رات سے ہی یہ کام نہ شروع کر دیں۔“ وسیم نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ ہم

عام زندگی نہیں گزار رہے تھے جو روٹین کا کام روٹین کے مطابق انجام دیتے۔ ملک میں آج بھی دشمنوں نے

ڈیوڈ شاکی صورت میں رابطہ کر لیا تھا اور ہمیں در بدر ہونا پڑا تھا اس لیے بہتر یہ تھا کہ ہم بھی وقت ضائع نہ کرتے۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے ابھی سے شروع کرتے ہیں۔“

”میں آپ اور دو بندے چلتے ہیں۔ عبداللہ اور سفیر یہیں رہیں گے۔“ وسیم خوش ہو گیا۔ ”آپ کو ایک نئی چیز بھی دکھاتا ہوں۔“

”کیا چیز ہے؟“

”وہیں چل کر دکھاؤں گا کچھ دن پہلے منگوائی تھی اور بہت شاندار زلٹ ہے اس کا۔“

مجھے خیال آیا۔ ”وہ جگہ دیکھی ہے؟“

”ہمارے ساتھ جو دو جائیں گے انہوں نے دیکھی ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک مرشد کی درگاہ میں جاسوس بھی تھا پھر یہ مشکوک ہو گیا تو اسے واپس بلایا دوسرا کام کر رہا ہے۔“

ہم کیونیکیشن دین لے کر نکلے۔ سفیر سو گیا تھا اور عبداللہ جاگ رہا تھا اسے بتایا۔ وسیم اندر جا کر دیکھ آیا سادی بھی سو گئی تھی۔ ہم روانہ ہوئے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک کم تھا۔ فتح جنگ کے پاس جمیل کے کنارے بہت سے کھانے پینے کے ریسٹوران اور ڈھابے کھل گئے ہیں۔ شوقین لوگ اکثر یہاں آتے ہیں خاص طور سے تازہ مچھلی بہت اچھی ملتی ہے۔ اس وقت اس طرف سے گاڑیاں آرہی تھیں اور ان میں زیادہ تر فیملیز اور گروپ تھے جو یقیناً کھانپ کر آرہے تھے۔ بسمنٹ میں ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ ڈرائیور وی جاسوس تھا۔ اس کا نام احسان تھا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کا سابق آرمی کمانڈر تھا۔ اس نے ہائی وے کے کنارے دین روک دی اور بولا۔ ”ہم پاس ہیں۔“

”فارم کہاں ہے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”وہ جس چھت پر سرچ لائنس آن ہیں۔“ احسان نے اشارہ کیا۔

یہ فارم ہاؤس سڑک سے کوئی دو سو گز دور تھا اس سے پہلے والی زمین خالی تھی اور شاید یہ ہائی وے کا حصہ تھی۔ فارم کے وسط میں عمارت بنی ہوئی تھی اور اس کی چھت پر تیز روشنی والی سرچ لائنس لگی تھیں جو آس پاس کے علاقے کو جتہ نور کر رہی تھیں۔ اتنی روشنی کا مقصد یقیناً سکیورٹی تھی۔ وسیم نے وین کا خاص کیمرہ آن کیا جس کا ٹیلی لینس اس کی چھت پر تھا اور وہ مزید بلند ہو کر دکھا سکتا تھا مگر فارم کے گرد چار دیواری اتنی اونچی تھی کہ کیمرہ اونچا ہو کر بھی اس کے اندر دکھانے سے قاصر تھا۔ وسیم نے کہا۔ ”اب میں آپ کو خاص چیز دکھاتا ہوں۔“

وسیم نے ایک دھاتی بریف کیس اٹھایا اور اسے کھولا تو اس سے ایک چار انچ قطر کی گول سیاہ ڈسک نکلی، اس کی موٹائی مشکل سے دو انچ ہوگی۔ اس نے مجھے تھما دی۔ ”دیکھیں اور بتائیں یہ کیا ہے۔“

ڈسک کے اوپر ایک گھومنے والا روٹر لگا ہوا تھا۔ اس میں مخصوص کھانچے تھے جیسے اس میں کچھ لگایا جاسکتا ہو۔ میں نے اسے پلٹ کر دیکھا تو اس کے نیچے ایک گول لینس نما شیشہ لگا ہوا تھا مگر یہ ڈسک کے کناروں کے اندر تھا یعنی اگر ڈسک نیچے رکھا جاتا تو یہ شیشہ نیچے نہیں نکراتا۔ اس کا وزن ایک پاؤ سے زیادہ نہیں تھا۔ میں نے غور کیا اور کہا۔ ”مجھے یہ کوئی جاسوس ڈیوائس لگ رہی ہے۔ اس میں کیمرہ ہے اور اس کے اوپر گھومنے والا روٹر ہے اس میں کچھ لگ سکتا ہے شاید پنکھایا ایسی کوئی چیز.....“

”آپ نے درست پہچانا یہ چھوٹا سادہ ترین اسپائی ڈرون ہے۔“

”فوجی مقاصد کے لیے ہے؟“

”نہیں یہ اتنا ہائی فائی نہیں ہے خاص طور سے کیونیکیشن میں عام بینڈ استعمال کرتا ہے۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔“

وسیم نے بریف کیس سے پگھڑیوں کا ایک سیٹ نکالا۔ یہ فابری کی نئی بہت ہلکی لیکن مضبوط پگھڑیاں تھیں۔ اس نے انہیں روڑ کے کھانچے میں فٹ کر کے کلپس کی مدد سے بند کر دیا اب یہ کسی صورت ان خود نہیں کھل سکتی تھیں۔ پگھڑیوں کا قطر تقریباً دس انچ تھا اور ان کی تعداد آٹھ تھی۔ پھر ہم وین سے اتر آئے۔ بریف کیس ہی اس کا کنٹرولنگ یونٹ تھا۔ اس میں اوپر والے حصے میں اسکرین لگی تھی۔ وسیم نے مجھے پکڑا لیا اور بولا۔ ”اے سر سے اوپر کر لیں۔“

میں نے اس کا نچلا حصہ اوپر کیا تو وسیم نے بریف کیس میں لگا ایک بٹن دبایا۔ کنٹرولنگ یونٹ آن ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرون کے نیچے کمرے کے ساتھ بہت ہلکی سی سرخ روشنی چل اٹھی اور پھر اس کی پگھڑیاں گردش کرنے لگیں۔ وسیم بریف کیس کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”چھوڑ دیں۔“

میں خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ ڈرون زور لگا رہا ہے اور میرے چھوڑتے ہی وہ اوپر جانے لگا۔ تقریباً دس فٹ اوپر جانے کے بعد وہ نظروں سے تقریباً اوجھل ہو گیا تھا۔ اتفاق سے آسمان پر بادل تھے اور اس وجہ سے بھی وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آواز اس وقت بھی بہ مشکل آرہی تھی جب وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ ہم وین میں واپس آ گئے۔ وسیم نے بریف کیس اس طرح رکھا کہ میں اسکرین دیکھ سکتا تھا اور پھر وہ جو آئے اسٹک کی مدد سے ڈرون کنٹرول کرنے لگا۔ اس کھڑا ایئرس نیچے کا منظر صاف دکھا رہا تھا۔ مگر ابھی سب تاریکی میں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ پچاس فٹ کی بلندی پر تھا وسیم نے تصدیق کی۔ ”یہ ابھی پچاس فٹ پر ہے اور یہ دو سو فٹ کی بلندی تک جاسکتا ہے۔“

”کتنی دوری تک آپ ریٹ ہو سکتا ہے؟“

”آدھا کلومیٹر تک۔“ وسیم نے جواب دیا۔ ”اس میں ایک چھوٹی سی لیکن بہت طاقتور ری چارج سہیل بیڑی لگی ہے۔ ایک بار چارج ہونے کے بعد یہ آدھا گھنٹہ بہ خوبی کام کر سکتا ہے۔ اس کی بیڑی کو پھر چارج ہونے میں آدھا گھنٹہ ہی لگتا ہے۔“

”اگر فوری ضرورت ہو تو؟“

وسیم نے بریف کیس میں لگی اضافی بیڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں اسپیر بیڑی ہے اسے لگایا جاسکتا ہے یہ اسی یونٹ سے چارج ہوتی رہے گی۔“

ڈرون اب فارم ہاؤس کے اوپر تھا۔ نیچے روشنی کی وجہ سے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں لوکٹ، شہتوت اور انگور کے باغات تھے۔ کوئی نما عمارت وسط میں تھی۔ اس کے اگلے حصے میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور وہاں کرسیوں پر تین مسلح افراد بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے پاس شراب کی بوتل تھی اور وہ تینوں پینے میں مصروف تھے۔ پہلے وسیم نے پورے فارم کا جائزہ لیا۔ غنچے حصے میں کچھ کھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ سامنے

گیٹ پر دو افراد اور تھے اور وہ ٹہل رہے تھے۔ باہر یہی پانچ افراد تھے۔ اب وسیم ڈرون کو عمارت کے گرد گھمراہا تھا۔ اس میں موجود کمرے کا لینس گھوم سکتا تھا اور آس پاس کے مناظر بھی دکھا سکتا تھا۔ ڈرون گھومتا ہوا ایک کھڑکی کے سامنے پہنچا تو میں نے اور وسیم نے بیک وقت لاحول پڑھی۔ اندر موجود جوڑا ایک دوسرے میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ انہیں کھلی کھڑکی کا احساس بھی نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ کھڑکی زمین سے سات فٹ اونچی تھی اور کوئی زمین پر کھڑے ہو کر اندر نہیں جھانک سکتا تھا۔ باہر موجود پانچ افراد میں فاضلی نہیں تھا اور جوڑے میں مرد بھی فاضلی نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے مقابلے میں بہت ہٹا کٹا تھا۔ فاضلی کا جسم چھریا تھا۔ باقی کھڑکیاں بند تھیں۔ وسیم ڈرون کو اوپری منزل پر لایا جہاں تین کمرے تھے۔ یہ تینوں کمرے ایک قطار میں تھے اور ان کے دروازے کھلے محن کی طرف تھے۔ فاضلی یا مالکان جیسے لوگ انہیں رہائش کے لیے استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ یہ اوپن تھے اور باہر سے میڑھیاں براہ راست اوپر تک آرہی تھیں یہ یقیناً ملازمین کے لیے مخصوص تھے۔

”میرا خیال ہے فاضلی اندر ہے۔“ میں نے کہا۔

”گاڑیاں دیکھتے ہیں۔“ وسیم نے کہا اور ڈرون کو پورچ کی طرف لایا اب احتیاط سے کام کرنا تھا کیونکہ یہاں روشنی تھی اور تین عدد پہریدار بھی موجود تھے۔ گاڑیاں اعلیٰ درجے کی اور لکڑی تھیں۔ ان میں ایک لینڈ کروزر کا نیا ماڈل تھا۔ ایک ہیلکس تھی اور یہ بھی تقریباً نئی تھی جب کہ تیسری فراری تھی۔ مگر یہ چند سال پرانا ماڈل تھا۔ اچانک ہی کوٹھی کی طرف سے کوئی آیا۔ وسیم مسلسل لینس گھمراہا تھا اور اسی وجہ سے ہٹا چل گیا۔ اس نے غلت میں ڈرون اوپر اٹھالیا۔ آنے والا فاضلی تھا اور اس کے ساتھ ایک خوب صورت عورت تھی۔ وہ دونوں فراری میں بیٹھے۔ پورچ میں بیٹھے تین افراد میں سے ایک اٹھ کر فاضلی کے پاس آیا۔ وہ اسے کچھ کہہ رہا تھا کیونکہ وہ سننے والا صرف سر ہل رہا تھا۔ پھر فاضلی نے کھڑکی کا شیشہ اوپر کیا اور کار اسٹارٹ کر کے باہر لانے لگا۔ میں نے احسان سے کہا۔

”وین آگے لے چلو مگر دو سگزر سے دور مت جانا اور رفتار سلور رکھنا۔“

ہم مخالف سمت میں جانے لگے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل تھا کہ فاضلی کس طرف کا رخ کرے گا مگر امکان یہی تھا کہ وہ ہنڈی اسلام آباد کی طرف جائے گا۔ وسیم نے ڈرون واپس بلا لیا تھا۔ مگر اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ فراری ایک منٹ سے بھی پہلے ہائی وے پر آئی اور جی ٹی روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔ احسان نے حکم پر وین واپس گھمائی۔ جب تک ڈرون آتا فراری اتنی دور جا چکی تھی کہ اس کی عقبی روشنیاں بہ مشکل نظر آرہی تھیں۔ ڈرون آیا تو وسیم نے خود باہر جا کر اسے پکڑا اور آف کر دیا۔ پھر وہ جیسے ہی اندر بیٹھا احسان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وسیم نے ڈرون کو ایسے ہی چھوڑا اور غلت میں وین کا کیراسسم آن کیا۔ اس کا زوم بہت طاقتور تھا۔ اس نے ایک کلومیٹر دور نکل جانے والی فراری کو واضح دکھایا۔ لیزر ریچ فائنڈر فاصلہ بھی بتا رہا تھا۔ وسیم نے احسان سے کہا۔

”وہ ایک کلومیٹر آگے ہے رفتار بڑھاؤ۔“

وین کا انجن طاقتور تھا مگر وہ رفتار میں فراری کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر فاضلی نارمل رفتار سے چلاتا تو اس کا پیچھا کیا جا سکتا تھا۔ وسیم نے اسکرین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اچھا موقع ہے وہ اکیلا ہے۔“

”عورت ساتھ ہے۔“

”ہاں لیکن میرا خیال ہے وہ اس کی ساتھی نہیں ہے صرف دل بستی کے لیے ساتھ ہے۔ اسے قابو کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ اتنا تو مجھے یقین ہے وہ دانتوں تک مسلح ہوگا اور ہوشیار ہو گیا تو بہت ماردھاڑ کے بعد ہاتھ آئے گا یا مارا جائے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”تب آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

”فی الحال دیکھو اور انتظار کرو۔“ میں نے کہا۔ ”فاضلی ایسے ہی مرشد کے مد مقابل نہیں آگیا۔“

”آپ کو شبہ ہے کہ اسے کسی کی پشت پناہی حاصل ہے؟“

”شبہ نہیں یقین ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وین رفتہ رفتہ فراری کے پاس آرہی تھی اور اب دونوں گاڑیوں میں نصف کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ کچھ دیر میں موٹر وے کے نیچے سے گزر کر نو غازی کی طرف آگئے۔ فراری کا رخ جی ٹی روڈ کی طرف تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ جی ٹی روڈ پر تھی اور ترنول سے وہ اسلام آباد کی طرف مڑی۔ دو منٹ بعد وہ کشمیر ہائی وے پر آگئی تھی۔ ہائی وے سے اترنے کے بعد ویم نے فاصلہ تین سو گز کر لیا تھا اور یہ بھی اچھا خاصا تھا۔ اگر ہم وین کے سٹم سے اس پر نظر نہ رکھے ہوتے تو اتنی دور سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اب فاضلی کسی صورت تعاقب کا شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے کسی ناگہانی صورت حال کے لیے اسلحہ تیار کر لیا تھا۔ نزدیک آنے کی وجہ سے ویم نے کیمرے کو نیچے کر لیا تھا۔ اب وہ چھت پر اتنا نمایاں نہیں تھا مگر اپنا کام کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد فراری جی ٹی ٹان کی طرف مڑ گئی۔ میں اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا کیونکہ ایک زمانے میں یہاں موجود بہت بڑے پارک میں جاگنگ کے لیے آتا تھا۔ اسے فاطمہ جناح پارک کہتے ہیں۔ اتفاق سے فراری اس پارک کی طرف جانے والی سڑک پر مڑی تھی۔ پارک کے ساتھ جی ٹی ٹان کا پوش ترین علاقہ تھا۔ یہاں بڑے بنگلے اور کوٹھیاں تھیں جو زیادہ تر اوپر کی طبقے یا غیر ملکیوں کے استعمال میں تھیں۔ ویم فکر مند ہوا۔“

”یہاں پولیس مستعد ہوتی ہے اور ذرا سی ٹک کی بنیاد پر روک لیتی ہے۔“

”جب روکے گی تو دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”اسلحہ چھپایا جاسکتا ہے؟“

”بالکل اور وین کے باہر ایک ایسے ٹی وی چینل کا نام اور لوگو ہے جو شاید ہی کوئی دیکھتا ہو۔“ ویم مسکرایا۔

”اس صورت میں ہم میڈیا والے بن جائیں گے۔“

”یہ اچھی ترکیب ہے۔ اگر اوپر ایک آدھ ڈش بھی لگا لو تو پوری چینل وین بن جائے گی۔“

فراری اس سیدھی سڑک پر جا رہی تھی پھر وہ پارک کے ساتھ والی سڑک سے پہلے جی ٹی ٹان کی آخری لائن کی طرف مڑ گئی۔ یہ بائیں طرف کی روڈ تھی جو این سیناروڈ کہلاتی ہے۔ احسان نے میرے کہنے پر رفتار تیز کی کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ فراری کسی گلی میں مڑنے والی ہے اور میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس بنگلے یا کوٹھی میں داخل ہوتی ہے۔ یہاں زیادہ بڑے مکان نہیں تھے۔ زیادہ تر نصف کنال کے بنگلے تھے اور کچھ جگہیں خالی پڑی تھیں۔ ہم موڈ تک پہنچے تو فراری گرین ہیلٹ کے ساتھ رک رہی تھی اور پھر اس سے فاضلی اتر کر ایک بنگلے کی طرف بڑھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ بنگلے کے آگے کنکریٹ کی تیار رکاوٹ رکھی ہوئی تھی۔ یہ شاید چوتھا یا پانچواں بنگلہ تھا۔ احسان نے وین ذرا پیچھے روک دی مگر ویم نے کہا۔ ”نہیں اسے آگے لے جاؤ اور گھوم کر دوسری طرف آؤ۔ بالکل اس

بنگلے کی سیدھ میں۔“

احسان نے وین آگے بڑھائی اور بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا اگلا حصہ مکمل طور پر بند تھا اور کنکریٹ کی رکاوٹ کی وجہ سے کوئی گاڑی آسانی سے گیٹ تک نہیں جاسکتی تھی۔ سیاہ گیٹ بڑا اور مکمل طور پر سیل فولادی چادر سے بنا ہوا تھا۔ وین آگے نکلی تو ویم نے کہا۔ ”اس قسم کی حفاظتی رکاوٹیں غیر ملکی افراد کے لیے کھڑی کی جاتی ہیں۔ عام افراد ایسا کریں تو یہ جرم شمار ہوگا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”بعض اوقات تو لگتا ہے پاکستانی ہونا ہی کوئی جرم ہے۔“

احسان نے پہلے کٹ سے گاڑی دوسری سڑک پر کی اور گھما کر بنگلے کے سامنے لے آیا۔ مگر یہاں درمیان میں گرین ہیلٹ کے درخت بڑے تھے اور منظر واضح نہیں تھا اس لیے وین کچھ آگے لے گئے جہاں سے چھت پر لگی دور بین سے بنگلہ دکھائی دے رہا تھا۔ ویم نے بڑی اسکرین پر اسے زوم کیا اور اس کا اوپری حصہ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ یہ دو منزلہ مکمل کورڈکوشی تھی مگر اس کے بائیں طرف ایک گیلری تھی۔ اسے بھی فولادی گرل سے بند کیا گیا تھا۔ سامنے والا حصہ جو ٹیرس کے ساتھ تھا، اس پر پوری دیوار سیاہ شیشے کی تھی اور اس کے اندر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ویم سے کہا۔ ”اس کے اندر نہیں دکھائی دے سکتا ہے؟“

”کوشش کرتا ہوں اس میں تھریل ایجبر ہے لیکن یہاں روشنی بہت زیادہ ہے اس کے ساتھ ہی ایک سینر سے کام لینا ہوگا۔“

ویم نے کیرے کو نائنٹ موڈ پر کیا تو پوری اسکرین برائٹ ہو گئی تھی پھر اس کی برائٹ نیس کم کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ اتنا کم کرنے میں کامیاب رہا کہ شیشے کے پار ہیو لے دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ لاؤنچ ہی تھا یہاں تین افراد تھے وہ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کون تھے کیونکہ وہ صرف رنگین ہیولوں کی صورت میں تھے۔ ویم نے کہا۔ ”مائی ہوتا تو سافٹ ویئر کی مدد سے انہیں واضح کر لیتا مجھے اس سافٹ ویئر کا استعمال نہیں آتا ہے۔“

اب کیرا بتا رہا تھا کہ بنگلے میں کم سے کم چھ افراد تھے ان میں تین اوپر تھے اور تین نیچے تھے۔ نیچے والے سامنے کے حصے میں تھے اور وہ مستعد گارڈز کی طرح ٹہل رہے تھے۔ ویم نے اشارہ کیا۔ ”اصل آدمی اوپر ہی ہے۔“

”یہ نمایاں ہو سکتے ہیں میرا مطلب ہے زوم ہو سکتے ہیں؟“

”میں کرتا ہوں۔“ ویم نے کی بورڈ کے چند بٹن دبائے اور اوپر ہی منزل کا منظر زوم ہونے لگا مگر اس سے امیج کی کوالٹی خراب ہو رہی تھی بڑی کوشش کے بعد وہ اسے اتنا زوم کر سکا کہ ان تینوں افراد کی جسامت نمایاں ہونے لگی۔ ان میں سے ایک کی داڑھی تھی۔ یہ کسی قدر بڑی فرنج کٹ تھی۔ باقی دو افراد کلین شیو تھے۔ ایک کے سر کے بالوں سے مجھے شبہ ہوا کہ وہ فاضلی تھا اور اس نے سوٹ پہن رکھا تھا فاضلی نے بھی آج سوٹ پہنا ہوا تھا۔ تینوں گفتگو میں مصروف تھے۔ ایک اور اسکرین پر سادہ منظر آرہا تھا۔ اس سے چھت کا منظر دکھائی دے رہا تھا جس پر ڈش اور سیٹلائٹ کیونٹیکیشن کے آلات دکھائی دے رہے تھے۔ ویم نے تصدیق کی۔

”یہ سیٹلائٹ پر مخصوص چینل کے لیے استعمال ہونے والے آلات ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے اس کوٹھی میں کوئی اہم بین الاقوامی شخصیت موجود ہے۔“ میں نے کہا۔

”اگر آپ کا اشارہ ڈیوڈ شا کی طرف ہے تو مجھے یہ جگہ اس کے شایانِ شان نہیں لگتی ہے۔“
 ”بات شایانِ شان کی نہیں ہے۔ سیوری اور ضرورت کی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کوئی مستقل اڈہ ہے۔
 اگر ان میں سے کوئی ڈیوڈ شا ہے تو وہ اس جگہ بھی رک سکتا ہے۔“

”اس صورت میں یہ جگہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔“ ویم نے کہا۔ ”فاضلی سے زیادہ اہمیت۔“
 ”بالکل اس صورت میں فاضلی ثانوی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ مگر فی الحال ہم فاضلی کے پیچھے ہیں۔“
 ”اب اسے چھیڑنا اور مسئلہ ہو جائے گا اس صورت میں یہاں موجود شخص چونکا ہو جائے گا۔“ ویم نے
 ایک نکتہ اور اٹھایا۔

میں سوچ رہا تھا۔ ”دیکھو اگر یہ شخص ڈیوڈ شا ہے تو ہم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ اس
 صورت میں ایک طاقتور ملک ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ بین الاقوامی دباؤ سنبھالنے کی ہم سکتے نہیں رکھتے ہیں اس لیے
 فاضلی کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں تو ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قطع نظر اس کے یہاں کون ہے۔“
 ویم مسکرایا۔ ”لگتا ہے آپ نے کچھ سوچ لیا ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے پاس بے ہوش کرنے والی
 کوئی چیز ہے؟“

”بالکل ہے۔“ ویم نے کہا اور ایک خانہ کھول کر اس سے ڈارٹ گن نکالی۔ اس میں چھ تیر لوڈ تھے۔ یہ
 انجکشن کی سوئی جیسے تھے۔ جسم پر لگتے ہی یہ دوا انجکٹ کر دیتے تھے اور دوا اتنی زود اثر تھی کہ دس سیکنڈ سے بھی پہلے
 آدمی مکمل طور پر بے ہوش ہو جاتا تھا۔ میں پہلے بھی اسے استعمال کر چکا تھا۔ میں نے واکی ٹاکی اور ڈارٹ گن لی
 اور دین سے اتر گیا۔ دوسرا آدمی رفاقت بیک آپ میں تھا۔ میں سڑک پار کر کے گرین بیٹ تک آیا اور دبے
 قدموں چلتا ہوا فراری کے پاس پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹا جھاڑی نما درخت تھا جو مجھے پوری طرح چھپا رہا تھا۔
 فراری یہاں سے کوئی سات آٹھ گز دور تھی اور یہ فاصلہ مناسب تھا۔ میں نے واکی ٹاکی کا بٹن دبایا اور آہستہ سے
 بولا۔

”کوئی تہدیلی آئی؟“

”نہیں۔“ ویم نے جواب دیا۔ ”وہ سب اپنی جگہوں پر ہیں..... لیکن نہیں اوپر والے کھڑے ہو گئے
 ہیں۔ دو کھڑے ہیں اور ایک بیٹھا ہے۔ جو دو کھڑے ہوئے ہیں وہ نیچے آ رہے ہیں۔“
 ”میرا خیال ہے ان میں فاضلی ہو گا اسے دیکھتے ہی مجھے خبردار کرو۔“ میں نے کہتے ہوئے واکی ٹاکی کا
 ولیم اتنا کم کر دیا تھا کہ صرف مجھ تک آواز محدود رہے۔ ایک منٹ بعد ویم نے تصدیق کی۔

”فاضلی ہے اور وہ باہر آ رہا ہے۔“

”رفاقت سے کہو مجھے بیک کرے اگر کوئی کی طرف سے کوئی آئے تو وہ اسے دیکھے لیکن مار دھاڑ سے گریز
 کرے۔“

”میں کہتا ہوں۔“ ویم نے کہا تو میں نے واکی ٹاکی بند کر دیا اور تیار ہو گیا۔ مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا
 اور فاضلی باہر آیا۔ اس نے سگریٹ سلگائی تھی پھر آرام سے فراری کی طرف آیا۔ عورت بدستور کار میں تھی اور

کون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ گرین بیٹ کی طرف تھی اس لیے فاضلی اس طرف آیا جیسے ہی دروازہ کھولنے کے لیے مڑا میں نے ڈارٹ اس کی پشت میں اتار دی تھی۔ بہت معمولی سی آواز آئی اور اتنی ہی ہلکی سی کراہ فاضلی کے منہ سے نکلی اور اس کا ہاتھ پشت کی طرف گیا مگر ڈارٹ پشت پر ایسی جگہ تھی جہاں اس کا ہاتھ جا نہیں سکتا تھا اور اس کوشش میں اس نے وہ وقت گنوا دیا جس میں وہ کسی سے مدد طلب کر سکتا تھا۔ وہ منہ کے بل کار پر گرا اور پھر آرام سے نیچے لڑھک گیا ایسا اٹنا میں گھبرائی ہوئی عورت نے نیچے آئی۔ اس نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔

”کیا ہوا تمہیں؟“

جیسے ہی وہ فراری کے بونٹ تک آئی۔ میں نے اسے بھی نشانہ بنایا۔ ڈارٹ اس کے سینے پر بائیں طرف ذرا اوپر لگا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ مار کر ڈارٹ نکالا اور کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد لہرا کر گری تھی۔ اسی لمحے بنگلے کا گیٹ کھلا اور دو افراد باہر آئے۔ مگر فوراً میرے دائیں طرف سے سائلنسر لگے ہتھیار سے ان پر فائرنگ ہوئی۔ گولیاں ان کے قدموں کے سامنے لگی تھیں۔ وہ تجربے کار لوگ تھے پلٹ کر واپس بھاگے۔ اتنی دیر میں، میں نے فاضلی کو اٹھا کر پشت پر لاد لیا تھا اور تیزی سے واپس آیا۔ دین کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور انجن اشارت تھا۔ میں اندر گھسا تو وسم نے دروازہ بند کر لیا۔ دین حرکت میں آئی اور رفاقت اس میں دوڑتے ہوئے فرنٹ ڈور سے اندر آیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے دین واپس بڑی سڑک پر گھوم چکی تھی۔ پیچھے سے کوئی کار روائی ہوئی تھی تو اس کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں نے کوئی آتشیں ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خاموش بیٹھ گئے تھے۔ بلکہ وہ پیچھے بھی آسکتے تھے۔ وسم کے ذہن میں یہ خدشہ تھا اس نے دور بین بھان کی اور عقب میں دیکھنے لگا۔ ابھی ہم کشمیر ہائی وے سے دور تھے کہ عقب میں تیز روشنیاں نمودار ہوئیں اور ایک گاڑی تیزی سے نزدیک آنے لگی۔ یہ طاقتور کلثری کا کرتھی۔ وسم نے زوم کیا اور کار کی اگلی سیٹوں پر دو افراد نظر آنے لگے۔ یہ چلے سے غیر ملکی اور خاصے تو مندر لگ رہے تھے۔ وسم نے پوچھا۔

”گاڑی کا کارہ کر دوں؟“

”بالکل۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس نیک کام میں دیر مت کرو۔“

اس نے آٹو میٹک اسٹارٹر پر انقل کا میکنزم استعمال کیا اور چھت پر رانقل نکلی۔ وسم کار کے اگلے ٹائر کا نشانہ لینے لگا۔ اس نے فائر کا بن دبا یا۔ مگر کار بدستور چلتی رہی۔ اس نے پھر فائر کیا۔ اس بار بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرے خدا اس کے تو ٹائر تک بلٹ پروف ہیں۔“

”دوسرے کا نشانہ لو۔“

وسم نے دوسرے کا نشانہ لیا اور اس بار بھی کوئی رد عمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اسکرین کا نشانہ لو۔“ جب ٹائروں پر اثر نہیں ہوا تھا تو اسکرین پر کیا ہوتا۔ گولیاں اس سے اچٹ کر نکل گئی تھیں۔ میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”اب مجھے بڑی حد تک یقین ہو گیا ہے کہ کوٹھی میں ڈیوڈ شاہی ہے اور یہ اس کے خاص آدمی ہیں۔“

”ان سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے؟“ وسم بولا اسی لمحے ہم ایک مزدانرک کے پاس سے گزرے جس پر دو دھلدا ہوا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے وسم سے کہا۔

”جب کار اس ٹرک کے پاس پہنچے تو اس کا ناز اڑا دینا۔“

وسیم میری بات سمجھ گیا ہم میں ایسی ذہنی ہم آہنگی تھی کہ ہم بہت کم الفاظ میں ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے تھے۔ ٹرک نارل رفتار سے چل رہا تھا اور کار بہت تیزی سے آرہی تھی جب وہ ٹرک کے پاس پہنچی تو وسیم نے ٹرک کے سامنے والے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کے نائز پر فائر کیا۔ ایک دھماکے سے نائز اڑا تھا اور وزنی ڈبوں سے لدا ٹرک بے قابو ہو کر دائیں طرف گھوما۔ اس وقت تک کار اس کے پاس آچکی تھی اور اس کے ڈرائیور کے پاس پہنچنے کا موقع نہیں تھا۔ ٹرک نے کار کو ٹکرائی اور کار گھوم کر گرین بیٹ پر چڑھی۔ اس کے بعد وہ فلمی انداز میں ہوا میں بلند ہوئی اور قلابازی کھا کر چھت کے بل سڑک پر گری۔ اس کے شیشے بٹ پروف تھے حادثہ پروف نہیں۔ کار کا پورا وزن آتا تو شیشے ٹوٹنے لگے۔ پھر کار اچھل کر سیدھی ہوئی اور مسلسل قلابازیاں کھانے لگی۔ ٹرک اتنی رفتار سے نہیں جا رہا تھا پھر کار ٹکرائے کے بعد اس کی رفتار مزید کم ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے بریک لگائے تو وہ کچھ دور گھسنے کے بعد رک گیا تھا۔ کوئی درجن قلابازیاں کھانے کے بعد کار بھی رک گئی اور اس کے فوراً بعد ہماری دین کشمیر روڈ پر مڑ گئی تھی۔ سب نے سکون کا سانس لیا۔

”جان چھوٹی۔“ وسیم نے گن اور کیمرے کو اندر کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو بروقت سوچھی۔“

”اندھیرا تھا نا اس لیے دور کی سوچھی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب دین مشکوک ہو گئی ہے پہلی فرصت میں اس کا حلیہ تبدیل کرالو۔“

”ایاز کے پاس چلتے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”درکشاپ پاس ہے۔“

وسیم نے اس سے رابطہ کیا تو وہ گھر پر تھا مگر موقع کا سن کر فوری آنے کا کہہ کر کال بند کر دی۔ دس منٹ بعد ہم درکشاپ کے سامنے تھے۔ یہ پوش علاقے کا کمرشل ایریا ہے اور یہاں تمام دکانیں مختلف قسم کی درکشاپوں پر مشتمل ہیں۔ رات سات آٹھ بجے ہی یہاں سناٹا ہو جاتا ہے اس وقت تو ہو کا عالم تھا۔ میں نے فاضلی کا جائزہ لیا۔ وہ بے ہوش تھا۔

”اسے کب تک ہوش آئے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”کم سے کم چھ گھنٹے بعد۔“ وسیم نے کہا اور پوچھا۔ ”اسے حویلی منتقل کرتا ہے؟“

”نہیں اسے ساتھ رکھیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”معاطے کو زیادہ پھیلا نا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے صبح

ہی اس کا فیصلہ ہو جائے اس صورت میں اسے شہر میں کہیں ڈالنا ہوگا۔“

”اگر اس کے پیچھے ڈیوڈ شاہ ہے تو وہ جلد یا بدیر آپ سے رابطہ کرنا چاہے گا۔“

”میں نے سم بند کر دی ہے اور دوسری سم لگالی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ ڈیوڈ شاہ کیسے رابطہ کرتا ہے۔“

”اس کے پاس دوسروں کے نمبرز تو ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”رابطہ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔“

”اس کا مطلب ہے ہم اس سے پہلے جو کر لیں وہ بہتر رہے گا۔“ میں نے فاضلی کی طرف دیکھا۔

”اکرم چشتی والا ٹریٹ منٹ کیسا رہے گا؟“ وسیم نے پوچھا۔

”تم نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کمینڈو دشمن موندہ عبرت بن کر رہ جاتا ہے۔“

ایاز مزید دس منٹ بعد پہنچا تھا۔ وقت نہیں تھا اس لیے ہم نے بجلی میں ساز و سامان اس کی جیب میں منتقل کیا۔ اس میں سب سے اہم فاضلی تھا اور پھر اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ جب ہم جا رہے تھے تو وہ وین ورکشاپ کے اندر لے جا رہا تھا یہ خیال تو بعد میں آیا کہ وہ واپس کیسے جائے گا۔ میں نے کہا تو دسم نے جواب دیا۔ ”فکر نہ کریں اس کے پاس کچھ نہ کچھ ہوگا۔“



ہم واپس فارم پہنچے تو دو بج رہے تھے اور ہم بہت بڑی کامیابی حاصل کر کے آئے تھے۔ فاضلی کو عقب میں موجود ملازمین کے لیے مخصوص ایک کمرے میں ڈالا گیا۔ اس کا دروازہ مضبوط لکڑی کا تھا اور کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں تھیں اس کے باوجود ایک آدمی کو وہاں لگا دیا۔ سفیر سو گیا تھا اور خزانے لے رہا تھا۔ میں جوتے اتار کر لیٹ گیا۔ مشکل سے دو گھنٹے پہلے ہم صرف گمرانی کا سوچ کر نکلے تھے۔ اس وقت میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارے ہاتھ فاضلی اتنی آسانی سے آجائے گا جسے اٹھانے کا صرف یہ سوچ کر منع کیا تھا کہ وہ شدید مزاحمت کرے گا اور میں اپنے مزید کسی ساتھی کا نقصان نہیں چاہتا تھا۔ بیٹو کی موت نے مجھے اس حوالے سے حساس کر دیا تھا لیکن فاضلی کے ہاتھ آنے سے مجھ لگ رہا تھا جیسے قدرت کی طرف سے میری مشکلات کے خاتمے کا وقت آگیا تھا۔ میرے دشمنوں کا برا وقت شروع ہو گیا تھا۔

کچھ عرصے پہلے اکرم چشتی جیسے موذی سے نجات ملی تھی۔ وہ زندہ تھا مگر سانپ سے کچواہن گیا تھا۔ پھر کنور خاندان کا خاتمہ ہوا۔ ان کے ساتھ راسن اور نشی دل جی جیسے ذیلی دشمن مارے گئے۔ اب فاضلی ہاتھ آگیا تھا۔ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں تھی لیکن عزم یہی تھا کہ اس موذی کو صحیح سلامت نہیں چھوڑنا ہے کہ یہ سلسلہ دشمنی کو آگے بڑھا سکے۔ مگر اس سے پہلے اس سے معلومات حاصل کرنی تھی۔ ایک بار پہلے بھی وہ ہاتھ آیا تھا اور ہم نے اسے ہیروئن کا عادی بنا کر اس کی زبان کھلوالی تھی۔ نشے کی طلب میں وہ ہماری ہر بات ماننے کو تیار ہو گیا۔ ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔ اب بھی اس پر یہی حربہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی اچانک مجھے خیال آیا کہ اس حادثے کی خبر شاید ٹی وی پر آگئی ہو۔ میں اٹھ کر لاؤنج میں آیا ٹی وی لگا کر مختلف چینل دیکھنے لگا مگر کہیں خبر نہیں تھی۔ میں وہیں صوفے پر نیم دراز ہو گیا اور وقفے وقفے سے چینل مچھاتا رہا۔ پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ رات کسی وقت سادی باہر آئی تو اس نے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کیا اور میرے پاؤں اوپر کیے تھے۔ صبح اٹھا تو صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ کچن سے سفیر اور دسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ دسم سفیر کو رات کے مشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ عبداللہ کو ہم رات کو ہی بتا چکے تھے۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس وقت فاضلی کی گمرانی وہی کر رہا تھا۔

میں ہاتھ روم سے فریش ہو کر آیا تو سادی ناشتہ لگا رہی تھی۔ انڈوں کے خاکینے کے ساتھ پراٹھے تھے۔ دسم اور سفیر میں کھانے کا مقابلہ جاری تھا۔ میں نے ناشتے کے دنگل میں شامل ہوتے ہوئے عبداللہ اور مانی کے بارے میں پوچھا۔ دسم نے کہا۔ ”عبداللہ اور دوسرے صبح ہی ناشتہ کر چکے ہیں۔ مانی سو رہا ہے۔“

”شکر ہے ورنہ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا ہے کھانے میں۔“ سفیر نے کہا۔

”سوائے بیٹو کے۔“ میں نے کہا۔

بیٹو کا ذکر آیا تو سب کے سب سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ”یاروہ صرف ہمارے آنسوؤں کا حقدار تو نہیں ہے اسے ہماری مسکراہٹیں اور ہنسی بھی تو چاہیے ہوگی۔“

سادی مسکرائی اور آنکھیں صاف کیں۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بیٹو سے ہمارا تعلق عام نہیں ہے۔“

اس کے بعد ہم نازل ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔ ”رات کے واقعے کی میڈیا پر کوئی خبر آئی ہے؟“

”بالکل لیکن سرسری سی۔ اس کے مطابق سڑک کے ایک حادثے میں ایک سفارت خانے سے تعلق رکھنے

والے دو افراد زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں اسپتال سے متعلقہ سفارت خانے والے لے گئے ہیں۔“

”اتنی فائرنگ ہوئی اور سڑک جس کا ٹائر گولی سے برست ہوا تھا اس کا کوئی ذکر نہیں ہے؟“

میرے سوال پر سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بالکل بھی نہیں۔“

”خیر ایسا تو ہوتا ہے غیر ملکیوں کے بارے میں میڈیا کی زبان پر بھی تالے لگ جاتے ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ

کوئی مرا نہیں۔“

مافی سوگھتا ہوا کچن میں آگیا۔ ”اُف..... مجھے بھوک لگی ہے۔ یہاں پراٹھے اور انڈے چل رہے ہیں۔“

”بیٹا تمہیں بھوک کب نہیں لگی ہوتی ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے معدے کے علاوہ تمہارے تمام

اعضائے رئیسہ اور غیر رئیسہ بھی خوراک ہضم کرنے کا کام کرتے ہیں۔“

”آپ بولتے رہا کریں۔“ مافی نے اس کے سامنے رکھا ہوا پراٹھا اٹھالیا۔ ”میری صحت پر کوئی اثر نہیں

پڑتا۔“

”تمہاری صحت پر تو کھانے اور محبت کا اثر بھی نہیں پڑتا۔“ سفیر نے چھیڑا۔ ”سنا ہے لڑکی نے انکار کر دیا

ہے کہ بچے سے شادی نہیں کرنی ہے۔“

اس بار مافی جھینپ گیا۔ ”ایسی بات نہیں ہے وہ مان گئی ہے۔“

”سچ میں۔“ سادی نے پراٹھا پلٹتے ہوئے کہا۔ ”جب تک میں تھی تب تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”ابھی بات ہوئی ہے اس سے۔“ مافی نے انکشاف کیا۔ ”اب آپ سب نے میری اور شازیہ کی شادی

کرانی ہے۔“

”اس کے بعد تم کیا کرو گے؟“ سفیر نے پوچھا۔ ”میرا مطلب دیگر است ہے۔ شادی کے بعد ہونے

والے کاموں کے علاوہ۔“

”میرا ارادہ اپنی آئی ٹی فرم کھولنے کا ہے۔“ مافی نے کہا۔ ”اب اس پر یہاں بھی بہت کام ہو رہا ہے۔

لاہور میں ایک بندہ ہے اس نے کچھ عرصے پہلے فرم کھولی تھی مگر اسے کام کے بندے نہیں ملے۔ کچھ دن پہلے

میری اس سے بات ہوئی ہے وہ مجھے پانڈز بنانے پر راضی ہے۔“

”پانڈز شپ میں جھنجھٹ بہت ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟“

”اس کے لیے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ پاپا دے سکتے ہیں مگر وہ دیں

گے نہیں، وہ تو مجھے پڑ کر سول سروس میں جھونک دیں گے۔“

”رہنے دے یا راس ملک اور قوم کا بیڑا غرق تیرے پاپا جیسے بیوروکریٹس نے کیا ہے۔“ سفیر نے کہا۔

”تم آگے تو مزید بیزا غرق ہو گا۔“

”میں متفق ہوں۔“ مانی نے اگلا گرم گرم پراٹھا توڑتے ہوئے کہا۔ ”مگر مسئلہ میرے پاپا کا نہیں ہے سروس کی تربیت ہی اس طرح کی جاتی ہے۔ آدمی کیسا ہی ہو وہاں سے ایک مخصوص سانچے میں ڈھل کر نکلتا ہے اور ہر ایک مشین کا پرزہ بن جاتا ہے۔“

”مانی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے کہا اور پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم اپنا بزنس اسٹیبلیش کرنا چاہو تو کتنی رقم درکار ہوگی کہ تم ہائی فائی اپنا بزنس چلا سکو۔“

”کم سے کم بیس سے پچیس لاکھ روپے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”دس لاکھ میں جمع کر چکا ہوں۔“

”وہ کیسے تم جاب تو کرتے نہیں ہو؟“ سفیر نے اعتراض کیا۔ ”سارا دن کھاتے ہو، کمپیوٹر پر گیم کھیلتے ہو یا سوتے ہو۔“

”میں رات بارہ سے صبح چار پانچ بجے تک کام کرتا ہوں۔ اس دوران میں آرام سے چالیس پچاس ڈالرز کمالیتا ہوں۔“

ہم حیران ہوئے تھے میں نے کہا۔ ”یعنی فی گھنٹہ دس ڈالرز؟“

”ہاں بعض اوقات اس سے بھی زیادہ۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں انٹرنیٹ کے ذریعے آئی ٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لیتا ہوں۔ کام کر کے دیتا ہوں اور مجھے پے پال اکاؤنٹ کے قمرود رقم مل جاتی ہے۔“

”یعنی تم اپنا کام کرو گے تو اس سے زیادہ کماد گے۔“

”بہت زیادہ..... اب تو پاکستانی آئی ٹی فرمز بھی تیزی سے آگے آرہی ہیں۔ حکومت کیا سپورٹ کرے گی اسے تو خود سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم اپنے ٹیلنٹ کے بل پر آگے جا رہے ہیں۔ میں نے ایک گروپ بھی بنا لیا ہے ہم اسی طرح گھروں پر کام کرتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک چھٹا بندہ ہے۔ ایک انیس سال کا لڑکا ہے۔ اس کا باپ شیخوپورہ میں آڑھتی کا کام کرتا ہے۔ میٹرک تک پڑھا پھر باپ نے کام پر لگا لیا وہاں اس نے کمپیوٹر استعمال کیا اور پھر اس لائن میں اتنا ماہر ہو گیا کہ باہر سے پڑھا ہوا سافٹ ویئر انجینئر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔“

”پچیس لاکھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم فرم کے لیے کام شروع کرو۔“

”تم ہم دیں گے۔“ سفیر نے کہا۔ مانی نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں ادھار کا قائل نہیں ہوں۔“

”ہم ادھار نہیں دے رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ پارٹنرشپ کر رہے ہیں، آخر تم ایسے شخص سے بھی تو پارٹنرشپ پر راضی ہو گئے جسے چار دن سے زیادہ نہیں جانتے ہو۔“

میری بات پر مانی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے مگر آپ لوگ اس طرح بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں بزنس کہاں سے کریں گے؟“

”بزئس تم کرو گے اور تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“ سفیر نے کہا۔ ”تم رقم لے کر لاہور جاؤ اور وہاں اپنا سیٹ اپ قائم کرو۔ جس گروپ کی بات کر رہے ہو اسے ہائر کرو اور کام شروع کر دو۔ میرا اندازہ ہے تمہیں بزئس سیٹ کرنے میں چھ مہینے سال سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اللہ نے چاہا تو تب تک ہم بھی اپنے مسئلے نمٹا لیں گے۔“

”اس سے زیادہ کی ضرورت پڑے تو وہ بھی دے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بنیادی طور پر ہم کاروباری لوگ ہیں، یہ تو بلاوجہ کے دشمن پیچھے پڑ گئے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ مانی خوش ہو گیا۔ ”میں آج سے ہی تیاری شروع کرتا ہوں۔“

”بالکل اگر تم لاہور جانا چاہو تو جلد از جلد روانہ ہو جاؤ۔“

”آپ کے کام کا کیا ہوگا؟“

”لاہور زیادہ دور نہیں ہے اور تمہارا کام تو ایک آدھ دن کا ہوتا ہے باقی ہم سب دیکھ لیتے ہیں ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیا کریں گے۔“

”یہ بھی بزئس کا حصہ ہوگا۔“ سفیر نے لقمہ دیا۔ ”تمہیں ادائیگی کریں گے۔“

”آپ نا ہمیشہ دل دکھانے والی بات کیا کریں۔“ مانی نے خفگی سے کہا۔ ”آپ لوگوں سے کیا بزئس کا تعلق ہے، کوئی اور ہوتا تو میں بہت پہلے خدا حافظ کہہ چکا ہوتا، یوں آپ لوگوں کے ساتھ دھکے کھارہا ہوتا اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پھر رہا ہوتا۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے سفیر کو گھورا۔ ”یہ کوئی ملازم نہیں ہے جسے ہم معاوضہ دیں۔ یہ ہمارا ساتھی ہے۔“

”میں ہر وقت حاضر ہوں۔ جب آپ بلائیں گے میں سب چھوڑ کر آؤں گا۔“

”بس تو تم جانے کی تیاری کرو۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”آؤ ذرا فاضلی سے ملاقات ہو جائے۔“

میں، سفیر اور وسیم پہنچے تو عبداللہ کو فٹری کے باہر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ وسیم نے پوچھا۔ ”پچھی کیا ہے؟“

”کچھ دیر پہلے تک پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اب سکون سے ہے۔“ عبداللہ مسکرایا اور تالا کھول دیا۔ اس نے صرف کنڈی لگانے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ اندر فاضلی ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے منہ اور ناک سے خون نکلا ہوا تھا۔ جسے اس نے اپنے کوٹ کی آستین سے صاف کر کے اس کا ستیاناس کر لیا تھا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا اور غرا کر بولا۔ ”شہباز یہ تم نے اچھا نہیں کیا..... دشمنی کا جو باب میں نے بند کر دیا تھا وہ تم نے پھر سے کھول دیا ہے۔“

”نہیں میں اسے ہمیشہ کے لیے بند کر رہا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے بہت عرصے تک امن کی پالیسی پر عمل کر کے دیکھ لیا لیکن میرے دشمن اس کے قائل نہیں ہیں اب میں نے پالیسی بدل دی ہے۔ تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ میں سرحد پار کیا کر کے آیا ہوں۔ میں نے وہاں اپنے تمام دشمنوں کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میں نہیں جانتا کہ تم کیا کر کے آئے ہو اور واپس آ گئے ہو کیونکہ اب میں نے تمہارے راستے میں نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”فاضلی تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ کیا تم اس کوٹھی میں جس شخص سے ملنے گئے تھے اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“

وہ چونکا۔ ”تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“

”میں بہت کچھ جانتا ہوں جب میں تمہیں اٹھا کر لے جا رہا تھا تو ایک گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔“

”افسوس کہ گاڑی تباہ ہوئی اور پیچھا کرنے والے اسپتال پہنچ گئے جہاں سے ان کے لواحقین انہیں لے گئے۔“ دیم نے کہا تو میں نے سفارت خانے کا نام لیا۔

”اب کیا کہتے ہو؟“

”میں کسی غیر ملکی سے ملنے نہیں گیا تھا۔“ فاضلی نے ڈھٹائی سے کہا۔

”میں نے کب کسی غیر ملکی کا کہا ہے۔“ میں ہنسا۔ ”خیر تم سچ مت بولو مگر ابھی تم ہمارے پاس ہو اور جلد وہ وقت آئے گا جب تم سچ بولنے کے لیے بے تاب ہو جاؤ گے اور ہمیں سننے کی جلدی نہیں ہوگی۔“

”شہباز اب بھی وقت ہے مجھے جانے دو۔“ اس نے کہا۔ ”میں سب بھول جاؤں گا یقین کرو میں اس وقت تمہارے لیے ہی کام کر رہا ہوں۔“

”اگر تمہارا اشارہ مرشد سے تمہاری دشمنی کی طرف ہے تو تم نے غلط آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ میں وہ شخص نہیں ہوں جو دوسروں کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائے۔ میں مرشد سے غمناک آیا ہوں اور آگے بھی اس سے نمٹ لوں گا۔“

اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ ”تو تم نہیں مانو گے؟“

”میری نہیں اپنے ماننے یا نہ ماننے کی فکر کرو کیونکہ جسمانی طور پر اس کا تم پر بہت برا اثر پڑنے والا ہے۔“

”شہباز تم حوصلہ مند دشمن ہو لیکن میں بھی بزدل نہیں ہوں۔ اگر تم پہلے والا حربہ استعمال نہ کرو تو تم مجھ سے کچھ نہیں معلوم کر سکتے۔“

”اگر یہ چیلنج ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ دیکھتے ہیں کون کا میاب رہتا ہے۔“ میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ کوٹھری میں گرمی شدید تھی کیونکہ وہاں اسے سی تو کیا پنکھا تک نہیں تھا۔ درحقیقت یہ کمر بالکل خالی تھا اور پکے فرش پر سوائے خاک کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”ابھی اس کا کھانا پانی بند رکھ دو دیکھتے ہیں کہ کب تک برداشت کرتا ہے۔“

ہم اندر آئے۔ ابھی صبح کا آغاز تھا اور نوبے ہی گرمی شدت اختیار کر گئی تھی۔ جب میں معمول کی زندگی گزار رہا تھا تو میرا گرمیوں کا اکثر وقت شمالی علاقے میں گزرتا تھا۔ اس وقت یہ جگہیں جنت بنی ہوتی ہیں۔ بلکہ بلند جگہوں پر تو جون جولائی اور اگست میں بھی کڑا کے کی سردی پڑ رہی ہوتی ہے۔ گلشیرز پر درجہ حرارت منفی میں ہوتا ہے اور ہائیکرز سردی سے بچاؤ کے سامان اور لباس کے بغیر وہاں نہیں جاسکتے تھے۔ ایک بار میں کنکورڈ یا گیا تھا جو کہ نو کا اور کئی دوسری بلند چوٹیوں کا بیس کیپ ہے۔ وہاں انیس جون کے دن درجہ حرارت منفی سات تھا اور

برف باری ہو رہی تھی۔ اسے دنیا کا بلند ترین میں کیپ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔
اندر سادی ناشتے کے بعد اب دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ وہ گوشت پلاؤ کے ساتھ شامی
کباب بنا رہی تھی۔ سامان سفیر نے صبح سویرے ایک رائڈر سے منگوایا تھا۔ کباب کے ساتھ روغنی نان ہوتے۔
میں نے کہا۔ ”یار اسے آتے ہی کس چکر میں ڈال دیا ہے۔“
”خود اسے شوق ہو رہا ہے۔“ وسیم نے شانے اچکائے۔

”میں چاہتا ہوں اسے ایک دو دن میں حویلی بھیج دوں اس حالت میں جب کہ ہمیں کسی وقت بھی یہاں
سے بھاگنا پڑ سکتا ہے سادی کو ہم ساتھ نہیں رکھ سکتے۔“
”میں سمجھتا ہوں اور کل سے اسے سمجھا بھی رہا ہوں۔“ وسیم نے دبی زبان میں کہا۔ ”مگر یہ سن کر رونے
دھونے لگتی ہے۔ پھر میری ہمت جواب دے جاتی ہے۔“

”یار وہ بہت دنوں بعد تم سے ملی ہے لیکن تم جانتے ہو یہاں خطرہ ہے اور پھر سوال تمہارے ہونے والے
بچے کا ہے اسے پُر امن ماحول چاہیے اس دنیا میں آنے کے لیے۔“
”ٹھیک ہے آج میں فیصلہ کن بات کرتا ہوں۔“ وسیم نے کسی قدر بہادر بن کر کہا۔ ”اسے ماننا پڑے گی
جذباتی پن سے کام نہیں چلے گا۔“

”شاباش۔“ میں نے ہمت بندھائی۔ ”ہمت کریا۔“
”کس بات کی ہمت۔“ سادی نے اچانک ہی لاؤنج میں انٹری دی۔
”بی بی تمہارے کان بہت تیز ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اپنے مطلب کی باتیں سن لیتی ہوں یقیناً میرے بارے میں ارشاد ہو گا کچھ..... نتیجی انہیں ہمت دلائی
جاری ہے۔“ اس نے ترجمی نظروں سے وسیم کو دیکھا تو اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔
”شہباز صاحب مجھے فاضلی کے معاملے میں ہمت کرنے کو کہہ رہے ہیں۔“

”اس میں ہمت کہاں سے آگئی؟“ سادی نے طنز کیا اور واپس چلی گئی۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا تو
وسیم کھسیا گیا۔ سفیر یہاں نہیں تھا وہ عبداللہ کے پاس رک گیا تھا ورنہ وسیم کی مزید شامت آتی۔ دوپہر کے کھانے
میں سب موجود تھے۔ سادی نے خاصی مقدار میں بنایا تھا اور میز پر چھج بجا کر اعلان کر دیا تھا کہ یہ رات تک کا ہے
اس لیے چاہیں تو ابھی کھالیں ورنہ رات کا بچا کر کھائیں۔ مگر پلاؤ اور کباب اتنے مزے کے تھے کہ سب نے
رات کا خیال دل کیا معدے سے بھی نکال دیا تھا۔ میں اور وسیم جلد ہار مان گئے۔ مگر سفیر، عبداللہ اور مانی میں
کانٹے کا مقابلہ ہوا جو بالآخر مانی نے جیتا اور فاتحانہ انداز میں ہم سب کو دیکھتا ہوا رخصت ہوا تھا۔ اب چائے کافی
کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ میں رات کو ٹھیک سے نہیں سویا تھا پھر کھانے کا خمار الگ تھا۔ اس لیے کمرے میں
جا کر جو بیڈ پر لیٹا تو پھر ہوش نہیں رہا تھا۔ شام کو سفیر نے منہ پر ٹھنڈا پانی ڈالا اور میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ پھر بھنا کر
کہا۔

”یہ کیا حرکت تھی؟“

”مونا صبح مجھے اسی طرح اٹھاتی ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”طریقہ واہیات ہے لیکن آنکھیں فوراً

کھل جاتی ہیں جو دوسری صورت میں اٹھنے کے آدھے گھنٹے بعد کھلتی ہیں۔“

”تو اسی لائق ہے کہ موتا جیسی کسی بیوی کا شوہر ہو اور سلاقی کیسے ہے سر پر بیلن مار کر؟“ میں نے اٹھ کر واش روم جاتے ہوئے کہا۔ نہادھو کر باہر آیا تو لان میں ٹی پارٹی چل رہی تھی۔ ایاز بھی آیا تھا۔ وہ فاضلی کے دیدار کا شائق تھا۔ پچھلی بار اس سے زیادہ ملاقات نہیں رہی تھی۔ عبد اللہ اسے فاضلی سے ملوایا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”شہباز صاحب..... یہ اللہ کی مہربانی ہے جو اس جیسا اقرار جانور آسانی سے ہاتھ آ گیا۔ اب پہلی فرصت میں اس کا جھٹکا کر دیں۔ حلال تو یہ کسی صورت نہیں ہوگا۔“

”کرنا جھٹکا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے اس کی زبان کھلوانی ہے۔“

عبد اللہ نے اسے آگاہ کیا۔ ”اس نے شہباز صاحب کو چیلنج دیا ہے کہ فاول پلے کے بغیر اس کی زبان کھلوا کر دکھائیں۔“

”فاول پلے؟“ ایاز نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پچھلی بار اسے ہیرن کا عادی بنادیا تھا اور مجبوراً اسے زبان کھولنا پڑی تھی۔“

”اس وقت بھی اس نے ساری بات نہیں بتائی تھی اور اس کی قوت ارادی یقیناً مضبوط ہے تبھی اس نے ہیرن جیسے موذی نسل سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔“

”ہم اس کی زبان کھلوا کر کیا کر لیں گے۔“ ایاز نے کہا۔ ”ہمیں تقریباً سب تو معلوم ہے۔“

”کل رات یہ کس بے ملنے گیا تھا یہ معلوم کرنا ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے اس مکان میں

ڈیوڈ شامو موجود تھا اور جب ہم فاضلی کو لے کر آ رہے تھے تو اس کے گرگے ہمارے پیچھے آئے تھے اور وہ ایسی بلٹ پروف کار میں تھے جس کے ٹائرز تک پر گولی کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔“

”پھر شہباز صاحب نے حل نکالا اور ہم چچھا چھڑانے میں کامیاب رہے۔“ وسیم نے بتایا۔ باقی سب کو علم تھا مگر ایاز کو پتا نہیں تھا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

”کمال کر دیا..... کیا خیال آیا بروقت۔“

”ہاں بھائی بس اسی کا دماغ کام کا رہ گیا ہے۔“ سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہمارے دماغ تو فارغ

ہو چکے ہیں۔“

”ان کا تو خوب چلتا ہے۔“ سادی نے وسیم کی طرف دیکھا۔

”ہاں لیکن تمہارے کہنے پر۔“ وسیم بولا۔ ”اگر میں اپنی چلاؤں گا تو تم سنو گی نہیں۔“

”اگر آپ یہاں سے جانے کا کہیں گے تو بالکل نہیں سنوں گی۔“

”پلیز سادی۔“ وسیم کا لہجہ تیز ہو گیا اور سادی کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھایا۔

”بھئی یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ تم اکیلے میں نمناؤ گے سب کے سامنے نہیں۔“

”آپ اسے اور شبہ دے رہے ہیں۔“ وسیم نے بھنا کر کہا تو سادی کھڑی ہوئی اور پاؤں پٹختی ہوئی وہاں

سے چلی گئی۔

”بھائی تمہیں بھی سب کے سامنے ہی یہ بات کرنی تھی۔“ میں نے ملاحت سے کہا۔

”سب کیا یہاں کوئی غیر ہے۔“

”پھر بھی میاں بیوی کی آپس کی بات آپس میں ڈنی چاہیے۔“

”اس طرح تو وہ کبھی نہیں مانے گی۔“

”کیوں نہیں مانے گی یا رشو ہر اپنی بیوی سے بات نہ منوا سکے تو اسے شوہر کہنا ہی نہیں چاہیے۔“

”یعنی یہاں سوائے تیرے کوئی شوہر نہیں ہے۔“ سفیر نے دانت نکالے۔ ”کیونکہ وہ تیری بیوی تیرے

اشارہ ابرو پر چلتی ہے۔“

”شادی کے بعد یہ چلیں گے۔“ وسیم نے ناگ اڑائی۔

”شادی تو میری بھی نہیں ہوئی ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ہاں مگر ٹو جس کے چکر میں ہے وہ تو یہ بات بھی مان کر نہیں دے رہی ہے۔“ سفیر نے کہا تو عبداللہ کھیا

گیا۔

”ایسی بات بھی نہیں ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

آج دن میں شدید گرمی رہی تھی اور اس وقت بھی خاصی گرمی تھی مگر گھاس کو پانی دیا گیا تھا اس لیے اس سے سکون آمیز نمی اٹھ رہی تھی۔ سورج غروب ہونے تک بادل گھر کر آئے تھے اور پھر اچانک ہی بہت تیز بارش ہوئی تھی لیکن ہم اندر نہیں گئے۔ باہر ہی بارش سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ کچھ دیر بعد اندر سے سادی کی کال آگئی۔ وہ پکڑے بنا رہی تھی۔ ہم پورچ والے حصے میں آ گئے۔ اس نے برآمدے میں میز پر تھا ل سجا دیا تھا اور اندر سے بنوا کر بھجوا رہی تھی صرف پکڑے ہی نہیں ساتھ میں چینی اور آلو فرائی بھی تھے۔ گرج چمک کے ساتھ برسی بارش میں پکڑے کھانے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ سفیر نے مجھ سے کہا۔ ”اب بول بیٹا اسے واپس بھجوا دے گا تو یہ مزے کہاں سے ہوں گے۔“

”یاریہ مزے بھی ہوں اللہ وہ وقت بھی لائے گا جب سب کی نیلیاں ہوں گی اور ہم ایسے موسم کو ایک ساتھ انجوائے کیا کریں گے۔“ میں نے کہا۔ سادی اندر سے بھجوا رہی تھی اور ہم کھا رہے تھے کچھ دیر بعد دیکھا تو وسیم غائب تھا۔ میں نے پوچھا۔

”یہ کہاں گیا؟“

”جھٹ پر جناب۔“ ایاز بولا۔ ”بیگم کے ساتھ بھی تو ساون منانا ہوتا ہے۔“

عبداللہ بھی غائب تھا اور کچھ دیر بعد وہ بالٹی میں آم بھر کر لے آیا تھا۔ انہیں مزید ٹھنڈا کرنے کے لیے بالٹی میں برف بھی ڈالی ہوئی تھی۔ ہم وہیں پورچ میں کرسیاں ڈال کر آموں کا مزہ اٹھاتے رہے۔ آم ایاز لایا تھا۔ عبداللہ وسیم اور سادی کے لیے اوپر دے آیا۔ دو بیٹے تک ہم نے بارش کو انجوائے کیا تھا مگر پھر تھک گئے۔ اندر آئے تو سادی اوپر سے آچکی تھی اس نے کپڑے بدل لیے تھے اور بہت خوش لگ رہی تھی۔ وسیم نے اسے منا لیا تھا۔ ہم نے چائے کافی کا مطالبہ کیا لیکن پہلے اس نے سب کو زبردستی کچی لسی پلائی۔ جب تک ہم کپڑے بدل کر آئے اس نے چائے اور کافی دونوں بنا لیے تھے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ شہزادی تھی۔ اس نے

کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پیا تھا۔ مگر یہاں کیسے صبح سے ہماری خدمت میں لگی تھی۔ اتنا کام اور ایسے سب نمٹانا ایک عورت کے بس کی بات ہے اور سادی عورت بھی تھی۔ دس مرد ایک جگہ ہوں تو وہ جگہ کبھی اتنی رونق والی نہیں ہو سکتی جتنی ایک عورت سے ہو جاتی ہے۔ صرف میرے ہی نہیں سب کے یہ احساسات تھے۔ سفیر تو اتنا جذبہ جاتی ہوا کہ ہاتھ پکڑ کر سادی سے اپنی ساری بکواس اور خطاؤں کی معافی چاہی تھی۔

”سفیر بھائی ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، آپ میرے بھائی ہیں میرے دیور ہیں۔ میں آپ کی بہن اور بھابی ہوں۔ رشتے میں نہ سہی عمر میں چھوٹی ہوں۔“

”تم بھی کس کی باتوں میں آ رہی ہو۔“ وسیم ہنسا۔ ”کل تک یہ پھر بکواس اور خطائیں کر رہا ہوگا۔“

مجھے اس وقت مزید حیرت ہوئی جب سادی نے ایاز کو جاتے ہوئے ایک ٹفن دیا جس میں اس نے پلاؤ اور کباب ڈالے تھا۔ اس نے پہلے ہی اس کے لیے نکال دیا تھا۔

”ایاز بھائی یہ شاہین اور ماں جی کے لیے ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ آئے گا؟“

”ایاز بھائی کی جیتی جو یہاں تھی۔“ سادی نے جیب کی طرف اشارہ کیا تو ایاز جھینپ گیا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو فاضلی کا سن کر آنے کے بے قرار تھا۔“

”میں چھپ رہی ہوں ایاز بھائی..... اب کے آئے گا تو شاہین کو بھی لے کر آئے گا۔“

”لوجی شروع ہو گئی میل ملاقات کی فرمائشیں۔“ سفیر بولا۔ ”جلد یہاں فاضلی کے ولید نای گرامی اور

اس کے بھی والد گرامی ڈیوڈ شاکی آمد بھی ہوگی۔“

سادی ہنسی۔ ”انہوں نے تو کل تک کا انتظار بھی نہیں کیا ابھی سے شروع ہو گئے۔“

سفیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”آج بات کہنے کے لیے کون کل تک کا انتظار کرتا ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ سادی کا مسئلہ مجھے ہی حل کرنا پڑے گا اس سے پہلے مونا اور اسے حویلی بھیجے گا ہو رہا

تھا تو وسیم اور سفیر کچھ نہیں کر سکے تھے، مجھے ہی زور دے کر یہ کام کروانا پڑا تھا۔ اس بار بھی شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔

اب یہ اتفاق تھا کہ اس وقت مونا امید سے تھی مگر اس کی یہ امید ہیلی کا پٹر کریش میں ختم ہو گئی تھی اور اب سادی

امید سے تھی۔ میری اور ہم سب کی خواہش تھی کہ وسیم اور سادی کا بچہ خیر خیریت سے دنیا میں آئے۔ لیکن اس کے

لیے ضروری تھا کہ سادی حویلی چلی جائے۔ یہاں ہم خطرے میں تھے اور اسے خطرے میں نہیں دیکھنا چاہتے

تھے۔ ایاز کے جانے کے بعد ہم اندر آئے۔ وہ ٹیکسی سے آیا تھا اور اپنی جیب پر واپس گیا تھا اس نے شناخت کے

مسئلے کی وجہ سے بادل نا خواستہ اسے فروخت کیا تھا مگر اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا اس نے دوبارہ اسے حاصل

کر لیا تھا مگر کراؤر کچھ دوسری چیزوں سے اس کا حلیہ بالکل بدل دیا تھا۔ ہم اندر آئے تو میں نے سادی سے کہا۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

وہ سمجھ گئی تھی۔ ”کیسے؟“

”یہاں نہیں۔“ میں نے کہا اور اسے چھت پر لے آیا۔ بارش تھم جانے کے بعد موسم خوشگوار حد تک ٹھنڈا

ہو گیا تھا۔ اچھی خنک ہوا چل رہی تھی۔ سادی جو چند منٹ پہلے تک بہت خوش تھی اس کا چہرہ اتر گیا تھا اور میری

ہمت نہیں ہو رہی تھی مگر کہتا تو تھا۔ ”مگر کیا تم جانتی ہو ہم فی الحال کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔“

”مجھے وضاحت مت دیں بس اپنا حکم سنائیں۔“

”یہ حکم نہیں درخواست ہے، تم موقع کی نزاکت کو سمجھو اور پلینز حونی چلی جاؤ۔ مجھے لگ رہا ہے میں اپنی جدوجہد کے آخری حصے میں ہوں۔ فنا و بقا کی اس جنگ میں کون جیتتا ہے اور کون مارا جاتا ہے میں کہہ نہیں سکتا۔ میری تو خواہش ہے تم سب ہی چلے جاؤ۔ اس ملک سے دور نکل جاؤ جب تک میں اپنے دشمنوں سے نمٹ نہ لوں۔ بیٹو کے بعد اب میں اور کوئی نقصان برداشت نہیں کر سکتا اگر ایسا ہوا اور میرے کسی ساتھی کی زندگی پر بن آئی تو میں سرنڈر کر دوں گا خود کو مرشد یا ڈیوڈ شا کے حوالے کر دوں گا۔“

”پلینز ایسا نہ کہیں۔“ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”ہم آپ کو نہیں چھوڑ سکتے اور آپ کیوں حکم نہیں دے سکتے آپ ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔ وسیم، سفیر بھائی اور عبداللہ بھائی آپ کا ساتھ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس سے زیادہ آسان تو ان کے لیے مرنا ہوگا۔ اگر وسیم نے آپ کو چھوڑا تو اللہ کی قسم میں ان کو چھوڑ دوں گی۔ شوہی آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔“

”تب تم جاؤ گی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں وسیم کا حکم ماننے سے انکار کر سکتی ہوں آپ کا نہیں۔“

میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”بے چارہ مجازی خدا..... پہلے ہی جوتے کی نوک پر رہتا ہے۔“

سادی جھینپ گئی اور آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”جی نہیں ان کی بھی مانتی ہوں۔ مگر یہ بات نہیں مانی پڑ رہی تھی جو آپ نے ایک منٹ میں منوالی۔“

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”خدا کی قسم، خود میں بھی تم لوگوں سے دور نہیں رہ سکتا مگر دل پر پتھر رکھ کر تم لوگوں کی بہتری کے لیے دور بھیجنا پڑتا ہے۔ ہم سب کو سب سے زیادہ خیال آنے والے سہمان کا ہے۔“

سادی شرانگئی۔ اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ ”مجھے کب بھیج رہے ہیں؟“

”کل ہی۔“ میں نے کہا۔ ”وسیم تمہیں چھوڑ آئے گا۔“

”ٹھیک ہے میں تیاری کر لوں۔“ اس نے نیچے جاتے ہوئے کہا اور اس کے جاتے ہی وسیم آ گیا۔

”مان گئی۔“

”تمہیں بتایا اس نے؟“

”نہیں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”جس طرح وہ میرے پاس سے منہ بنا کر گئی ہے اس سے مجھے پتا

چل گیا۔ آپ کو معلوم ہے بیوی دنیا جہان کی باتوں کے بدلے بے چارے شوہر سے لیتی ہے۔“

”کیونکہ شوہر ہی ان ساری آفتوں کے ذمے دار ہوتے ہیں۔“ سفیر بولا وہ بھی اوپر آ گیا تھا اور کولڈ

ڈرنک کے منہ بستہ ٹن لے آیا تھا۔ اس نے ایک ٹن مجھے اور ایک وسیم کو تھمایا۔

”پنچھیوں کا کیا حال ہے؟“

”مزرے میں ہیں، عیاشی والا ڈنر کیا اور باقی عیاشی کے لیے اپنے کمرے میں ہیں۔“

میں نے سفیر کو گھورا۔ ”وہ میاں بیوی ہیں۔“

”ٹو نے نکاح نامہ دیکھا ہے کیا؟“

”آدمی کو زبان پر اعتبار کرنا چاہیے جب تک اس کے برعکس ثابت نہ ہو جائے۔“

”شہباز صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ دسم نے سر ہلایا۔ ”ویسے ہم بہت مہذب اور میسرز والے بنتے

ہیں مگر ان باتوں میں میسرز بھول جاتے ہیں۔“

”اچھا بابا وہ میاں بیوی ہیں میں نے مان لیا۔“ سفیر نے کہا۔ ”اب بتاؤ ان کا کرنا کیا ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ انہیں ان کی گاڑی دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔“

”وہ آگے کہیں پھنسے تو ہمیں بھی پھنسا دیں گے۔“ سفیر نے خبردار کیا۔ ”اس لیے سوچ سمجھ کر چھوڑنا۔“

”ان کا کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا اور فاضل کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے۔“

”وہی جو ہم نے طے کیا تھا۔“ دسم چکا۔ ”میں نے تو اچھے والے سلوشن کی ٹیوب بھی منگوا لی ہے۔“

آج سفیر اس کی نگرانی کر رہا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اس کا کیا حال ہے سارا دن کھانا پانی بند

ہونے سے کچھ فرق پڑا؟“

سفیر کا منہ لٹک گیا۔ ”بہت حرامی ہے ابھی بارش میں اس نے کھڑکی سے لگ کر اوپر برسنے والے پانی

سے پیاس بجھالی اور کھانا ابھی مسئلہ نہیں ہے۔“

دسم نے کہا۔ ”کم سے کم اڑتالیس گھنٹے بعد وہ بلبلائے گا بھوک سے۔“

”اسے کمزور مت سمجھو۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اتنے سخت جان لوگ کم دیکھے ہیں۔ اسے دیکھ کر یقین

نہیں آتا کہ وہ مرشد جیسے بزدل شخص کی اولاد ہے۔“

”ہمارے پاس بہت وقت ہے۔“ سفیر لاپرواہی سے بولا۔ ”دیکھتے ہیں کب تک اپنی اکڑ پر قائم رہتا

ہے۔“

بارش کے بعد کچھ دیر غنڈی ہوائیں چلتی رہی تھیں مگر اب ہوا رک گئی تھی اس کے باوجود خشکی برقرار تھی

اور ہم چھت پر اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہاں سے کچھ دور واقع فتح جنگ روڈ صاف دکھائی دے رہی

تھی اور نصف رات کے قریب وہاں سے اکادکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ دسم کے آدمی گیٹ اور احاطے میں چوکس

تھے۔ سفیر جمائیاں لے رہا تھا وہ سب سے پہلے رخصت ہوا پھر دسم بھی چلا گیا۔ اب میں اکیلا تھا۔ میں کچھ دیر اور

ٹھلنا چاہ رہا تھا۔ پکڑے اور آم زیادہ ہی کھا لینے سے پیٹ میں کچھ گرائی تھی جو اتنی دیر ٹھلنے سے کم ہوئی تھی۔ مگر

ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی میں چاہتا تھا کہ یہ ختم ہو جائے تو میں بھی سونے کے لیے نیچے جاؤں۔ بارہ بجے

تک میں نے بہتر محسوس کیا اور نیچے جانے کا ارادہ کیا تھا کہ سڑک کی طرف سے ایک بڑی گاڑی فارم کی طرف

آنے والے راستے پر مڑی۔ یہ شاید پرانے ماڈل کی مزد پک آپ تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹ کے ساتھ اوپر بھی تیز

روشنی والی لائٹس لگی تھیں۔ اس کے پیچھے ایک گاڑی اور تھی۔ فارم کی طرف مڑنے کے بعد پک آپ کی رفتار کم

ہونے کے بجائے تیز ہوئی تھی اور جب وہ گیٹ سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر رہ گئی تو مجھے خطرے کا احساس ہوا

اور میں بھاگ کر پورج کے اوپر والی چھت تک آیا میں نے چلا کر گیٹ کے گارڈز سے کہا۔

”ہوشیار دو گاڑیاں اس طرف آ رہی ہیں۔“

گارڈز پہلے ہی ہوشیار ہو گئے تھے اور وہ سوراخوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ پک آپ گیٹ کے نزدیک آ گئی تھی اور اس کی رفتار برقرار تھی۔ پھر گارڈز پلٹ کر بھاگے اور ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک دھماکے سے فارم کا گیٹ ٹوٹا اور پک آپ دندناتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔



میں نے ہستول نکال لیا۔ خاور تونج کرکوشی کی عمارت تک پہنچ گیا تھا مگر اس کا ساتھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ احسان اور اشفاق اوپر کمرے میں تھے۔ وسیم اور سفیر بھی یقیناً سو چکے تھے۔ مانی جاگ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دشمن اندر آچکا تھا اور ابھی اسے کوشی میں گھسنے سے روکنا تھا۔ میں نے مزدا پک آپ کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لے کر تین فائر کیے اور اسکرین بکھر گئی۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے آنے والی ذرا عجیب ساخت کی بکتر بند نما گاڑی کے چھت سے مشین گن گولیاں برسائے لگی تھیں۔ اس کا نشانہ میں تھا۔ مشین گن اتنی طاقتور تھی کہ گولیوں نے دیوار کو بھی پار کر لیا تھا اور میں بال بال بچا اگر جھٹکے سے پیچھے نہ گرتا تو یقیناً میں بھی نشانہ بن جاتا۔ مشین گن کی آواز بہت زیادہ نہیں تھی مگر مجھے امید تھی کہ اندر تک پہنچی ہوگی۔ عبداللہ مسلح ہو کر کوشی کے سامنے پہرہ دے رہا تھا۔ مگر اس کے پاس بھی ہستول تھا۔ بھاری اسلحہ اندر تھا۔ میں نے غلٹ میں وسیم کو کال کی اور اس نے فوراً ریسپو کی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

”دو گاڑیاں اندر گھس آئی ہیں۔ پیچھے والی پر بھاری مشین گن ہے۔ کوئی کوشی کے سامنے والے حصے میں نہ آئے۔ مشین گن کی گولیاں دیواروں سے گزر رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”آپ کہاں ہیں؟“

”چھت پر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”سفیر کہاں ہے؟“

”اٹھ گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ہم سامنے والی سمت آرہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن بہت احتیاط سے۔“ میں نے کہا اور موبائل جیب میں رکھ لیا البتہ کال نہیں کاٹی تھی۔ بکتر بند نما گاڑی سے اس پہلے برسٹ کے بعد دوسرا فائر نہیں ہوا۔ میں نے ایک کونے سے سر نکال کر دیکھا تو مجھے مزدا خالی نظر آئی۔ اس کی ڈرائیونگ یا فرنٹ سیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ یہ سنگل کیبن تھی اور اس کے سامنے بہت بھاری فولادی جھنگل لگا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے یہ گیٹ تباہ کر کے آرام سے اندر آ گئی تھی۔ شاید اسے اسی کام کے لیے آگے رکھا گیا تھا اور اس میں موجود افراد کام کے بعد اتر کر بکتر بند میں چلے گئے تھے۔ اچانک نیچے سے کسی نے بکتر بند پر برسٹ مارا مگر گولیاں اس کی سطح سے اچٹ کر نکل گئیں۔ اس کا رنگ بھی عجیب سا سیاہی مائل نیلا تھا۔ اس برسٹ کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔

اس کا مطلب تھا کہ اس کا میٹل بہت ہی سخت تھا۔ ورنہ عام بکتر بند گولیاں روک لیتی ہے مگر گولیاں اس کی

سطح میں ضرور جنس جاتی ہیں۔ خاص طور سے رائفل کی گولیاں۔ جب کہ اس پر تو اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ آنے والے فاضلی کے لیے آئے تھے اور یقیناً وہی لوگ تھے جنہوں نے فاضلی کے اغوا کے وقت ہمارا پیچھا کیا تھا وہ بھی ایسی ہی بلٹ پروف گاڑی میں تھے جس پر گولیاں اچٹ رہی تھیں۔ اب مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ میں نے عبداللہ کو کال کی اس نے بھی فوری کال ریسیو کی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”پیچھے ہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”فاضلی کو بھی دیکھ رہا ہوں۔“

میں نے اسے مختصر آگے کا احوال بتایا۔ اس دوران میں احسان اور اشفاق بھی اٹھ کر آ گئے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ میں نے انہیں چھت پر ہی دو جگہ لگا دیا مگر ساتھ ہی خبردار کیا کہ بکتر بند سے مشین گن فائر ہونے کی صورت میں فوری پیچھے ہو جائیں کیونکہ گولیاں دیوار پار کر رہی تھیں۔ میں انہیں لگا کر ریزرو کی طرف آیا تھا کہ ایک گونجتی ہوئی آواز آئی۔ ”شہباز ملک..... تم میری آواز سن رہے ہو؟“

بولنے والا اردو بول رہا تھا صاف لگ رہا تھا کہ یہ اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ وہ لہجے سے انگریز یا کسی مغربی ملک کا لگ رہا تھا۔ میں نیچے آیا۔ لاؤنچ میں سفیر اور وسم موجود تھے۔ وسم نے میرے خدشے کی تصدیق کی۔ ”یہ مجھے وہی لگ رہے ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے کہا۔

”شہباز ملک۔“ باہر سے پھر آواز آئی۔ ”میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد فائر کھول دوں گا۔ یہ دیواریں ان گولیوں کو نہیں روک سکتی ہیں۔ میں صرف فاضلی کو لینے آیا ہوں اور اسے لے کر خاموشی سے چلا جاؤں گا دوسری صورت میں.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”مجھے ان سے بات کرنی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں کہیں وہ تمہاری آواز سنتے ہی فائر نہ کھول دیں۔“ سفیر نے تشویش سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ تمہاری یہاں موجودگی کی تصدیق چاہتے ہوں۔“

”میرے دشمن اتنے اچھے نہیں ہیں کہ صرف تصدیق کے لیے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔“ میں نے کہا اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف لپکا کیونکہ اس نے گنتی گننا شروع کر دی تھی میں نے دروازہ کھولا مگر آڑ میں رہتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ ”اوکے میں ہوں بات کرو۔“

وہ رک گیا پھر اس نے کہا۔ ”شہباز..... ہمیں فاضلی چاہیے۔“

”اگر میں انکار کروں تو؟“

جواب میں بکتر بند اندر آئی اور اس نے مزد کو دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ ”اس صورت میں یہاں کوئی فرد زندہ نہیں بچے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا لیکن فاضلی بھی مارا جائے گا پھر تم کسے لے جاؤ گے۔“

”ہم اس کی لاش لے جائیں گے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں حکم ہے اسے زندہ یا پھر مردہ ہر حالت میں لے کر آئیں۔“

”مجھے سوچنے کی مہلت دو۔“ میں نے کہا اور پھر عبداللہ کو کال کی۔ وہ بھی یہ گفتگو سن رہا تھا کیونکہ بولنے

والا میگا فون استعمال کر رہا تھا اور میں اپنے حلق سے میگا فون کا کام لے رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔
”یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟“

”پیچھے سے نکل سکتے ہیں مگر سادی بی بی کے لیے بہت مشکل ہوگا۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا اسی وجہ سے میں سادی یا کسی بھی عورت کو جو ہماری کمزوری بن جائے ساتھ رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ دشمن سے ہمیشہ غیر متوقع طور پر سامنا ہوتا تھا۔ ایسے میں کوئی عورت یا جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتا تھا وہ ہمارے لیے مسئلہ بن جاتا۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا مگر فی الحال کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہماری گاڑیاں سانس کی طرف تھیں اور بغیر گاڑیوں کے ہم فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ مانی اسڈی سے جھانک رہا تھا۔ البتہ راشد اور رومانہ اپنے کمرے میں دیکے تھے۔ انہوں نے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بکتر بند سے مجھے خبردار کیا گیا۔ ”شہباز ملک وقت تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ اب تم ایک منٹ کے اندر فیصلہ کرلو۔“

”تمہیں ڈیوڈ شانے بھیجا ہے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں کسی ڈیوڈ شاکو نہیں جانتا۔“ اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

”تب تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“

”ہمیں نام سے نہیں کام سے مطلب ہے۔“ اس نے چالاکی سے جواب دیا۔ ”ایک منٹ ہو گیا اب

تمہارا جواب چاہیے ہاں یا ناں۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”اوکے..... لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم فاضلی کو لے کر خاموشی سے چلے جاؤ گے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم فاضلی کو حاصل کر کے فائر کھول دو۔“

”کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”تمہاری تسلی کے لیے اتنا کر سکتا ہوں کہ ہم بکتر بند فارم ہاؤس کے گیٹ سے باہر لے جاتے ہیں۔ لیکن اس خیال میں مت رہنا کہ پیچھے سے نکل جاؤ گے۔ اس وقت تم چاروں طرف سے گھیرے میں ہو یقین نہیں ہے تو آزما کر دیکھ لو مگر اس صورت میں اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہو گے میں نے پہلے ہی خبردار کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم پہلے بکتر بند باہر لے جاؤ۔“ میں نے کہا اور عبداللہ کو کال کی۔ ”فاضلی کو کوٹھری سے نکال

لاؤ۔“

بکتر بند واپس گئی اور گیٹ سے باہر نکل کر رک گئی تھی۔ وقت کم تھا اس لیے مجھے فوری فیصلہ کرنا پڑا۔ میرا ہر ساتھی فاضلی سے لاکھوں گنا زیادہ قیمتی تھا۔ اس لیے مجھے فیصلہ کرنے اور اپنی ناک نچی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک منٹ بعد عبداللہ کچن والے دروازے سے فاضلی کو لے کر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے مگر اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔ ”مبارک ہو تمہارے دوسرے والد گرامی کی طرف سے بلاوا آیا ہے انہوں نے بہ نفس نفیس اپنا کمانڈو دستہ بھیجا ہے تمہیں لینے کے لیے۔“

”شہباز میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم بلاوجہ مجھ سے الجھ رہے ہو۔ میں تمہارا ہی کام کر رہا ہوں۔“

”اچھا؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تب مرشد کا کام تمام کر دو میری تمہاری دشمنی ختم ہو جائے

گی۔“

”بالآخر یہی ہوگا۔“ اس کے ہونٹ بھیج گئے تھے۔ ”میں اپنے ہاتھوں سے اسے جہنم رسید کروں گا مگر اس سے پہلے وہ اپنی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔“

”ڈرامے بازی مت کرو۔“ سفیر نے اسے جھڑکا۔ ”تم دونوں باپ بیٹے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔“
 ”تم مجھے گندی ترین گالی دے لو۔“ فاضلی نے ناگواری سے کہا۔ ”لیکن مرشد کو میرا باپ مت کہو۔“
 ”کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔“ سفیر نے اسے ٹیس کیا۔ ”بے شک اس نے تمہاری ماں سے زیادتی کی لیکن بہر حال تم اسی اٹلیس کا نطفہ ہو۔“

فاضلی کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا اور وہ خاموش رہا جیسے خون کے گھونٹ پی رہا ہو۔ باہر سے آواز آئی۔
 ”فاضلی کہاں ہے؟“

”یہاں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے باہر بھیج رہا ہوں۔“
 فاضلی دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ ”یہ لوگ یہاں تک کیسے آئے؟“
 وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”مجھے کیا پتا..... میں تو خود نہیں جانتا کہ میں کہاں ہوں؟“
 ”مجھے یقین ہے کہ تمہارے پاس کوئی چیز ہے جس کی مدد سے یہ لوگ یہاں آئے ہیں۔“
 ”میرے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“
 ”میں نے چیک کیا تھا۔“ وسم نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”تم نے سگنل پکڑنے والے آلے سے چیک کیا ہوگا لیکن آج کل ایسی جدید ترین چپ آگئی ہیں جو نارمل حالت میں کوئی سگنل نہیں دیتی ہیں اس لیے ان کو پکڑا نہیں جاسکتا ہے لیکن جب انہیں باہر سے سگنل دیا جاتا ہے وہ بھی جوابی سگنل دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اس کے جسم میں ایسی ہی کوئی چپ لگی ہے۔“
 ”تب ہم نے دیر کر دی ہے۔“ وسم نے کہا۔ ”ورنہ اس کے جسم میں آپریٹ کا نشان تلاش کرنا کون سا مشکل کام تھا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ انجکٹ کی جاتی ہیں بہت مختصر ہوتی ہیں۔“
 ”فاضلی۔“ باہر سے لکارنے کے انداز میں کہا۔
 ”مجھے ان کے عزائم اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔“ میں نے فاضلی سے کہا۔ ”یہ تمہیں زندہ یا مردہ بہر صورت لینے آئے ہیں۔“

”تم نے اچھا کیا جو مجھے زندہ جانے دے رہے ہو اسی وجہ سے تم بھی زندہ ہو ورنہ یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے مردہ بھی لے جانے کے لیے تیار ہو کر آئے ہوں گے۔“
 ”فاضلی میں ایک سوال کر رہا ہوں اگر تم نے ٹھیک جواب دیا تو ہو سکتا ہے ہماری دشمنی اسی جگہ ختم ہو جائے۔“

”پوچھو؟“

”تم ڈیوڈ شا کے لیے کام کر رہے ہو۔“
 ”میں انکار کروں گا تو تم یقین نہیں کرو گے اور میں ہاں کہوں گا تو یہ سچ نہیں ہوگا۔“ اس نے مکاری سے

جواب دیا۔ ”اس لیے تم اپنے طور پر سمجھنے کے لیے آزاد ہو۔“

”ٹھیک ہے تم نے جواب نہیں دیا اس لیے پیشکش ختم ہوگئی اب تم جاسکتے ہو۔“

فاضلی باہر نکلا اور متوازن قدموں سے گیٹ کی طرف جانے لگا۔ اس کی چال سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ چوبیس گھنٹے سے بھوکا اور تھکا ماندہ ہے۔ وہ گیٹ سے نکلا تو بکتر بند کا سائینڈ کا دروازہ کھلا اور اس کے اندر جاتے ہی بند ہو گیا۔ پھر بکتر بند کے اوپر لگی مشین گن سے گولیاں برسنے لگیں۔ مگر ان کا نشانہ ہم نہیں بلکہ پورچ میں موجود گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے نائز تھے۔ ایک بھر پور برسٹ نے سب کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اس وقت ہم افراتفری میں اندر کی طرف بھاگے تھے اور اوپر موجود احسان اور اشفاق نے اسے حملہ سمجھ کر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ظاہر ہے ان کی جوابی کارروائی کا بکتر بند پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اپنا کام کر کے بکتر بند پر ورس ہوئی اور پھر گھوم کر بڑک کی طرف جانے لگی۔ مزدا پک آپ یہیں رہ گئی تھی۔ فائرنگ رکتے ہی ہم باہر نکلے تھے۔ خادو برآمدے کے ستون کی آڑ میں دبا ہوا تھا۔ احسان اور اشفاق اوپر سے آگئے تھے۔ احسان نے کہا۔ ”وہ اسلام آباد کی طرف گئے ہیں۔“

وسیم اندر چلا گیا تھا کہ ساوی کو تسلی دے اور یہاں سے روانگی کی تیاری کی جائے۔ ظاہر ہے اب ہم یہاں نہیں رک سکتے تھے۔ فاضلی کا ہمدرد تو نامعلوم تھا مگر خود فاضلی یہ جگہ دیکھ گیا تھا۔ میں اور سفیر گاڑیوں کا معائنہ کر رہے تھے جب کہ عبد اللہ باقی تین کے ساتھ چوتھے گاڑ کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کا نام شفیق تھا اور وہ ٹو نے گیٹ کے نیچے دبا ہوا ملا تھا۔ گیٹ وزنی تھا مگر اس کی موت اصل میں مزدا پک آپ کے گرے گیٹ پر چڑھنے سے ہوئی تھی۔ وہ بے چارہ کچل کر رہ گیا تھا۔ اس کی لاش سامنے آتے ہی ماحول جو پہلے ہی اجتر تھا اب دھکی بھی ہو گیا تھا۔ وہ ہمارا ملازم ہی نہیں ساتھی بھی تھا اور اس نے مرتے دم تک ساتھ دیا تھا۔ لاش کی حالت خراب تھی۔ اسے ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اتنے ہنگامے کے بعد پولیس کا یہاں آنا عین قرین قیاس تھا۔ اس لیے جلد از جلد یہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔ میں نے ایاز کو کال کی اور اسے فوری کسی بڑی گاڑی کے ساتھ اس طرف آنے کو کہا۔

”ہم نکل رہے ہیں تم راستے میں ملنا۔“

خوش قسمتی سے لینڈ کروزر کا صرف ایک نائز برسٹ ہوا تھا البتہ راشد اور رومانہ کی نازک اندام گاڑی کا حشر ہو گیا تھا اس کے نہ صرف نائز برسٹ تھے بلکہ انجن بھی تباہ ہو گیا تھا۔ چار میں سے دو موٹر سائیکلیں استعمال کے قابل تھیں۔ دو کو یہیں چھوڑ کر جانا تھا۔ ان کی نمبر پلیٹیں جعلی تھیں اور ان کی مدد سے ہمارا سراغ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ احسان اور اشفاق نے پھرتی سے لینڈ کروزر کا نائز بدلا۔ اس دوران میں اندر سے سامان لا کر لینڈ کروزر میں بار کیا گیا۔ میں نے مزدا پک آپ کا معائنہ کیا تو اس کے اسٹیرنگ اور بریک ایکسی لیٹر، کچھ اور گیر کے ساتھ ایک ڈیو افس منسلک نظر آئی ایسا لگ رہا تھا کہ اسے ریویوٹ کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ تبھی انہوں نے اسے بے دریغ دروازے سے نکلوا دیا تھا۔ اس کا مقصد ہی دروازہ توڑنا تھا۔ مانی کا موڈ خراب تھا۔ اس نے مجھ سے شکوہ کیا۔

”کس قدر گھٹیا لوگ ہیں ہمیں آئے ایک دن ہی تو ہوا ہے۔“

”بس بھائی ایسے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میرا تو مشورہ ہے تم پوریا

بستر سمیٹو اور لاہور کی طرف نکل جاؤ۔“

وہ دنگ رہ گیا۔ ”ابھی؟“

”ہاں ابھی..... تمہیں کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر اتار دیں گے وہاں سے کوئی پرائیویٹ کار لے لینا اور لاہور چلے

جاتا۔“

مانی اپنا سامان سیٹنے کے لیے بھاگا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ جو فکس ہو گیا ہے اس کی فکر مت کرے بس اپنا کمپیوٹر والا سامان لے اور یہاں سے نکلے۔ دسم اور سفیر اسلحہ لا کر گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ عبداللہ، راشد اور رومانہ کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مانی اندر سے برآمد ہوا اور تیزی سے میرے پاس آیا۔ ”شوبی یہ آپ نے مصیبت یہاں رکھی ہوئی ہے؟“

”کون سی مصیبت..... سفیر کی بات کر رہے ہو؟“

اندر سے آتے سفیر نے سن لیا اور بھنا کر بولا۔ ”میں نے کیا کیا ہے۔“

”میں سفیر بھائی کی بات نہیں کر رہا۔“ مانی جلدی سے بولا۔ ”وہ لڑکی جو اندر ہے۔“

”اندر دو لڑکیاں ہیں بلکہ ان میں سے ایک خاتون ہے۔“

مانی زچ ہو گیا۔ ”آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔“

”یار مذاق تم کر رہے ہو اندر موجود تمام افراد کے نام تمہیں معلوم ہیں تو نام لو نا۔“

”میں اس لڑکی رومانہ کی بات کر رہا ہوں۔“

”تکنیکی طور پر وہ بھی لڑکی نہیں ہے۔“

مانی جج زچ ہونے لگا۔ ”اب آپ سفیر بھائی بن رہے ہیں۔“

اس پر سفیر نے اسلحے کی آخری کھپ گاڑی میں بیخ دی اور غرا کر بولا۔ ”ہاں سارے زمانے کے کر توت

سفیر بھائی کے سر ڈال دو۔“

”آپ میری بات کیوں نہیں سن رہے؟“ مانی نے تقریباً ناچتے ہوئے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”یار تم سناؤ گے تو میں سنوں گا نا۔“

”یہ میرے بارے میں ہی کچھ سنائے گا۔“ سفیر نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ تو مانی نے بال نوچتے ہوئے

چلا کر کہا۔

”وہ مرشد کی بیٹی ہے۔“

میں دم بخود رہ گیا تھا اور اندر جاتا سفیریوں واپس آیا جیسے اسے کسی اسپرنگ نے کھینچ لیا ہو۔ دسم کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا تھا۔ میں نے مانی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور سرگوشی میں پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے رومانہ مرشد کی بیٹی ہے؟“

”تو اتنی دیر سے آپ کو اور کیا بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ اس نے غلطی سے کہا اور اندر چلا گیا۔ اب تک میں نے سوچا نہیں تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے ان کا کیا کرنا ہے۔ مگر امکان یہی تھا کہ ہم انہیں بھی آزاد کرتے درخوردانہ ہو جاتے مگر مرشد کی بیٹی کو کیسے چھوڑ کر جاسکتے تھے۔ سفیر نے کہا۔

”یہ مانی بد معاشی کر رہا ہے۔“

”وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو اس موقع پر مذاق کرے۔“ وسیم نے نفی میں سر ہلایا تو مجھے ہوش آیا اور میں سفیر اور وسیم کو کام جاری رکھنے کا کہہ کر اندر کی طرف لپکا۔ رومانہ اور راشد صوفی پر بیٹھے تھے ان کا سامان بھی ساتھ تھا۔ میں نے جاتے ہی بلا تہدید رومانہ سے پوچھا۔

”تم مرشد علی کی بیٹی ہو؟“

وہ چونکی اور ہراساں ہو کر مجھے دیکھا۔ ”آپ..... آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”میری بات کا جواب دو۔“ میرے لہجے میں ایک اجنبی سی غراہٹ آگئی۔ اب اس کے ساتھ راشد بھی ہم گیا تھا۔ رومانہ نے سر ہلایا۔

”مرشد علی میرے قادر ہیں۔“

میں نے تسلی کے لیے مرشد علی کے مزید حوالے دیے اور مکمل اطمینان کر لیا کہ یہ اسی مرشد علی کا ذکر ہے۔ پھر میں نے راشد کی طرف دیکھا۔ ”تم اس کے بھائی ارشد علی کے بیٹے ہو؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”جی وہ میرے پاپا ہیں۔“

عبداللہ بھی دم بخود تھا۔ اس لیے جب میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”تم دونوں ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔“

تو عبداللہ نے فوراً اپنی گن ان پر تان لی۔ ”بالکل۔“

”انہیں باہر گاڑی میں لے آؤ۔“

بکتر بند کی واپسی کے مشکل سے آدھے گھنٹے بعد ہم بھی وہاں سے نکل آئے تھے۔ اب پولیس آتی اور اس اسٹیٹ ایجنٹ سے شمتی جس نے ہمیں فارم کرائے پر دیا تھا۔ اس کے پاس ہمارے نام اور آئی ڈی کارڈز کی کاپیاں تھیں مگر ان سے ہمیں تلاش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فارم سفیر نے لیا تھا مگر جب میں نے اس سے راستے میں پوچھا تو اس نے دانت نکال کر کہا۔

”میں نے اس کے ریکارڈ سے اپنی آئی ڈی کی کاپی ایسی صفائی سے نکالی تھی کہ اسے خبر بھی نہیں ہوئی بعد میں کہہ رہا تھا کہ کہیں گرگئی میں پھر دے دوں۔“

”یہ ٹو نے عقل مندی کا کام کیا۔“

”میں ہمیشہ عقل سے کام لیتا ہوں۔“

”جب سونا آس پاس نہیں ہوتی ہے۔“ وسیم نے لقمہ دیا۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ سادی اور رومانہ فرنٹ سیٹ پر ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

”تب ہی ٹو غلطی سے بھی کوئی عقل کی بات نہیں کرتا۔“ سفیر نے جواب دیا۔ میں، سفیر اور راشد درمیان والی نشست پر تھے۔ عبداللہ ایک بائیک پر تھا۔ باقی تینوں ظاہر ہے اپنی بائیک پر تھے۔ ابھی ہم نے جی ٹی روڈ کراس کی تھی کہ ایاز کی کال آگئی۔

”آپ کہاں ہیں۔“

”جی ٹی روڈ پر آگئے ہیں۔“

”کشمیر ہائی وے پر مت جائیے گا۔ پنڈی کی طرف آئیں میں ویسٹ راج کے پاس ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا اور ویم کو پنڈی کی طرف چلنے کو کہا۔

”میں اپنی جیب لایا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔ ”لیکن ہوا کیا ہے؟“

میں نے اسے مختصر بتایا کہ ہوا کیا تھا۔ فاضلی کے نکل جانے کا سن کر اسے مایوسی ہوئی تھی لیکن جب

میں نے اسے مرشد کی بیٹی کے بارے میں بتایا تو وہ دنگ رہ گیا۔ ”مرشد زادی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ کہاں سے آپ کے ہاتھ لگی۔“

”یہ اندھیرے میں اندھے کے ہاتھ میں بیڑا جانے سے بھی بڑا کیس ہے۔ بالکل اتفاقیہ ہاتھ آئے ہیں

دونوں..... خیر سے مرشد کے سن ان لامبھی ہیں جو پہلے ہی جیتنے کے عہدے پر فائز ہیں۔“

دس منٹ بعد ہم ویسٹ راج کی طرف مڑ گئے۔ ایاز مستقل رابطے میں تھا اور ہمیں بتا رہا تھا کہ وہ کہاں

ملے گا۔ اس سے پہلے اس کی جیب نظر آگئی۔ ویم نے لینڈ کروزر اس کی جیب سے ذرا آگے روکی کیونکہ یہاں

سڑک تنگ تھی اور دو گاڑیاں ساتھ کھڑی ہو جاتیں تو تیسری کے گزرنے کی جگہ باقی نہ رہتی۔ ویسے رات کے ایک

بجے یہاں سناٹا تھا۔ باقاعدہ ملاقات کا وقت نہیں تھا اس لیے صرف سلام دعا ہوئی۔ سادی، ویم، راشد اور رومانہ کو

مع کچھ اسلحے کے ایاز کی جیب میں منتقل کیا گیا۔ اگرچہ میں نے ویم سے کہا نہیں تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ سادی اور اسے

کیوں بھگوال والی حویلی بھیج رہا ہوں۔ اس نے مجھ سے بغل گیر ہو کر کہا۔ ”میں نکل ہی اسے حویلی چھوڑ کر آتا

ہوں۔“

سادی بھی سمجھ رہی تھی اس لیے میرے بازو پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ ”میں آپ کے لیے بہت دعا کروں

گی۔“

”مجھے تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”اپنا بہت خیال رکھنا۔“

”مجھے افسوس ہے میں نے آپ کو تنگ کیا۔“

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ سب ایاز کی جیب پر سوار ہوئے اور ایاز انہیں لے کر روانہ ہو گیا۔ رائڈرز بھی ان کے ساتھ چلے گئے

تھے۔ میں، مانی، سفیر اور عبداللہ اسی سڑک سے فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ رات کا وقت تھا اور کسی ٹیکسی کا ملنا

مشکل تھا اس لیے مانی کی لاہور رواگلی مچ تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم لاہور جاتے

ہی بینک اکاؤنٹ کھلو لینا۔ عبداللہ اس میں رقم ٹرانسفر کر دے گا۔ ابھی تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟“

”میرے پاس رقم ہے آپ فکر نہ کریں۔ وہاں لاہور میں میرے کئی دوست ہیں۔ میں آرام سے ایڈ

جسٹ ہو جاؤں گا۔ ویسے میرا بینک اکاؤنٹ ہے میں کہیں سے بھی آپریٹ کر سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم رابطہ نہیں کرو گے۔ اگر کوئی اہم بات ہوگی تو نیٹ کی مدد سے کال کرو گے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ اس نے کہا

ہم فیض آباد والی کوٹھی پہنچے اور کال نیل کے جواب میں شاہ جی سوتے سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس نے گیٹ

کھولا تھا۔ یہاں آتے ہوئے میں نے آس پاس کا جائزہ لیا تھا۔ اگر یہاں کی گھرائی ہو رہی تھی جب بھی میں کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ سفیر کسی قدر قنوطی ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یار دو گھنٹے پہلے ہم کتنے خوش اور مطمئن تھے۔ دشمنوں سے ہماری خوشی دیکھی نہیں جاتی۔ کیسے منٹوں میں سب تر ہتر ہو گئے۔“

”یہی زندگی ہے، نارمل لوگوں کی زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے ذرا دیر کو سکون ملتا ہے اور پھر بھاگ دوڑ کی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔“

”اب کیا کرنا ہے؟“ سفیر نے جمای لی۔

”مجھے ذرا ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے۔“ میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں اسی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔“

عبداللہ گاڑی سے اسلحہ نکال رہا تھا۔ مانی نے صبح چلے جانا تھا اس لیے اس نے اپنا سامان گاڑی میں رہنے دیا۔ شاہ جی ٹائف چائے بنا لیا تھا۔ فرمائش سفیر نے کی تھی مگر وہ سب کے لیے بنا کر میرے کمرے میں ہی لے آیا۔ شاہ جی کے جانے کے بعد سفیر نے کہا۔ ”اس سارے چکر میں ایک ہی اچھی بات ہوئی ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”مرشد کی بیٹی اور داماد کا ہاتھ آنا بڑی کامیابی ہے لیکن ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس سے فائدہ کس طرح اٹھا سکتے ہیں۔“

سفیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”اس میں نہ سمجھ میں والی بات کون سی ہے؟..... مرشد کو اطلاع دو کہ اس کی لاڈلی ہمارے پاس ہے۔ اس کے بعد وہ ہمارے اشاروں پر نہ ناپے تو کہنا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کیا تم مرشد کو نہیں جانتے ہو، وہ صرف اپنی ذات کو اہمیت دینے والا شخص ہے۔ پھر رومانہ نے گھر سے بھاگ کر اس سے بغاوت کی ہے۔ تم نے اس کا خوف نہیں دیکھا جو اسے اپنے باپ سے ہے۔ ایسے میں رومانہ کے حوالے سے کوئی دھمکی مرشد پر کتنا اثر کر سکتی ہے؟“

سفیر نے نفرت سے کہا۔ ”اس بے غیرت کو اپنی عزت کی پروا بھی نہیں ہوگی؟“

”یار یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہمارے بدترین دشمن بھی اس حوالے سے ہم پر شک نہیں کر سکتے۔ مرشد کبھی یقین نہیں کرے گا کہ اس کی بیٹی کی عزت کو ہم سے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہاں ہم اسے قتل کر سکتے ہیں اور غالباً مرشد بھی یہی سوچ رہا ہوگا۔“

سفیر نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ٹوٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”اس لیے اس معاملے میں غنڈا رہ..... وہ دونوں ابھی ہمارے پاس ہیں۔ ہم آرام سے فیصلہ کریں گے کہ انہیں کیسے استعمال کرنا ہے۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ سفیر نے چائے کا خالی گگ رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ ”میں سونے جا رہا ہوں۔“

”میں بھی سونے کی سوچ رہا ہوں لیکن اگر ٹوٹو نے اب مجھے مونا والے اسٹائل میں اٹھایا تو تیری خیر نہیں ہو گی۔“

”نہیں اٹھاؤں گا۔“ سفیر ہنسا۔ ”لیکن طریقہ مزے کا ہے۔“

”تب میں تجھ پر آزمائوں گا۔“

”میں عادی ہو گیا ہوں۔“ سفیر نے جاتے ہوئے کہا۔

میں نے غسل کیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔ گرمی کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ عروج پر تھی اور ہر ایک گھنٹے بعد ایک گھنٹے کے لیے لائٹ جاری تھی مگر کوشی میں موجود آٹو بیٹک جنریٹر اس کا ازالہ کر رہا تھا۔ لائٹ جاتے ہی وہ خود بخود اشارت ہو جاتا تھا اور لائٹ آنے پر خود بخود بند ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے اے سی مسلسل کام کر رہے تھے۔ اس لیے ہم سکون سے سوتے رہے۔ صبح سفیر نے مجھے جگایا لیکن شرافت سے اور مہذب انداز میں بیڈٹی پیش کر کے۔ اٹھ نہ رہے تھے۔ ہم دو بجے سوئے تھے۔ نیند پوری ہوئی تھی مگر جسم میں کسل مندی تھی۔ میں نے جمائی لی۔ ”اتنی جلدی اٹھا دیا۔“

”کیونکہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔“ سفیر نے منطقی انداز میں کہا اور مجھے چائے کا گمگمہا دیا۔

”یار سوتے سوتے چائے پی تھی اور اٹھتے ہی پھر چائے۔“

”بیٹے ابھی کافی ہوئی تو تو خوشی خوشی فرماتا۔“

”کیونکہ کافی شانی ہوتی ہے۔“ میں نے اٹھ کر غسل خانے کا رخ کیا۔ تازہ دم ہو کر واپس آیا۔ چائے نوشی کے دوران سفیر نے آگاہ کیا کہ زبیدہ خانم کیا سریلے پراٹھے پکا رہی ہے۔ میں حیران ہوا۔ ”سریلے پراٹھے؟“

”ایسے سمجھ نہیں آئے گا کھا کر دیکھے گا تو ہتا چلے گا۔“

”ٹوٹنے ناشتہ کر لیا؟“

”ہاں تبھی تو بتا رہا ہوں۔“

ہم نیچے آئے جہاں عبداللہ ڈائمنگ ٹیبل پر موجود تھا۔ پراٹھوں کے ساتھ رات کا بنا ہوا آلو قیرہ تھا اور کیا خوب تھا۔ اگرچہ میں ہاتھ کے ڈائمنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر آپ میں کھانا بنانے کا فن ہے تو باقی کام محنت کا رہ جاتا ہے۔ مگر زبیدہ ان عورتوں میں سے تھی جن کے ہاتھ میں سچے سچ ڈائمنے ہوتا ہے وہ جو بھی بناتی تھی خوب بناتی تھی۔ یہ ورتی پراٹھے تھے مہین ہونے کے باوجود ان کی کئی تھیں تھیں۔ سفیر کا لقب درست تھا جو اس نے ان پراٹھوں کو دیا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم اوپر والے لاؤنج میں آئے۔ زبیدہ کو تازہ چائے دیں لانے کو کہا۔ مانی سورہا تھا وہ جب اٹھتا تو ناشتہ کرتا اور اس کے بعد عبداللہ اسے کسی ٹیکسی میں بٹھا آتا۔ میں نے عبداللہ کو بتایا کہ میں اب خود ڈیوڈ شا کو کال کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ہتھکڑ ہو گیا سفیر نے بھی اعتراض کیا۔ ”یہ رسکی ہوگا۔“

”رسک تو ہے لیکن ڈیوڈ شا پہلے ہی اس لوکیشن سے واقف ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑے گا۔ کل رات بھی اس کے آدمیوں نے ثابت کیا کہ وہ ہمارے درپے نہیں ہے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ وہ ڈیوڈ شا کے آدمی تھے؟“

”ننانوے فیصد یقین ہے۔“ میں نے کہا۔

”ٹوکیا بات کرے گا؟“ سفیر نے پوچھا۔ ”جب کہ ٹو جانتا ہے کہ اس کا کیا مطالبہ ہوگا۔“

”میں جانتا چاہتا ہوں کہ اس نے فاضلی کو کیوں ساتھ ملایا ہے؟“

”آسان سی بات ہے اب مرشد اس کے کام کا نہیں رہا ہے۔“

”نہیں ڈیوڈ شانے فاضلی کو اس لیے ساتھ ملایا ہے کہ وہ مرشد کے گھر کا بھیدی ہے اور اس سے چھپی نفرت کرتا ہے ڈیوڈ شانے اسی نفرت کا فائدہ اٹھا کر اسے ساتھ ملایا ہے۔ مرشد نے اس کی دی ہوئی ضمانت کو جوتے کی نوک پر رکھا اور یہ ڈیوڈ شاچیہ شخص کی بہت بڑی توہین تھی۔ اب وہ اس سے مرشد کو سزا دینے کا کام لے رہا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ اس کا احسان میرے سر رکھنا چاہے گا۔ جیسا کہ فاضلی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرا ہی کام کر رہا ہے اور مجھ سے دشمنی کا باب بند کر چکا ہے۔“

”سانپ ڈسنا اور بچھوڈ نک مارنا کبھی نہیں بھولتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے سفیر کی بات پر سر ہلایا۔ ”کل رات کے واقعے کی کوئی اطلاع آئی؟“

سفیر نے بتایا۔ ”ہاں پولیس نے موقع پر پہنچ کر لاش قبضے میں لے لی ہے۔ عبد اللہ نے اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی ہے وہ لاش لینے آرہے ہیں۔ انہیں پچیس لاکھ روپے بھی دیں گے۔“

”جان کا تو کوئی بدل نہیں ہے لیکن اس کے لواحقین کے لیے یہ رقم بڑا سہارا بن جائے گی۔“ میں نے کہا

دور وہ سم نکال کر موبائل میں لگائی جس پر ڈیوڈ شا کی کال آئی تھی جس نمبر سے کال آئی تھی وہ میں نے اسی سم میں محفوظ کر لیا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر محفوظ کیا تھا کہ بعد میں کبھی ڈیوڈ شا سے رابطہ کرنا ہو تو میرے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ میں نے نمبر ملایا۔ تیل جانے لگی اور چند لمبے بعد کسی نے کال ریسیو کی اور برٹش لہجے میں بولا۔ ”ہیس ہوازدیر؟“

”شہباز ملک..... ڈیوڈ شا سے بات کراؤ۔“

اس نے شاید ڈیوڈ شا سے پوچھا اور پھر مجھ سے بولا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”لگتا ہے ڈیوڈ شا کو بات نہیں کرنی ہے۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ سفیر اور عبد اللہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں ڈیوڈ شا کے گھر سے ہونے والی مختصر گفتگو کا احوال سنایا۔ سفیر نے سر ہلایا۔

”ٹو نے ٹھیک کیا، اس کا دماغ کچھ خراب ہو رہا ہے فاضلی کو واپس حاصل کر کے۔“

”کاش آپ نے پہلے ہی دن اس پر اکرم چشتی والا ٹریٹ منٹ کر دیا ہوتا۔“ عبد اللہ نے مایوسی سے کہا۔

”یہ تو زہریلا سانپ دانتوں سمیت آزاد ہو جانے والی بات ہوئی ہے۔“

”وہ پھر ہاتھ آئے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اسی لمحے موبائل کی تیل بجی۔ میں نے ایک بار مکمل تیل بچنے دی اور جب کال کٹ جانے پر اس نے دوبارہ ملائی تو میں نے کال ریسیو کی اور رکھائی سے بولا۔ ”ہیس ہوازدیر؟“

”میں بات کر رہا ہوں۔“ ڈیوڈ شانے نام لیے بغیر کہا۔

”ڈیوڈ شا۔“ میں نے جان بوجھ کر اس کا نام لیا۔ ”تم غالباً بہت مصروف تھے۔“

”میں دوسری کال پر تھا۔ کہو تم نے کیوں کال کی تھی؟“

میں نے اس کے انداز میں رکھائی محسوس کی تھی۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ فاضلی تمہارے پاس پہنچ گیا

ہے؟“

”کون فاضلی.....؟“

”ڈیوڈ شا تمہارے جیسے رہنے کے آدمی کو زیب نہیں دیتا اس طرح جھوٹ بولنا یا پھر میں نے تمہاری حیثیت کا اندازہ ہی غلط لگایا ہے۔ کیا میں وہ تصاویر پیش کروں جن میں تم اپنی کوشی کے اوپری لاؤنج میں فاضلی کے ساتھ موجود تھے۔“

وہ ایک لمحے کو چپ ہوا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز تم بلاوجہ الجھ رہے ہو۔ فاضلی سے دور رہو۔ میں اس سے کام لے رہا ہوں۔“

”اب تم مجھ پر احسان جتاؤ گے تم میرا ہی کام کر رہے ہو۔“ میرا الجھ طنز یہ ہو گیا۔ ”لیکن ڈیوڈ شا تم صرف اپنے ایک معتب کو سزا دے رہے ہو۔ دوسری بات یہ کہ فاضلی پر میرے کچھ حساب نکلتے ہیں۔ وہ صرف مرشد کی ناجائز اولاد نہیں ہے اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ذاتی نقصانات پہنچائے ہیں جن میں سے بعض ناقابلِ تلافی ہیں۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا اس لیے بہتر ہو گا تم اسے چھوڑ دو۔ اس وقت بھی میں نے اپنے ساتھیوں کی خاطر اسے چھوڑا لیکن اب وہ میرے ہاتھ آیا تو وہی اس کی زندگی کا شاید آخری لمحہ ہو۔“

میں نے آخری جملہ کہتے ہی کال کاٹ دی اور فوراً موبائل بند کر کے سم نکال لی تھی۔ سفیر نے میرے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”تُو نے ٹھیک کیا جو اسے جتا دیا کہ ہم بے خبر نہیں ہیں اور ہمارے پاس بھی ذرائع ہیں۔“

”آپ نے کہا ہے کہ اب فاضلی ہاتھ آیا تو اس کا کام تمام کر دیں گے تو کیا.....؟“

”اب سچ میں یہی کرنا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم نے معلومات کے چکر میں وقت ضائع کیا۔“

”ہم نے نہیں، تُو نے۔“ سفیر نے ہنسی کی۔ ”میں اور سیم تو پہلے ہی اس کے قائل تھے۔“

”چل یار میں نے..... پر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا ہے کہ دشمن کا نہ ہونا بھی کتنے سکون کی بات ہے۔ اب مجھے معلوم ہے کہ سرحد پار میرا کوئی دشمن باقی نہیں ہے۔ اس طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”بھارتی ایجنسیوں کو تیری تلاش ہے۔“

”وہ دوسری بات ہے ان سے میری ذاتی دشمنی تو نہیں ہے۔“

”پھر بھی آپ کو اس حوالے سے محتاط رہنا چاہیے۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”پچھلے کچھ سالوں میں بھارتیوں

نے علاقائی حوالے سے بہت بڑے نکال لیے ہیں اور وہ اب برتری کے ساتھ اپنا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔“

”وہ برتر نہیں ہو گئے ہیں۔“ میں نے تنخی سے کہا۔ ”ہم ہی جھک گئے ہیں جب کبھی ہمارے حکمران کرپٹ

ہوں گے تو وہ قوم کی ترجمانی کیسے کریں گے؟ وہ سمجھیں گے کہ بین الاقوامی طاقتوں کو خوش کر کے ہی اقتدار میں رہ سکتے ہیں۔“

عبد اللہ نے سر ہلایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میری گزارش پر بھی غور کریں۔ اگر آپ کا کیس بین

الاقوامی سطح پر گیا تو آپ کے لیے مشکل ہو جائے گی۔“

”تب میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”اب اگر ڈیوڈ شا آپ سے بات کرے اور مدد مانگے تو آپ اس کے سامنے بھارتیوں سے جان

چھڑانے کی شرط بھی رکھ دیجیے گا۔“

”میں اب اسے اتنا قابل نہیں سمجھتا کہ وہ بھارتیوں سے میری جان چھڑا دے۔ وہ مرشد کا مسئلہ حل کر دے یہی بڑی بات ہوگی میرے لیے۔“

”لیکن آپ اس سے بات ضرور کریں۔“ عبداللہ نے اصرار کیا۔ ”اس صورت میں بھارتیوں سے نہ سہی اس سے آپ کی جان ضرور چھوٹ جائے گی۔“

عبداللہ کی بات قابل غور تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں سوچوں گا۔“
”آپ میاں ممتاز کو بھی بھول رہے ہیں اس کا کنور خاندان سے کاروباری تعلق تھا اور اسے بھی نقصان ہوا ہوگا۔“

”فی الحال اسے بھول جاؤ وہ سیاستدان ہے اور اس سے الجھنا ہمارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“
مافی نیچے سے آیا۔ اس نے ناشتہ کر لیا تھا اور اب جانے کے لیے تیار تھا۔ ہم سب اسے چھوڑنے کو جا رہے تھے مگر اس نے منع کر دیا۔ ”نہیں میں عبداللہ بھائی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔“
میں نے اسے گلے سے لگایا۔ ”تم دور جا رہے ہو لیکن یہ مت سمجھنا کہ اکیلے ہو گے، کوئی بھی مسئلہ ہو ہمیں فوراً بتانا۔“

”کیوں نہیں جی۔“ اس نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”اب آپ ہی تو میرے بڑے ہو۔“
”بیٹے اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ کیوں بڑا بنایا جا رہا ہے۔“ سفیر نے معنی خیز انداز میں کہا تو مافی جھینپ گیا۔

”آپ کا ذہن تو ہمیشہ ٹیکو ہی سوچتا ہے۔“
”اور درست سوچتا ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ ”لیکن تم فکر مت کرو شاز یہ سے تمہاری شادی ضرور ہوگی۔“
”بالکل جب میاں بیوی راضی تو پھر قاضی بھی راضی۔“ عبداللہ نے محاورے کا حشر کرتے ہوئے کہا۔
پھر وہ مافی کو لے کر چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے وسیم کو کال کی۔
”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“

”نہیں جناب بہت آرام سے پہنچ گئے تھے۔“ وسیم نے کہا۔ ”بس نئے پنجپیوں نے تھوڑا ہنگامہ کیا تھا۔ مگر اب سکون سے ہیں۔“

”ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا۔“ میں نے کہا۔ ”باقی پروگرام کب کا ہے؟“
وسیم سمجھ گیا کہ میں اس پر کھل کر بات نہیں کر رہا اس لیے اس نے جواب دیا۔ ”ان شاء اللہ آج ہی منشا نا ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

”آپ کی طرف سب شکون ہے؟“

”ہاں باہر والے سے بات ہوئی ہے۔ اس کا موڈ تھوڑا اکھڑا ہوا لگ رہا ہے۔“
”آپ فکر نہ کریں کچھ دن بعد جم جائے گا آج کل گرمی زیادہ ہے نا تو اکھڑ گیا ہوگا۔“ وسیم نے ہنس کر

کہا۔ ”لوٹ کر بدھو نے گھر ہی آنا ہوتا ہے۔“

”لیکن وہ بدھو نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ عبداللہ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تھا اس نے مانی کو ایک پرائیویٹ کار میں بٹھایا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہی روانہ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہم گپ شپ کرتے رہے۔ راشد اور رومانہ کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر ندیم نے رابطہ کیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے بیون کے ہاتھ کاغذات بھیج رہا ہے میں متعلقہ جگہوں پر سائن کر دوں۔ ایک گھنٹے بعد اس کا بیون آکر سائن کرا کے لے گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سفیر حسب معمول خواب خرگوش کے مزے لینے لگا۔ کچھ عرصے سے آرام کرنے سے اس کی ہلکی سی توند نکل آئی تھی۔ خوش خوراک وہ ہمیشہ سے تھا۔ اس لیے توند کی وجہ آرام طلبی ہی ہو سکتی تھی۔



عبداللہ کچھ گاڑیوں کے لیے نکلا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ کھولا۔ یہ وائی فائی کی مدد سے پٹی سی ایل براڈ بینڈ سے منسلک تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مرشد کی درگاہ پر ہونے والی کارروائی کی رپورٹس تو دیکھوں۔ جب میں نے سرچ کیا تو انٹرنیٹ پر مختلف اخبارات اور نیوز سائٹس پر اس کے بارے میں بہت سا مواد نکل آیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ چند رپورٹرز نے خاصے چشم کشا انکشافات کیے تھے۔ خاص طور سے ظفر شاہ نامی ایک رپورٹر نے بتایا کہ درگاہ میں موجود بارود تجزیے کے بعد کئی بڑی وارداتوں میں ہونے والے دھماکا خیز مواد سے مشابہہ پایا گیا۔ خاص طور سے ایک فوجی بیس پر حملے کا حوالہ تھا۔ اس میں ہمارے فوجی اٹاٹوں کو خاصا بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اس انکشاف کے باوجود مرشد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اسے گرفتار کیا گیا تھا۔

پھر ایک چھوٹی سی خبر نے متوجہ کیا۔ یہ آج کے ایک اخبار میں آئی تھی۔ ارشد علی نامی شخص کسی جھگڑے میں زخمی ہونے کے بعد اسپتال لایا گیا تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگی تھی اور اس کی حالت تشویشناک تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ مرشد علی کا چچا زاد ارشد علی تو نہیں تھا۔ راشد اسی کا بیٹا تھا اور وہ رومانہ یعنی دختر مرشد کو لے کر فرار ہوا تھا۔ یقیناً مرشد اور ارشد کے درمیان جھگڑا ہوا تھا اور اسی کا نتیجہ ہو سکتا تھا کہ ارشد علی اسپتال پہنچ گیا تھا مگر پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ انڈیا لے جائے جانے سے پہلے میری ارشد علی سے بات ہوئی تھی مگر اب اس کا نمبر میرے پاس نہیں تھا البتہ مرشد ہاؤس کے نمبرز تھے میں نے سوچا اور ڈیوڈ شا سے گفتگو والی سم لگا کر مرشد ہاؤس کال کی۔ مرشد کے منتطیق بیکر ٹری نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو کس سے بات کرنی ہے۔“

”تمہارے اور بے شمار دوسرے حرامیوں کے ناجائز باپ مرشد سے۔“ میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”مجھے پہچان تو لیا ہوگا۔ میں بھی تمہاری ولدیت میں شامل ہوں لیکن معنوی لحاظ سے۔“

”تم شبہ باز ملک ہو۔“

”یہ بھی تمہارے کسی باپ کا نام ہے لیکن فی الحال مجھے صرف مرشد سے دلچسپی ہے۔“

”وہ مصروف ہیں۔“ اس نے بدھو ہو کر کہا۔

”ہاں رشتے داروں کا صفایا کرنے میں مصروف ہے۔ نادر کو مار چکا ہے اور اب چچا زاد کو اسپتال پہنچا

دیا۔“

”اے غلطی سے چل جانے والی گولی لگی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں تصدیق کر دی۔
 ”ایک آدھ دن میں اس کی بھی موت واقع ہو جائے گی۔ ایسا لگتا ہے آخر میں یہ خاندان صرف مرشد سے چلے گا مگر کیا اسے یقین ہے کہ وہ جسے اپنی اولاد سمجھتا ہے وہ اسی کی اولاد ہے؟“
 ”تم فضول باتیں بہت کرتے ہو۔“ سیکرٹری نے جڑ جڑتے ہوئے کہا۔
 ”چلو تم کوئی کام کی بات بتاؤ۔ سنا ہے مرشد کی ناجائز اولاد نبرون یعنی فاضلی نے بغاوت کر دی ہے۔“
 ”یہ بھی فضول بکواس ہے۔“

میں اس سے کچھ دیر اور فضول بکواس کرتا رہا اور اس نے تنگ آ کر فون بند کر دیا۔ لیکن مجھے وہ بات معلوم ہو گئی تھی جس کے لیے میں نے کال کی تھی۔ میں نے انٹرنیٹ پر ایک بار پھر خبر پڑھی۔ اس میں اسپتال کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ میں نے اس اخبار کا نمبر ویب سائٹ سے لیا اور کال کی۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے اٹھایا تو میں نے اسے سٹی ایڈیٹر سے ملائے کو کہا۔ اس قسم کی خبریں سٹی ایڈیٹر ہی دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد سٹی ایڈیٹر لائن پر تھا اور مجھ سے بات کرنے کے بجائے کسی ماتحت پر چلا رہا تھا۔ ”یہ تم نے کیا لکھا ہے مجھے نوکری سے نکلواؤ گے..... ہاں جی فرمائیے۔“

میں نے خبر کا حوالہ دیا اور پوچھا۔ ”مجھے اسپتال کا معلوم کرنا ہے جہاں ارشد علی داخل ہے۔“
 ”یہ تو رپورٹ ہی بتا سکتا ہے۔“ اس نے کہا اور چلا کر بولا۔ ”خرم ادھر آؤ تمہاری کال ہے۔“
 چند لمحوں بعد رپورٹر خرم لائن پر تھا میں نے اس سے وہی سوال کیا تو اس نے آگے سے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں ارشد علی کا کلاس فیور ہا ہوں کچھ عرصے سے اس سے رابطہ نہیں تھا آج اخبار میں یہ خبر دیکھی تو پتا چلا۔“

”آپ اس کے گھر سے بھی معلوم کر سکتے تھے۔“
 ”مجھے اس کے گھر کا نمبر نہیں معلوم، میں نے کہا نارابطہ ہوئے زمانہ ہو گیا ہے۔“
 اس بار اس نے مجھے اسپتال کا نام بتا دیا اور ساتھ ہی اطلاع دی۔ ”کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔“

میں نے اب عبد اللہ کو کال کی۔ ڈیوڈ شادالی سم میں مرشد ہاؤس کال کرتے ہی نکال چکا تھا اور اب اپنی ٹارل سم پر بات کر رہا تھا۔ ”تم کہاں ہو؟“
 ”ایاز کے ساتھ ایک گاڑی دیکھ رہا ہوں۔“
 ”یہ کام ایاز پر چھوڑ دو اور فیض آباد کے پارک تک آ جاؤ میں وہیں ملوں گا۔“
 ”خیریت؟“

”خیریت ہے، ایک اسپتال تک جانا ہے۔“ میں نے اسے اسپتال کا بتایا۔ ”وہاں مرشد کا چچا زاد بھائی ارشد زید علاج ہے اسے گولی لگی ہے۔ یہ ارشد کا باپ ہے۔“

”میں سمجھ گیا میں میں منٹ میں آ جاؤں گا۔“

تین بج گری شدت کی تھی اور گلیاں دور دور تک سنسان تھیں۔ ایسے میں صرف وہی گھر سے باہر تھے جن کی مجبوری تھی۔ میں نے دھوپ سے بچنے کے لیے پی کیپ اور بڑا سن گلاس لگایا تھا اس سے میری صورت چھپ گئی تھی۔ کسی قدر ڈھیلی ٹی شرٹ تلے ایک اعشاریہ اڑتیس کا پستول تھا اور ایک چھوٹا کولٹ تھا۔ سفیر سوار تھا میں شاہ جی کو بتا کر نکلا اور ٹھٹھا ہوا پارک کی طرف بڑھا۔ اس طرف جانے کا مقصد یہ اندازہ لگانا تھا کہ کونسی کی نگرانی تو نہیں ہو رہی تھی اور فوراً گلی کے کونے پر قلفی کی ریڑھی لگائے شخص نے مجھے متوجہ کیا وہ کہیں سے بھی قلفی بیچنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی قدر ہٹا کٹا اور صاف رنگ والا شخص تھا۔ جب میں مخالف سمت میں روانہ ہوا تو اس نے فوراً ریڑھی میرے پیچھے لگا دی۔ پھر کسی گھر سے اسے قلفی کے لیے آواز دی گئی تھی مگر وہ انسانی کر کے میرے پیچھے آتا رہا۔ میرا شک پختہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی پیچھے ہے۔

میں نے اپنی رفتار مزید سست کر لی۔ میں چاہتا تھا کہ جب پارک پہنچوں تو عبداللہ آ گیا ہو اور ہم فوری روانہ ہو جائیں اور نگرانی کرنے والے ٹاپے رہ جائیں۔ مگر سست رفتاری کے باوجود پارک جلد آ گیا اور عبداللہ نہیں آیا تھا۔ میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر جا بیٹھا۔ عبداللہ کی منی بجیر و چند منٹ بعد نمودار ہوئی اور میں اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس کے رکتے ہی میں سوار ہو گیا اور اس سے کہا۔ ”جلدی نکلو ہماری نگرانی ہو رہی ہے۔“

عبداللہ نے وہیں سے جیب گھمائی تو میں نے دیکھا قلفی والا شاید موبائل یا واکی ٹاکی پر کسی سے بات کر رہا تھا یقیناً ہمارے بارے میں بتا رہا ہوگا۔ اس کی کال کا نتیجہ ایک گلی سے سفید کاری صورت میں نکلا اور وہ ہمارے پیچھے لگ گئی۔ قلفی والا مقامی تھا اور کار میں بیٹھے دو افراد بھی مقامی لگ رہے تھے۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”ان سے پیچھا چھڑانا ہوگا تب ہی ہم اسپتال کی طرف جاسکتے ہیں۔“

”کوشش کرتے ہیں۔“ اس نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا لیکن منی بجیر و کا انجن زیادہ طاقتور نہیں ہوتا ہے۔ نئے ماڈل میں یہ پھر بھی بہتر ہے پرانے ماڈل میں تو چھ سو سی انجن ہوتا تھا۔ اس کی رفتار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ پیچھے آنے والی کار خیر تھی اور اس کے مقابلے میں زیادہ طاقتور انجن اور پک آپ رکھتی تھی۔ اب عبداللہ سے کچھ کہنا بے کار تھا اسے یہ گاڑی رکھنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ ہم فیض آباد سے نکل کر مری روڈ پر آئے اور راولپنڈی کی طرف بڑھے۔ پھر عبداللہ نے اچانک ہی جیب بلال کالونی میں گھمادی۔ یہ متوسط درجے کی لیکن اچھی کالونی تھی جو لوگ اسلام آباد اور فیض آباد جیسی مہنگی جگہوں پر نہیں رہ سکتے تھے وہ بلال کالونی میں رہائش اختیار کرنا پسند کرتے تھے۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”یہاں کہاں ٹھہر رہے ہو یہاں گلیوں میں ان سے پیچھا چھڑالیں گے کیا؟“

”آپ دیکھیں جناب میں کیا کرتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا اور جیب گھما کر کالونی کے پاس لایا۔ اس نے پارک کا ایک چکر لگا۔ جیسے موقع دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے ایک پتلی گلی میں گاڑی گھمادی۔ یہ تین مرلے والے گھر تھے اور یہاں گلیاں بہت تنگ تھیں۔ ایک گاڑی کھڑی کر دی جاتی تو اس کے بعد جگہ ملنی مشکل تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ عبداللہ کیا چاہ رہا تھا بالآخر ایک گاڑی یوں کھڑی ملی کہ اس کے برابر سے جیب بہ مشکل گزر سکتی تھی عبداللہ

نے کسی نہ کسی طرح رگڑ کھا کر جیب گزاری۔ یہی نہیں اس نے آگے جا کر جیب روکی اور پورس میں لا کر اس پر ان لوہاٹا کار کو ہوں مگر ماری کہ وہ ترجمی ہو کر رہ گئی۔ جیب کو نقصان ہوا تھا مگر دھماکے نے اندر تک اطلاع پہنچا دی تھی۔ جب تک ہم گلی کے کونے پر پہنچے اور خیر آئی جب تک اہل خانہ اندر سے نکل آئے تھے۔ خیر والا چلا رہا تھا کہ انہیں راستہ دیا جائے مگر وہ اپنی گاڑی کے نقصان کا جائزہ لے رہے تھے۔

”کیسا رہا؟“ عبد اللہ نے وہاں سے نکل کر پوچھا۔

”شاندار لیکن جیب کا بیڑا غرق ہو گیا۔“

”اس کی خیر ہے۔“ وہ مری روڈ پر آتے ہوئے بولا۔ ”اصل کام ہو گیا نا۔“

کچھ آگے جا کر اس نے اسٹڈیم روڈ سے جیب اسلام آباد کی طرف موڑ لی کیونکہ اسپتال اسلام آباد میں تھا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا۔ ”اگر ارشد علی مرگیا تو مرشد کے راستے کا ایک کاغذ اور صاف ہو جائے گا۔“

”مرشد نے دشمنی کو پکا کر لیا ہے۔ ارشد کے تین بھائی اور ہیں اور پھر اس کے بیٹے بھی ہیں۔“

”گویا اسے بہت سے رشتے داروں سے لڑنا پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے اس کے برے دن آگئے ہیں۔“

”جناب برے دنوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ عبد اللہ نے دبی زبان میں کہا۔ ”جب تک اس برائی کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے مرشد جیسے لوگ جیتے جی اپنی فطرت نہیں چھوڑ سکتے، لیکن ہم اسے برا اور راست

نشانہ نہیں بنا سکتے۔ مجھے یقین ہے وہ ضرور مارا جائے۔“

عبد اللہ خاموش ہو گیا۔ بیس منٹ بعد ہم اسپتال میں تھے۔ یہاں شعبہ حادثات سے پتا چلا کہ ارشد علی کا

آپریشن کر دیا گیا اور گولی نکال لی تھی مگر وہ آئی سی یو میں تھا۔ آئی سی یو میں جانے کی اجازت دیے ہی نہیں تھی۔

میں نے عبد اللہ سے پوچھا۔ ”یہاں ڈاکٹروں اور خاص طور سے سرجنوں والا لباس کہاں ہوتا ہوگا۔“

”ابھی معلوم کرنا ہوں۔“ اس نے کہا اور قریب سے گزرتی ایک کیوٹ سی نو عمر نرس کو روکا۔

”مس ایکسکوز می۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ سرجن انتظار حسین کہاں ہوں گے؟“

”سرجن انتظار.....“ اس نے سوچا اور ٹی میں سر ہلایا۔ ”سوری میں نہیں جانتی۔“

”انہوں نے کہا تھا کہ وہ لباس تبدیل کرنے والے حصے میں ہوں سرجن لباس کہاں بدلتے ہیں؟“

”آپ اسی راہداری میں چلے جائیں اس کے آخر میں آپریشن ایریا ہے وہیں مینج روم ہے۔“

ہم اس کا شکریہ ادا کر کے اس طرف روانہ ہوئے۔ آئی سی یو کے مقابلے میں آپریشن ایریا میں جانے پر

کوئی پابندی نہیں تھی۔ لباس کی تبدیلی کی جگہ بھی آرام سے مل گئی۔ کمرے کے دروازے پر لکھا تھا۔ میں اور

عبد اللہ بے تکلفی سے اندر داخل ہوئے۔ وہاں صرف ایک سرجن تھا جو سرجری کا لباس اتار کر اپنا پہن رہا تھا۔

وہاں اسکرینیں لگی تھیں جن کے پیچھے لباس تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے اپنے ساز کے لباس منتخب کیے اور انہیں

کپڑوں پر ہی پہن کر آخر میں چہروں پر نقاب بھی لگا لیے۔ میں نے ہپی کیپ کمر میں انکالی تھی اور سن گلاس سر پر

تھے۔ اسی ہیبت کذائی میں ہم آئی سی یو کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کام توقع سے زیادہ آسان ہوا تھا۔ کسی نے نہ تو

چیک کیا اور نہ روکا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”تم کہیں وقت گزرا تا جب تک میں ارشد علی سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”کسی خطرے کی صورت میں آپ کو خبردار کروں گا۔“

آئی سی یو پر تعینات گارڈ نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آرام سے دروازہ کھول دیا۔ کسی سے ارشد علی کے بارے میں پوچھنے کا مطلب تھا کہ میں اپنا بھاڑ آپ پھوڑ دوں۔ اس لیے میں ایسے ہی مختلف کمروں میں جھانک کر دیکھنے لگا اگر مریض کے علاوہ کوئی اور نظر آتا تو میں سواری کر لیتا تھا۔ میں نے آج تک ارشد علی کو نہیں دیکھا تھا مگر مجھے امید تھی کہ اس کے نقوش میں مرشد کی جھلک دکھائی دے گی۔ بالآخر مجھے ایک مریض پر شبہ ہوا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کا تقریباً چھپن برس کا شخص تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا اور اس کے نکتوں سے آنکھیں کی ٹکلی لگی ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اندر گیا اور اس کے سر ہانے رکھا چارٹ اٹھا کر دیکھا اس پر ارشد علی لکھا تھا۔ میں نے مطمئن ہو کر اسے آہستہ سے آواز دی۔ ”ارشد..... آنکھیں کھولو..... تم میری آواز سن رہے ہو۔“

اس نے کوئی رد عمل نہیں دیا مگر میں مستقل مزاجی سے اپنی بات دہمی آواز میں دہراتا رہا۔ مجھے بارہا تجربہ ہوا تھا کہ بالکل بے ہوش آدمی کا لاشعور بھی بیدار ہوتا ہے اور وہ آوازیں سنتا ہے۔ اگر آوازیں مسلسل آئیں تو وہ شعور کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس بار بھی میرا تجربہ کامیاب رہا۔ چند منٹ بعد ارشد علی کی آنکھیں ہلنے لگیں اور پھر اس نے چونکنا شروع کیا۔ بالآخر وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں ہلکی سی دھندلاہٹ تھی۔ وہ مسکن دوا کے زیر اثر تھا اس لیے ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آیا تھا اس لیے مجھے مزید پانچ دس منٹ کوشش کرنا پڑی تھی تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوا کہ میری بات سمجھ سکے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”ارشد علی میں شہباز ملک ہوں..... مرشد کا دشمن..... جس نے تمہیں مروانے کی کوشش کی..... اب وہ تمہارے بیٹے راشد کو مروانا چاہتا ہے۔“

میرا یہ حربہ بھی کامیاب رہا۔ بیٹے کے نام نے اسے تڑپا دیا تھا اور وہ تیزی سے ہوش میں آ گیا۔ اس نے لڑکھاتی آواز میں پوچھا۔ ”تم..... سچ میں شہباز ملک ہو۔“

”یاد کرو میں نے ایک بار تم سے فون پر بات کی تھی۔“ میں نے کہا اور اسے کچھ باتوں کا حوالہ دیا جو میں نے اس سے کی تھیں۔ اسے یاد آ گیا اور اس نے سر ہلایا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”ارشد میں بہت خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ صرف یہ بتانے کے تمہارا بیٹا ارشد اور بہو درمانہ میرے پاس ہیں اور محفوظ ہیں۔ وہ مرشد سے بچتے پھر رہے تھے۔“

”شکر ہے میرے مالک..... شکر ہے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔ ”ورنہ ہم نے تو اپنے طور پر اسے پھڑپھڑا ہوا سمجھ لیا تھا۔“

”ایک اتفاق کے تحت وہ میرے پاس آیا اور اب میں اس کی حفاظت کروں گا۔ لیکن ارشد تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔“

”کیسا تعاون؟“ وہ کسمایا۔ وہ جس طرح بات کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی حالت خطرے سے

باہر آگئی تھی یا ڈاکٹروں نے اسے مسکن دوا پر رکھا ہوا تھا تکلیف سے بچانے کے لیے۔ دوسری بات کچھ دیر بعد درست ثابت ہونے لگی۔

”تمہیں کس نے گولی ماری ہے؟“

”مرشد نے۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”وہ اپنے بد معاشوں کے ساتھ ہمارے گھر کھس آیا تھا۔ وہ رومانہ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ میری اس سے تلخ کلامی ہوئی اور اس نے اچانک پستول نکال کر گولی چلا دی۔“

”تمہارے ساتھ بھی محافظ ہوں گے انہوں نے کچھ نہیں کیا؟“

”مرشد کے آدمیوں نے انہیں پہلے ہی بے بس کر دیا تھا۔“

”صرف یہی ایک معاملہ تھا؟“

”نہیں اس کا کہنا ہے کہ درگاہ میں ہونے والی تباہی اور اسلحہ پکڑے جانے میں ہمارا ہاتھ ہے۔“

”تم لوگ اب درگاہ کے معاملات میں شامل ہو؟“

”بالکل نہیں، نادر کے مرنے کے بعد مرشد نے ہمیں بے دخل کر دیا ہے۔ اب ہم وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔ ہم بھائیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہاں سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھیں گے۔ مگر ارشد نے رومانہ کو بھگا کر معاملہ خراب کر دیا۔“

”اب مرشد کا کیا رُغل ہوگا؟“

”تم دیکھ نہیں رہے ہو۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے گولی مارنے کے بعد اس نے دمکی دی تھی کہ اگر دودن کے اندر رومانہ واپس نہیں آئی تو ہم چاروں بھائیوں کو پورے خاندان سمیت نیست و نابود کر دے گا۔“

”وہ ایسا ہی شخص ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ارشد وقت آگیا ہے کہ تم میرا ساتھ دو..... ہم اس موذی سانپ کا سر ہمیشہ کے لیے پکھل سکتے ہیں۔“

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”تم اصغر سے بات کر دے مجھ سے چھوٹا بھائی ہے۔ وہ سب سے زیادہ جرأت مند بھی ہے۔“

ارشد نے مجھے بھائی کا نمبر دیا۔ اس دوران میں وہ بے چین ہو رہا تھا پھر اس نے کراہنا شروع کر دیا۔ جب وہ نمبر بتا رہا تھا تو اس کی کراہیں خاصی بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر اس نے چنخنا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی سے اس کے سر ہانے لگا ایرجنسی کال کا بٹن دبایا اور باہر نکل آیا۔ چند لمحوں بعد ایک ڈاکٹر اور ایک نرس نمودار ہوئی اور تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ عبد اللہ ایک طرف موجود تھا۔ اس نے اشارہ کیا اور ہم دونوں تیزی سے باہر نکل آئے۔ آپریشن ایریا کی طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ پرائیویٹ وارڈ کے ایک خالی کمرے میں ہم نے بستر جنوں والا لباس اور نقاب اتار کر وہیں ڈالا اور اپنے اصل حلیے میں ٹہلتے ہوئے آرام سے باہر نکل آئے۔ عبد اللہ نے باہر آکر پوچھا۔ ”کیا بات ہوئی؟“

میں نے اسے خلاصہ سنایا۔ وہ خوش ہو گیا۔ ”یہ اچھا ہوا کہ ہمارے پاس ایک موقع آیا۔ ہم مرشد کے شریکوں کو پوری طرح اکسائیں گے اور انہیں اپنی مدد کا یقین دلائیں گے۔“

”بالکل تصادم جتنا زور دار ہوگا ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اب ذرا بھگوال کی طرف چلا جائے۔“

”وسیم سادی بی بی کو لے کر جا چکا ہوگا۔“

”ہاں اس نے کہا تھا کہ یہ کام آج ہی منٹا دے گا۔ ہم ذرا راشد سے بات کریں گے۔“

مری ہائی وے پر شمال کی طرف جانے والوں کا رش تھا۔ خاص طور سے بھارہ کہو میں تو ٹریفک جام ہو رہا تھا۔ بہ مشکل ہم وہاں سے نکلے اور سبلی ڈیم روڈ سے ہوتے ہوئے پنڈ بھگوال پہنچے۔ موسم یہاں بھی گرم تھا مگر کسی قدر بلندی کی وجہ سے اس کی شدت کم تھی۔ حویلی جھیل کنارے تھی اس لیے وہاں ٹھنڈک کا تاثر تھا۔ وسیم کے کم سے کم نصف درجن آدمی جھیل میں غوطے لگا رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی گیٹ پر موجود محافظوں نے گیٹ کھول دیا۔ میں ایک بار پہلے بھی یہاں آیا تھا مگر بہت تھوڑے وقت کے لیے۔ آج مجھے تفصیل سے حویلی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ پرانے طرز تعمیر کی لیکن خاصی عالی شان حویلی تھی۔ اس میں نچلے حصے میں دس بارہ بڑے کمرے تھے جن میں سے دو تو ہال نما تھے۔ اوپر بھی چھ سات کمرے تھے۔ پھر یہ خانہ تھا اور قیدی وہیں رکھے جاتے تھے مگر روانہ کی وجہ سے ان دونوں کو اوپر ہی حصے کے ایک کمرے میں رکھا گیا تھا۔

یہ بات مجھے اچھی لگی۔ رومانہ بے شک مرشد جیسے شیطان کی بیٹی تھی لیکن وہ عورت ہونے کے ناطے لائق احترام تھی۔ میں اور میرے ساتھی اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک کرنا تو ایک طرف رہا اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وسیم سادی کو لے کر جا چکا تھا۔ اس نے چار آدمی ساتھ لیے تھے اور باقی سب یہاں موجود تھے۔ چھاننی کے بعد اس نے مشکوک افراد کو نکال کر نئے آدمی رکھے تھے۔ ان کی تعداد دو درجن تھی اور یہ سب لڑنے مرنے والے تربیت یافتہ لوگ تھے۔ وسیم کی عدم موجودگی میں رئیس الدین نامی شخص ان کا انچارج تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کا خوشرو اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے نئے آنے والوں کا تعارف کرایا۔ سب مجھ سے ملنے کے مشتاق تھے اور بعض تو عقیدتمندانہ طور پر ملے۔ ملاقات کے مرحلے سے گزر کر ہم اندر آئے۔

یہاں بجلی تھی مگر لوڈ شیڈنگ کا سلسلہ جاری تھا جس کے تدارک کے لیے ایک طاقتور جنریٹر موجود تھا۔ اس لیے اندر اے سی چل رہے تھے۔ ہماری خاطر تواضع لٹی اور پیڑوں سے کی گئی۔ پھر جاسن اور شہتوت پیش کیے گئے جو حویلی کی پیداوار تھے۔ یہاں اعلیٰ درجے کے پھلوں کا ایک باغ بھی تھا۔ رئیس نے کھانے کا پوچھا لیکن میں نے فی الحال منع کر دیا اور رئیس سے پوچھا۔ ”ان دونوں کو کہاں رکھا ہے؟“

”اوپر جناب ایک بیڈروم دیا ہے۔ پورا خیال رکھ رہے ہیں۔“

”یہ اچھی بات ہے میں راشد سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی بلواتا ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک آدمی کو اشارہ کیا جو وہیں موجود تھا۔ ”اوپر جا کر راشد کو لے

آؤ۔“

وہ دس منٹ بعد راشد کو لے آیا۔ رئیس عقل مند آدمی تھا راشد کے آنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ راشد متفکر لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”پہلے تو مجھے تم کو ایک افسوسناک خبر سنانی ہے۔ تمہارے پاپا راشد علی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور وہ شدید زخمی

حالت میں اسپتال میں داخل نہیں۔“

”نہیں۔“ وہ بے ساختہ کھڑا ہو گیا۔ ”کب..... کیسے؟“

”یہ تو مجھے بھی علم نہیں ہے لیکن یہ واقعہ گزشتہ چوبیس گھنٹے کے دوران میں ہوا ہے۔ ارشد علی سے میں خود

مل کر آ رہا ہوں۔ اس کا آپریشن ہو گیا ہے اور وہ آئی سی یو میں ہے۔“

راشد کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔ ”یہ یقیناً مرشد کا کام ہے۔“

”جو تمہارا چچا اور سرسبھی ہے۔“ عبداللہ نے لقمہ دیا۔

”مت کہیں اسے میرا رشتہ دار۔“ اس نے بھڑک کر کہا۔ ”اگر پاپا کو کچھ ہوا تو میں.....“

”تم بھول رہے ہو وہ رومانہ کا باپ ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ ”کیا تم اس کی پروا بھی نہیں کرو

گے؟“

راشد کا لہجہ مدہم ہوا تھا مگر اس میں نفرت موجود تھی۔ ”وہ اپنے باپ سے نفرت کرتی ہے۔“

”کوئی لڑکی اپنے باپ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کرے بہر حال وہ اس کی موت گوارہ نہیں کرے گی۔“

میں راشد کو ٹیٹ کر رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اگر اسے مرشد کے خلاف موقع ملے تو وہ کس حد تک جاسکتا

ہے۔ اگر وہ اپنے سر کا کام تمام کر سکتا تھا تو یہ بھی اچھی بات تھی۔

”اس صورت میں، ہمیں رومانہ کو چھوڑ دوں گا۔“ اس نے حتمی انداز میں کہا اور پھر مجھ سے ملتی لہجے میں

”بولو۔“ ”آپ نے پاپا کو دیکھا وہ کیسے تھے آپ کی بات ہوئی ان سے؟“

”ہاں بات ہوئی اور ارشد نے بتایا کہ اس پر گولی مرشد نے چلائی تھی۔ وہ اپنے گروں سمیت تمہارے گھر

میں گھسا تھا اور رومانہ کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اسی دوران میں دونوں طرف سے گرما گرمی ہوئی اور مرشد نے

گولی چلا دی جو تمہارے پاپا ارشد علی کی ریڑھ کی ہڈی میں لگی۔ اس کا آپریشن ہو گیا ہے مگر اس کی حالت ٹھیک

نہیں ہے۔“

”میں اس کتے کو چھوڑوں گا نہیں۔“

”لیکن ایک حقیقت ہے جسے تم نظر انداز کر رہے ہو، مرشد بہت طاقتور ہے۔ اس کے پاس بے شمار عقل

کے اندھے مرید اور خطرناک اشتہاری مجرم ہیں جو اس کے اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کیا تم لوگوں کے پاس

اتنی قوت ہے کہ اس سے لڑ سکو۔“

راشد مرجھا گیا تھا۔ ”نہیں..... پہلے ہم بھی گدی کے معاملات میں شامل تھے تو ہماری بھی چلتی تھی لیکن

جب مرشد نے ہمیں بے دخل کیا تو ہماری طاقت بہت کم ہو گئی۔“

میں اس کی بات سمجھ رہا تھا، پہلے بے لگام اندھے مریدوں کی طاقت میں ان کا بھی شیر تھا، اسی طرح

گدی کی بے محابا آمدنی میں بھی انہیں ملتا تھا مگر اب وہ ان دونوں چیزوں سے محروم ہو گئے تھے لیکن اس کا مطلب

یہ نہیں تھا کہ وہ بالکل ہی گئے گزرے تھے۔ دولت کی ان کے پاس بھی کی نہیں تھی مگر ان کے پاس وہ ذہن نہیں تھا

جو مرشد کے پاس تھا اور جسے صرف اپنا مفاد عزیز تھا۔ اس پر وہ بھائی کو بھی قربان کر سکتا ہے اور بیٹی کو بھی، ورنہ اس

کی بیٹی کے لیے اس کے چچا کے گھر سے اچھا گھر اور کون سا ہو سکتا تھا۔ میں راشد کی بات پر چونکا وہ کہہ رہا تھا۔

”پلیز مجھے جانے دیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم قطعی محفوظ نہیں ہو، مرشد کے ہزاروں مرید تمہیں تلاش کر رہے ہیں اور مزید یہ کہ تمہارے پورے خاندان کو یعنی چچاؤں سمیت پورے خاندان کو مرشد نے برے انجام کی دھمکی دے دی ہے۔“

”خود اس کے برے دن قریب آرہے ہیں۔“ راشد نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ سمجھتا ہے کہ خاندان کو کاٹ کر خود اکیلے حکومت کر لے گا۔ یہ خاندان کی قوت تھی جو وہ اس مقام پر پہنچا۔“

”میں تم سے متفق ہوں لیکن فی الحال طاقت کا توازن اس کے حق میں ہے اور تم لوگوں کی بچت اسی میں ہے کہ اس سے دور رہو۔ ابھی تم لوگوں کو خود کو مضبوط بنانا ہے اور ایسے اتحادی تلاش کرنے ہیں جو مرشد کے خلاف تمہاری مدد کر سکیں۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”آپ بھی تو مرشد کے دشمن ہیں۔“

”ہاں لیکن فی الحال میں تم لوگوں کا اتحادی بھی نہیں ہوں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”ہمارے درمیان دشمنی نہیں ہے لیکن فی الحال دوستی بھی نہیں ہے۔“

”دوستی ہو تو سکتی ہے۔“

”تم ابھی بچے ہو..... ان معنوں میں نہیں..... کیونکہ تم اپنی مرضی سے شادی تک کر چکے ہو۔ مگر اپنے بڑوں کے آگے بچے ہی ہو۔ اس لیے تمہاری بات کی اہمیت نہیں ہوگی۔“

”آپ میرے بڑوں سے بات کر سکتے ہیں۔“

”ارشد علی نے اپنے چھوٹے بھائی اصراف کا نمبر دیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اسی کی اہمیت ہے؟“

راشد نے تائید کی۔ ”بالکل، ہم میں اصراف چچا ہی پاپا کے بعد اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ شروع دن سے مرشد کے خلاف تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے گدی میں اپنا حصہ برقرار نہ رکھا تو مرشد ایک دن ہمیں نکال باہر کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔“

”میں اصراف سے بات کرنے جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور اس کا نمبر دہرایا۔ ”کیا یہ اس کا پرانا نمبر ہے؟“

راشد نے سر ہلایا۔ ”خاص پرانا..... میرا خیال ہے ان کے پاس شروع سے یہی نمبر ہے۔“

میں نے اصراف کا نمبر ملایا۔ چند تیل کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ میں نے بلا تہید کہا۔ ”اصفر میں شہباز ملک بات کر رہا ہوں تمہارا یہ نمبر محفوظ نہیں ہے۔ میں جس نمبر سے کال کر رہا ہوں اس پر کوئی ایسا نمبر ایس ایم ایس کرو جو محفوظ ہو یعنی تمہارے استعمال میں نہ ہو۔“

”شہباز ملک۔“ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”تم بھائی جان سے ملنے سے گئے تھے۔“

”ہاں اسی نے مجھے تمہارا نمبر دیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نمبر بھی جو مگر اسی محفوظ نمبر سے بھیجنا اپنے نمبر سے نہیں۔“

میں نے کال کاٹ دی اور راشد کی طرف دیکھا۔ ”اس تک اطلاع پہنچ گئی ہے کہ میں ارشد سے ملا ہوں۔“

”یہ تو موبائل نمبر ہے یہ کیسے غیر محفوظ ہو سکتا ہے؟“ راشد نے تعجب سے پوچھا۔

”تم نہیں سمجھو گے اس کی آبروروشن تو اور آسان ہے خاص طور سے مرشد جیسے لوگوں کے لیے۔“ میں

نے کہا۔ ایک منٹ بعد ہی ایک اجنبی نمبر سے کال آنے لگی۔ میں نے کال ریسیو کی دوسری طرف اصرافری تھا۔

”بہت برا ہوا ہے۔“ اس نے بھرائے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے جانے کے بعد بھائی جان کی حالت بگڑ گئی

اور وہ.....“ اصرافری نے لگا تھا

میں نے بے ساختہ انا اللہ پڑھی تو راشد کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اضطراری انداز میں

میرے پاس آ گیا۔ میں نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے پاس بٹھالیا اور اصرافری سے کہا۔ ”مجھے سچ

افسوس ہو رہا ہے۔“

اصرافری نے خود پر قابو پاتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا۔ ”ہم اتنی مشکل میں ہیں کہ اپنے بھائی کی لاش بھی

لینے خود نہیں جاسکتے۔ کوٹھی سے باہر جانے والوں کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی ہے۔ دور کے کچھ رشتے دار

لاش لینے گئے ہیں۔“

”تم نے پولیس سے تحفظ مانگا ہے۔“

”اس علاقے کی پولیس تو مرشد کی غلام ہے یوں سمجھ لو کہ وہ اس کے درودی والے مرید ہیں۔ میں نے

ایک واقف کار ایس پی سے بات کی ہے ممکن ہے ہمیں جنازہ کے لیے پولیس گارڈ دیا جائے۔“

”تم نے مجھے بری خبر سنائی ہے لیکن میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔ تمہارا بھتیجا راشد میرے پاس ہے

اور بالکل محفوظ ہے۔“

”راشد تمہارے پاس ہے۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”کیا میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟“

”بالکل لو بات کرو۔“ میں نے موبائل راشد کو تھما دیا اور اس نے اصرافری سے بات کرتے ہی رونا شروع کر

دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ میں وہیں رہا لیکن اس کی دھاڑوں میں مداخلت نہیں کی۔ اسے اپنے

باپ کا سوگ منانے کا حق تھا۔ عبداللہ خاموش بیٹھا تھا آوازیں سن کر رکیں نے اندر جھانکا تھا مگر سب معمول کے

مطابق پا کر واپس چلا گیا۔ یعنی ہم آرام سے بیٹھے تھے۔ اس لیے راشد کا رونا دھاڑنا اس کے لیے بے معنی تھا۔

چند منٹ بعد راشد کا رونا سسکیوں میں بدل گیا۔ پھر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔

”چچا اصرافری کچھ کہہ رہے ہیں۔“

اصرافری نے مجھ سے کہا۔ ”یہ نادان لڑکا گھر آنے کی بات کر رہا ہے جو ان حالات میں بالکل بھی مناسب

نہیں ہے۔ مرشد کے کتے پاگلوں کی طرح اس کی اور رومانہ کی تلاش میں ہیں۔“

”میں تم سے متفق ہوں۔ اس کا جنازے میں جانا بالکل مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر

موبائل بند کر دیا۔

”نہیں میں اپنے باپ کے جنازے میں جاؤں گا۔“ راشد نے زور سے کہا اس کی آنکھیں اور ناک ذرا

سی دیر میں سرخ ہو گئی تھیں۔ ”میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“

”یہ تمہارے بڑوں کا فیصلہ ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”راشد کے بعد اب اصرافری اور دوسرے ہی

تمہارے بزرگ ہیں۔ کیا تم ان کا فیصلہ ماننے سے انکار کر رہے ہو۔“
اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ ”میں کتنا بد بخت بیٹا ہوں جو باپ کے جنازے کو کندھا بھی نہیں دے سکے گا۔“

”دنیا میں ایسے بہت سے واقعات ہوتے ہیں اور کندھا نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ تمہیں اپنے باپ سے محبت نہیں ہے۔ مرشد تمہاری جان کا دشمن ہو رہا ہے اسے معلوم ہے کہ تم جنازے میں شریک ہونے کی پوری کوشش کرو گے اس لیے اس کے قاتل وہاں موجود ہوں گے۔ اگر تم مارے گئے تو یہ مرشد کی ایک اور فتح ہوگی جب کہ تمہیں ابھی اس سے اپنے باپ کا انتقام لینا ہے۔“

”میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے دانت پر دانت جما کر کہا۔
”اس کے لیے ضروری ہے تم خود بھی زندہ رہو۔ مرشد میرے بھائی کا قاتل ہے۔ اگر میں تمہاری طرح جذباتی ہو کر اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا تو اب تک خود قبر میں ہوتا۔ میں بھی اپنے بھائی کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔“

”پر میں کیا کروں میرے اندر ایک آگ سی لگ گئی ہے۔“
”اے سنبال کر رکھو یہی آگ تمہارے کام آئے گی۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب تم آرام کرو اور ہاں مجھے امید ہے کہ رومانہ سے تمہارا رویہ تبدیل نہیں ہوگا۔ اس کا سوائے اس کے اور کوئی قصور نہیں ہے کہ وہ مرشد کی اولاد ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اگر نہیں کرتا تب بھی اتنا گھٹیا پن نہیں کر سکتا کہ اس کے باپ کا بدلہ اس سے لوں۔“

میں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ”فی الحال تم یہیں رہو باہر جانے سے گریز کرو یہ جن لوگوں کا سیٹ آپ ہے وہ اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ تم یہاں کی لوکیشن سے واقف ہو، میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“
”سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں اور رومانہ کمرے تک رہیں گے۔“

”گڈ یہاں تم کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اگر مرشد کی طرف سے سراغ لگانے کا ڈرنہ ہوتا تو میں تمہیں رابطے کے لیے کوئی موبائل بھی دے دیتا مگر یہ بہت رکی ہے۔ کئی بار مجھے بھی اسی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑا کہ موبائل ٹریس ہو گیا یا کال پکڑی گئی تھی۔ یہ وقت صبر سے گزارو اللہ نے چاہا تو تمہیں اس کا اچھا ہی صلہ ملے گا۔“
میں اور عبداللہ باہر آئے اور واپس شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔ ”تم نے مزید کوئی بندوبست کیا ہے۔ میری مراکسی اور رہائش سے ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”اوشہر آپارہ میں ایک فلیٹ لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ ایسے ہی پڑا ہوا ہے۔ فرنش ہے مگر چھوٹا ہے۔“

”کتنا بڑا ہے؟“

”بس دو کمرے ہیں اور ایک لاؤنج ہے۔“

”ہم تین کے لیے کافی ہیں۔“ میں نے کہا اور سفیر کو کال کی۔ ”وہاں سے نکل آ مگر خیال سے مگرانی ہو رہی

ہے۔ ڈاج دے کر آتا۔“

”کہاں آتا ہے؟“

”آپارہ کی طرف آجا۔“

”اور یہ جو سامان ہے یہاں۔“ سفیر نے کہا اس کا اشارہ اسلحے کی طرف تھا۔

”ہلکا پھلکا ساتھ رکھ لے باقی شاہ جی کے حوالے کر کے آجا۔“



شام کا وقت تھا۔ عبداللہ نے جناح سپر مارکیٹ کے پاس گاڑی روکی۔ دن کی گرمی کے بعد اب موسم بہتر تھا اور اسی وجہ سے مارکیٹ کے کھانے پینے والے حصوں میں رش شروع ہو گیا تھا۔ عبداللہ میرے اور اپنے لیے آئنسرکیم فالودہ لے آیا۔ اس وقت مجھے ایسی کسی ٹھنڈی چیز کی طلب ہو رہی تھی۔ ہم گاڑی میں ہی اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”کیا خیال ہے ان لوگوں کی مدد کی جائے؟“

”فی الحال صرف زبانی کلامی۔“ میں نے کہا۔ ”کہنے سے یہ ہمارے حلیف نہیں بن جائیں گے اور مسئلہ ہے گدی کے دشمنوں کا۔ مرشد نے اپنے عقیدت مندوں میں ہمیں گدی کا دشمن بنادیا ہے اس لیے جو بھی آئے گا وہ ہم سے دشمنی بھانے پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے ہم ان پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتے ہیں۔“

”میں سمجھ گیا۔“ عبداللہ بولا۔ ”ہمیں جو کرنا ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر کرنا ہے۔“

”بالکل، مرشد کا خاندان اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ ابھی ان پر مشکل آئی ہے تو یہ مظلوم بن رہے ہیں ورنہ ان کی فطرت بھی مرشد سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ جب گدی ان کے ہاتھ میں آئے گی تو یہ بھی وہی سب کریں گے جو مرشد کرتا آیا ہے۔“

”میرا خیال ہے ہمارے لیے ایک موقع ہوگا۔ مرشد کے گرگے جنازے کے موقع پر موجود ہوں گے اور ہم ان کو تازہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے عبداللہ کی بات پر غور کیا۔ ”تمہارا مطلب ہے ہمیں وہاں موجود ہونا چاہیے۔“

”ہمیں نہیں کیونکہ ہم جانے پہچانے لوگ ہیں۔ ہاں ہمارے آدمی ان کے لیے اجنبی ہوں گے وہی عام لوگوں کی طرح جنازے میں شریک ہو سکتے ہیں۔“

”ایسا ممکن ہے لیکن کسی گڑبڑ یا مردھاڑ کی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔“

”صرف اپنا بچاؤ۔“ عبداللہ نے تجویز کیا۔ ”الجھنے سے ان کے پکڑے جانے اور شناخت سامنے آنے کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”گڈ یہ تجویز قابل غور ہے۔“ میں نے کہا اور موبائل نکال کر اصغر علی کو کال کی۔ اس کی بجائے کسی اور نے کال ریسیو کی۔ ”اصغر سے بات کراؤ۔“

”آپ کون ہیں جی؟“ بولنے والے نے دیہاتی لہجے میں کہا۔

”ایس ملک۔“ میں نے جواب دیا اصغر سمجھ جاتا کہ ایس سے مراد شہباز ہے۔ وہ ایک منٹ بعد کال پر تھا

میں نے پوچھا۔ ”جنازہ کب ہوگا؟“

”پرسوں جیسے کے بعد دوپہر میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا تم آؤ گے۔“

”مرشد کا ہر آدمی مجھے پہچانتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا راشد سے بات ہو سکتی ہے اس کی ماں تڑپ رہی ہے۔“

”مجھے اس کے دکھ کا احساس ہے مگر یہ بہت رکی ہوگا۔ مرشد اس کی تلاش میں ہے اور ہماری ذرا سی بے احتیاطی سے وہ اس کا سراغ لگالے گا۔ دوسری بات یہ کہ اب میں اس جگہ نہیں ہوں، جب جاؤں گا تو راشد سے بات کرادوں گا۔“

”میں سمجھتا ہوں مگر بھابی یہ بات سمجھنے کو تیار نہیں ہے۔“

”اے بھلاتے رہو۔ راشد اور رومانہ جہاں ہیں وہ بالکل محفوظ ہیں۔“

”رومانہ۔“ وہ فرمایا۔ ”یہ سارا عذاب اس لڑکی کی وجہ سے آیا ہے۔“

”اس معاملے میں راشد برابر کا فریق ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ نادان لڑکا ہے۔ اسے اس لڑکی نے پھنسا دیا ہے۔ ہم نے راشد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر رومانہ کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔“ اصغر کے لہجے کا بغض بتا رہا تھا کہ وہ اور باقی خاندان رومانہ کے بارے میں اچھے خیالات نہیں رکھتا ہے۔

”بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“

”نہیں جواب ہوگا وہ دنیا دیکھے گی۔“ اصغر کا لہجہ خطرناک ہو گیا۔ ”ہم بھائی جان کی قبر کی مٹی سوکھنے نہیں دیں گے۔“

خواہش تو میری بھی یہی تھی کہ مرشد خاندان آپس میں لڑ مرے۔ لیکن زبانی کلامی میں نے اسے ٹھنڈا رہنے کو کہا۔ بہر حال وہ سمجھنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ جب وہ کہے تو ہم راشد کو اس کے حوالے کر دیں۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ظاہر ہے وہ اب قید میں نہیں ہے لیکن میں پھر کہوں گا وہ محفوظ جگہ ہے۔“

”میں بھی تب ہی سمجھوں گا جب اس کی حفاظت خود کر سکوں۔“ اصغر نے جواب دیا۔ ”شہباز ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”نی الحال یہ مشکل ہے کیونکہ میں خود چھپتا پھر رہا ہوں صرف مرشد نہیں میرے اور دشمن بھی ہیں۔“

”تم موقع نکال سکتے ہو۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”مرشد کا خاتمہ بہت ضروری ہے، تمہارے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔“

”یہ تو ہے لیکن میں غلت میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔“ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے تم مشورہ کر لو پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اسی لمحے موبائل نے بیل دی یہ سفير تھا اور اس نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔

”کہاں مصروف تھا میں دس منٹ سے کال کر رہا ہوں۔“

”بتاؤں گا، تو کہاں ہے؟“

”آپارہ پہنچ گیا ہوں، ایک ٹیکسی میں ہوں۔“

”بس تو اسی کے ساتھ جناح سپر آجا۔ ہم یہیں ہیں۔ عبداللہ کی گاڑی میں۔“

”آ رہا ہوں۔“ سفیر نے کہا اور کال کاٹ دی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ بھی وہاں سے نکل آیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ ایک ٹیکسی سے اتر اور سڑک پار کر کے پارک میں کھڑی ایک منی بجیر کی طرف بڑھا۔ یہ عبداللہ جیسی تھی مگر ہم تو مخالف سمت تھے میں سفیر کو کال کرنے جا رہا تھا کہ میری نظر ٹیکسی والے پر گئی اور میں چونکا۔ یہ وہی قلفی والا تھا جو میرے پیچھے آیا تھا۔ میں نے جلدی سے سفیر کو کال کی اور اس نے ریسپو کی کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ جیب خالی ہے اور اب اسے ہماری تلاش تھی۔ سفیر نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کہاں ہو؟“

”اتنی آس پاس مت دیکھ..... ٹو نگرانی کرنے والے کو ساتھ لگایا ہے۔“

سفیر چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”بیٹے یہی ٹیکسی والا تو نگرانی کر رہا تھا۔ پہلے قلفی پہنچ رہا تھا اور اب ٹیکسی والا بن گیا۔“

”تب ہی تو میں حیران ہوا کہ میں اتنی آسانی سے کیسے نکل آیا اور ٹیکسی والے کو دیران سڑکوں پر گھماتا رہا۔“ سفیر نے غصے سے کہا۔ ”مجھے کیا پتا تھا کہ میں نگرانی کرنے والے کو ہی ساتھ لے آیا ہوں۔“

”وہ بھی دل میں ہنس رہا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال واپس جا اور اسے گن پوائنٹ پر لے کر یہاں سے نکل۔“

”کہاں جاؤں.....؟“

”باہر نکل یا پھر اسے جیب میں منتقل کر لیں گے ہم تیرے پیچھے ہیں۔“

سفیر نے سر ہلایا اور دوبارہ ٹیکسی والے کی طرف بڑھا جو یہ ظاہر تو کسی گاہک کا انتظار کر رہا تھا مگر درحقیقت وہ سفیر کی نگرانی کر رہا تھا۔ سفیر نے اس سے کچھ بات کی اور دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گیا۔ ٹیکسی حرکت میں آئی اور عبداللہ نے جیب اسٹارٹ کی۔ ہم اس کے پیچھے روانہ ہوئے تھے۔ عبداللہ نے مجھ سے پوچھا۔ ”اس کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”اسے بھگوال پہنچانا ہے۔“

عبداللہ مسکرایا۔ ”آج کے دن ہی دوسرا ٹپ ہوگا۔“

”جگہ بری نہیں ہے یہاں تو بہت گری ہے۔“

کچھ دیر بعد ٹیکسی اسلام آباد کے جی سکس سیکٹر سے کشمیر ہائی وے اور مری ہائی وے کو ملانے والے لنک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر کچھ آگے راول ٹاؤن تھا۔ سفیر عقل مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہائی وے پر رش ہوتا ہے اور کسی بھی ہنگامی صورت حال میں فوراً پولیس آ جاتی ہے۔ اس لیے کوئی عام علاقہ ہی مناسب تھا۔ ٹیکسی راول ٹاؤن کے پاس سے ہوتی لکھوال کی طرف مڑ گئی اور پھر ایک مناسب جگہ رک گئی۔ مناسب یوں کہ وہاں سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں تھیں اور سڑک سنسان تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں منظر دھندلا رہا تھا۔ میں اور عبداللہ اتر کر ٹیکسی

تک آئے جہاں ڈرائیور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے بیٹھا تھا میں نے اسے دروازہ کھول کر نیچے کھینچ لیا۔ ”بیٹے اب آئے ہونا چکر میں۔“

سفر نے اسے پہلے ہی ہینڈ ز اپ کیا ہوا تھا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اس کے پاس سے ایک عدد پستول، ایک موبائل اور ایک چھوٹا سا واکر ٹاکی نما آلہ نکلا تھا۔ میں نے موبائل اور واکر ٹاکی دونوں کی بیٹریاں نکال لیں۔ اس کے علاوہ بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ اس کے پاس سے مزید کچھ نہیں نکلا تھا مگر مجھے خدشہ تھا کہ اس کے جسم میں بھی فاضلی کی طرح کوئی نشان دہی کرنے والا آلہ نہ چھپا ہو۔ فیکسی اس کی اپنی تھی کیونکہ بک میں اسی کا نام تھا اور اس کے پاس آئی ڈی کارڈ اور شناختی کارڈ بھی تھا۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کیونکہ اس قسم کے کام کرنے والے شناختی کاغذات لیے نہیں پھرتے ہیں۔ اس کا نام سید کرمان شاہ تھا۔ نقوش سے وہ کشمیری لگ رہا تھا۔ ہم نے اسے جیب کے پچھلے حصے میں بٹھایا۔ اس کی فیکسی لاک کر کے وہیں چھوڑ دی تھی۔ سفیر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہمارا رخ ایک بار پھر بنگوال کی طرف تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں جانتا ہوں تم کن کے لیے کام کرتے ہو۔ کیا تمہیں کسی قسم کا کوئی انجکشن لگایا گیا تھا؟“

اس کے چہرے پر ایک لمبے کو حیرت نظر آئی مگر اس نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ میں نے گہری سانس لے کر رئیس الدین کو کال کی۔ ”ایک بندہ لارہے ہیں اسے چیک کرنا ہے اس کے جسم میں کوئی بگ نہ ہو۔“

”کوئی بھی بگ ہو تو اسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آپ اسے لے آئیں۔“

مگر مجھے یہ کام رکس لگا تھا۔ اگر اس کے جسم میں موجود بگ ایکٹو تھا تو اس کی مدد سے آخری لوکیشن کا پتا کیا جاسکتا تھا میں نے رئیس سے کہا۔ ”تم بندہ سامان سمیت پیچھے سڑک پر بھیج دو ہم آرہے ہیں۔“

”جیسا آپ کہیں جناب..... بندہ ابھی دو منٹ میں نکلتا ہے۔“

سورج ڈوبنے کے بعد اندھیرا چھا رہا تھا۔ سمگلنگ ڈیم سڑک پر کچھ دیر بعد مخالف سمت سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ عبداللہ نے جیب سڑک کے کنارے روک لی تھی۔ آنے والی گاڑی سے وسم کے دو آدمی اترے۔ ان میں سے ایک نے ایک بریف کیس تھام رکھا تھا۔ ہاتھ ملانے کے بعد اس نے کہا۔ ”مجھے شمس کہتے ہیں جناب، کسے چیک کرنا ہے؟“

”اے۔“ میں نے کرمان کی طرف اشارہ کیا۔ ”شاید اسے انجکشن سے بگ لگایا گیا ہے۔“

”اگر وہ سنگٹل دے رہا ہے تو ایک منٹ میں پتا چل جائے گا۔“ شمس نے کہا اور بریف کیس کھولا جو اصل میں ایک قسم کا کمپیوٹر تھا۔ اسے آن کر کے اس نے ایک مائیک نما آلہ نکالا اور ہم سے کہا۔ ”سب اپنے موبائل اور دوسرے دائر لیس آلات بند کر دیں۔“

سب نے اپنے موبائل بند کر دیئے۔ شمس کرمان کو سڑک پر گاڑیوں سے ذرا دور لے گیا۔ وہ آلہ پھیر کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا وہ جسم کے جس حصے پر آلہ پھیر رہا تھا اس کا گراف کمپیوٹر کی اسکرین پر آتا جا رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے آلہ کرمان کے بائیں ہاتھ پر کیا اس کی کہنی سے ذرا نیچے ایک سرخ دھبہ روشن ہو گیا۔ شمس نے کہا۔ ”ویش اٹ..... بگ ہے۔“

عبداللہ نے کرمان کا بازو کھینچ کر سیدھا کیا اور شمس کے ساتھ آنے والے نے ایک چھوٹا لیکن نوکیلا چاقو

نکال لیا۔ ”کہاں ہے؟“

”مٹس نے انگلی سے رکھ کر بتایا۔ ”یہاں ہے۔“

اس کے ساتھی نے عبداللہ اور سفیر سے کہا۔ ”اے مضبوطی سے پکڑیں۔“

کرمان دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی چاقو کی نوک اس کی کھال میں اتری اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے کہ آواز نکلتی میرا ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا تھا۔ وہ بچل رہا تھا مگر تین افراد کی گرفت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چاقو والے نے ایک منٹ میں بگ تلاش کر کے نکال لیا۔ مٹس مارچ سے روشنی دکھا رہا تھا۔ خون آلود بگ سڑک پر گر ادیا یہ مشکل سے کلونچی کے دانے جتنا بڑا تھا۔ مٹس نے اسے آلے سے چیک کیا۔ میں نے اسے کہا۔ ”مزید چیک کرو ہو سکتا ہے اس کے جسم میں مزید بگ چھپائے گئے ہوں۔“

”میں چیک کرتا ہوں۔“ مٹس نے ایک چھوٹے سے پتھر سے بگ کو بھیل دیا اور فوراً ہی کپیوٹر کی اسکرین سے اس کے سگنل غائب ہو گئے۔ اس کے بعد مٹس نے اسے دوبارہ مکمل طور پر چیک کیا مگر اس کے جسم میں مزید کوئی بگ نہیں تھا۔ سفیر نے اپنا رومال کرمان کے بازو پر باندھ دیا۔ زخم معمولی سا تھا دو تین دن میں بھر جاتا۔ مٹس اور اس کا ساتھی اپنا سامان سمیٹ کر اپنی گاڑی میں چلے گئے اور ہم نے کرمان کو دوبارہ جیب میں بٹھایا اور حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ رئیس ہماری اتنی جلدی پھر آمد پر خوش تھا اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کرمان کا استقبال کیا اور ہم سے کہا۔ ”بہت دن سے فارغ بیٹھے تھے اب ذرا مصروفیت رہے گی۔“

”بالکل اسے خاص پروٹوکول دو۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”پوچھ گچھ ذرا دیر بعد کریں گے۔“

رئیس سمجھ گیا۔ ”ایسا تیار کروں گا کہ آپ سوال بعد میں کریں گے یہ جواب پہلے دے گا۔“

کرمان کو تہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ رئیس نے کھانے پر رکنے کا اصرار کیا اور ہم مان گئے کیونکہ وہ لوگ قبائلی انداز میں بکرے کی بھی بنارہے تھے۔ بکرا ہمیں سے خرید گیا تھا اور اس کی کھال اتار کر اندر سے سب نکال کر اس میں ابلے چاول بھر کر اسے زمین میں دبا کر اوپر انکارے دھکا دیئے گئے تھے۔ عام طور سے یہ ڈش رات میں کھیتی ہے مگر انہوں نے دن میں بنائی تھی اور رات کے کھانے تک یہ تیار ہو گئی تھی۔ بھی کے ساتھ اسی مرحوم بکرے کی باقیات کا کٹنا کٹ بھی بنایا گیا تھا جو تندوری نان کے ساتھ پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد تہوے سے شغل کرنے کے بعد میں نے رئیس سے پوچھا۔ ”گرفتار شدہ کا کیا کیا ہے؟“

”تہ خانے میں اس طرح الٹا لٹکا ہوا ہے کہ اس کے چاروں ہاتھوں پاؤں زنجیروں سے بندھے ہیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر دباؤ آ رہا ہے۔ یقیناً اب تک اس کا حشر ہو گیا ہوگا۔“

مجھے اس پوز کا ذاتی تجربہ تھا اور یہ بنا کسی تشدد کے اذیت دینے کا بہت ہی خوفناک طریقہ تھا۔ آدمی کو ایسی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ مرنے کی آرزو کرنے لگتا۔ میں سوچ سکتا تھا کہ کرمان کا کیا حشر ہوگا کیونکہ خاصی دیر ہو گئی تھی۔ تہوے نوشی کے بعد میں اور عبداللہ نیچے پہنچے۔ سفیر نے ایک پُر تکلف ڈنر کے بعد کسی ہنگامہ آرائی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اتنے اچھے ڈنر کا مزہ خراب ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تب تم رکو ہم ذرا مل کر آتے ہیں۔“

دن میں تہ خانہ یقیناً ٹھنڈا ہوتا ہوگا مگر رات کے وقت دسم ذرا گرم تھا۔ پھر رئیس نے اس کے

ایگزاسٹ فین بھی بند کرادیئے تھے۔ اٹے لٹکے کرمان کو یہ گرمی یقیناً بہت زیادہ لگ رہی تھی کیونکہ اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا اور اس کی ناک سے پسینہ ٹپ ٹپ کر رہا تھا ہمیں دیکھ کر وہ بلبلایا۔ ”خدا کے لیے میں مر رہا ہوں..... مجھے اتار دو۔“

”اتنی جلدی نہیں مرو گے تم۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”اتارنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔“

میں نے تائیدی۔ ”بشرطیکہ کچھ سوالوں کے جوابات بالکل درست دو۔“

”پوچھیں جی میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

”تم کس کے لیے ہماری جاسوسی کر رہے تھے؟“

”مجھے زاہد نے اس کام پر لگایا ہے۔“

”اور یہ زاہد کون ہے۔“

اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ ”آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کس نے بھیجا ہے۔“

”ہم اس شخص کو جانتے ہیں اس کے چھوٹے موٹے گرگوں کو نہیں۔ تمہارے جسم میں یہ چپ کس نے لگائی تھی۔“

”چپ کیا جی؟“

”وہ جو انکشن لگایا تھا اس کی بات کر رہا ہوں۔“

”پتا نہیں جی وہ آدمی زاہد کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے مجھے انکشن لگایا تھا۔“

”وجہ کیا بتائی؟“

”کوئی وجہ نہیں بتائی جی۔“ اس نے جواب دیا۔

”زاہد کون ہے؟“

”ادھر راجا بازار میں اس کا ڈیرہ ہے۔ بد معاش ہے، دکان والوں سے ہتہ لیتا ہے۔ ڈاکے بھی مارتا ہے۔“

میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو معمولی سا کوئی لفنگا ہے۔“

”اسے ماریں گولی ہم جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اسے بھی مار کر یہیں دفن کرتے ہیں۔“

”ہاں اسے کچھ اتا پتا تو ہے نہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”بے کار بندہ ہے اسے ٹھکانے لگاؤ۔“

وہ پھر بلبلایا۔ ”میرا قصور جی میں تو معمولی سا آدمی ہوں۔“

”تجھی بے کار ہو اگر کچھ جانتے تو ہم چھوڑنے کا سوچتے بھی۔“

عبداللہ نے پستول نکالا تو اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”ایک خاص بات ہے

جی..... میں نے بتائی نہیں تھی۔“

”کیا خاص بات ہے؟“

”وہ جی انکشن لگانے کے لیے مجھے ایک جگہ لے گئے تھے۔“

عبداللہ نے اس کے سر پر پستول کی نال ماری۔ اس نے ہاتھ ہاکا رکھا تھا مگر یقیناً اسے تار

ہوں گے۔ وہ سر جھٹک رہا تھا۔ جب اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو عبد اللہ نے کہا۔ ”پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔“

”میں کیسے بتاتا جی بہت ظالم لوگ ہیں، زاہد نے کہا تھا کہ میں نے اس بارے میں زبان کھولی تو مجھے تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن میرے بیوی بچوں کو ضرور کاٹ کر رکھ دیں گے۔“

”ہم بیوی بچوں کو تو کچھ نہیں کہیں گے مگر تمہیں ضرور مار کر گاڑ دیں گے۔“ عبد اللہ نے پستول لہرایا اس کی پرفارمنس قابلِ داد تھی۔ وہ کرمان کو اچھا خاصہ دہشت زدہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

”وہ تمہیں اسلام آباد لے گئے تھے۔“

وہ چونکا۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا۔“

”میں نے کہا نا ان کے بارے میں جانتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اسے ڈیوڈ شادالی کوٹھی کی لوکیشن بتائی۔ اس نے سر ہلایا۔

”بالکل مجھے یہیں لے گئے تھے۔“

”وہاں تم نے انجکشن لگانے والے کے علاوہ اور کس کو دیکھا تھا؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”میں نے وہاں ایک عجیب آدمی دیکھا۔“

”عجیب سے مراد؟“

”ویسے تو وہ لمبا ترنگا اور باڈی بلڈر ٹائپ کا تھا جی لیکن اس کے دونوں ہاتھ بہت لمبے اور کسی درخت کی شاخ کی طرح تھے۔“

میں چونکا۔ ”تمہارا مطلب ہے وہ ایب نارل قسم کا شخص تھا۔“

”نہیں جی بالکل نارل تھا۔ جب تک میں وہاں رہا وہ نگرانی کرتا رہا تھا جی..... اس کا انداز ہی بڑا خوفناک تھا۔ بولتا بھی تو لگتا ابھی پھاڑ کھائے گا۔“

وہ شاید ڈیوڈ شا کا کوئی محافظ تھا۔ میں نے سوچا اور اس سے مزید سوال کیے مگر اسے اس سے زیادہ علم نہیں تھا۔ میں نے نگرانی کو بلوا کر اس کی ٹانگیں کھلوادیں لیکن ہاتھ بدستور زنجیر سے بندھے تھے۔ وہ ڈھیر ہو گیا تھا کیونکہ اتنی دیر تک الٹا لٹکے رہنے کے بعد اس کی ریڑھ کی ہڈی عارضی طور پر مفلوج ہو گئی تھی۔ اسے کھانا پانی دینے کی ہدایت کر کے ہم اوپر آ گئے۔ عبد اللہ مایوس تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”ہو گا یا اتنی غلط کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے کہا۔ ہم اوپر آئے اور باہر باغ میں نکل آئے۔ یہاں شام اور رات ٹھنڈی تھی۔ آسمان سے اوس گر رہی تھی اور یہ بھی اچھی لگ رہی تھی۔ رئیس خدمت گزاری پر آمادہ تھا اس نے پھر ہمارے لیے تسی بنوائی۔ سفیر اندر خرائے لے رہا تھا۔ میں اور عبد اللہ رئیس کے ساتھ کپ شپ کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں حویلی کا گیٹ کھلا اور دو گاڑیاں اندر آئیں۔ ایک سے وسیم اترا دوسرے میں اس کے ساتھ جانے والے تھے۔ مجھ سے سلام دعا کر کے وہ اندر چلے گئے۔ وہ آج ہی واپس آ گیا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے بتایا کہ وہ شام تک میانوالی پہنچ گئے تھے۔

”بڑے ملک صاحب نے بہت اصرار کیا کہ میں رات کو رک جاؤں مگر مجھے یہاں کے معاملات کا خیال

تھا اس لیے ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔

”رک جاتے یا یہاں کا ہم دیکھ رہے ہیں نا۔“ میں نے کہا۔ ”اور جو بلی میں سب امن ہے۔“

”ہاں ماں جی سادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ انہیں اس کی بہت فکر تھی۔“

”ماں جی ایسی ہی ہیں، سب کی فکر کرنے والی اور سب سے پیار کرنے والی۔“

”کچھ چیزیں بھی لایا ہوں میں آپ کے لیے۔“ دیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”خاص لوگوں نے بھجوائی ہیں۔“

میں نے اپنے دلی تاثرات کو چہرے پر آنے سے روکا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سویرا نے کچھ بھیجا ہوگا۔ جب تک میں حویلی میں تھا ہر مہینے اس کی جانب سے کوئی نہ کوئی سوغات ملتی تھی۔ کبھی کڑھا ہوا کریم اور کبھی ہاتھ سے بنا ہوا سوئیٹر۔ میرے کبل اور کھیسوں کے کنارے وہی بنتی تھی۔ دیم گاڑی سے ایک بیک نکال لایا۔ ”اس میں ہے سب کچھ میں نے کھول کر نہیں دیکھا۔“

”دیکھ بھی لیتے تو کیا ہم میں کوئی پردہ تھوڑی ہے۔“ میں نے کہا اور لا پرواہی سے لے کر بیک گود میں رکھ لیا لیکن یہ سوچ کر میرا جسم سنسنا گیا کہ سویرا نے اسے اپنے ہاتھوں سے چھوا ہوگا اس میں سامان رکھا ہوگا اب میں اسے چھو رہا تھا۔ دیم اور عبداللہ بیک وقت منے تو میں چونکا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میں بے خیالی میں بیک پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ میں جھینپ گیا۔ ”نہس کیوں رہے ہو؟“

”ایسے ہی جناب۔“ دیم نے شرارت سے کہا۔ ”سنا ہے مجنوں کو لیلیٰ کا اونٹ بھی پیارا تھا۔“

”کتا۔“ میں نے تھج کی۔ ”اونٹ مجنوں کا تھا۔ اس لیے لیلیٰ کو پیارا ہوگا۔“

وہ کچھ دیر مجھے چھیڑتے رہے اور سچی بات ہے میں خود چھڑنا چاہتا تھا۔ محبوب کا ذکر کسی طور بھی ہو آدی کو برا نہیں لگتا چاہے وہ محبت کے معاملے میں مجھ جیسا انتہائی ریزرور رہنے والا بندہ کیوں نہ ہو۔ پھر میں نے کرمان کا بتایا تو ماحول نارل ہو گیا۔ دیم نے کہا۔ ”مجھے اس لیے بازوؤں والے کا سن کر تشویش ہو رہی ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟“

”میرا خیال ہے ڈیوڈ شا کا کوئی خاص محافظ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اس رتبے کے لوگ ذرا خطی بھی ہوتے

ہیں۔ اپنی حیثیت جتانے کے لیے ایسی چیزیں رکھتے ہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔“

”ہاں میرے نزدیک باڈی گارڈ وہ اچھا ہوتا ہے جو چلنے سے باڈی گارڈ نظر نہ آئے۔“

”جیسے امریکی صدر کے ہوتے ہیں، بالکل عام سے لیکن بہت چوکس اور ہوشیار رہنے والے۔“ عبداللہ

نے کہا تو دیم نے اس کی طرف دیکھا۔

”تم نے کہاں سے دیکھ لیے؟“

”فلموں میں۔“ عبداللہ نے سادی سے جواب دیا۔

”وہ حقیقت میں بھی اسے ہی ہوتے ہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”امریکی صدر کا خاص باڈی گارڈ اسٹاف

انتیس افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور ہمارے ہاں شاید انتیس سو افراد کا ہوتا ہے۔“

”اس کے باوجود امریکی صدر کی حفاظت کے لیے عوام کو تکلیف نہیں دی جاتی ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔
 ”ہمارے ہاں ہر قسم کے سرکاری کاموں کے لیے صرف عوام کو تکلیف دی جاتی ہے۔“ میں نے دوسری صورت حال پیش کی۔

ہماری اس گفتگو کے دوران وسیم کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے ہلایا۔ ”کس کی سوچ میں گم ہو؟“
 ”جودل کے پاس ہوتے ہیں مگر ذرا دور چلے جاتے ہیں۔“ اس بار عبداللہ نے اس کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی۔ مگر وسیم سنجیدہ رہا، اس نے کہا۔

”شہباز صاحب ہم ڈیوڈ شاکی یہاں موجودگی کو بہت ہلکا لے رہے ہیں۔“
 ”میرے خیال میں تو ہم پوری طرح محتاط ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں، ہم محتاط تو ہیں لیکن ہم نے اس پر باقاعدہ غور نہیں کیا کہ ڈیوڈ شا آپ کے آتے ہی یا آپ سے بھی پہلے یہاں کیوں آیا اور اب یہاں کیا کر رہا ہے؟“
 ”مرشد کا بیڑا غرق۔“ عبداللہ نے کہا۔

”نہیں وہ اگر اس کا بیڑا غرق کرنا چاہے تو اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ ڈیوڈ شا جیسے سازشی عناصر فضول کی انتقامی کارروائیوں کے چکر میں نہیں پڑتے ہیں۔ وہ مسئلے کی جزئی یعنی دشمن کو مٹانے دینے پر یقین رکھتے ہیں۔“

وسیم کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“
 ”مجھے یقین ہے وہ آپ کے چکر میں آیا ہے۔ مرشد کو سزا دینے کی بات وہ صرف آپ کو متوجہ کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ مرشد بہت زیادہ پھنس گیا ہے اور یوں سمجھ لیں کہ وہ دلدل میں دھنس جانے والا شخص ہے۔ اس پر توجہ دینا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔“
 ”تمہارا مطلب ہے مرشد اب اتنا خطرناک نہیں رہا ہے؟“
 ”بالکل..... اب وہ صرف ایک گولی کی مار رہ گیا ہے۔ یقین کریں اسے رونے والا بھی کوئی مشکل سے ملے گا۔“

”اس کے جو جاہل مرید ہیں؟“
 ”وہ سب منتشر ہو جائیں گے۔“
 ”تم مرشد کے چچا زادوں کو بھول رہے ہو جو گدی کے دعوے دار ہیں اور وہ بھی وہی کریں گے جو مرشد کرتا آیا ہے ہم سے دشمنی انہیں وراثت میں ملے گی اور وہ اسے نبھانے پر مجبور ہوں گے۔“
 ”تب تم نے کچھ سوچا ہے؟“

”ہاں میں سفر کے دوران یہی کام کرتا رہا۔ ایک تو میں نے سوچا ہے کہ مرشد کے خلاف اس کے چچا زادوں کو پوری حمایت کا یقین دلایا جائے اور معاملے کو تصادم تک لایا جائے۔“
 ”خدا کی قسم ہم نے بھی یہی سوچا ہے۔“
 ”ہم مسکرایا۔“ ہم سب ایک ہیں نا اس لیے مائنڈ پیچ کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حمایت صرف زبانی

کلامی ہو اور عملی مدد کی بھی جائے تو اس طرح کہ ہمارا نقصان نہ ہو۔ ہم جنگ میں یوں شامل ہوں کہ کنارے کنارے رہیں۔“

”یہ بھی سوچا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”ہمارے پاس راشد کی صورت میں ایک مہرہ ہے ہمیں اس پر عمل درآمد شروع کر دینا چاہیے۔“
میں نے وسیم کو تفصیل سے اصرار علی سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ وہ یہ جان کر بڑے جوش ہو گیا کہ ارشد علی مرشد کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ”بس تو جنگ کا اسلحہ تیار ہے صرف طبل بجانے کی ضرورت ہے۔“
”جیسے کے دن یعنی برسوں تک مدفن ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اس میں ہمارے آدمی شامل ہوں گے اور مرشد کے آدمیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”جنگ کا پہلا میدان تو یہی موقع ہو سکتا ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”لیکن وہاں بہت سے عام لوگ بھی ہوں گے۔“ عبداللہ نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”اگر اندھا دھند گولیاں چلیں تو نہ جانے کتنے لوگ مارے جائیں گے۔“

”کام ہوشیاری سے کیا جائے تو ایسا نہیں ہوگا۔“ وسیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے ارشد کے بھائیوں نے مرشد کے خلاف ایف آئی آر درج کرادی ہوگی۔“

”ابھی تک تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تب آپ اکسائیں اگر پولیس ایف آئی آر درج نہیں کر رہی تو وہ لوگ کورٹ میں جائیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”ایف آئی آر کٹ گئی تو مرشد کے گرد گھیرا تنگ ہو جائے گا۔“

وسیم درست کہہ رہا تھا۔ میں نے اسی وقت اصرار کو کال کی اور اس سے ایف آئی آر کا پوچھا۔ ”تم نے ارشد علی کے قتل کی ایف آئی آر درج کرائی ہے؟“

”مقامی پولیس اسٹیشن میں کوشش کی تھی مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ میں نے بتایا تاہم گھر سے نہیں نکل رہے، باہر مرشد کے آدمی گھات لگائے بیٹھے ہیں۔“

”تم لوگوں کو ہمت کرنا ہوگی اور پولیس کے بجائے تم کل کورٹ میں جاؤ، وہاں سے ایف آئی آر کے آرڈر لو۔ اس سے کیس مضبوط ہو جائے گا۔“

”ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”سوچو تم کرگزرو۔“ میں نے اکسایا۔ ”ایک بار مرشد کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی تو پھر اس کی طرف سے تم لوگوں کے خلاف کچھ کرنا آسان نہیں رہے گا۔“

”میں بھائیوں سے مشورہ کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اگر تمہیں کورٹ تک جانے کے لیے سکیورٹی درکار ہے تو میرے آدمی حاضر ہیں۔“

”مجھے فیصلہ کرنے کے لیے وقت دو۔“ اصرار نے کہا تو اس کا لہجہ کمزور تھا۔ اس وقت مجھے لگا کہ اس پر کوئی دباؤ آیا ہے۔ شاید دوسرے بھائی دشمنی کے اس سلسلے کو دراز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ جب چند گھنٹے پہلے میری اس سے بات ہوئی تھی وہ بہت جارحانہ موڈ میں تھا۔ میں نے اسپیکر فون آن کیا ہوا تھا اس لیے وسیم اور عبداللہ سن

رہے۔ کال ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

”ایسا لگ رہا ہے یہ لوگ ڈر رہے ہیں۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ وسیم نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ”کیا خیال ہے کیوں نہ انہیں بہادر بنایا

جائے۔“

”مطلب؟“

”یہ چاروں بھائی درگاہ سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے احاطے میں الگ الگ کونٹیوں میں رہتے ہیں۔“ وسیم نے کہا اور لوکیشن واضح کی۔ ”آس پاس زرعی زمین ہے وہ بھی ان کی ملکیت ہے۔ شمال میں تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے پر پہاڑیاں ہیں۔“

”وہاں سے کارروائی کی جاسکتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل میں اسی کا ذکر کر رہا ہوں ہمارے پاس بہترین اسناپرائفل ہیں۔“

”نشاندہ کون ہوگا؟“

”اطراف میں چھپے ہوئے مرشد کے گرگے۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہم ان کے خلاف کارروائی کریں گے اور

وہ ان لوگوں کے خلاف۔“

”تب یہ کام آج ہی ہونا چاہیے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”بہت دن ہو گئے ہیں کچھ کیا نہیں ہے۔“

”خدا کا خوف کر دیا رہی تم نے ایک بندے کو اچھا خاصا دہشت زدہ کیا ہے اور اس کا سر بھی بجایا تھا۔“

میں نے اسے یاد دلایا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میرا اشارہ اس طرف ہے۔“ عبداللہ نے ہاتھ سے پستول کا اشارہ کیا۔

”تب تیاری کرو۔“ وسیم نے کہا۔

”تم تھکے ہوئے آئے ہو آرام کرو میں اور عبداللہ دیکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”شہباز صاحب یہی تو اپنا آرام ہے۔“ وسیم مسکرایا۔ ”سادی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے

آرام ہی آرام تھا، اب ذرا کھولوں گا۔“

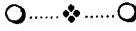
”دین ایاز کے گیران میں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بڑے کام کی گاڑی ہے۔“

”اس کے بغیر بھی ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ وسیم نے کہا اور اندر جاتے ہوئے بولا۔ ”میں اپنے آدمیوں

کو تیار کرتا ہوں۔“

عبداللہ اور ریکس اس کے ساتھ چلے گئے ان کے جانے کے بعد میں نے بیگ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک نیا سلا ہوا سفید کرتہ شلوار تھا۔ کرتہ ہاتھ سے کڑھا ہوا تھا۔ ہاتھ سے کڑھے ہوئے رومال تھے۔ گڑ اور گندم سے بنی نکلیاں تھیں۔ مکی کے گڑ میں بھنے دانے تھے۔ یہ سب مجھے پسند تھے۔ میں نے ایک رومال نکال کر جیب میں رکھ لیا۔ یہ سب سویرا کی پسندیدہ خُش کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ میں یہ سب یہاں نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے بیگ منی عجبر و میں رکھ دیا۔ میرا دل بے اختیار مچلا کہ سویرا سے بات کروں مگر میں نے دل کو تھپکا کہ موقع نہیں ہے۔ یہاں سے کال کرنے کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شا کو اس جگہ کا علم بھی ہو جائے گا۔ جیسے اسے فیض آباد والی

کوٹھی کا پتا چل گیا تھا اس لیے میں دل مار کر رہ گیا۔



وسیم کے آدمی اتنے منظم تھے کہ دس منٹ میں سات افراد پوری تیاری کے ساتھ حویلی کے پورچ میں موجود تھے۔ ان سب نے ٹی شرٹس کے نیچے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ فی الحال اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا مگر وہ گاڑیوں میں موجود تھا۔ میں نے اور عبداللہ نے بھی بلٹ پروف پہنا۔ گرمی میں یہ خاصا چھتا لیکن گولی کے زخم کے مقابلے میں یہ چھین کچھ بھی نہیں تھی۔ اسلحے کے علاوہ وسیم اس مہم کے لیے خصوصی سامان الگ سے ایک بڑے سوٹ کیس میں لایا تھا۔ ہم سب دو گاڑیوں میں سوار ہوئے۔ ایک پرانے ماڈل کی ملٹری جیپ تھی جس کا پچھلا حصہ جو عام طور سے کینوس سے بنا ہوتا ہے اس میں فولادی تھا۔ اندر نشستیں لگائی گئی تھیں۔ دوسری پوشو ہار جیپ تھی۔ یہاں ایک ٹویٹا ڈبل کیبن اور ایک بڑی ڈانچ پک پک آپ تھی۔ مگر ان کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں ہم تینوں آگئے جب کہ وسیم کے آدمی ملٹری جیپ میں تھے۔ دونوں گاڑیاں کچے اور ناہموار راستوں پر چلنے میں بے مثال تھیں۔ وسیم نے ایک نقشہ نکالا اور اسے سامنے پھیلایا۔ اس نے اندر کی روشنی آن کر دی تھی۔

”اس طرف سے ایک راستہ مرشد کے اڈے کی طرف جاتا ہے۔ کچا ہے مگر برائیں ہے، ہاں بارش ہو جائے تو بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ دو کلومیٹر کے بعد ہمیں کچی سڑک مل جائے گی لیکن اس کی وجہ سے ہمیں مری ہائی وے کا چکر نہیں کاٹنا پڑے گا۔ ہم براہ راست اس کے علاقے میں نکلیں گے۔ وہیں ان چچا زادوں کی رہائش ہے۔“

”بس تو پھر چلو۔“ میں نے کہا۔ ذرا نیو وسیم کرتا اس نے اشارت کی اور آگے بڑھائی۔ گیٹ پر موجود گاڑوں نے پٹ کھولے اور دونوں گاڑیاں باہر آ گئیں۔ ہم مری ہائی وے سے مخالف سمت روانہ ہوئے۔ پانچ منٹ بعد وسیم نے جیپ سڑک سے کچے راستے پر موڑ لی۔ یہ کچی سڑک اونچے نیچے ٹیلوں اور چھوٹے پہاڑوں کے بیچ سے بل کھاتی گزر رہی تھی۔ رات کی وجہ سے رفتار نہایت سست تھی اور عملاً دونوں گاڑیاں پیدل کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ عبداللہ نے خود کو لڑھکنے سے بچاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تو ہم صبح پہنچیں گے۔“

”صرف بیس منٹ کا راستہ ہے۔“ وسیم نے کہا اور اس کا کہنا درست ثابت ہوا۔ بیس منٹ سے بھی پہلے دوسری پختہ سڑک پر لپکے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ سچی اور لٹی کا خمار اس راستے نے اتار دیا تھا اور اب جسم کے ساتھ ذہن بھی چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ سب نے سڑک آنے کے بعد سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر ابھی عشق کے امتحان ختم نہیں ہوئے تھے۔ مخالف سمت میں چند منٹ کے سفر کے بعد وسیم نے دوبارہ گاڑی کچے میں اتار دی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں راستہ ناہموار تھا مگر میدان سے گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں گھنے درختوں کے جھنڈ تھے اور اکثر جگہوں پر جھاڑیاں تھیں۔ لوگ یہاں اپنے مویشی چراتے تھے۔ کہیں کہیں اکا دکا زرعی زمین بھی تھی۔ پھر روشنیاں نظر آئیں تو ہم چوکنہ ہو گئے کیونکہ یہ روشنیاں مرشد کے اڈے یعنی نام نہاد درگاہ کی تھیں۔ مگر وہ ہم سے بہت دور اور جنوب مشرق میں رہیں۔ ہم ان سے کتر آ کر شمال کی طرف بڑھے۔

”بس ایک کلومیٹر دور ہے اب۔“ وسیم نے کہا تو میں حیران ہوا۔ یہ راستہ تو واقعی بہت مختصر ثابت ہوا تھا ورنہ اسلام آباد ایک پریس دے سے گزر کر آنے میں اس سے تین گنا وقت اور پانچ گنا فاصلہ لگ جاتا۔ درمیان

میں ایک خشک پہاڑی نالہ آیا مگر اس میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا ہم آرام سے دوسری طرف نکل آئے۔ پھر ایک احاطہ دکھائی دیا۔ وسیم نے اس سے بھی دوری رکھی۔ ”یہ ہے ان چاروں بھائیوں کی رہائش گاہ۔“

”جواب تین رہ گئے ہیں۔“ عبداللہ نے تصحیح کی۔ ”مگر ان کی آل اولاد کی تعداد خاصی ہے۔ میرے علم کے مطابق کے چاروں بھائیوں کے ملا کر کوئی چودہ بیٹے اور شاید اتنی ہی بیٹیاں ہیں۔“

”مگر مرشد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میری اطلاع کے مطابق اس کے تین بیویوں سے کوئی چھ سات بیٹے اور دس کے قریب بیٹیاں ہیں۔ ناجائز اولادوں کا خود اسے بھی پتا نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر اس کے سارے بیٹے چھوٹے ہیں شاید سب سے بڑا چودہ برس کا ہوگا۔“

وسیم نے جیب روک دی اس نے روشنیاں پہلے ہی بند کر دی تھیں اور پچھلی جیب والوں نے بھی اس کا اتباع کیا تھا۔ مجھے خیال نہیں آیا کہ وہ خاصی تاریکی میں کیسے ڈرائیو کر رہا ہے جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں پر نائٹ ویژن نظر آئی۔ وہ اس کی مدد سے سب صاف دیکھ رہا تھا۔ جیب رکتے ہی اس نے ہمارے لیے نائٹ ویژن نکالیں۔ انہیں پہن کر ہم بھی سب صاف دیکھ سکتے تھے۔ بس ماحول ہرا ہرا ہو رہا تھا۔ دوسری جیب سے بھی سب اتر آئے تھے اور انہوں نے بھی نائٹ ویژن پہن لی تھیں۔ وسیم نے جیب کے پچھلے حصے میں موجود اسلحہ سب میں تقسیم کیا۔ ہر آدمی کو ایک خود کار رائفل، اس کے تین میگزین، ایک پستول اور اس کے دو میگزین ملے تھے۔ منتخب افراد کو ہینڈ گرنیڈز بھی دیئے۔ پھر دوسری جیب سے تین عدد خاصی بڑی نال والی تین عدد اسٹیررائفلیں اتاری گئیں۔ ان پر ایسی جدید دوربین نصب تھی جو رات کی تاریکی میں بھی دکھائی تھی۔ آخر میں وسیم نے سب کو جدید قسم کے ریڈیو دیئے جن کا یونٹ سامنے بلٹ پروف پر لگ جاتا اور مائیک کان پر آ جاتا۔ اس کی مدد سے ہم سب آپس میں رابطے میں رہتے۔

وسیم کے چار آدمی مع عبداللہ کے جیپوں کے آس پاس رک گئے۔ ان کا کام جیپوں کی حفاظت کرنا اور اس طرف آنے والوں سے نمٹنا تھا۔ میں وسیم اور تین افراد جنہوں نے اسٹیررائفلیں اٹھا رکھی تھیں ہمارے ہمراہ پہاڑی کی طرف بڑھے۔ وسیم نے ایک بیگ اضافی اٹھا رکھا تھا۔ نائٹ ویژن کی وجہ سے بہت آسانی ہو رہی تھی کیونکہ ہم تقریباً تاریکی میں بغیر ٹھوکر کھائے آرام سے چل رہے تھے۔ دس منٹ بعد ہم پہاڑی پر تھے جو نیم دائرے کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ وسیم نے ایک آدمی کو اسٹیررائفل سمیت ایک جگہ مورچہ بنانے کو کہا۔ باقی دو آدمیوں کو ایک اور جگہ مورچہ بنانے کے لیے چھوڑا اور ہم پہاڑی کے سب سے بلند حصے میں آئے۔ یہاں سے احاطہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اندر روشنیاں تھیں اور ان روشنیوں میں وہاں ٹھٹھلے مسخ افراد دکھائی دے رہے تھے۔ مگر فاصلہ پانچ سو گز سے زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ واضح نہیں تھے۔ وسیم نے اسٹیررائفل لگانے سے پہلے بیگ سے ایک ذرا بڑی دوربین نکال کر میرے حوالے کی۔

”ذرا جائزہ لیں۔ عینک ہٹا دیں یہ بھی نائٹ ویژن موڈ رکھتی ہے۔“

میں نے دوربین کو نائٹ ویژن موڈ پر کیا تو سارا منظر کھنچ کر آنکھوں میں آ گیا۔ میں نے احاطے کا جائزہ لیا۔ وہاں چار مختلف گونڈیوں کے گردسات یا آٹھ مسلح افراد تھے لیکن مجھے شبہ ہوا کہ وہ کرائے پر ملنے والے سیورٹی گارڈز تھے۔ انہوں نے وردیاں کچھ ایسی ہی پہنی ہوئی تھیں۔ گونڈیاں تاریک تھیں وہاں اکا دکا روشنیاں تھیں مگر

احاطہ اچھا خاصا روشن تھا۔ اس کی چار دیواری تقریباً دس فٹ اونچی تھی اور اس پر کوئی تین فٹ کی خاردار بار لگی ہوئی تھی۔ احاطے سے باہر آنے جانے کے لیے ایک ہی گیٹ تھا۔ یہ بند تھا اور اس پر دو افراد تھے لیکن وہ اندر تھے۔ اتنی دیر میں وسیم نے رائفل سیٹ کر لی تھی۔ اس کا ٹرائی پوڈ تھا کیونکہ اسے خالی ہاتھوں سے چلانا مشکل تھا۔ اس کا جھکنا زوردار ہوتا۔ میں نے کہا۔ ”ان لوگوں نے عام قسم کی سیوریج رکھی ہے۔ یہ مرشد کے بد معاشوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔“

وسیم نے اپنی دور بین سے دیکھا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ ایجنسی سیوریج گارڈ ہیں۔ بالکل بے کار اور

نا اہل۔“

ہم ابھی تک احاطے کا معائنہ کر رہے تھے اور آس پاس دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے ذرا دور بین گھمائی تو میری توجہ احاطے کے عقبی حصے میں موجود چند افراد کی طرف گئی جو دیوار کے پاس جمع تھے۔ میں نے دور بین ایڈجسٹ کی تو وہ واضح ہو گئی۔ وہ اس طرح سے تھے کہ یہاں سے واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اگر وہ دیوار سے چپکے ہوتے تو شاید بالکل دکھائی نہ دیتے مگر وہ لا پرواہی سے دیوار سے ذرا الگ چل رہے تھے اس لیے میری نظروں میں آ گئے۔ میں نے گنا تو ان کی تعداد چھ نکلی۔ وہ سب مسلح تھے۔ پھر ان میں سے ایک شخص آگے آیا جس نے کوئی بھاری چیز اٹھا رکھی تھی اور وہ دیوار کے قریب بیٹھ کر کچھ کرنے لگا۔ میں نے وسیم کو متوجہ کیا۔ ”دیکھنا یہاں کچھ لوگ ہیں۔“

”یہ تو گڑبڑ ہے۔“ اس نے دیکھنے کے بعد کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ حملہ کرنے آئے ہیں۔“

”صرف چھ بندے؟“

”نہیں اور ہوں گے۔ آپ آس پاس دیکھیں میں ان کو چیک کرتا ہوں۔“ وسیم نے اپنی رائفل ان کی طرف گھمائی اور میں احاطے کے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ جلد انکشاف ہوا کہ احاطے کا تقریباً چاروں طرف ہی کم و بیش دو درجن افراد موجود تھے ممکن ہے ان کی تعداد اس سے زیادہ ہو اور وہ سب پوری طرح مسلح مگر چپے ہوئے تھے۔ اچانک وسیم بولا۔ ”میرے خدایہ کوئی بہت بڑا بم لگا رہے ہیں۔ یہ تو دیوار کے ساتھ موجود کوئی کو بھی تباہ کر دے گا۔“

”انہیں روکو۔“ میں نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ”ورنہ نہ جانے کتنے بے گناہ مارے جائیں گے۔“

وسیم نے کان پر لگے ہیڈ سیٹ پر انگلی رکھی اور اپنے اساتذہ پر زورداروں کو حکم دیا۔ ”احاطے کے آس پاس دیکھو اور جو شخص نظر آئے اسے اڑا دو۔“ حکم دیتے ہوئے وسیم خود بھی نشانہ لے رہا تھا اور پھر اس نے سانس روک کر ٹریگر دبا دیا۔ میرا خیال تھا کہ گولی چلنے کا دھماکہ بہت زیادہ ہوگا مگر کوئی دھماکا نہیں ہوا اس کے بجائے شخص کی ہلکی سی آواز آئی۔ رائفل سائلنر ڈبھی۔ میں نے دور بین گھما کر دیکھی۔ وسیم نے جس کا نشانہ لیا تھا وہ گر گیا تھا اور وہی بم لگا رہا تھا۔ اس کے ساتھی بدحواس ہو کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے کسی سمت اندھا دھند فائرنگ کی۔ پورا علاقہ اس کے چلائے برسٹ سے گونگ اٹھا۔ وسیم نے فوراً اس کے پاس والے کو نشانہ بنایا۔ میں دور بین گھما کر دیکھ رہا تھا۔ وسیم کے آدمیوں نے نشانے لگانا شروع کر دیے تھے۔ میں نے ایک منٹ میں کم سے کم تین افراد کو گرتے دیکھا تھا۔ دوسری طرف سے بدحواس مسلح افراد نے یہ جانے بغیر کہ ہم کہاں

ہیں اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔

اس بار ایسا لگا جیسے میدان جنگ سج گیا ہو۔ گولیوں کے شعلے بلندی سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ احاطے میں موجود افراد فائرنگ کی آوازوں سے پریشان ہو کر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ گیٹ کی طرف آئے اور کچھ عقبی سمت گئے جہاں سے سب سے پہلے فائر کی آواز آئی تھی۔ کوشیوں کی روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ وسم نے تیسرے آدمی کو نشانہ بنایا تھا کہ اچانک ہی احاطے کی طرف سے بے پناہ تیز اور چکا چوند کرنے والی روشنی نمودار ہوئی اور دھماکے کی آواز ہم تک کچھ دیر سے پہنچی تھی۔ وسم نے بم لگانے والے کو مار گرایا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ بم کسی اور نے اڑا دیا تھا۔ بم اتنا طاقتور تھا کہ اس کی شکاں و بوقاتی دور سے بھی محسوس ہوئی تھی۔ جہاں دھماکہ ہوا تھا وہاں اتنا بڑا شعلہ لٹکا جو دس بارہ سینکڑ تک برقرار رہا تھا اور اس دوران میں ہمارے لیے اس طرف دیکھنا مشکل ہو رہا تھا میں نے دور بین کا نائٹ ویژن موڈ ختم کیا اور پھر آنکھوں سے لگایا تو ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔

اس طرف نہ صرف احاطے کی دیوار بارہ تیرہ گز تک صاف ہو گئی تھی بلکہ اس کوٹھی کا بڑا حصہ بھی منہدم ہو گیا تھا جس کے ساتھ بم لگا تھا۔ اس طے سے دھڑا دھڑ شعلے اٹھ رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جو لوگ باہر موجود تھے وہ بھی اس بم کا شکار ہو گئے تھے۔ وسم کا بھی یہی خیال تھا کیونکہ وہ سب پاس ہی تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہ تو بچ بچ کا محاذ چھڑ گیا ہے۔“

”مگر یک طرفہ ہے جناب، یہ لوگ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے اب یہ کام ہمیں ہی کرنا ہوگا۔“ وسم نے کہا اور ایک فائر کیا۔ ”یہ چوتھا گیا۔“

”اتنے ہی تمہارے آدمیوں نے بھی مار گرائے ہیں۔“

”یعنی دشمن کی نصف نفری صاف ہو گئی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کم سے کم چار بم کا نشانہ بنے ہیں۔“

میں نے دور بین سے احاطے کے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کھیتوں میں کئی کی فصل تھی مگر وہ زیادہ بلند نہیں تھی اس میں کھڑا آدمی فوراً نظر میں آتا اس لیے وہاں موجود لوگ لیٹے ہوئے تھے اور اب اس پہاڑی کی سمت گولیاں برسا رہے تھے مگر ہم ان کی رنچ سے باہر تھے۔ البتہ مجھے عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کی فکر تھی۔ میں نے دور بین سے ان کے آس پاس کا جائزہ لیا اور فوراً ہی مجھے تین افراد اس طرف ریگتے دکھائی دیئے وہ ان سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھے میں نے ریڈیو پر کہا۔ ”عبداللہ تین افراد تمہاری طرف آرہے ہیں۔ دو سو گز کی دوری پر شمال مشرق کی طرف سے۔“

”ہم ان سے ٹھٹے ہیں۔“ عبداللہ نے کہا۔

اب میں نے رہنمائی کا کام سنبھال لیا۔ میں افراد کو تلاش کرتا اور اسنا پھر زکو بتاتا۔ رائفل دور بین کو ایک حد سے زیادہ حرکت دینا مشکل تھا اور اس کا کیوئس بھی وسیع نہیں تھا بہت صاف دکھائی تھی لیکن محدود جگہ دکھائی تھی۔ اسی دوران میں درگاہ مرشدیہ کی طرف سے گاڑیوں کی روشنیاں نمودار ہوئیں اور وہ تیزی سے اس طرف آ رہی تھیں۔ میں نے وسم کو خبردار کیا اور اس نے اس طرف موجود اسنا پھر کو حکم دیا کہ ان گاڑیوں کو ناکارہ کر دے۔ اسنا پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ میں نے دور بین گاڑیوں کی طرف کی آگے والی ایک کھلی جیب تھی جس میں

بد معاشوں کے سے انداز میں کوئی درجن بھر اسلحہ بند سوار تھے اور وہ خاصی رفتار سے آرہی تھی۔ اچانک اس کا اگلا دایاں ٹائر برسٹ ہوا۔ وہ گھوم کر مڑی اور سڑک پر قلابازیاں کھانے لگی۔ کچھ افراد اچھل کر باہر گرے اور ان کی بچت ہوگئی کیونکہ جو چپ میں تھے ان کا حشر ہو گیا تھا میں نے ایک سرٹک کر باہر گرتے دیکھا تھا۔ دوسری گاڑی جو ایک لکڑی فور وہیل تھی اس نے رفتار کم کی اور اسی وجہ سے اٹلنے سے بچ گئی۔ اسناہر نے اس کا ٹائر بھی اڑا دیا۔ ابھی وہ احاطے سے ایک کلومیٹر دوڑ گئیں۔

بیشتر افراد کے مارے جانے کے بعد اب بچے کچھے بھاگ رہے تھے اس لیے وسیم نے فائرنگ روک دینے کا حکم دیا۔ میری توجہ احاطے کی طرف تھی۔ وہاں اب زیادہ مسلح افراد نظر آرہے تھے۔ یقیناً کچھ گاڑیوں کو ٹھیسوں کے اندر بھی ہوں گے وہ باہر نکل آئے تھے اور پھر اصفر، اس کے بھائی جیتے بھی مسلح ہو کر باہر آئے تھے۔ ان کو بالکل علم نہیں تھا کہ کیا ہوا ہے؟ وہ ٹوٹی دیوار کے پاس تھے اور تباہ شدہ کونٹھی میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر آگ نہایت شدید تھی۔ یقیناً کونٹھی میں بچ جانے والے افراد نکال لیے گئے تھے اور جو نہیں آسکے تھے ان کے بچنے کا امکان مشکل نظر آ رہا تھا۔ اتنا بڑا دھماکا، فائرنگ اور پھر کم و بیش دو درجن افراد کی ہلاکت معمولی واقعہ نہیں تھی جلد یا بدیر یہاں پولیس کی آمد یقینی تھی اور اس سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا تھا۔

درگاہ مرشدیہ کی طرف سے مسلح افراد کی یہ طور ملک آمد ثابت کرتی تھی کہ احاطے پر حملہ مرشد کے آدمیوں نے کیا تھا۔ وہ بم اڑانے میں کامیاب رہے تھے لیکن اس کے بعد یہ حملہ مکمل طور پر ناکام رہا تھا۔ حملہ آوروں کو بھاری جانی نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا تھا۔ پہلے آنے والے افراد میں سے نصف مارے گئے تھے اور کئی شدید زخمی تھے۔ ملک کے لیے آنے والی ایک گاڑی تباہ اور اس میں موجود افراد مارے گئے تھے یا شدید زخمی تھے۔ دوسری گاڑی والے بچ گئے تھے مگر انہوں نے اگلے قدموں درگاہ کا رخ کیا تھا۔ پھر احاطے والے بھی اب ہوشیار اور مسلح تھے اس لیے امکان کم تھا کہ ان پر پھر حملہ ہو سکے گا۔ اب ہمارا یہاں سے نکل جانا ہی مناسب تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”پیک اپ کرو۔“

وسیم نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور اسناہر رائل نقل فولڈ کرنے لگا۔ اسے سمیٹ کر ہم نیچے اترنے لگے۔ دس منٹ بعد سب گاڑیوں کے پاس جمع تھے اور روانگی اختیار کر رہے تھے۔ ہم اسی راستے سے واپس جاتے۔ اس بار بھی احتیاطاً دونوں جیپوں کی روشنیاں بند رکھی تھیں۔ جب تک ہم جھانڑیوں تک پہنچ گئے اور پھر روشنیاں آن کر کے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ ویسے دیکھ لیتا تو کوئی ہمارے پیچھے نہ آتا مگر اس سے یہ پتا چل جاتا کہ ہم اس طرف سے آئے تھے۔ میں نے موبائل نکال کر چیک کیا مگر اس پر سگنل نہیں تھی۔ سگنل ہمیں آگے سڑک پر ملے اور میں نے وہ نمبر ملایا جس پر اصفر سے بات ہوئی تھی۔ کال خاصی دیر بعد کسی اور نے ریسپونڈ کی اور دھشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”کون ہے کس سے بات کرنی ہے۔“

”ایس ملک..... اصفر سے بات کرو۔“

”ادھر آگ لگی ہے تجھے بات کی پڑی ہے۔“ اس نے چلا کر کہا لہجے سے وہ کوئی ملازم لگ رہا تھا۔

”بکواس بند کرو..... میں اسی سلسلے میں اصفر سے بات کرنا چاہتا ہوں اگر تم نے ایک منٹ میں بات نہ

کرائی تو نتیجے کے خود ذمے دار ہو۔“

دھمکی سے زیادہ وہ میرے لہجے سے ڈر گیا تھا۔ ”اچھا جی کرانا ہوں۔“

کچھ دیر بعد اصرار لائن پر تھا۔ ”شہباز ملک تم.....“

”نام مت لو۔“

”یہاں قیامت گزر گئی ہے۔“ وہ بھی وحشت زدہ تھا۔ ”اصغر اپنی بیوی اور دو بیٹوں کے ساتھ مارا گیا

ہے۔“

”اصغر کون ہے؟“

”میرا چھوٹا بھائی۔“ وہ رونے لگا تھا۔ ”مرشد نے ہمارا سنا دیا ہے۔“

یہ خاندان جس طرح بنا تھا اور اس مقام تک پہنچا تھا اس کا مقدر ہی بتا ہی تھا۔ مگر میں نے رکی ہمدردی

کی۔ ”مجھے افسوس ہے ہم ذرا دیر سے آئے اور مرشد کے آدمی اس وقت تک ہم لگا چکے تھے۔“

اصغر چونکا۔ ”تم؟..... کب آئے؟“

”تمہارا کیا خیال ہے باہر حملہ آوروں کو تمہارے ان گارڈز نے روکا ہے جو کسی کام کے نہیں ہیں۔ باہر

مرشد کے آدمیوں کی کم سے کم ڈیڑھ درجن لاشیں موجود ہیں۔ اگر تم لوگ ہمت کرو تو انہیں دیکھ سکتے ہو۔ مرشد

ان لاشوں کو واپس حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے گا کیونکہ یہ اس کے خلاف ثبوت ہوں گی۔ اگر وہ ایسا

کرنے میں کامیاب رہا تو اس کے بعد اس کے لیے اپنی گردن بچانا بہت آسان ہو جائے گا۔ میری بات سمجھ

رہے ہوتا؟“

”ہاں سمجھ رہا ہوں۔“

”مرشد کا منصوبہ بری طرح ناکام رہا۔ میرا خیال ہے وہ آج ہی تم سب کا خاتمہ چاہتا ہوگا۔ اس کی حالت

زخمی سانپ کی سی ہے جو واپس بل میں گھس گیا ہے۔ اسے یہ ڈر بھی کھائے جا رہا ہوگا کہ دور و نزدیک جو حقیقی

درگا ہیں ان کے سجادہ نشین اس نوزائیدہ درگاہ کا پول کھول سکتے ہیں۔ اس کا اثر اس کی سیاست پر بھی پڑے

گا۔ اب اسے مہلت دی تو وہ محنت یاب ہو کر پھر حملہ کرے گا۔“

”تب ہم کیا کریں؟“

”ہمت کرو اور باہر نکل کر اپنے علاقے کا کنٹرول سنبھالو۔ لاشوں کو اپنی تحویل میں لے لو اور ان کی

تصویریں اور ویڈیو بھی بنالو۔ یہ کام پولیس کی آمد سے پہلے کر لو کیونکہ پولیس بھی مرشد کی غلام ہے ان کا بھروسہ

نہیں ہے کہ وہ سرے سے لاشیں ہی غائب کر دے۔“

”باہر خطرہ ہے۔“

”پہلے بھی تم یہ سوچ کر اندر بیٹھے رہے اور کیا ہوا۔ یقین کرو اگر ہم صرف دس منٹ کی تاخیر سے آتے تو وہ

تم سب کو مار چکے ہوتے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ مرشد کے آدمی یہاں آ رہے ہیں۔“

”اس کے آدمیوں میں ہمارے جاسوس شامل ہیں ان سے ہمیں اطلاعات ملتی ہیں۔“

”تب تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”انتا بڑا نقصان ہوا ہے ہمارا۔“

”جیسے تم ابھی جت کر رہے ہو اسی طرح اس وقت بھی یقین نہیں کرتے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ وقت ضائع کیے بغیر یہاں آ جاؤں۔ میرے آنے سے تم سب بچ گئے ورنہ افسوس کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتے۔ اب ہم وہاں سے نکل آئے ہیں اس لیے اب جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے اور اس کا فیصلہ بھی تمہیں ہی کرنا ہے۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔

”یہ دبو آدمی ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”اور ارشد اسے سب سے جذباتی قرار دے رہا تھا۔“ میں ہنسا۔ ”اگر یہ ایف آئی آر ہی درج کرا دے تو اسے ہی بہت سمجھوں گا۔“

”یہ کسی صورت مرشد کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”اگر مقابلہ کر سکتے تو گدی سے یوں بے دخل نہ ہوتے۔“ عبداللہ بولا۔ ”شاید اس نے آپ کا شکر یہ تک ادا نہیں کیا۔“

”اس جیسے لوگ کسی کا شکر یہ ادا کرنا نہیں جانتے ہیں۔“

”بہر حال ہم نے مرشد کو ایک جھٹکا اور دیا ہے۔“ وسیم خوش تھا۔

”اس کے پاس لڑنے مرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔“ عبداللہ نے مایوسی سے کہا۔ ”کل اس کے پاس درجنوں اور آ جائیں گے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ایک لاش دس لوگوں کو ڈرا دیتی ہے اور مرشد کے آدمی کون سے جانثار ہیں۔ جو جج جج کے عقیدت مند ہیں وہ تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ انہیں محدود طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن ان پر انحصار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے مرشد کے پاس جو بد معاش ٹولہ بچا ہے وہ اب اپنے بارے میں ضرور سوچے گا۔“

”یہی میں بھی کہہ رہا ہوں پچھلے چند مہینوں میں ہم ان میں سے پچاس ساٹھ کو ٹھکانے لگا چکے ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہمارے چند آدمی مارے گئے۔ یقیناً اس فرق کو محسوس کیا ہوگا۔“

”تربیت یافتہ افراد کی کمی آسانی سے پوری نہیں ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس معاملے میں مرشد کو اچھی خاصی زک پہنچی ہے اگر اس کے خلاف ایف آئی آر بھی آ جائے تو اس پر مزید دباؤ آ سکتا ہے۔“

”بالکل۔“ وسیم نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ”ایک بار مرشد کی اپنے شریکوں سے کھل کر جنگ ہو جائے تو اس کی آڑ میں اس کا صفایا کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔“

ہم نے کوئی حکمت عملی بہت زیادہ بحث مباحثے کے بعد نہیں بنائی تھی مگر حالات و واقعات اور پھر ہماری ذہنی ہم آہنگی سے ایک حکمت عملی جیسے خود بخود طے ہوتی چلی گئی۔ مرشد کو درندے کی طرح ہکا کر اس طرف لایا جائے جہاں اس کا شکار آسان اور محفوظ ہو۔ یہ حکمت عملی کام کر رہی تھی۔ حالات ہمارے لیے مؤافق تھے۔ آدھ گھنٹے بعد ہم واپس کوہلی پہنچ گئے تھے۔ مشن پوری طرح کامیاب رہا تھا اور ہم نے صرف چند سو گولیاں خرچ کر کے دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ آج کی رات یقیناً مرشد کے لیے بہت بھاری تھی۔ راستے میں اس پر بھی بحث ہوئی تھی کہ اصغر اور اس کے خاندان والوں کو ہم اپنی سیوریٹی دین گے میں نے مخالفت کی اور یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ میرا موقف تھا کہ ہم براہ راست کسی بھی معاملے میں ملوث نہیں ہوں گے۔ ہاں پس پردہ رہ کر اس

آگ کو بھڑکانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ وسیم کا جو آدمی درگاہ میں تھا وہ بہت کم رابطہ کرتا تھا کیونکہ اس میں خطرہ بہت زیادہ تھا اگر وہ پکڑا جاتا تو اس کی موت بہت عبرتناک ہوتی۔ اس لیے وہ محتاط تھا۔

ہم واپس آئے تو رئیس الدین بے تابی سے ہمارا منتظر تھا اس نے گیٹ کھلتے ہی ہماری جیب کے پاس آکر کہا۔ ”شہاب کا پیغام آیا ہے میں نے ریکارڈ کر لیا ہے۔“

ہم اندر حویلی کے کنٹرول روم میں آئے جہاں جدید کمپیوٹرز کی مدد سے نہ صرف موصلاقی سسٹم بلکہ سکیورٹی سسٹم کو بھی کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ یہاں ہمہ وقت ایک فرد موجود رہتا تھا۔ رئیس کے اشارے پر آپریٹر نے ریکارڈر چلایا۔ شہاب نے غلٹ میں یہ پیغام ریکارڈ کر لیا تھا اور وہ رکے بغیر بول رہا تھا۔ ”یہاں شام سے ہلچل مچی ہے۔ مسلح افراد تیار کر رہے ہیں اور ایسا لگتا ہے وہ کہیں قتل و غارت گری کا بہت بڑا منصوبہ بنا کر جا رہے ہیں۔ اس وقت درگاہ سے تمام غیر متعلقہ لوگوں کو ہٹا دیا گیا ہے اور عام ملازمین کو بھی ان کی رہائش گاہوں تک محدود کر دیا ہے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں بھی اپنے کمرے میں ہوں لیکن میں نے چوری چھپے یہ سب دیکھ لیا ہے۔ میں براہ راست رابطہ نہیں کر سکتا کیونکہ میرے ساتھ ایک آدمی اور رہتا ہے اس لیے موقع پا کر وائس ایس ایم ایس کر رہا ہوں۔“

”یہ تو پرانی رپورٹ ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایک پیغام اور بھی ہے۔“ رئیس نے جواب دیا اور آپریٹر کو دوسرا پیغام پلے کرنے کو کہا۔ شہاب کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

”ابھی دس منٹ پہلے درگاہ میں ہنگامی حالات نافذ کر دیئے گئے ہیں۔ آدھا گھنٹا پہلے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں آئی تھیں اس کے بعد درگاہ سے دو گاڑیاں مزید سولہ سترہ افراد کو لے کر گئی تھیں۔ مگر دونوں گاڑیاں واپس نہیں آسکیں صرف سات افراد واپس آئے ہیں اور یہاں بہت شدید خوف و ہراس پایا جا رہا ہے۔ درگاہ کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ ہر طرف مسلح افراد لگے ہیں مگر پہلے جانے والوں میں سے بھی چند ہی افراد واپس آئے ہیں۔ سنا ہے کہ کوئی تین درجن لوگ مارے گئے ہیں یا شدید زخمی ہیں۔ ان کا کچھ نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ مرشد کی..... گئی ہے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”ایک خیال ہے کیوں نہ میڈیا کو اس معاملے میں شامل کر دیا جائے۔“

”وہ کیسے؟“

”میرے پاس تقریباً سارے چینلوں کے نمبر ہیں۔ میں کال کرتا ہوں۔“

”تجویز اچھی ہے میڈیا کے آنے سے حقائق چھپانا مشکل ہو جائے گا۔“ وسیم نے تائید کی۔

”تب نفاذ کرو، وقت گزر رہا ہے۔“

عبداللہ چینلوں پر کال کر کے یہ اطلاع دینے لگا۔ پھر اس نے ایک واقف کار صحافی کو بھی کال کر کے بتایا۔ وہ اس کے اعتماد کا آدمی تھا اور عبداللہ کا نام کسی صورت سامنے نہیں لاتا۔ اس بھاگ دوڑ نے تمھارے تائید نہیں تھا

مگر مجھے اب غسل کی خواہش ہو رہی تھی۔ رئیس نے مجھے ایک کرا دکھایا۔ اس کے ساتھ انچ ہاتھ بھی تھا۔ سفیر برابر والے کمرے میں تھا۔ جب تک میں نہا دھو کر تازہ دم ہو کر آیا۔ مختلف چینلوں پر بریکنگ نیوز آنا شروع ہو گئی تھی۔ مگر فی الحال کوئی نیوز ٹیم جائے وقوع پر نہیں پہنچی تھی۔ چینل والے پولیس انتظامیہ سے بھی رابطہ کر کے واقعے کے بارے میں پوچھ رہے تھے مگر ان کی طرف سے فی الحال کسی بیان سے انکار کیا جا رہا تھا۔ پولیس ترجمان کا کہنا تھا کہ ابھی تصدیق کی جا رہی ہے اور پولیس کی ٹیمیں جائے وقوع پر روانہ کر دی گئی ہیں۔

عبداللہ نے اپنے واقف کار صحافی کو بریف کر دیا تھا کہ یہ اصل میں مرشد خاندان کی گدی کے پیچھے آپس میں لڑائی کا شائبہ تھا۔ اس لیے کئی چینلوں پر اس کا ذکر بھی آ رہا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی مرشد اور اس کے خاندان کا نام یوں اچھلنے پر۔ آدھے گھنٹے بعد میڈیا ٹیمیں بھی علاقے میں پہنچ چکی تھیں۔ پولیس نے اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر عام لوگوں اور میڈیا ٹیموں کو آگے جانے سے روک دیا۔ مگر ان کے کیمرا مین اپنا کام کر رہے تھے۔ تباہ شدہ کوٹھی دکھائی جا رہی تھی اور کئی لاشیں بھی ٹی وی اسکرین پر نظر آ چکی تھیں۔ پھر اصرار اس کے خاندان والوں کو پتا چلا کہ میڈیا آگیا ہے تو انہوں نے باقاعدہ پریس کانفرنس کا اعلان کر دیا۔ پولیس نے میڈیا اور صحافیوں کو اندراج کرنے کی اجازت نہیں دی۔

اصغر، اس کا بچپن والا بھائی اکبر اور چند دوسرے افراد بھی باہر میڈیا کے سامنے آئے اور انہوں نے نہایت جذباتی انداز میں بتایا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے مرشد پر ارشد علی کے قتل اور اس حملے کا واضح الزام لگاتے ہوئے اس کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کو کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر پولیس نے ایف آئی آر درج نہیں کی تو وہ عدالت میں جائیں گے۔ اس پریس کانفرنس نے وہ کام کیا جو میرے خیال میں دس ایف آئی آر بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ اصغر نے الزام لگایا کہ آس پاس مرشد کے سکہ بند بد معاشوں کی لاشیں موجود تھیں اور اسے خدشہ تھا کہ پولیس ان لاشوں کی شناخت بدل دے گی۔ نیز یہاں درگاہ سے آنے والی دو تباہ شدہ گاڑیاں بھی تھیں۔ اصغر نے میڈیا کو ان کی نمبر پلیٹ اور لاشوں کی تصاویر بھی دیں جو انہوں نے پولیس کی آمد سے پہلے لے لی تھیں۔ ساتھ ہی اس نے مرشد جیسے سفاک اور قاتل شخص کے خلاف حکومت سے سکيورٹی طلب کی تھی۔ اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

”ہم کب سے سکيورٹی مانگ رہے تھے۔ اگر حکومت پہلے ہماری بات سن لیتی تو ہمارے خاندان کو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔“

آدھے گھنٹے کی اس پریس کانفرنس نے مرشد کو اچھا خاصا بے نقاب کر دیا تھا۔ اب اس کے لیے اپنے جرائم سے انکار آسان نہیں ہوتا۔ اس پریس کانفرنس نے پولیس کو بھی مشکل میں ڈال دیا تھا اب وہ چاہنے کے باوجود حقائق نہیں چھپا سکتی تھی۔ جب میڈیا اور پریس نے پولیس افسران کو گھیرنا شروع کیا اور ان سے سوالات کیے تو ان کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے ہر سوال کا جواب گول کر کے جان چھڑائی تھی۔ دسیم نے کہا۔ ”یہ تو لگ رہا ہے کہ پولیس مرشد کو بچانے کے لیے پوری طرح کمر بستہ ہے۔“

”کیونکہ وہ ان کا مالی باپ جو ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”حکومت انہیں اتنی تنخواہ نہیں دیتی ہے جتنی خیرات مرشد دے دیتا ہے۔ مگر مرشد کے لیے جان چھڑانا آسان نہیں ہوگا۔ میری بھی یہی خواہش ہے کہ پولیس

ایف آئی آر درج نہ کرے اور امفر اینڈ پارٹی عدالت چلی جائے۔“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وسم نے جمائی لی۔ ”دیکھتے ہیں کہ اب کیا ہوتا ہے۔“



کچھ دیر بعد سب آرام کے لیے اٹھ گئے تھے۔ وسم نے آج ڈبل سفر کیا تھا اور میں بھی تھک گیا تھا۔ حویلی فیض آباد والی کوٹھی کی طرح آراستہ اور پُرغیش نہیں تھی۔ یہاں صرف نشست گاہ اور چند کمروں میں فرنیچر تھا۔ رہائش کے لیے مخصوص کمروں میں وہی آسانی رکھی گئی تھی کہ فرش پر انڈرلے کے ساتھ قالین ڈال لیے تھے۔ اسی پر سوتے، اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے تھے۔ کمروں میں اے سی فٹ تھے اور ہم دل کھول کر ان کا استعمال کر رہے تھے۔ میں تکیہ لے کر لیٹ گیا۔ اب تک جو ہوا تھا میں اس سے خاصا مطمئن تھا اس لیے خشکی نے ذرا دیر میں تھپک کر مجھے سلا دیا۔ صبح ذرا جلدی آنکھ کھلی تو تازہ دم تھا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ منہ پر پانی مار کر میں باہر لان میں نکل آیا۔ موسم کسی قدر خشک تھا اور ہوا چل رہی تھی۔ مگر سورج نکلتے ہی موسم گرم ہو جاتا۔ جون کا تیسرا ہفتہ ختم ہونے کو تھا اور ابھی تک صبح معنوں میں مون سون کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

بچن کے ساتھ ہی ڈائننگ روم تھا اور ناشتہ چل رہا تھا۔ سفیر اٹھ گیا تھا۔ عبداللہ اس کے ساتھ تھا اور اسے رات کی روداد سنارہا تھا۔ سفیر نے مجھے دیکھ کر سر ہلایا۔ ”میری ذرا سی نیند میں تم لوگوں نے اتنا کچھ کر دیا۔“
 ”کیونکہ ڈو سورہا تھا۔“ میں نے سر ہلایا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میز پر خالص لاہوری ناشتہ تھا یعنی کلچے اور سری پائے۔ رات کا کھانا پیا ہضم ہو گیا تھا۔ سفیر نے کہا۔

”رات مانی کا میٹج آیا تھا۔ وہ خیریت سے ہے اور ہماری خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہے۔“
 ”میں سوچ رہا ہوں آج اس کے اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کر دوں۔“ عبداللہ بولا۔
 ”یہ اچھا ہے اسے کہنا نہ پڑے۔“ میں نے تائید کی۔ ”ٹی وی پر کوئی تازہ آپ ڈیٹ آئی ہے۔“
 ”پولیس نے مرشد کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ وسم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”میری ابھی امفر سے بات ہوئی ہے اور وہ اب عدالت جا رہے ہیں۔“
 ”گذرات کے واقعات کی کیا خبر ہے؟“

”پولیس کے مطابق اس واقعے میں چوبیس افراد مارے گئے جن میں سے سات کا تعلق امفر سے تھا۔ سترہ افراد نامعلوم ہیں۔ زخمیوں کی تعداد انیس ہے۔ سات افراد امفر کے ہیں اور باقی.....“
 ”نامعلوم۔“ میں ہنسا۔ ”پولیس مردوں سے اقبال کر لیتی ہے اور یہاں زخمی بھی نامعلوم ہیں۔“
 ”ٹی وی اور اخبارات نے بڑے پیمانے پر کوریج کی ہے لاشوں اور زخمیوں کی تصاویر بھی دی ہیں جو امفر نے نہیں مہیا کی تھیں۔“

”باہر مارے جانے والوں کے بارے میں امفر اینڈ پارٹی نے کیا بیان دیا ہے؟“
 ”ان کا کہنا ہے کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتے دھماکے اور فائرنگ کے بعد ان کی طرف سے بھی فائرنگ ہوئی تھی۔ اس لیے ہو سکتا ہے مارے جانے والے اس فائرنگ کا نشانہ بنے ہوں۔“
 ”.....“ وہ بیان ہے۔“

”مرشد اس پر یقین نہیں کرے گا۔“ وسیم نے کہا۔ ”پولیس بھی نہیں کرے گی کیونکہ ایک درجن سے زیادہ افراد اسنا پیر زکاشکار ہوئے ہیں اور اصغر کے لوگوں کے پاس اس قسم کے ہتھیار نہیں ہیں۔“

”نہ کریں لیکن وہ ہم پر الزام نہیں لگا سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب ذرا اصغر سے بات کر لی جائے۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اصغر کو کال کی۔ وہ کورٹ میں موجود تھا اور اپنے وکیلوں کے ہمراہ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کرنے جا رہا تھا۔ میں نے اسے بڑھاوا دیا۔ ”یہ ضروری ہے۔ مرشد حد سے گزر گیا ہے اور اسے لگام دینا ضروری ہے۔“

”ایک بار اس کے خلاف ایف آئی آر درج ہو جائے تو میں دیکھتا ہوں یہ کیسے چلتا ہے۔“ اصغر نے پھر بڑھک ماری۔

”بالکل ایک بار ایف آئی آر درج ہو جائے۔“ میں نے کہا۔ حالانکہ مجھے اندازہ تھا کہ مرشد جیسا آدمی قتل کر کے رکتے ہاتھوں پکڑا جائے اور اس کا کیس سالوں عدالت میں چل رہا ہے گا مگر اسے سزا نہیں ہوگی۔ ہمارا نظام انصاف کرپٹ، کمزور اور سست ہے۔ دولت مند مجرم اس سے فائدہ اٹھ کر بچ نکلتے ہیں۔ میں نے اس سے بات کر کے موہاں رکھا تھا کہ اس کی بیل جی اور اجنبی نمبر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے فوری بیل کاٹ کر موہاں آف کر دیا۔ وسیم نے پوچھا۔ ”کس کی کال تھی؟“

”اجنبی نمبر تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ ڈیوڈ شا کی کال تھی۔“

وسیم کے ساتھ سفیر بھی چونک گیا۔ ہم نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ سفیر نے کہا۔ ”ڈیوڈ شا کو یہ نمبر کیسے ملا ہو گا؟“

”کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے اصغر اور اس کے گھر کے نمبر ٹریک کر لیے ہوں گے، میں نے اصغر کو کال کی اور اسے میرا نمبر مل گیا۔“ میں کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ”اب میرا یہاں رکنا ٹھیک نہیں ہے۔“

”کہاں جائیں گے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”عبداللہ نے آپارہ میں ایک فلیٹ لیا ہے وہاں جائیں گے۔ عبداللہ اور سفیر میرے ساتھ ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے آپ راتے میں اس سے بات کر سکتے ہیں۔“

ہم وہاں سے نکل آئے اس بار مری روڈ کا رخ کیا اور عبداللہ راول چوک پر اتر گیا۔ اس نے مجھے ایک چابی تھمائی اور فلیٹ کا پتا بتایا۔ ”میں ڈرامائی والا کام نمٹا کر آتا ہوں۔“

”کوٹھی کی طرف مت جانا۔“ میں نے اسے خبردار کیا۔ ”اس کی نگرانی ہو رہی ہوگی۔“

”نہیں مجھے بس بینک سے کام ہے۔“ عبداللہ اتر کر ایک طرف کھڑی ٹیکسیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سفیر نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی اور ہم آپارہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سورج نکلنے ہی دن شدید گرم ہو گیا تھا اور گاڑی کا اسے سی آن تھا ورنہ ہمارا حشر ہو رہا ہوتا۔ سفیر نے سرد آہ بھری۔

”کیا در بدری ہے، کہیں سکون سے چند گھنٹے گزارنا نصیب نہیں ہوتا ہے۔“

”شکر کر زمین کے اوپر پھر رہے ہیں ایسے غبیث دشمنوں کے ہوتے ہوئے زمین کے نیچے نہیں ہیں۔“
 ”یہ بھی ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ ”ڈیوڈ شا کو کال کرو۔“
 ”گاڑی کہیں روک لے۔ اگر وہ ٹریفک کر رہا ہوگا تو سمت سے بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

سفیر نے جیب ایک کنارے درختوں کے سائے میں روک لی۔ اس نے انجن آن رہنے دیا تھا تاکہ اسے ی کام کرتا رہے۔ میں نے موبائل آن کیا اور اسی نمبر کو مایا جس سے کال آرہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک گورے نے کال ریسپوکی۔ اس کا لہجہ گواہی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ شا سے بات کرادو۔“
 ”تم کون ہو؟“ وہ غرایا۔

”وہی جسے ڈیوڈ شا کال کر رہا تھا۔ جلدی کرو میرے پاس وقت نہیں ہے۔“
 اس بار اس نے توقف کیا اور چند لمحے بعد بولا۔ ”پانچ منٹ بعد کال کرو۔“ اس نے کہتے ہی لائن کاٹ دی۔ میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور سفیر کی طرف دیکھا۔
 ”ڈیوڈ شا ہوشیاری دکھا رہا ہے۔ اس نے پانچ منٹ بعد کال کرنے کو کہا ہے۔“
 سفیر نے سر ہلایا۔ ”تاکہ سگنل سے لوکیشن پتا چلا سکے۔ شہباز مجھے تشویش ہو رہی ہے ڈیوڈ شا کچھ زیادہ ہی بچے پڑ رہا ہے۔“

”یہاں سے چل۔“
 سفیر نے عقل مندی کی اور گاڑی مخالف سمت میں موڑ دی۔ پانچ منٹ میں ہم تین کلومیٹر ز دور آگئے اور میں نے پھر ڈیوڈ شا کو کال کی۔ اس بار بھی اسی گورے نے ریسپوکی اور تقریباً دو منٹ کی تاخیر سے لائن پر آیا۔ میں نے استہزاء انداز میں کہا۔ ”لائن فون کے لیے آپریٹر ہوتے ہیں تم نے موبائل فون کے لیے بھی آپریٹر رکھا ہوا ہے۔“

اس نے میری بات نظر انداز کر کے بلا تمہید کہا۔ ”شہباز تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔“
 ”میں نے کیا اچھا نہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔ ویسے میں سمجھ گیا تھا اس کا اشارہ گزشتہ رات والے واقعے کی طرف تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ فاضلی اور اس کے معاملات سے الگ رہو۔“
 ”میں نے اس دن کے بعد سے فاضلی کی صورت نہیں دیکھی اس کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”میرا اشارہ مرشد اور اس کے کزنز کے درمیان لڑائی کی طرف ہے۔“
 ”میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔“

”تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”تم نے اصغر علی کو کال کی تھی۔“
 ”بالکل کی تھی کیونکہ وہ بھی مرشد کا دشمن ہے میں نے خیریت معلوم کرنے کے لیے کال کی تھی۔“
 ”غلط، تم اسے اکسارہے تھے کہ وہ مرشد کے خلاف کیس کرے۔“

”ڈیوڈ شا۔“ اس بار میرا الجھ بھی سرد ہو گیا۔ ”آخر تم مرشد کے لیے اتنا پریشان کیوں ہو؟“

”شہباز میں اس سے اپنے انداز میں منٹ رہا ہوں۔“

”تو نمٹو کس نے روکا ہے اور تم کس خوشی میں میرے معاملات میں مداخلت کر رہے ہو؟“

وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز میں نہیں چاہتا کہ تم کسی قانونی مسئلے میں پڑو اور تمہاری آزادی متاثر ہو۔“

”میرے مسائل اور آزادی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ کیا تعلق ہے؟“

”ڈیوڈ شا مجھے لگ رہا ہے تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو اور میں مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جہاں تک مرشد کا تعلق ہے تم اس سے نمٹتے رہو لیکن میرے معاملے میں مداخلت مت کرو میں اس سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا ہوں۔“

”شہباز اس سے میرا پلان خراب ہوگا اور ہو سکتا ہے تم بھی مشکل میں پڑ جاؤ۔“

”اگر یہ دھمکی ہے تو میرے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اگر تم اطلاع دے رہے ہو تو تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے کبھی مشکلات کو اہمیت نہیں دی۔“

اچانک سفیر نے میرے بازو پر ہاتھ رکھا۔ وہ گھڑی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں کوئی دس منٹ سے ڈیوڈ شا سے محو گفتگو تھا اور یہ مدت خاصی زیادہ تھی۔ میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ شا میں تمہیں پانچ منٹ بعد کال کرتا ہوں۔“

میرے کال کانٹے ہی سفیر نے گاڑی اشارت کی اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔ ”آپ بلاوجہ کی احمقانہ گفتگو فرما رہے تھے۔“

”بس یا راتے عرصے بعد ڈیوڈ شا کی حسین آواز سنی تو خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔

ہم اسلام آباد کی حدود میں تھے۔ ”بیٹے یہ اسلام آباد ہے یہاں آدی دس منٹ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا ہے۔ ڈیوڈ شا کے ریڈیائی کتے ہماری بوسونگھ رہے ہوں گے۔“

پانچ منٹ بعد سفیر نے پانچ گلو میٹرز دور ایک اور جگہ گاڑی روکی۔ میں نے موبائل نکالا اور ڈیوڈ شا کو کال کی اس بار اس نے خود ریسپونڈ کر دیا۔ ”شہباز میری درخواست ہے تم صرف دو دن اس معاملے سے دور رہو۔ رات بھی تم نے بہت نقصان کیا ہے۔“

”میرا سوال وہی ہے کہ مرشد کے نقصان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ وہ میرا سوال نظر انداز کر کے بولا۔

”سوری ڈیوڈ شا تمہارا مجھ پر کوئی قرض نہیں ہے جو میں اس طرح چکاؤں اور نہ ہمارے درمیان دوستی یا دشمنی کا ایسا تعلق ہے کہ میں وضعداری دکھاؤں اس لیے میں تمہاری درخواست رد کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔ سفیر نے مجھے داد دی۔

”بالکل ٹھیک جواب دیا ٹو نے۔ یہ ہندو کے منہ والا خود کو کچھ سمجھتا ہے۔“

”وہ سچ سچ طاقتور شخص ہے لیکن ساتھ ہی بہت ٹھنڈے دماغ کا اور نہایت کینہ پرور بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے وہ کسی چکر میں ہے خاص طور سے اس نے مرشد کے آدمیوں کے مرنے کو نقصان قرار دیا ہے۔“

”تیرا مطلب ہے وہ ڈراما کر رہا ہے؟“

”نہیں مرشد کے خلاف تو وہ سچ سچ سرگرم ہوگا۔ میرا خیال ہے وہ صرف اسے تباہ کرنا چاہتا ہے اس کے سیٹ آپ کو نہیں۔“

سفر چونکا۔ ”تیرا مطلب ہے وہ اس سیٹ آپ پر قابض ہونا چاہتا ہے۔“

”بالکل اور اسی لیے وہ مرشد کے آدمیوں کے مارے جانے پر دھکی ہے کیونکہ یہ سب بالآخر اسے ملتے۔“

”مگر کیسے؟“

”مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ فاضلی مرشد کا بہترین متبادل ہو سکتا ہے۔ وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ مرشد کی اولاد ہے۔“

”ہونے کو تو وہ ادبامہ کا فرزند ارجمند ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ مگر اسے مانے گا کون جب کہ وہاں کا ایک ایک بچہ فاضلی کے ماں باپ کو جانتا ہے۔“

”یہ کہانی بنانا کون سا مشکل کام ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ مادر زاد ولی کے طور پر پیدا ہوا اور کسی غیبی اشارے پر مرشد نے اسے پرورش کے لیے اس غریب جوڑے کے سپرد کر دیا تاکہ وہ غریبوں میں پرورش پائے اور غریب پروری سیکھے۔ یار جاہل عوام تو ایسی باتوں پر لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے رہی سہی کسر پورے کرنے اور قانون کو مطمئن کرنے کے لیے فاضلی کی ڈی این اے رپورٹ پیش کر دی جائے گی۔“

”لیکن مرشد اور اس کے بیویاں بچے.....“

”اب مجھے لگ رہا ہے کہ ان سب کو، ورنہ بیشتر کو اچانک دنیا سے رخصت کر دیا جائے گا اور جو بچے گا وہ فاضلی سے ٹکر لے نہیں سکے گا۔ ارشد علی اینڈ برادران کا دم پہلے ہی توڑ دیا گیا ہے اور وہ مرشد سے مقابلہ نہیں کر سکے تو فاضلی تو اس کا بھی باپ ہے۔“

”پیر مرشد۔“ سفر نے عقیدت سے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما اور بہ ظاہر میرے ہاتھ کو لیکن درحقیقت اپنے ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ ”مان گیا آپ کو ڈیوڈ شا اور فاضلی جاکیں جہنم میں جاکیں یہ گدی تو آپ کو جیتی ہے۔“

”بکواس نہ کر۔“ میں نے ہاتھ کھینچا۔ ”یہاں سے نکل ایسا نہ ہو کہ عبداللہ کام نشتا کر پہنچ جائے اور چابی ہمارے پاس ہے۔“

”کوئی بات نہیں وہ ڈراما انتظار کر لے گا۔“ سفر نے آرام سے کہا اور ایک فوڈ اسپاٹ پر گاڑی روک دی۔

”یہاں سے کھانے پینے کو کچھ لیتے ہیں وہاں تو کچھ نہیں ہوگا۔“

یہ خاصا جدید قسم کا فوڈ اسپاٹ تھا جہاں دیسی سے لے کر دلایتی ہر طرح کے کھانے تیار کیے جاتے تھے اور پارسل ہوتے تھے۔ سفر نے دل کھول کر اپنی پسند کی چیزیں لیں اس دوران میں، میں نے پینے کے سامان کی

خریداری کرتا رہا۔ اس میں مختلف طرح کے پیک جوس، کولڈ ڈرنک اور منرل واٹر کی بوتلیں شامل تھیں۔ پھر میں نے سفیر کے موبائل سے عبداللہ کو کال کی اور اس سے چائے کا پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”وہاں سب ہے آپ فکر نہ کریں کھانے کو بھی پاس سے سب ملتا ہے اور اے ون ملتا ہے۔“

”سفیر احتیاطاً خریداری میں لگ گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم کب تک پہنچ رہے ہو؟“

”کچھ وقت لگے گا۔“ عبداللہ نے بتایا۔ ”میں بینک میں ہوں مانی سے پوچھ کر کام کر رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے پھر ہم جا رہے ہیں۔“ میں نے سفیر کو ادائیگی کرتے دیکھ کر کہا اور کال کاٹ دی۔ سفیر نے خاصا کچھ جمع کر لیا تھا جو کئی شاپروں میں تھا لیکن میں نے اس سے زیادہ وزن اٹھایا ہوا تھا اس لیے کوئی بھی شاپر اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔ ”اپنا اپنا بوجھ سب اٹھاؤ۔“

”وہ تو میدان حشر میں ہوگا۔“ سفیر نے باہر آ کر ہانپتے ہوئے کہا۔

”بیٹے میں دیکھ رہا ہوں گناہوں کے ساتھ تیرا ذاتی بوجھ بھی اس دھرتی پر بڑھتا جا رہا ہے۔ تو نہ نکل آئی کھا کھا کر آرام کرنے سے۔“

”آرام کہاں کرتا ہوں۔“ سفیر نے احتجاج کیا۔ ”جب کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو.....“

”تو آدمی ایک سرساز کر لیتا ہے۔ کہاں تو مجھ سے زیادہ فٹ تھا اور کہاں اب تجھ سے یہ چار شاہر زنبیں

اٹھائے جا رہے۔“ میں نے افسوس سے کہا۔

”بس یا زندگی کے اس چکر کو آرام آ جائے تو پھر سے روٹین لائف میں ایک سرساز شروع کریں گے۔“

”ان شاء اللہ۔“ میں نے جیب اشارت کی۔ دس منٹ بعد ہم آپارہ کے اس فلیٹ کے سامنے تھے۔ یہ ذرا پرانے لیکن بہت اچھے اور صاف ستھرے فلیٹس تھے۔ کل چار منزلہ تھے اور نیچے دکانیں تھیں۔ ہم گاڑو سے پوچھ کر دوسری منزل پر آئے۔ فلیٹ کھلا کھلا تھا، سامنے بڑا سالانہ تھا۔ اسی میں کچن تھا۔ اس کے بعد برابر دو بیڈ روم تھے ان کے ساتھ انچ باتھ روم تھے اور باتھ رومز کے درمیان کشادہ بالکونی تھی۔ اس سے سامنے سرکاری ملازمین کے لیے مخصوص کوارٹر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سفیر آمد کے دس منٹ کے اندر سارا جائزہ لے آیا تھا۔ اس نے اطلاع دی۔

”یار بالکل سامنے ایک بیر بہوٹی جیسی خاتون دھلے کپڑے ٹانگ رہی ہیں۔“

”بیر بہوٹی سے کیا مراد ہے یہ تو برسات میں نکلتی ہیں۔“

”یار خود بھی سرخ سرخ سی ہیں اور لباس بھی ایسے رنگ کا پہنا ہوا ہے۔ بہت عرصے بعد کوئی اچھا چہرہ

دیکھنے کو ملا ہے۔“

”گلتا ہے مونا سے دوری رنگ لا رہی ہے، تجھے ہر خاتون خوب صورت لگنے لگی ہے۔“

”نہیں یار خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں تو ایک نظر دیکھ تو سہی۔“ سفیر اصرار کر کے مجھے بالکونی میں لایا اور آگے دھکیل کر خود پیچھے رہا۔ سڑک کے فوراً پار موجود گھر کی چھت پر سچ ایک ایسی ہی خاتون تھیں۔ شدید گرمی میں انہوں نے سرخ لباس پہنا ہوا تھا اور خود بھی تپش سے سرخ ہو رہی تھیں۔ رنگ دروپ کے بارے میں سفیر کا بیان درست تھا لیکن جب میں گیا تو وہ اپنا کام کر چکی تھیں اور اب واپس جا رہی تھیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا

کہ ”مجھے درغلا کر یہاں لے آیا میں پلٹا تو وہ ہنسا۔“ بیٹے بڑے پارسا بنتے ہو لیکن اندر سے.....“
 ”کون کبخت پارسا بن رہا ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اندر آیا۔ ”بس کم گناہ گار بننے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”اچھا ڈائلاگ نہ مار میرا شکر یہ ادا کر کہ میری وجہ سے تجھے اچھی شکل دیکھنے کو مل گئی۔“
 ”ہاں آج تک جتنی اچھی شکلیں دیکھی ہیں وہ تیری وجہ سے ہی دیکھی ہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ سفیر فرج سے برف نکال لایا اور ایک کولڈ ڈرنک کی بوتل کھولی۔ یہ گرم تھی لیکن برف نے اسے سرد کر دیا۔ سفیر نے گلاس آکس کیو بس سے بھر دیا تھا اس لیے مزہ آگیا۔ گلاس میں برف زیادہ اور کولڈ ڈرنک کم تھی۔ اس لیے ہم نے کئی بار ڈال کر پی۔ میں نے موبائل نکال کر چیک کیا مجھے فکر تھی کہ وہ آن نہ رہ جائے۔ اس صورت میں ہمارا سراں لگا یا جا سکتا تھا۔ حفظہ مقدم میں نے سرے سے سم ہی نکال کر رکھ لی۔ سفیر کچھ دیر سرخ پوش خاتون کے حوالے سے چھیڑ چھاؤ کرنے کے بعد سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یار اگر یہ بات سچ ہے تو ہمارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔ فاضلی خلعت میں اپنے ناجائز باپ سے کم نہیں ہے۔“

”ٹوٹھیک کہہ رہا ہے۔ ڈیوڈ فاضلی کی صورت میں یہاں اپنا ایک قابل اعتماد اور مضبوط حلیف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسا وہ اپنے مفاد کے لیے کر رہا ہے ہمارے مفاد کے لیے نہیں۔“
 ”فاضلی سانپ کی اولاد ہے وہ ڈسٹا ہی سیکھے گا۔ اس لیے اس سے پہلے کہ وہ طاقتور بنے اس کا سر بھی کچلنا پڑے گا۔“

”یہ کام اس کے گدی نشین ہونے سے پہلے کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بار وہ گدی پر قابض ہو گیا تو ڈیوڈ شا کے قابو میں بھی مشکل سے رہے گا۔“

یہاں اسے سی نہیں تھا مگر روم کوڑا تھا۔ سفیر نے اسے چلایا تو کراٹھنڈا ہونے لگا۔ ”ڈیوڈ شا بہت شاطر سیاست دان ہے، ٹو نے اسے جواب دے کر ٹھیک کیا۔ مرشد بنیادی طور پر ہمارا مسئلہ ہے اور اس سے کیسے نمٹنا ہے یہ بھی ہمارا مسئلہ ہے۔ وہ ہمیں ڈکلیٹ نہیں کرا سکتا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے اور کیسے نہیں۔“
 ”مگر اب ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ڈیوڈ شا جس طرح میرا موبائل ٹریس کر رہا ہے اس سے لگتا ہے کہ اس کے ذہن میں میرے یا ہمارے حوالے سے کچھ ہے۔“

”سانپ کی بات ہے تجھے قابو کرنا تو اس کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ ”تیرے ساتھ اگر کوئی اور بھی ہاتھ آجائے تو اس کے لیے مزید آسانی ہوگی تجھ پر دباؤ ڈالنے میں۔“

سفیر درست کہہ رہا تھا۔ ”اس لیے ہمیں اب موبائل کا استعمال کم سے کم کر دینا چاہیے۔“
 ”میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔“ سفیر نے کہا۔ ”اگر ہم کوئی طاقتور ریڈیو سیٹ لے لیں۔ جوتیس پینتیس میل تک ٹرانسمٹ کر سکے تو یہ موبائل کا بہترین متبادل ہوگا۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”یار میں نے بچوں کے کھلونوں کی شاپس میں ایسے واکر کیٹ دیکھے ہیں جن پر کھٹا ہوتا ہے کہ وہ ایک کلومیٹر تک کام کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ پروفیشنل واکر کیٹ اس سے زیادہ رینج کے مل سکتے ہیں۔“

”اپنا وسم اس معاملے میں چپتا ہے اس سے کہتے ہیں۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ اسی اثنا میں کال بیل بجی اور اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ عبداللہ پسینے میں شرابور اندر آیا اور اس نے آتے ہی سب سے پہلے فریج سے منرل واٹر کی بوتل نکال کر ایک ہی سانس میں آدمی صاف کر دی اور پھر روم کو لڑکے کے سامنے آ بیٹھا۔

”آج تو گرمی نے مار دیا اوپر سے جیکسی بھی ایسی ملی کہ اس کا سائڈ والا شیشہ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

”میر بہونیاں تازہ رہے ہیں۔“ میں ہنسا۔

عبداللہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو سفیر نے اسے تشریح کر کے حیر بہوٹیوں کی وضاحت کی۔ عبداللہ اس کے ساتھ چھت دیکھنے گیا۔ ان دونوں کی واپسی خاصی دیر بعد ہوئی، پتا چلا کہ سرخ پوش خاتون کپڑے ڈالنے کے دوسرے راؤنڈ کے سلسلے میں چھت پر تھیں۔ اس بار سفیر کا بیان تھا کہ وہ خود بھی خاصی بیگم گئی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”یاریہ اچھی بات نہیں ہے شریف عورتوں کو اس طرح جان بوجھ کر دیکھنا۔“

سفیر نے عبداللہ کی طرف دیکھا اور ہنسا تو عبداللہ کھینسا گیا۔ میں نے غور کیا۔ ”یہ کیا پکڑ ہے؟“

”خاتون دو نمبر ہیں۔“ سفیر نے کہا۔

”نہیں۔“ میں بے یقینی سے بولا۔

”عبداللہ نے بتایا ہے اس سے پوچھو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”یہ سچ ہے یہ چالو قسم کی عورت ہے۔ یہاں شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے لیکن اس کے گھر مردوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے خود بھی شام کو اجنبی افراد کے ساتھ گاڑی میں جاتی ہے اور اکثر رات گئے یا صبح واپس آتی ہے۔“

میں حیران ہوا۔ ”تب محلے والے برداشت کیسے کر رہے ہیں۔“

”کچھ لوگوں نے تمھارے میں رپورٹ کرانے کی کوشش کی جس کے نتائج ان کی اپنی صحت کے حق میں مضر نکلے۔ ایک آدھ دفعہ جھگڑا بھی ہوا اور پولیس آکر احتجاج کرنے والوں کو سمیٹ کر لے گئی۔ دو تین دن بعد وہ واپس آئے تو ان کی حالت دیکھ کر باقیوں نے عبرت پکڑی اور اب کوئی ان سے تعرض نہیں کرتا ہے یہ بھی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ایک وقت تھا جب شرفا کے درمیان ایسی چیزوں کا وجود قطعی ناقابل برداشت ہوتا تھا۔ مگر اب لوگ مجبور ہو گئے ہیں۔“

سفیر نے سر ہلایا۔ ”روشن خیالی نے ہر جگہ تسلط جمالیا ہے اب ایسی باتوں کو عام لیا جاتا ہے۔“

کچھ دیر اسی موضوع پر بات کرنے کے بعد مجھے خیال آیا اور میں نے عبداللہ سے کہا۔ ”یاری کوئی ایسا طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ہم ڈیوڈ شاپا مرشد کی طرف سے ٹریس کیے جانے کا خطرہ مول لیے بغیر آپس میں رابطہ کر سکیں۔“

عبداللہ ہنسا اور اس نے جب سے ایک چھوٹا سا پرانے زمانے کے موبائل جیسا سیٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ ”کیا بات ہے شہباز صاحب ایک ہی بات سب کے دماغوں میں ایک ساتھ ہی آتی ہے۔“

”اسے ہی ذہنی ہم آہنگی کہتے ہیں۔“ میں نے کہا اور اٹھا کر دیکھا تو یہ ایک معروف بین الاقوامی کمپنی کا

سیٹلائٹ فون تھا۔ میں حیران ہوا۔ ”یہ تو بہت مختصر ہے۔“
 ”ابھی لانچ ہوا ہے ورنہ اس سے پہلے سیٹلائٹ فون نارمل لائن فون سیٹ سے بھی بڑے ہوتے تھے۔
 اس کے چار جز زیادہ ہیں مگر یہ محفوظ ہے۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ اگر ہم گروپ پیکیج لیں تو وہ ہمیں سستا پڑے گا۔“

”گروپ پیکیج سے کیا مراد ہے؟“
 ”اس میں صرف آپس میں بات ہو سکتی ہے۔“
 ”نہیں ایسا فون لوجو ہر جگہ کال کے لیے استعمال ہو سکے۔ مہنگے کی پروا امت کرو۔ حفاظت زیادہ ضروری ہے۔“

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”بنک میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہاں ایک پرانا واقف کار مل گیا وہ آج کل اس کی مارکیٹنگ کر رہا ہے۔“
 ”بس تو اس سے بات کر لو کم سے کم پانچ چھ سیٹ ہوں ہمارے پاس۔“ سفیر نے کہا۔ ”ان سے ہمیں بلا کھٹکے رابطے میں آسانی رہے گی۔“

”میں نے بھی اس سے یہی کہا ہے اس نے اپنی شاپ پر بلایا ہے شام کو جاؤں گا۔“
 ”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“ سفیر نے اعلان کیا۔ ”کسی نے پیزا کھانا ہے۔“
 ”میں نے۔“ عبداللہ نے ہاتھ اوپر کیا۔
 ”میرا موڈ نہیں ہے۔“ میں نے انکار کیا تو سفیر لاؤنج کی طرف چلا گیا۔ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔
 ”مانی کو رقم ٹرانسفر کر دی؟“

”ہاں، وہ بہت تیز ہے آج ہی اس نے دفتر کے لیے جگہ بھی تلاش کر لی۔ کہہ رہا تھا کہ ایک ہفتے میں فرنش کر کے کام بھی شروع کر دے گا۔ میں نے اسے پچیس لاکھ ٹرانسفر کیے ہیں وہ کہہ رہا تھا کہ ابھی دس کریں لیکن مجھے آپ کی بات یاد تھی اس لیے میں نے پچیس ہی کیے۔“
 ”یہ اچھا کیا۔ وہ بار بار کہتا یا ہم مصروف یا پھنسنے ہوتے تو اس کا کام رک جاتا اب وہ سب طرف سے بے فکر ہو کر بزنس سیٹ کرنے میں لگ جائے گا۔“

اچانک لاؤنج کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے آٹے کی بوری گری ہو۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا اور ہم دونوں اٹھ کر بیک وقت لاؤنج کی طرف بڑھے۔ میں نے سفیر کو آواز دی مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ خطرے کا احساس کرتے ہی ہم دونوں نے بیک وقت پستول نکال لیے تھے۔ پھر عبداللہ نے لاؤنج میں جھانک کر وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہم باہر آئے، سفیر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچن اوپن اور ایک طرف سے کاؤنٹر والا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے کاؤنٹر کے دوسری طرف جھانکا۔ سفیر کروت کے بل پڑا ہوا تھا۔ وہ بے سدھ تھا۔ میں نے بے ساختہ جھک کر اسے چپک کر ناچا ہا کہ میرا سر زور سے پکرایا۔ اسی لمحے دوسری آواز آئی جیسے پھر آٹے کی بوری گری ہو اور اس بار یہ بوری عبداللہ ثابت ہوا۔ وہ لاؤنج کے وسط میں گرا ہوا تھا۔ پھر تیسری بوری گرنے کی آواز آئی جو میں تھا۔

یہاں کوئی چیز تھی شاید کوئی گیس جو ہمارے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا تھا مگر میں بے ہوش نہیں ہوا تھا البتہ جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ میرے کانوں نے چرچانے جیسی آواز سنی اور پھر باہر کا دروازہ یوں کھلا جیسے کسی نے بے پناہ دباؤ ڈال کر اس کے لاک کو ناکارہ کر دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک شخص اندر آیا جس نے اس گرمی میں بھی بڑی سی چادر سے خود کو چھپایا ہوا تھا۔ پھر اس نے چادر اتاری تو میرے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے تھے۔ وہ چھوٹے قد کا نیم آدمی تھا مگر اس کے بہت موٹے بازو اس کے گھٹنوں تک آرہے تھے۔ وہ ڈیوڈ شا کا گرگا تھا۔ اس کے پیچھے دو سفید فام اندر آئے تھے۔ وہ یہاں تک کیسے پہنچے؟ میں اس سوال پر غور کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا تھا۔



مجھے دشمن کی قید میں جانے کا اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ اگر اس کی کوئی ڈگری ہوتی تو میں بلاشبہ پی ایچ ڈی کر چکا ہوتا۔ بے ہوش ہونے سے لے کر ہوش تک ہر طرح کا تجربہ تھا۔ عام طور سے ہوش میں آنے کے بعد میں کسی الگ تھلگ اور خاموش جگہ قید ہوتا تھا جہاں مجھے فرار سے روکنے کے تسلی بخش انتظامات کیے جاتے تھے۔ مگر اس بار ذرا منفرد انداز میں ہوش میں آیا۔ اچانک ایک چھینک کے ساتھ حواس بیدار ہوئے اور آنکھیں کھلیں تو ڈیوڈ شا میرے سامنے تھا۔ میں ایک صوفے پر تھا اور وہ میرے مد مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بے ہوشی سے ہوش کی طرف آنے کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ میں پورے لباس میں صوفے پر سکون سے بیٹھا ہوا تھا اور میرا ذہن پوری طرح قابو میں تھا۔ بے ہوشی سے واپس آنے کے دوران عام طور سے جو ناگوار اثرات طبیعت پر محسوس ہوتے تھے اس وقت ان کا شاید تک نہیں تھا۔ بلکہ ذہن اور جسم بالکل تروتازہ محسوس ہو رہے تھے۔ البتہ نکتوں میں ایک لطیف اور مینھول جیسی خوشبو کا احساس تھا شاید کسی دوا کو سونگھا کر مجھے ہوش میں لایا گیا تھا۔ چھینک اسی کارِ عمل تھی۔ ڈیوڈ شا مجھے ہوش میں پا کر زربل مسکرایا۔ ”شہباز کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”بہترین۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تم پر جو گیس استعمال کی گئی تھی وہ صرف بے ہوش کرتی ہے، جان کے لیے خطرہ نہیں بنتی ہے، چاہے اس کی مقدار کتنی زیادہ کیوں نہ ہو۔“

”گیس کی کیا ضرورت تھی تمہارا گوریلا ہی کافی تھا۔“ میں نے مسکرا کر کہا لیکن اندر سے میں بہت فکر مند تھا اور یہ فکر مندی عبداللہ اور سفیر کے حوالے سے تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اس جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بند اور چھوٹا ہال نما کمرہ تھا۔ بہت سفید اور بہت صاف ستھرا۔ فرش دودھیا سفید ٹائلوں کا تھا اور دیواروں پر چمکیلا سا سفید پینٹ تھا۔ البتہ یہاں موجود فرنیچر بالکل سیاہ تھا۔ یہ کنفراسٹ کچھ زیادہ ہی تھا۔ جیسے کسی جشی کے بہت سفید دانت نمایاں ہوتے ہیں۔ میرے عقب میں ذرا پیچھے ایک تنومند سفید فام سیاہ سوٹ میں ساکت کھڑا ہوا تھا۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ ڈیوڈ شا کا باڈی گارڈ نہیں ہے۔ اگر عبداللہ اور سفیر بھی لائے گئے تھے تو وہ کہیں اور تھے۔ یہ پہلا موقع ہوتا کہ میرے ساتھ میرے اہم ترین ساتھی بھی دشمن کی قید میں آ گئے تھے۔

”باسو عام لوگوں کے لیے ہے۔“ ڈیوڈ شا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ تم جیسا شخص اس

سے مرعوب ہوگا۔“

”باسو غالباً اسی گوریلے کا نام ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال مبارک ہو تم نے بالآخر مجھے قابو کر لیا۔“

”تمہیں باسو کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

”اسی ٹیکسی ڈرائیور سے جو ہماری نگرانی کر رہا تھا۔“

”میرا بھی یہی خیال تھا۔“ ڈیوڈ شانے سر ہلایا۔ ”وہ پرسوں سے غائب ہے۔“

”پرسوں۔“ میں چونکا۔ ”کیا تاریخ بدل گئی ہے؟“

ڈیوڈ شانے میری کلائی کی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا صبح کے سات بج رہے تھے اور اگلا دن شروع ہو گیا تھا۔ گویا میں انیس گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ مگر اتنی طویل بے ہوشی کیسے ممکن تھی۔ ڈیوڈ شانے میرا ذہن بھانپ لیا۔ اس نے کہا۔ ”اس گیس کی خصوصیت ہے اسے دو یا تین بار استعمال کر کے بے ہوشی کا دورانیہ بڑھایا جاسکتا ہے۔ ویسے تم فکر مت کرو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس دوران میں تمہیں نگی کی مدد سے خوراک بھی دی گئی تھی۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا، گویا اسی وجہ سے مجھے ہموک پیاس نہیں تھی۔ ڈیوڈ شامیری جان کا دشمن نہیں تھا مگر وہ تمام دشمنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور خطرناک ضرور تھا۔ اگر کبھی اسے میری جان لینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ ایک لمحہ ہچکچائے بغیر نہایت سرد مہری سے مجھے موت کی نیند سلا دیتا۔ وہ خاصے عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ میں راضی خوش اس کے ساتھ چلوں۔ مگر ہر بار اس سے معاملہ درمیان میں رہ جاتا اور کوئی نہ کوئی ایسی گڑبڑ ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے راست اقدام کا فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے قابو کیا تھا۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی اور دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ میں اس کے پلان میں مداخلت نہ کر سکوں جو وہ مرشد سے نمنے کے لیے بروئے کار لا رہا تھا۔

اب ایسا لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شافاضلی سے کام نہیں لے رہا تھا بلکہ فاضلی کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ نہ صرف مرشد کے خاتمے کی طرف جا رہا تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کے چچا زادوں کا خاتمہ بھی چاہتا تھا۔ اگرچہ ہم بھی یہی چاہتے تھے مگر ہمارے اور ڈیوڈ شا کے مقاصد میں بہت زیادہ فرق تھا۔ ہم اس پورے ٹولے کا خاتمہ چاہتے تھے اور ان میں فاضلی بھی شامل تھا جب کہ ڈیوڈ شافاضلی کو مرشد کی جگہ لانا چاہتا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ فاضلی گدی نشین ہوتے ہی ہم سے دشمنی پر کمر باندھ لے گا۔ اس کا طاقتور ہونا ہمارے مفاد میں نہیں تھا۔ ڈیوڈ شا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”تم فکر مند لگ رہے ہو؟“

”کیا مجھے نہیں ہونا چاہیے؟“

”اگر تم ہونا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ فکر کی کوئی بات نہیں

ہے۔“

”اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی نہیں ہونا چاہیے؟“

”ہاں ان کے بارے میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ آزاد ہیں یہاں صرف تم لائے گئے ہو۔“

”میں تمہاری بات پر کس طرح یقین کروں۔“

ڈیوڈ شانے اپنے کوٹ سے میرا موبائل نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ ”تصدیق کرلو۔“
موبائل آف تھا، میں نے آن کر کے سفیر کو کال کی۔ اس نے تیل پوری جانے سے پہلے کال ریسپونڈ کر لی
اور بے تابی سے بولا۔ ”شہباز تو کہاں ہے؟“

”پہلے یہ بتا کر ٹو اور عبداللہ کہاں ہیں؟“

سفیر تاز گیا۔ ”ہم محفوظ ہیں۔“ اس نے کہا۔

”اس موبائل کو آن رکھ کر خود کو محفوظ سمجھ رہے ہو۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تمام موبائل فوراً ترک کر دو
اور اپنی جگہیں۔۔۔۔۔“ اچانک مجھے لگا کہ لائن کٹ گئی ہے۔ موبائل سے ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز آرہی تھی۔
”ہیلو۔۔۔۔۔ہیلو۔۔۔۔۔“

”بے کار ہے۔“ ڈیوڈ شا کے باڈی گارڈ نے اچانک عقب سے مجھ سے موبائل اچک لیا۔ ”یہاں سنگٹل
کام نہیں کر رہے ہیں۔“

”کام نہیں کر رہے یا تم لوگوں نے ہلاک کر دیئے ہیں؟“ میں نے سکون سے کہا۔

”تم کچھ بچو گے؟“

”ہاں ایک گلاس خنڈا پانی۔“ میں نے کہا تو ڈیوڈ شانے اپنے گر کے کی طرف دیکھا اور اس نے فوری
بڑے اسٹیکس شیشے کے گلاس میں پانی پیش کیا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اس کے چہرے پر چوٹوں
کے مندمل ہوتے نشان تھے۔ میں نے گلاس لے کر کہا۔ ”شاید تم اس گاڑی میں تھے جو دودھ کے ٹرک سے ٹکرائی
تھی۔“

اس کی آنکھوں میں سفاک چمک لہرائی۔ ”ہاں اس دن تم قسمت لے کر آئے تھے۔“

”تم بھی قسمت لے کر ہی نکلے تھے ورنہ واپس آ کر دو افراد کو شوٹ کرنے میں دو منٹ لگتے۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔“

میں نے پانی پی کر گلاس اسے تھما دیا اور ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔“

”رومانہ اور راشد۔“ اس نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

میں اس غیر متوقع مطالبے پر چوٹا۔ ”یعنی مرشد کی بیٹی اور اس کا داماد۔“

”وہ تمہارے پاس ہیں۔“

”ہاں لیکن وہ تمہیں نہیں مل سکتے۔“

”کیوں؟“

”وہ میری پناہ میں ہیں اور جو میری پناہ میں ہوں ان کو میں کسی کے حوالے نہیں کرتا۔“

”وہ تمہارے دشمن خاندان سے ہیں۔“

”ہوں گے۔“ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ”میں پورے خاندان سے دشمنی کا قائل نہیں ہوں۔“

ڈیوڈ شانے نرمی سے کہا۔ ”مگر وہ مل جائیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔“

”آسانیاں تلاش کرنا تمہارے جیسے شخص کو زیب نہیں دیتا ہے۔“ میں نے ملاعت سے کہا۔ ”تم ان دو

افراد کے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتے ہو بلکہ شاید کر رہے ہو گے؟“

ڈیوڈ شا کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ ”کل رات پولیس اسٹیشن سے واپسی پر اصفراور اس کے دو بیٹے اور ایک بھتیجا دو گارڈز سمیت نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بن گئے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں بھی کسی ایسی خبر کی توقع کر رہا تھا۔ مرشد خاندان بہت تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ مجھے اصفرائینڈ پارٹی سے ہمدردی نہیں تھی، مگر نہ جانے کیوں اس کے مارے جانے کا سن کر مجھے دکھ ہوا تھا۔ اب ان بھائیوں میں صرف ایک بچا تھا اور اس کا جینا بھی محال نظر آ رہا تھا۔ مرشد بہت تیزی اور سفاکی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ مرشد کا کام ہے؟“

خلاف توقع ڈیوڈ شانے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ کل دوپہر میں گرفتار ہو گیا تھا۔“

یہ ایسی خبر نہیں تھی کہ میں سکون سے بیٹھا رہتا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ ”تم..... سچ کہہ رہے ہو..... میرا مطلب ہے.....؟“

ڈیوڈ شانے اپنے ساتھ تپائی پر پڑا شام کا اخبار اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں مرشد کی گرفتاری کی مکمل خبر تھی۔ ایک تصویر میں اسے پولیس موبائل میں بیٹھے دکھایا جا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ایک ناقابل بیان سی خوشی ہوئی تھی۔ مرشد فرعون وقت تھا اس نے میرے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے اور اس کی پوری کوشش تھی کہ میں کسی طرح اس کے زرخید پولیس والوں کے ہاتھ آؤں تاکہ وہ تشدد کر کے مجھے پولیس مقابلے میں مار دیں۔ مگر اللہ کو یہ منظور نہیں تھا میں کبھی گرفتار نہیں ہوا مگر آج مرشد گرفتار ہو کر جا رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ایک دن میں اس کی ضمانت ہو جاتی۔ بہر حال وہ گرفتاری کی ذلت سے تو گزر رہا تھا۔ خبر کے مطابق اسے دو رات پہلے ہونے والی قتل و غارت گری کے سلسلے میں درج کرائی جانے والی ایف آئی آر کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ ایف آئی آر عدالت کے حکم پر درج کرائی گئی۔ شاید اصفراپنے بیٹوں اور بھتیجے کے ہمراہ اسی سلسلے میں تھانے سے آ رہا تھا جب انہیں قتل کر دیا گیا۔ مگر ڈیوڈ شا کا کہنا تھا کہ یہ مرشد کا کام نہیں تھا تو پھر کس نے انہیں مارا تھا؟

”یہ فاضلی کا کام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں وہ اپنے راستے کے تمام ممکنہ کانٹوں کو صاف کر رہا ہے۔“ ڈیوڈ شانے بلا جھجک اعتراف کر لیا۔

”اور تم اس قتل و غارت گری میں اس کا ساتھ دے رہے ہو؟“

”پرسوں رات تم نے جو کیا.....“

”وہ سیلف ڈیفنس تھا۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”وہ حملہ کرنے آئے تھے جو مارے

گئے۔“

”اے بھی سیلف ڈیفنس ہی سمجھو۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”شہباز مجھے وہ دونوں درکار ہیں اگر تم نہیں دو گے

تو میں کسی اور طریقے سے حاصل کر لوں گا اور اگر اس دوران میں کوئی نقصان ہوا تو تم مجھے ذمے دار قرار نہیں دے سکو گے۔“

میرا دل دھڑکا تھا لیکن میں نے اپنے تاثرات سپاٹ رکھے۔ ”ڈیوڈ شا اگر تمہارے کسی فعل سے مجھے یا

میرے ساتھیوں کو کوئی نقصان ہوا تو تم کس طرح بری الذمہ ہو سکتے ہو؟“

”کیونکہ میرے کام میں تمہاری وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔“

”کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم اور فاضلی مرشد اور اس کے کزنز کے خلاف ہر طرح سے آزاد ہو صرف ان دو

کے نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”پڑے گا لیکن تم نہیں سمجھو گے۔“ ڈیوڈ شا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ”شہباز اگر تمہارے دونوں ساتھی بھی یہاں

ہوتے تو کیا تم تب بھی انکار کرتے؟“

”شاید نہیں۔“ میں نے سوچ کر کہا۔ ”تم نے دو دن کی بات کی تھی اور اس وقت تم نے مجھ سے راشد اور

رومانہ کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔“

”کیونکہ اس وقت فاضلی نے ان کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔“

”تو تم فاضلی کے اشاروں پر چل رہے ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”ڈیوڈ شا مجھے تم جیسے آدمی

سے توقع نہیں تھی کہ تم عام سے لوگوں سے اتنے دھوکے کھا سکتے۔ پہلے مرشد، پھر شی دل جی اور اب فاضلی۔ کیا

تمہیں یقین ہے کہ وہ بعد میں بھی تمہارا تابعدار ثابت ہو گا؟“

ڈیوڈ شا کا رنگ معمولی سا بدلا مگر اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔ اس نے چالاکی سے بات بدل دی۔

”میں نے دو دن کی بات کی تھی ابھی اسے پورا ہونے میں سولہ گھنٹے ہیں۔“

”اس دوران میں فاضلی مرشد اور اس کے گھر والوں کا صفایا کر دے گا۔ ساتھ ہی شاید ارشد کا آخری

بھائی بھی اس کا نشانہ بنے گا۔“

”نہیں ان کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب وہ کسی قابل نہیں رہے۔“

گویا ارشد ایڈ برادران کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ ایک بھائی اکبر بچا تھا جو ڈیوڈ شا کے خیال میں کسی قابل نہیں

تھا مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ کب کیا کر گزرے۔ ہو سکتا ہے اکبر بھی فاضلی اور مرشد کے

لیے وہاں بن جائے۔ میں نے مرشد کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”وہ مرشد ہاؤس سے اپنی درگاہ والی کوشی میں منتقل ہو گیا ہے اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“

مرشد ہاؤس شہر میں تھا یہاں کسی بھی قسم کے ہنگامے کی صورت میں پولیس بہت تیزی سے آ جاتی۔

جب کہ درگاہ مرشد یہ شہر سے فاصلے پر تھا وہاں کسی ہنگامے کی صورت میں پولیس اور مدد خاصی دیر سے پہنچتی جیسا

کہ پرسوں رات ہوا تھا۔ ہم اپنا کام کر کے اطمینان سے وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ پولیس اس کے بھی

خاصی دیر بعد پہنچی تھی۔ میری معلومات کے مطابق درگاہ ہنگامے سے پہلے ہی عام افراد کے لیے بند کر دی گئی تھی

اور عام ملازمین بھی اپنے رہائشی حصوں تک محدود کر دیئے گئے تھے۔ ناکام حملے کے بعد درگاہ کی سیوریج انتہائی

سخت کر دی گئی تھی۔ ایسے میں اگر فاضلی وہاں براہ راست کوئی کارروائی کرنا چاہتا تو یہ آسان نہیں ہوتا۔ یقیناً وہ

کسی پلان کے تحت چل رہا تھا اور وہ مرشد کو سر پرانز دیتا۔ ڈیوڈ شانے میرے ساتھ جس طرح کھل کر بات کی

تھی اور بہت سی باتوں کا آسانی سے اقرار کر لیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ حالات اس کے اور فاضلی کے اتنے

قابو میں آ گئے تھے کہ میرے کچھ جان لینے سے انہیں فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں ڈیوڈ

شا کے قبضے میں تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ میں اس قید سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے ڈیوڈ شا سے پوچھا۔

”تمہارے آدمی مجھ تک کیسے پہنچے جب کہ میں بہت محتاط تھا۔“

”تم محتاط تھے لیکن تم ایک غلطی کر گئے۔ بات کرنے کے بعد جب تم لوکیشن بدل رہے تھے تب تم نے موبائل آف نہیں کیا تھا اور میرے آدمی اسے ٹریک کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے۔ اگر تم موبائل آف کر دیتے تو ان کے لیے اتنی جلدی جہیں تلاش کرنا ممکن نہ رہتا۔“

مجھے یاد آ گیا کہ جب سفیر کے اشارے پر میں نے کال کاٹی تھی تو موبائل بند کرنا بھول گیا تھا اور اس سکنٹر کی مدد سے ڈیوڈ شا کے گھر سے ہم تک پہنچ گئے اور پھر انہوں نے آرام سے تعاقب کر کے فلیٹ دیکھ لیا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”تجسبی..... واقعی مجھ سے یہ غلطی ہوئی۔“

”اب تم آرام کرو۔“ ڈیوڈ شا نے اچانک کہا۔ ”جب تم آمادہ ہو کہ رومانہ اور راشد کو میرے حوالے کر دو گے تو بتا دیتا۔“

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی جب میں انکار کر چکا تھا تو پھر کیونکر راضی ہوتا۔ تو منہ فخص نے مجھ سے کہا۔ ”پلیز مسٹر شہباز۔“

میں اس کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو دروازے پر وہی گوریلانا فخص موجود تھا اور اس وقت اس نے صرف ایک بڑی سی نیگر پینی ہوئی تھی جو اس کے گھٹنوں تک آ رہی تھی۔ اوپری جسم مکمل طور پر عریاں تھا اور اس کا ایک ایک رگ پٹھا واضح تھا۔ اس کا جسم بہت ٹھوس اور گٹھا ہوا تھا۔ نہ ہونے کے برابر پیٹ اور لمبے بازو اسے عجیب سی ساخت دے رہے تھے۔ کم سے کم میں نے آج تک انسان کی ایسی ہیئت نہیں دیکھی تھی۔ اس کا سر صاف تھا اور پچیلی ہوئی ناک پر چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں درندگی جھلک رہی تھی۔ منہ چوڑا اور جڑے مضبوط تھے۔ وہ شاید منگول اور وسط ایشیائی نسلوں کا کسچر تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سفاکی نمودار ہوئی۔ تو منہ فخص نے کہا۔ ”باسا سے دو نمبر میں لے جاؤ۔“

”چلو۔“ اس نے غرا کر انگریزی میں کہا۔

”یہ تو بولتا ہے۔“ میں نے تو منہ کی طرف دیکھا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ یہ بھونکتا ہوگا۔ ویسے ڈیوڈ شا نے یہ جانور کہاں سے پکڑا۔“

باسو کا چہرہ سرخ اور آنکھیں سرخ تر ہو گئی تھیں۔ اس نے غرا کر میری طرف دیکھا اور تو منہ سے بولا۔

”مجھے اجازت دو میں اس کا دماغ درست کر دوں۔“

”یہ صرف کانٹے کے لیے اجازت لیتا ہے۔“ میں ہنسا۔ ”بھونکتا اپنی مرضی سے ہے۔“

”پلیز مسٹر شہباز۔“ تو منہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم بلا وجہ کا مسئلہ مت بنو ابھی تم پر سخت وقت آنے والا ہے۔“

”کیا اس کی صورت میں۔“ میں نے باسو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ویسے اس کے لیے مناسب جگہ کوئی چڑیا گھر ہے جہاں یہ بنجرے کے پیچھے رہ کر بچوں کا دل بہلائے۔“

میں باسو کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے میں نہیں دیکھ سکا کہ تنومند نے اسے کیا اشارہ کیا اچانک ہی اس کا رنگ ورپ نائل ہو گیا اور اس نے غرانا بھی موقوف کر دیا۔ اس نے نرمی سے ہاتھ بڑھا کر میرے شانے پر رکھا اور مجھے لگا جیسے کوئی تنا میرے شانے پر آگیا ہو اور جب اس نے پکڑ کر کھینچا تو میں آرام سے کھنچا چلا گیا۔ بلاشبہ اس کی گرفت اور قوت دونوں جتناقی تھیں۔ وہ اسی طرح مجھے کھینچتا ہوا اگلی راہداری کے کونے میں واقع کمرے تک لایا اور دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا۔ اس دوران میں اس نے قوت کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس نے مجھے تکلیف نہیں دی تھی گرفت سخت تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔ مجھے اندر دھکیلنے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ کمرے میں سوائے ایک قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں اسے سی کی خشکی تھی مگر بہ ظاہر کوئی ڈسٹ یا خانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں سوائے ایک دروازے کے اور کچھ نہیں تھا۔ چھت پر پینٹل لائٹس لگی تھیں اور کمرہ بہت روشن تھا۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں ڈیوڈ شا کے رویے پر غور کر رہا تھا۔ یہ نہ صرف پہلے کے مقابلے میں بدلا ہوا تھا بلکہ کچھ دھمکی آمیز بھی تھا۔ اس نے مجھے میرے ساتھیوں کے حوالے سے دھمکی دی تھی اور پھر روانہ اور راشد کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ اصل میں فاضلی کا تھا مگر ڈیوڈ شا نے اسے پیش کیا تھا۔ اس کمرے میں بیٹھنے سے پہلے اس نے کہا تھا کہ جب میرا ارادہ ہو جائے تو میں اسے مطلع کر دوں۔ بھلا میرا ارادہ کیوں ہونے لگا جب کہ میں اسے پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں بے خیالی میں اپنا پایاں ہاتھ مسل رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس میں ہلکی سی سوزش ہو رہی ہو۔ اس وقت میں نے توجہ نہیں دی تھی مگر جب میں نے ہاتھ ملا تو سوزش بہت تیزی سے بڑھی تھی اور پھر ایک منٹ میں یہ اتنی بڑھ گئی کہ مجھے لگا جیسے میرے ہاتھ کو آگ میں رکھ دیا ہے۔ اس بار میں دلیل کر رہ گیا۔ میرے ذہن میں امین کی تکلیف کا خیال آیا جب ڈیوڈ شا نے اس کے ہاتھ پر ایک خاص قسم کا زہر لگا دیا تھا جو شدید تکلیف کا باعث بنا تھا اور ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکے تھے۔ کیا ڈیوڈ شا نے وہی زہر مجھے بھی لگا دیا تھا؟

تکلیف معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ اگر میں قوت برداشت نہ رکھتا تو یقیناً کراہ رہا ہوتا۔ میں نے ہاتھ اپنی بغل میں دے کر دبایا مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو ایک موقع پر میرے جسم سے جدا ہونے والا تھا اور ڈاکٹر اسے کانٹے کی تیاری بھی کر چکے تھے مگر پھر دسم اینڈ پارٹی عین موقع پر مجھے وہاں سے نکال لائے اور پھر حکیم قادس نے میرا علاج کر کے اس ہاتھ کو ٹھیک کر دیا۔ لیکن ایسی تکلیف تھی کہ اس کے مقابلے میں ہاتھ کا جسم سے الگ ہونا آسان لگ رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے یقیناً میری بے ہوشی کے دوران زہر لگا دیا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ زہر اپنے ہاتھ پر لگا کر مجھ سے ہاتھ ملاتا اور اس سے زہر میری جلد میں سرایت کر جاتا۔ خود ڈیوڈ شا کے پاس توڑ تھا اور وہ تکلیف سے بچ جاتا۔ مگر مجھے زہر لگانے کے لیے اسے زحمت نہیں کرنا پڑی ہوگی اس نے آرام سے بے ہوشی کے دوران مجھے لگا دیا اور اب اس کے متحرک ہونے کا وقت آگیا تھا۔

بالآخر میرا ضبط جواب دے گیا اور میں کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ زہر لب میں ڈیوڈ شا کی سات پشتوں کو کوس رہا تھا۔ کیونکہ ان میں سے ہر پشت اس جیسے خبیث آدمی کی دنیا میں آمد کی ذمہ دار تھی۔ تکلیف ایسی تھی کہ ایک جگہ رکنے کے بجائے مسلسل بڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں با آواز بلند ڈیوڈ شا کو نواز رہا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا

تھا کہ ایمن کس تکلیف سے گزری تھی کیونکہ اسی تکلیف سے میں بھی گزر رہا تھا۔ میں ہٹا کٹا مرد ہونے کے باوجود برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور اس نے نازک عورت ہونے کے باوجود بہت دیر تک یہ تکلیف سہی تھی۔ اچانک کمرے میں ڈیوڈ شاکی آواز کوئی۔ ”میں تمہاری گالیاں سن رہا ہوں اور میں نے برا نہیں مانا۔“

”ذلیل شخص۔“ میں نے دھاڑ کر کہا۔ ”کاش کہ میں نے تجھے قتل کر دیا ہوتا۔“

”ممکن ہے تم ہی مجھے قتل کرو۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”لیکن جب میرا وقت آئے گا تب مردوں

گا۔“

”ڈیوڈ شام نے..... وہی زہر لگایا ہے جو ایمن کو لگایا تھا؟“ میں نے قالین پر دوہرے ہوتے ہوئے کہا۔

کمرے کی خنکی کے باوجود میرے مساموں سے پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔

”ہاں یہ وہی زہر ہے۔ شہباز تم رومانہ اور راشد کو میرے حوالے کر دو میں ایک منٹ میں تمہیں اس تکلیف

سے نجات دلا دوں گا۔“

”لغت ہو تم پر۔“ میں نے جواب دیا۔ اس سے آگے جو کہا وہ سب ناقابل اشاعت سمجھیں۔ میں نے

زندگی میں کبھی اتنی تھوڑی سی دیر میں کسی کو اتنی گالیاں نہیں دی تھیں۔ اس پر بھی ڈیوڈ شاہے مزہ نہیں ہوا تھا اس نے آرام سے کہا۔

”ٹھیک ہے جب تم آمادہ ہو تو مجھے آواز دے لینا۔“

میں نے پھر اپنی زبان گندی کی اور اسے بتایا کہ میں اسے کیا دوں گا۔ تکلیف کی شدت نے مجھے پاگل کر

دیا تھا۔ میں قالین پر باقاعدہ لوٹ رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہاتھ کودیواریوں پر ماروں۔ نہ جانے کیسے میں

نے خود کو اس حرکت سے روکا ورنہ میرے ہی ہاتھ کو نقصان پہنچتا۔ درد یا ڈیوڈ شا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ نہ جانے کتنی دیر

گزری۔ درد سے توجہ ہٹانے کے لیے میں ذہن میں الٹی کتنی دہرانے لگا مگر یہ کتنی چند بار گنتے ہی گڈمڈ ہو جاتی

تھی میں بھول جاتا کہ نواسی سے پہلے کیا آتا ہے اور ستر کے بعد کیا تھا؟ جب لوٹنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوا تو

میں اوندھے منہ لیٹ گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ میری زبان خاموش تھی مگر میرا رواں رواں اللہ کے حضور

گڑگڑا رہا تھا کہ مجھے اس تکلیف سے نجات دے۔ شاید اس وقت میں نجات کے بدلے مرنے کو بھی تیار ہو

جاتا۔

پھر تکلیف نے میرے ذہن پر غشی سے طاری کر دی۔ میں کب کراہتے کراہتے آس پاس سے خود سے

غافل ہو گیا مجھے پتا نہیں چلا تھا۔ پھر ہوش آیا تو سکون تھا۔ صرف ہاتھ میں نہیں بلکہ ذہن و قلب میں بھی سکون تھا۔

جسم پسینے میں شرابور ہو کر خشک ہو گیا تھا البتہ گلے میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر ڈرتے

ڈرتے اپنے ہاتھ کو چیک کیا۔ اسے چھوا مگر ذرا بھی تکلیف نہیں تھی۔ ہاتھ بالکل نارمل تھا۔ میں نے اسے دبایا پھر

بھینچ کر دیکھا۔ کچھ نہیں ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ بے ہوشی کے دوران ڈیوڈ شا نے مجھے اس کا توڑ تو نہیں دے دیا

تھا۔ توڑ ایک انجکشن تھا جو ایمن کو بھی لگایا گیا تھا۔ میں نے اپنے بازو کو چیک کیا پھر جسم کو محسوس کر کے دیکھا مگر نہ تو

کہیں انجکشن کا نشان تھا اور نہ ہی اس کی تکلیف تھی۔ پھر تکلیف کیسے ختم ہوئی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو

دنگ رہ گیا۔

ابھی نوبے تھے اور میں سو آٹھ بجے اس کمرے میں آیا تھا گویا مجھے پینتیس چالیس منٹ سے زیادہ یہ تکلیف برداشت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ڈیوڈ شائستا اچھا نہیں تھا کہ اتنی جلدی مجھے اس تکلیف سے نجات دلا دیتا۔ میرا ذہن اب ٹھیک کام کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ تکلیف خود بخود کیسے ختم ہوگئی۔ کیا زہر نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تھا یا پھر یہاں بھی حکیم قاسم کی معجزہ صفت دواؤں نے اپنا کرشمہ دکھایا تھا۔ ان دواؤں کی بدولت میرے زخم بہت تیزی سے بھر جاتے تھے۔ جان لیوا سانپ کا زہر بھی مجھے مارنے سے قاصر رہا تھا تو کیا اسی وجہ سے یہ زہر بھی بے کار ثابت ہوا تھا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب ڈیوڈ شائستا کی طرف سے رد عمل کا انتظار کروں گا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ چند منٹ بعد ڈیوڈ شائستا کی آواز آئی۔ ”شہباز تم میری آواز سن رہے ہو؟“

ظاہر ہے میں خاموش رہا۔ وہ وقفے وقفے سے مجھے پکارتا رہا اور میں نے ایک بار بھی جواب نہیں دیا تھا۔ آخر میں اس کے لہجے میں کسی قدر جھنجھلاہٹ آگئی تھی۔ پھر وہ چپ ہوا اور اس کے چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ میں نے اس موقع پر بھی ساکت رہنا مناسب سمجھا۔ کسی نے میرے پاس بیٹھ کر میری نبض دیکھی، پھر دل کی دھڑکن چیک کیا اور آخر میں آنکھ کھول کر پتلی کا معائنہ کیا۔ میں نے آنکھ کو مرکوز کرنے کے بجائے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے سامنے جو چہرہ تھا اس کے نقوش مشرق بعید کے باشندوں جیسے تھے۔ وہ چھنی، جا پانی، کوریائی یا ویت نامی اور تھائی تک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا گویا وہ ڈاکٹر تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”وائل سائن نارمل ہیں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے اسے شدید تکلیف میں ہونا چاہیے۔“ ڈیوڈ شائستا بولا وہ بدستور اسپیکر سے بول رہا تھا۔

”میں نے چیک کیا ہے جناب..... آپ تکلیف کی وجہ بتا سکتے ہیں۔“

”ایک زہر جو اس کے بائیں ہاتھ میں انجکٹ کیا گیا ہے۔“

اس نے میرا بائیں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”اس پر زہر کی کوئی علامت نہیں ہے۔“

”وہ علامت والا زہر نہیں ہے اور نہ ہی جان لیوا ہوتا ہے لیکن یہ بہت شدید تکلیف کا باعث بنتا ہے۔“

تکلیف ایسی ہوتی ہے کہ انسان مرنے کی آرزو کرتا ہے کیا اس صورت میں وائل سائن درست ہو سکتے ہیں؟“

”بالکل نہیں..... معمولی سی تکلیف بھی دل کی دھڑکن، نبض کی رفتار بدل دیتی ہے، آنکھ کی پتلی پھلتی اور

سکڑتی ہے۔ جب کہ اس کی تمام چیزیں بالکل نارمل ہیں۔“

یہ صورت حال غالباً ڈیوڈ شائستا کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”اگر اس کے وائل سائن

نارمل ہیں تو اسے ہوش میں ہونا چاہیے۔“

”بالکل ہونا چاہیے جناب۔“ ڈاکٹر نے اس سے اتفاق کیا۔

”پھر یہ بے ہوش کیوں ہے؟“

”اس کے لیے اسے لیب لے جا کر چیک کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ٹھیک ہے اسے لیب منتقل کرو۔“ ڈیوڈ شانے کہا۔ ”اسے فوری ٹریٹ کرو اور پتا چلاؤ کہ یہ کیوں ہے ہوش ہوا ہے۔“

”دیا جانے والا زہر اعصاب کو متاثر کرتا ہے؟“

”نہیں وہ صرف تکلیف پیدا کرتا ہے۔“

”اس صورت میں اس کا معائنہ بہتر رہے گا۔“

”باسو سے کہو اسے لیب لے جائے۔ پورگی طرح محتاط رہنا یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

باسو کو ہدایت مل گئی تھی وہ اندر آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں سمجھا کہ وہ مجھے اٹھانے لگا ہے مگر اس نے اچانک ہی میرے سیدھے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔ کم سے کم اس وقت مجھے لگا تھا کہ وہ ہتھکڑی ہے۔ مگر جب اس نے دوسرے ہاتھ میں کچھ نہیں پہنایا اور مجھے سمجھنے کراپنے وسیع و عریض شانے پر ڈالنا تب میں نے موقع پا کر اپنے ہاتھ میں ڈالی جانے والے شے کو دیکھا۔ یہ ہتھکڑی نہیں تھی بلکہ خاصا موٹا چاندی جیسے رنگ کا دھاتی کڑا تھا۔ یہ تقریباً دو انچ چوڑا اور ایک انچ موٹا تھا۔ یہ میری کلائی میں اس طرح فٹ آیا تھا کہ اس نے کلائی کو پکڑ لیا تھا مگر دبا نہیں رہا تھا۔ بالکل مناسب سائز تھا۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی یہ کڑا مجھے ایسے ہی نہیں پہنایا گیا تھا۔ باسو مجھے شانے پر لادے آرام سے چلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر آگے تھا اور پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے ہاتھ اوپر کر کے کڑے کا معائنہ کیا۔ یہ ہموار اور میٹ فینشنگ کے ساتھ تھا۔ مگر اس پر نہ کوئی نشان تھا اور نہ ہی کوئی ابھار صرف جہاں سے ٹل کر بند ہوا تھا وہاں باریک سی لکیر تھی۔ ایسی ہی باریک لکیر دوسری سمت تھی جہاں سے یہ کھلتا ہوگا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں دوسرے ہاتھ سے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ ایک پیس کی طرح ٹھوس تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ میں راستے پر بھی توجہ دے رہا تھا مجھے لگا کہ میں جس عمارت میں تھا وہ خاصی بڑی تھی۔ یہ کم سے کم وہ گھسی نہیں ہو سکتی تھی جہاں فاضلی ڈیوڈ شا سے ملنے گیا تھا۔ دور اہدایاں مرنے کے بعد ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں چاروں طرف طبی مقاصد کے لیے مخصوص جدید ترین مشینری لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر باسو نے مجھے ایک کاؤچ نمائینڈ پر لٹا دیا۔ پھر اس نے ایک اسٹریپ میرے سینے سے باندھی اور ایسی ہی دوا سٹریپس رانوں اور پنڈلیوں پر بھی باندھ دیں۔ البتہ میرے ہاتھ آزاد تھے مگر وہ سینے والی اسٹریپ کی وجہ سے کہنیوں سے اوپر حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا اور بولا۔ ”اس کی شرٹ اتارو۔“

باسو نے سینے والی اسٹریپ کھول کر ایک ہی جھٹکے میں میری شرٹ پھاڑ کر اتار دی۔ دوسرے جھٹکے میں بنیان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اوپری جسم عریاں کر کے اس نے اسٹریپ دوبارہ باندھ دی تھی۔ ڈاکٹر نزدیک آیا اور میرے سینے، بازو اور سرے الیکٹروڈ چپکانے لگا۔ وہ مشینوں کی مدد سے میرا جائزہ لینے جا رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ اب ڈراما پکڑا جائے گا۔ اس لیے میں نے ہوش میں آنے کی اداکاری شروع کر دی۔ پہلے کراہا اور پھر تقریباً چیخنے کے انداز میں کراہنے لگا۔ ڈاکٹر تیزی سے میرے پاس آیا اس نے میرا گل تھپتھپایا۔ ”ہے کچھ محسوس کر رہے ہو۔“ اس نے انگریزی میں پوچھا وہ انگریزی ہی بول رہا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ یہ اس کی مادری زبان

نہیں تھی۔ ”اے ہوش میں آؤ۔“

میں فرمانبرداری سے ہوش میں آ گیا مگر چیخا اور کراہتا جاری رکھا۔ ”میرا ہاتھ پلیر کچھ کرو۔“
 ”کیا ہوا ہے ہاتھ میں؟“ اس نے مکاری سے پوچھا۔ حالانکہ ڈیوڈ شا اسے بتا چکا تھا۔
 ”شدید..... شدید تکلیف ہے۔ مجھے کوئی دوا دو۔“

”کیسی تکلیف ہے؟“ اس نے پوچھا ویسے وہ میرے لیے ذرا بھی فکر مند نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سوال کا جواب میں نے گالیوں کی صورت میں دیا اور حلق پھاڑ کر چلایا۔

”تجے ہو تو پتا چلے کہ کیسی ہو رہی ہے اپنے باپ کو بلا اس نے مجھے زہر دیا ہے۔ میں اسے.....“ اس سے آگے بھی جو تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ یہ اداکاری ضروری تھی۔ ایک تو میں ڈیوڈ شا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں تکلیف میں تھا مگر اس کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ دوسرے مجھے خطرہ تھا کہ اسے پتا چل گیا کہ مجھے اب تکلیف نہیں ہے تو وہ مجھ پر کوئی دوسرا حربہ آزمائے گا وہ اس کے لیے بالکل تیار اور آزاد تھا۔ اس لیے اسے تکلیف کا تاثر دینا ضروری تھا۔ میں چلا رہا تھا اور ساتھ میں کسمارہا تھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ اداکاری کو اصلی سچ دوں اس کے لیے خود پر جبر کر کے میں ڈیوڈ شا کو وہ گالیاں دے رہا تھا جو میں نے زندگی میں نہیں دی تھیں۔ ساتھ ہی اسے بے معنی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور باسو کسی جن کی طرح ایک طرف ساکت کھڑا تھا۔ بالآخر میں چیخنے چلانے اور گالیاں دینے سے ”تھک“ گیا اور یوں ہاپنے کے انداز میں کراہنے لگا جیسے مجھ میں اب بولنے اور چلانے کی سکت نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہاں بس وہی دو تھے مگر اچانک تالی بجنے کی آواز آئی اور پھر فاضلی اپنے مخصوص زہریلے انداز میں بولا۔

”ویل ڈن شہباز..... تم اداکاری اچھی کر رہے ہو۔“

اس پر میں نے فاضلی کو بھی نواز کر رکھ دیا اور آخر میں بولا۔ ”کتے کے بچے..... اپنے باپ نمبر دو سے بول..... تجھے بھی یہ زہر دے..... تب تو بھی اداکاری کر سکے گا۔“
 فاضلی میرے سامنے آیا۔ ”شہباز تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں جانتا ہوں تم کتنے اعلیٰ درجے کے اداکار ہو۔“

میں نے ایک بار پھر اس کی ایسی کم تھمی کی اور مزید جواب دینے سے گریز کیا۔ وہ بد بخت پہلے بھی میری اداکاری بھانپ چکا تھا۔ جب مرشد ہاؤس میں اس نے مجھے عقل ماؤف کر دینے والا انجکشن لگایا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ انجکشن ایکسپائر ہو گیا تھا۔ اسی طرح فاضلی بھی بچ گیا تھا۔ جس طرح اسے یقین تھا کہ میں اداکاری کر رہا ہوں اسی طرح مجھے بھی یقین تھا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔ پاگل نہ ہوتے ہوئے بھی پاگل ہونے کی اداکاری زیادہ مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انسان سب کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے لیکن تکلیف نہ ہوتے ہوئے تکلیف میں ہونے کی اداکاری یقیناً مشکل کام ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا مگر فاضلی منحوس بھانپ گیا تھا۔ اب پتا نہیں میری اداکاری میں خامی تھی یا اس کا ذہن میری طرف سے پہلے ہی مفلوک تھا۔ ڈیوڈ شا کی آواز گونجی۔ ”یہ اداکاری نہیں کر رہا ہے۔ اسے سچ سچ شدید اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“
 دشمنی کے باوجود اس حسن ظن پر میں نے دل ہی دل میں ڈیوڈ شا کا شکر یہ ادا کیا اور اس کے مزید احق

بننے کی دعا مانگی۔ پھر کراہتے ہوئے بولا۔ ”تم نے دیکھ لیا ہے میں نے تکلیف برداشت کر لی ہے۔ ڈیوڈ شا، اب تم کیا کرو گے مجھے مزید اذیت دو گے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”تمہیں آزمانے میں کیا حرج ہے؟“

”ڈیوڈ شا بہت بڑا حرج ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے نزدیک مرشد اور فاضلی جیسے دشمن ہو جاؤ گے اور ان کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ موقع ملے ہی انہیں جہنم رسید کر دوں گا۔“

فاضلی کے تاثرات مجھے گھڑے تھے اور اس نے مجھے خوفناک نظروں سے دیکھا تھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے الیکٹروڈ چپکا دیئے تھے اور اب ایک طرف رکھے کمیوٹر پر کچھ کر رہا تھا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ وہ اس کے ساتھ لگا رہا پھر اس نے اعلان کیا۔ ”کسی قسم کی تکلیف یا اندرونی زخم کا نشان نہیں ہے۔ تمام وائٹل سائن نارمل ہیں۔“

میں نے دل میں اسے برا بھلا کہا اور منہ سے بولا۔ ”وائٹل سائن کی اولاد..... میں تکلیف سے مر رہا ہوں۔“

”تم فراڈ کر رہے ہو۔“ فاضلی نے کہا اور میں نے گالیوں کا نیاراؤٹڈ شروع کیا۔ اس پر ڈاکٹر ہنسنے لگا ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اردو سمجھ آتی تھی۔ فاضلی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور غرا کر بولا۔

”اپنا منہ بند کرو۔“

اس پر ڈاکٹر کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے فاضلی کے سے لہجے میں کہا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”میں ہر جگہ جا سکتا ہوں۔“ فاضلی نے دعویٰ کیا۔

ڈاکٹر اس کے پاس آیا اور ذرا اچک کر اس کی ناک سے تقریباً ناک ملا کر بولا۔ ”یہ جگہ اس میں شامل نہیں ہے۔ ناؤ گیٹ آؤٹ۔“

فاضلی کا چہرہ بگڑا تھا مگر جب اس نے باسو کی طرف دیکھا تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے زہر پل کہا۔ ”حرامی دیکھ لوں گا تجھے۔“

فاضلی وہاں سے چلا گیا اور جاتے جاتے ڈاکٹر سے بھی زہر پل بہت کچھ سن گیا تھا۔ دونوں ڈیوڈ شا کے لیے کام کر رہے تھے اور ظاہر ہے وہ اپنا جھگڑا ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھا سکتے تھے جہاں ڈیوڈ شا کو مداعت کرنی پڑے لیکن مجھے بہت خوشی ہوئی تھی ایک تو فاضلی کی بے عزتی ہوئی تھی جس میں میں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا دوسرے ڈاکٹر کے رویے نے ثابت کیا تھا کہ ڈیوڈ شا کے دوسرے آدمی فاضلی سے نفرت کرتے تھے۔

میں اس چیز سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ فاضلی کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے ڈیوڈ شا سے پوچھا۔ ”سراس کا کیا کرنا ہے..... میرے آلات اس کی تکلیف کی نشاندہی سے قاصر ہیں۔“

”یہ زہر ایسا ہی ہے۔“ ڈیوڈ شانے کسی قدر فخر سے کہا۔ ”میری ایجاد ہے اور اس کا توڑ بھی میں نے ایجاد کیا ہے۔ باسو کو بھیج دو، میں انجکشن بھیجتا ہوں۔“

باسو چلا گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پانچ منٹ بعد آیا اور ڈاکٹر نے چھوٹے سے سلور سلنڈر میں موجود انجکشن نکالا۔ یہ گیس کی مدد سے بخ رکھا گیا تھا۔ سلینڈر کھولتے ہی اندر سے بھاپ سی نکلی تھی۔ ڈاکٹر نے

اسے میرے بازو میں انجکٹ کر دیا۔ اگرچہ میری تکلیف پہلے ہی ٹھیک ہو چکی تھی۔ مگر میں نے خوشی خوشی تو زلگوا لیا۔ ایمن کے تجربے سے مجھے معلوم تھا کہ تکلیف کتنی دیر میں کم ہوتی ہے میں نے اسی لحاظ سے رد عمل دیا اور تقریباً دس منٹ میں 'نارل' ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر میرا معائنہ کیا اور ڈیوڈ شا کو بتایا۔ "جسمانی حالت اور وائٹل سائن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔"

"مگذا اسے میرے پاس بھیج دو۔" ڈیوڈ شانے حکم دیا۔

باسونے ڈاکٹر کے اشارے پر اسٹرپس کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ میں نیچے اترا اور گویا پہلی بار اپنے ہاتھ پر دھاتی کڑا دیکھ کر چونکا۔ "یہ کیا ہے؟"

"چلو۔" پاسو غرایا۔

"شہباز اس کے ساتھ آ جاؤ میں وضاحت کرتا ہوں یہ کیا ہے؟" ڈیوڈ شانے کہا۔

"غالباً تم نے مجھے باضابطہ اپنے غلاموں میں شامل کر لیا ہے۔" میں نے طنزاً کہا۔ "یہ کڑا اسی سلسلے میں

ہے۔ سنا ہے تمہارے آباؤ اجداد امریکا میں سیاہ فام غلاموں کو ایسی ہی چیزیں پہناتے تھے۔"

ڈیوڈ شانے جواب نہیں دیا اور میں باسو کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مجھے اسی کمرے میں لایا۔ اس جگہ گھومنے پھرنے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ یہ ساؤنڈ پروف تھی۔ سناٹا اتنا مکمل تھا کہ میں اپنی سانس کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ یہ کوئی عام جگہ نہیں تھی یقیناً اسے خاص مقاصد کے لیے خاص انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ڈیوڈ شا اسی صوفے پر براجمان تھا اور اس کے ہاتھ میں اسکاچ و ہسکی کا گلاس تھا۔ البتہ اس کا تنومند محافظ غائب تھا اس کی جگہ باسونے لے لی اور میرے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ شانے مجھے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ڈیوڈ شا میں تمہارا کھیل پہلے ہی سمجھ گیا تھا مگر اس پر بات کرنے سے پہلے اس کے بارے میں جانتا چاہوں گا۔" میں نے ہاتھ بلند کر کے کڑا دکھایا۔

"تم نے ایک حد تک درست کہا کہ یہ تمہیں قابو میں رکھنے کے لیے ہے۔" ڈیوڈ شانے کہا۔ "یہ ملٹی فنکشن

ڈیوڈ اس ہے۔ اگر تم میرے پاس آنے کی کوشش کرو گے تو تمہیں شدید قسم کا برقی جھٹکا لگے گا جو تمہارے اعصاب شل کر دے گا۔ کم سے کم آدھا گھنٹہ تم کسی حرکت کے قابل نہیں رہو گے۔"

"ٹھیک ہے یہ آگے مزید کیا کام کرتا ہے؟"

"اس میں دو گرام پونا شیم سانا بیڈ خالص حالت میں موجود ہے۔" ڈیوڈ شانے کہا تو میرے جسم میں

خوف کی سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ اس خوفناک زہر کی ہلاکت خیزی سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ خالص حالت میں زبان پر رکھتے ہی یہ انسان کی جان لے لیتا ہے۔ انسان کو اتنی مہلت بھی نہیں ملتی ہے کہ وہ ایک لفظ ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ اس زہر کا ذائقہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ امریکہ میں سزائے موت کے مجرموں کو یہ زہر سانس کے راستے دیا جاتا ہے یا انجکٹ کیا جاتا ہے دونوں صورتوں میں یہ دو سے تین سیکنڈ میں آدمی کی جان لے لیتا

ہے۔ یہ جان کر میرا خوفزدہ ہونا فطری امر تھا کہ میرے ہاتھ سے منسلک اس کڑے میں یہ زہر موجود تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ زہر کس صورت میں میرے جسم میں داخل ہو جائے گا۔"

ڈیوڈ شانے ہاتھ آگے کیا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی جیسے رنگ کا کسی قدر موٹا چھلا تھا۔ "یہ اس کا کنٹرولر

ہے۔ اگر تم اس سے ایک گز کی دوری پر آ جاؤ تو تمہیں برقی جھٹکا لگے اور اگر تم اس سے سو گز دور چلے جاؤ تو زہر انجکٹ کرنے والا فنکشن حرکت میں آ جائے گا۔"

میں مسکرایا۔ "میری غلام والی بات درست ثابت ہوئی نا۔ اب دیکھو میں آزاد ہونے کے باوجود تمہارا غلام ہوں۔ تم مجھے آزاد کر دو تب بھی تم سے دور نہیں جاسکتا۔ کسی بھی ارادے سے تمہارے پاس نہیں آسکتا۔ باقی دی وے جب میں مکمل طور پر تمہارے قابو میں ہوں تو اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ صورت حال عارضی ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ خیر تم اس کے پابند بھی نہیں ہو۔ اب میرے لئے کیا حکم

ہے؟"

"تم آرام کرو۔ ابھی تمہارے پاس چند گھنٹے ہیں۔"

"چند گھنٹے کس چیز میں؟"

"باسو۔" ڈیوڈ شانے میرے سوال پر دھیان دیئے بغیر کہا۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ باسو مجھے پکڑ کر اٹھاتا تو میں خود کھڑا ہو گیا۔ باسو مجھے اسی کمرے میں لے آیا۔ وہاں پہلے سے ایک ٹرے میں دو عدد ایلے ہوئے انڈے، مکھن لگے سلاٹس، اور نچ جو س کا ایک گلاس اور پیک چائے کا کپ تھا اس میں رکھی چائے تادیر گرم رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک منزل واٹر کی بوتل تھی۔ یہ شاید میرا ناشتہ تھا۔ میں قالین پر بیٹھا اور ناشتے سے استفادہ کرنے لگا۔ میں نے آخری بار چوبیس گھنٹے پہلے سری پائے کا ناشتہ کیا تھا۔ لیکن مجھے، نکلی سے خوراک دی گئی تھی اس لئے مجھے معمول کی بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتہ کر کے میں نے چائے کے کپ کی سیل کھولی۔ ایک مشکل مرحلے سے گزرنے کے بعد میں خود کو پُر سکون محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کی ڈیوڈ شانے رومانہ اور راشد کا مطالبہ فی الحال مجھے سے ترک کر دیا تھا لیکن وہ انہیں میرے ساتھیوں سے حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔



اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
سولہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

کاشفِ دلیر کے قلم سے ایک تیز رفتار ایکشن سے بھرپور ناول



PDFBOOKSFREE.PK

ایک ایک باہر نکال، دیکھ کر آپک سلسلہ

- ❑ کوئی نہیں جانتا کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کون سا واقعہ مستقبل میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔
- ❑ انسانی عقل و فہم محدود ہے۔ وہ صرف محدود دائرے میں مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے۔
- ❑ خیر و شر کی اس ازلی جنگ کا قصہ اس کے بغیر فلسفہ حیات کے اسرار و رموز سے آگاہی نہیں دے سکتا۔
- ❑ اس نوجوان کی کہانی جس نے دنیا میں آنکھ کھولی تو قتل و غارت گری، تباہی و بربادی اس کی پہنچ گئی۔
- ❑ اس کی زندگی کے لیے بھی کوئی جائے پناہ نہ تھی لیکن قدرت کو شاید اس سے کوئی اہم کام لینا مسطور تھا۔
- ❑ چنانچہ وہ زندہ رہا اور اپنے دشمنوں کے لیے ایک چھتیا ثابت ہوا۔

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور
 علی میاں پبلیکیشنز
 فون: 37247414

E-mail: alimian_publications@yahoo.com